UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222832
UNIVERSAL
LIBRARY

اس وجہ سے یہ چھوٹے اور باقی بڑے کہلاتے ہیں - دریاے دون اور دنیپر کی وادیوں میں کوسک* آباد ہیں' ایک نسل جو سلاف' تاتار اور غالباً خچہ اور فا پید نسلوں کے میل سے بنی ہے - روس کا مشرق اور جنوب مشرقی حصہ کوہ اُورال سے بحر کیسپین اور کوہ قاف تک زیادہ تر تاتار' باشکیر' کرگز اور دیگر ایشیائی نسلوں سے آباد ہے' جو ابھی تک اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں: تاتاریوں میں سے کچھ عیسائی ہوکر سلاف نسل میں گھل مل گئے' جو مسلمان ہوے اور جنہوں نے بعد میں یورپین تہذیب اختیار کرنے سے بھی انکار کیا وہ دوسری حقیر نسلوں کے ساتھ اقوام جرائم پیشہ میں شمار ہوتے رہے +- بحیثیت مجموعی روس میں سلاف نسل کی اکثریت ہے' اس لئے باوجود اپنے غیر معمولی اجزا کے روسی قوم سلاف کہلاتی ہے —

اس امر کا قطعی فیصلہ مشکل ہے کہ سلاف نسل یورپین ہے یا ایشیائی - عام طور سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نسلیں وسط ایشیا کے سپاٹ میدانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر مغرب یا جنوب مغرب کی طرف رخ کرتی رہی ہیں' اور جنوبی روس مہاجر نسلوں کی شاہ راہ رہا ہے' جن میں سے تمام مشرق سے مغرب کی طرف گئی ہیں- سلاف نسل کی ہجرت کے بارے میں تاریخی ثبوت کوئی نہیں' لیکن یہ فرض کرلینے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ یہ نسل عام قاعدے کے خلاف چلی - وسطی یورپ سے جن نسلوں نے جنوب یا مشرق کا رخ کیا ہے ان کا حال تاریخ میں ملتا ہے' لیکن سلاف نسل ان میں سے نہیں ہے' اور اس کے علاوہ جرمن نسلوں کی ہجرت سلاف نسل کے جنوبی یورپ میں آباد ہونے کے بعد شروع ہوئی - یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں وحشی نسلیں ایک دریا کے کنارے کی طرح وسطی ایشیا سے بہتی ہوئی یونان اور ایران کی شہر پناہوں سے آکر ٹکراتی تھیں- سلاف نسل

---

* روسی میں انہیں کزاک کہتے ہیں - لفظ قزاق اسی نام کی ایک اور شکل اور اس قوم کی ایک اور تعریف ہے -

+ بولشوک نظام نے انہیں اب انسانیت کا رتبہ عطا کردیا ہے —

کا ذکر ہیرو ڈوٹس یا کسی اور قدیم مورخ کی تصانیف میں نہیں ملتا، لیکن غالباً وہ بھی اسی سیلاب کی ایک موج تھی جسے کوہ کار پیتھین کی بغل میں اور دریائے ڈینیوب کے کنارے ٹھکانا ملا —

چوتھی صدی عیسوی میں ایک یورپین نسل بحر بالٹک کی طرف سے آئی اور روس پر قابض ہوگئی - اس کا رہبر اور بادشاہ ہر مانرش تھا، اور یہ نسل جرمن تھی- ہر مانرش نے روس کو پہلی دفعہ ایک سلطنت بنایا، مگر یہ معلوم نہیں کہ جس نسل سے اس نے ملک چھینا وہ سلاف تھی یا کوئی اور - سلاف نسل ایک بارگی یا ایک ریلے میں ملک پر قابض نہیں ہوئی، اور اس کے شمال اور شمال مشرق کی طرف پھیل کر آباد ہونے کا حال جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ ہر مانرش کے بعد ہے- نویں، دسویں اور گیارھویں صدیوں میں، جب سلاف نسل روس پر بتدریج قابض ہو رہی تھی، یورپ کی طرف سے وریاگ اور دوسری جرمن اور سکینڈی نیوین نسلوں کے حملے ہوئے، اور روسی شرفا کا دعویٰ ہے کہ وہ یورپین ہیں اور انہیں نسلوں کی اولاد ہیں - فاتح نسلوں کی طرح ان جرمن مہاجرین نے بھی زمین پر قبضہ کرلیا، زمیندار بن گئے اور انہوں نے مغلوب سلاف نسل کی محنت کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا، اگر یہی صورت قائم رہتی تو یہ تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ روس کے زاری عہد کے شرفا اور امرا سب جرمن نسل سے ہیں، لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاروں نے روس کو تہ و بالا کردیا - کوئی شہر، کوئی شریف خاندان ان سے نہ بچ سکا، اور مشرقی روس میں انہوں نے دیہاتی آبادی تک کو نیست و نابود کردیا - جس ملک میں تاتاروں نے قدم رکھا، اس کے باشندوں میں تاتاری خون پہنچ گیا، اور اگر روس میں کچھ ایسے خاندان بھی باقی رہ گئے جو تاتاروں کے پنجوں سے جان بچا لے گئے تو یہ مشکل سے ثابت کیا جا سکے گا کہ اُن کی نسل میں تاتاری خون نہیں —

شریف خاندانوں کے شجروں میں نقائص پیدا کرنے کے علاوہ تاتاری حملوں نے

روس کو ایک اور نقصان پہنچایا - شہر کیف میں نویں صدی کے شروع سے عظمت کے آثار نمایاں ہورہے تھے- پہلے اسے سلاف نسل نے جو رفتہ رفتہ وادی دنیپر کے عرض و طول میں پھیل رہی تھی ' اپنی ایک منزل بنائی' اور چونکہ وہ قسطنطنیہ کی شاہ راہ پر واقع تھا' اس لئے وہ بہت جلد تجارت کا مرکز بن گیا - اسی صدی میں جب وریاگ نسل نے روس اور شہر کیف پر قبضہ کیا تو کیف کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ گئی یہاں تک کہ سنہ ۸۶۰ ع میں اس کے بادشاہ نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ کردیا ' لیکن تجارتی لحاظ سے کیف کے بادشاہ حکومت قسطنطنیہ اور ان اسلامی ممالک کی سرپرستی کے محتاج تھے جن کے راستے میں قسطنطنیہ واقع تھا - مسلمانوں کا اثر تو صرف اس قدر ہوا کہ روسی بول چال میں بہت سے فارسی اور عربی الفاظ رائج ہوگئے قسطنطنیہ کے اثر سے کیف کے بادشاہوں اور روس کی تقریباً کل آبادی نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ' شاہزادہ عظیم ' ولاجیمر ویفوساخ سنہ ۱۱۱۳ - ۱۱۲۵ کے عہد میں روسی نسلیں عیسائی ہونے کی وجہ سے خود کو روشن ضمیر اور مہذب تصور کرنے لگی تھیں اور فی الواقع قسطنطنیہ کے رہبانوں اور اسلامی ممالک کے تاجروں نے روس کی وحشی فطرت میں تہذیب اور تمدن کے بیج بودیے تھے- ان خانقاہوں (Monastaries) میں جو جا بجا قائم ہوئی تھیں چند روسی رہبانوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا ' مذہبی ضروریات نے روسی ابجد اور ابجد کے ساتھ باقاعدہ زبان کی تخلیق لازمی کر دی' چنانچہ اسی زمانے میں کلیسائی روسی زبان * کی بنیاد پڑی' لیکن تہذیب کی یہ روشنی بجلی کی سی چمک تھی ' اور ملک کو ایسی تاریکی میں چھوڑ گئی جو پہلے کی جہالت سے بھی زیادہ ہولناک تھی - شاہزادہ عظیم کی موت کے بعد ملک میں سیاسی انتشار پیدا ہو گیا ' اور گذشتہ عہد کی جو تھوڑی بہت یادگار باقی تھی' اُسے تاتاروں نے لوٹ کر برباد کر دیا - تاتاری

---

* اسے سلاف زبان بھی کہتے ہیں - انجیل کا ترجمہ اصل یونانی سے اسی زبان میں ہوا ' اور کلوسا میں بولشوک انقلاب تک یہی رائج تھی —

حملوں کے بعد کئی سال تک وہ شہر جو شاہان کیف کے زمانے میں آباد اور خوشحال تھے راکھ کے انبار بنے رہے ' شہری زندگی اور شہری تہذیب کے تمام آثار مٹ گئے تاتاریوں کے کشت وخوں نے ایشیا اور یورپ میں باہمی بیر کے بیج بو دیے ' عیسائی مذہب کے رہنماؤں نے حسب معمول فتنے کو بڑھایا ' اور روسی قوم کو تاتاریوں کے توسط سے تمام ایشیائی نسلوں سے ایسی گہری نفرت ہو گئی جس کا صدیوں تک اثر باقی رہا' اب ہمارے زمانے میں آخر کار بولشوک انقلاب نے اُس کے نقش دلوں سے مٹائے ہیں —

محض نسل کے لحاظ سے روسی قوم کو بحیثیت مجموعی یوروپین تصور کرنا غلط ہے - لیکن وہ ایشیا کے تمدنی مرکزوں سے دور اور یورپ سے نزدیک ہی ہے ' یا جیسے روسی خود کہتے ہیں ' اُن کا منہ یورپ کی طرف ہے اور پیٹھ ایشیا کی طرف ' اس لئے روسی ذہنیت پر یورپ ہی کا اثر رہا ہے - تاریخی واقعات اور یورپ کی تقلید نے اسے ایشیا کا دشمن بنا دیا ' بااقتدار ریاست ہونے کے بعد اس نے ایشیائی اقوام سے وہی عداوت برتی جو شروع سے اس وقت تک یورپ کی قوموں کا معمول رہی ہے- روسی کسانوں پر یوروپین تہذیب کا اثر کبھی نہیں ہوا مگر مذہبی تعصب نے انہیں یورپ ہی سے وابستہ' یا کم از کم ایشیائی نسلوں اور ایشیائی تمدن سے بیگانہ رکھا - ایشیائی سیرت پر یوروپین تہذیب کی قلم لگانے سے روس یورپ اور ایشیا کی درمیانی کڑی بن گیا ' اور اگر اس تعلق سے روس کو نقصان ہوا اور یورپ اور ایشیا کو مطلق فائدہ نہ پہنچا ' اگر روس نے یوروپین اور ایشیائی تہذیب کو ارادۃً یکجا کرکے دونوں میں سے اپنی خاص تہذیب نہیں تعمیر کی اور بنی نوع انسان میں باہمی مفاہمت کا ذریعہ نہیں بنا تو یہ اس کے رہنماؤں کی تنگ نظری تھی ' لیکن پھر بھی روسی سیرت' تہذیب اور ادب میں ایشیائی عنصر موجود ہیں' کہیں کہیں ایسی صورت میں بھی کہ ایشیا کے وطن پرستوں کو یوسف گم گشتہ کے پائے جانے کا مژدہ سنا سکیں —

تاتاری حملوں کے بعد سے پندرھویں صدی کے وسط تک روس میں طوائف الملوکی رہی ہے - ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے سے لڑتو سکتی تھی مگر کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ فتح یا شکست سے کوئی خاص نتیجہ نکلے - قسمت ریاست مسکووی ● کی جو خاندان رومنوف کے قبضے میں تھی کسی قدر مددگار رہی، اور وہ اپنے ہمسروں کے مقابلے میں پھیلتی اور مضبوط ہوتی رہی، یہاں تک کہ پندرھویں صدی کے وسط تک کوئی ایسی ریاست نہ تھی جو تن تنہا اسکا مقابلہ کرسکے - ایک صدی کے بعد اوان چہارم (۱۵۳۳ - ۱۵۶۴) نے اس کے اقتدار کو اسقدر بڑھا دیا کہ وہ ملک پر حاوی ہوگئی، اور بہت سی ریاستیں اس میں شامل ہوگئیں - اوان چہارم کے مظالم نے ملک میں بہت بےچینی پیدا کردی اور اسکی موت پھر طوائف الملوکی کا باعث ہوئی - ریاست کا انتظام ابتر ہو گیا، جان و مال تک محفوظ نہ تھے اور گذشتہ بدنظمی کے مقابلے میں اگر اس وقت حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے تو صرف اس لحاظ سے کہ اب روس ایک باقاعدہ ریاست بن گیا تھا، پہلے کی چھوٹی خود مختار ریاستیں شاذ ہوگئی تھیں، اور بیسیوں ظالم بادشاہوں کی بجائے صرف ایک بادشاہ تھا۔ اگر اوان کو سلیقے کا وارث ملتا تو غالباً روس اسی صدی میں مہذب نہیں تو باوقار اور مضبوط ریاستوں میں شمار ہونے لگتا لیکن اوان کے مرتے ہی فساد اور خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور ملک کا نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرد۔

سولھویں صدی کے آخر تک کم و بیش یہی کیفیت رہی - اوان چہارم کے ہاتھ کا گرا ہوا عصا اور اسکی ناکام اُمیدوں کا ورثہ پیٹر اعظم † کو ملا، جو اپنے مورث کی طرح خود سر، بےرحم اور بیباک تھا اور اتنا سنگدل بھی کہ اُس میں فساد اور بد نظمی کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لئے جتنا خون بہانا ضروری تھا وہ بہاسکے۔ اسکے علاوہ وہ بلند حوصلہ بھی تھا اور اس کے تصور میں بھی وہی ہمت تھی

● اس ریاست کا دارالسلطنت شہر مسکوا (ماسکو) تھا † سنہ ۱۶۷۲ - ۱۷۲۵

جو اس کے دل میں - اس نے یہ محسوس کیا کہ روس کو یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے صرف اندرونی انتظامات درست کرنا اور فوج کی تعداد بڑھانا کافی نہیں تھا بلکہ انگلستان، جرمنی اور فرانس کا صنعت و حرفت میں ہم پلہ بننا بھی ضروری تھا۔روس کی یہ حاجت پوری کرنے کے لئے اس نے خود ہالینڈ میں جاکر جہاز بنانا سیکھا اور افراد کو صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے کی بہت ترغیب دی۔ روس کا قدیم دارالسلطنت ماسکو یورپ اور سمندر سے بہت دور تھا، پیٹر نے دریائے نیوا پر بحر بالٹک کے ساحل پر ایک نیا دارالسلطنت سینٹ پیٹرزبرگ تعمیر کیا، جو یورپ کے بڑے شہروں کی وضع پر تھا اور جس میں یہ دونوں صفتیں بھی موجود تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پیٹر کو ایہ وہم ہوگیا کہ روس کی ترقی صرف یورپ کی تقلید سے ہو سکتی ہے اور اُس نے روس کے سر برآوردہ طبقوں کو یورپین معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔کچھ مخالفت کے بعد جو خون کے دریاؤں میں بہادی گئی، روسیوں نے پیٹر کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔ چند نسلوں کے بعد وہ اپنی پرانی وضع ایسی بھول گئے کہ اسے یاد کرکے انہیں خود تعجب ہوتا تھا، اور اپنی نئی طرز معاشرت کے ایسے فریفتہ ہوگئے کہ انہیں اپنی گذشتہ زندگی اور اپنی تاریخ پر شرم آنے لگی یورپ کی پیروی میں روسی ریاست نے عظمت اور اقتدار تو بہت کچھ حاصل کیا، لیکن اندھا دھند تقلید میں روسی قوم نے اپنی شخصیت گم کردی، جو اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوا۔ اُس نے دنیا کی نعمتیں تو سب جمع کرلیں، لیکن دل کی وہ کیفیت ہوگئی کہ اُن سے لطف اُٹھانے کا مادہ نہ رہا۔

پیٹر نے روسی ادب کو ریاست کے زیرسایہ لے کر اُس کی نشوونما کے لئے راستہ صاف کردیا، لیکن وہ زمانہ بھی بہت جلد آگیا جب ریاست قوم کی ذہنی ترقی میں رکاوٹیں ڈالنے لگی، اور جیسے پیٹر نے روسی ذہنیت کو قدیم روسی فلسفۂ

زندگی سے پاک کرنے کے لئے خون کے دریا بہاے تھے' ویسے ھی ایک صدی بعد زاری حکومت نے آزاد خیالی کو موت کا خوف دلا کر اور اکثر موت کی سزا دے کر روکنا چاھا - روسی تصور پر اس داروگیر کا بہت گہرا اثر ھوا' اور اُس عہد کی اکثر تصانیف پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ ھذیان کی حالت میں لکھی گئی ھیں' یا مصنف کے تصور نے دیوانگی اختیار کرلی ھے - تقریباً ھر مصنف کے دل پر مایوسی ایک خون کے دھبے کی طرح لگی ھوئی ھے' جو چھٹائے نہیں چھٹتا - مگر اس کیفیت کا الگ اور مفصل ذکر لازم ھے —

جو کوئی روسی قوم سے دوستی کرنا' اور روسی ادب کو سمجھنا چاھتا ھے اسے پہلے روسی فطرت کی نرالی خصوصیتوں' روسی دل کی نادر کیفیتوں سے ضرور واقیفت پیدا کرلینا چاھئے - روسی ادب کا مورخ بھی اس پر مجبور ھے کہ اپنے پڑھنے والوں کو موضوع کی دشواریوں سے باخبر کردے' اس لئے کہ روسی قوم کی طرح روسی ادب نے بھی باقاعدہ نشو و نما نہیں پائی' اُس میں کوئی ایسی خصوصیات یا علامات نہیں جنھیں ابتدا سے انتہا تک بیان کیا جاسکے' یعنی صحیح معنوں میں روسی ادب کی کوئی تاریخ نہیں - اُس کی صورت ایسے باغ کی نہیں ھے جس میں فطرت کے باغبان نے شوق اور نزاکت احساس سے ترتیب قائم کی ھو' وہ ایک خود رو جنگل ھے جس میں ھر پودا اور ھر پھول اپنی طبیعت کے زور سے اُگا ھے' اور اپنی خوبیاں نمایاں کرنے کے لئے کسی غورپرداخت یا قدردانی کا احسان مند نہیں - اس خود رو جنگل پر ایک سرسری نظر ممکن ھے کہیں نہ جمے' جھاڑیوں اور کانٹوں میں اُلجھ جاے' یا ظاھری بے سر وسامانی اُسے مایوس کردے اور وہ فطرت انسانی کی جلوہ افروزی کے دیدار کے لئے کسی اور طرف رخ کرلے - روسی ادب کا مورخ اس جنگل میں ظاھری حسن یا نظام پیدا کرنے کا دعوی نہیں کرسکتا' جو خود ادراک اور اشتیاق نہ رکھتا ھو اُسے اس جنگل کی سیر میں کوئی لطف نہیں آسکتا' اس جنگل کا

کوئی پھول اُس کے دل پر اپنا نقش نہیں قائم رکھہ سکتا - سیرت کی دلفریبی اکثر صورت سے نہیں ظاہر ہوتی ہے ' لیکن جسے حقیقت کی جستجو ہو اُسے ان ظاہری باتوں کے پھندے میں نہ پڑنا چاہئے ' اور یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اُس کا مقصد تلاش کرنا اور پانا ہے ' اعتراض کرنا اور مایوس ہوجانا نہیں - روسی ادب کی تاریخ صرف اسی امید پر لکھی جاسکتی ہے —

" یورپ میں کوئی ایسی قوم نہیں " روسی مورخ کلیو چفسکی لکھتا ہے : " جس کے افراد تھوڑی مدت تک اس جانفشانی اور تیزی سے کام کرسکیں جیسے روسی کرتا ہے ' مگر استقلال اور اندازے سے زیادہ عرصے تک محنت کرنے کی صلاحیت بھی کہیں اس قدر کمیاب نہیں " روسی ادب کو نظام اور نشو و نما سے محروم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہدار قومی سیرت کی یہ خصوصیت ہے - ادب اور عام طور سے فنون لطیفہ میں اُن اصولوں کو بہت کم دخل ہے ' جن کے مطابق عمل کرنا عالم کا فرض ہے ' لیکن روسی فطرت میں قلون مزاجی اور بیقراری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کسی قسم کا ادبی معیار یا تنقید کے کوئی اصول تک نہیں مقرر ہوسکے - روسی مذاق اس حیرت انگیز تیزی سے بدلتا رہا ہے اور ہر نئے دور نے پچھلے دور کے بتوں اور بزرگوں کو اس بیدلی سے بھلایا ہے کہ مورخ کے لئے کسی قسم کا سلسلہ قائم کرنا صرف ناممکن نہیں بلکہ ناجائز بھی ہوجاتا ہے - اگر مورخ اٹھارویں صدی کا ادبی ذخیرہ جمع کرتا ہے اور اسکا مطالعہ کر کے انیسویں صدی کے ادب میں وہ خصوصیات تلاش کرتا ہے جن کی اسے پچھلی صدی کے کارناموں میں ایک جھلک سی نظر آئی ہے تو اسے سراسر مایوسی ہوتی ہے ' اُنیسویں صدی کے مصنفوں نے بالکل الگ رنگ اختیار کیا اور جدت کے شوق میں انھوں نے گذشتہ دور کی ارزوؤں اور کوششوں کو بالکل بالائے طاق رکھدیا ' انیسویں صدی کے پہلے حصے کا طرز ہمیں اسکے آخری حصے میں نہیں ملتا ' بیسویں صدی میں انقلاب سے قبل پھر ایک نیا دور شروع ہوا ' جس میں انیسویں صدی کے آخر کے اسلوب بالکل ترک

کردیے گئے' اور روسی ادب کے آشنا اُسے اُس شکل میں بہ مشکل پہچان سکیں گے جو اُس نے انقلاب کے بعد اختیار کی ہے - اٹھارویں صدی کے وسط سے' جب ادبی جد و جہد کا آغاز ہوتا ہے' روسی زبان نے بھی کئی جنم لئے ہیں - پہلے یہ کوشش تھی کہ اُس کی خامیوں کی خانہ پری فرانسیسی زبان سے کی جائے' پھر جدت پسندی نے یہ عادت چھڑاکر اُسے خالص روسی بنانا چاہا - اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ پابندی بھی اُٹھنے لگی' اور دستفسکی اور چخف نے وہ زبان اختیار کی جو معمولی گفتگو میں استعمال ہوتی تھی' اور جس میں بیرونی زبانوں کے الفاظ کثرت سے اپنا لئے گئے تھے - انقلاب سے پہلے ادبی حلقوں پر پھر ایک وحشت سوار ہوئی' جس نے انھیں مشکل پسندی اور انوکھے پن کی طرف ایسا مائل کردیا کہ انھوں نے معنی اور مطلب کو الفاظ پر' اور الفاظ کو ندرت پر نثار کردیا - انقلاب کے بعد کی زبان وہی سمجھ سکتا ہے جو روس کی دیہاتی بولیوں سے بخوبی واقف ہو' اور کچھہ انقلاب کا سود' بھی سر میں رکھتا ہو —

"روسی انسان خود رأے اور من چلا ہوتا ہے' اس لئے کہ جس فطری ماحول میں وہ زندگی بسر کرتا ہے' اس کی خاصیت تلون مزاجی ہے - روسی آب و ہوا اکثر انسان کی محکم سے محکم تدبیریں پلٹ دیتی ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ امید پوری نہیں ہونے دیتی- روسی انسان ان دغابازیوں کا عادی ہوگیا ہے' اور باوجودیکہ اُس کی اپنی طبیعت احتیاط اور ہوشیاری کی طرف مائل ہے' وہ اکثر اپنا سر ہلاکر ایسے ارادے کرتا ہے جن میں کامیابی کا سب سے کم امکان ہوتا ہے' ایسی تدبیریں سوچتا ہے جو بظاہر بالکل غلط ہوتی ہیں' اور یوں اپنے فطری ماحول کا منہ چڑاتا ہے ..... پیٹ پالنے کے لئے اُسے فطرت اور آب و ہوا سے لڑنا پڑتا ہے' اُس کے کام کا تقاضا رہتا ہے کہ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں اکیلا محنت کرے' درخت کاٹے یا ہل چلاے ..... وہ اپنی طبیعت کو سماجی تعلقات کے مطابق تربیت دینا نہیں سیکھہ سکا ' اُس کے جذبات سماجی فرائض کو مشکل سے تسلیم کرتے ہیں ..... اس لئے روسی تنہائی میں

بہتر کام کرسکتا ہے، جب اُسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو، دوسروں کے ساتھہ باہمی امداد کے اصولوں پر اُسے عمل کرنے کی عادت نہیں اور خواہش بھی نہیں - وہ دل کی بات کہتے ہوے گھبراتا ہے، کسی کو اپنا راز داں نہیں بنانا چاہتا، ہر وقت چوکنا رہتا ہے، تنہائی اُسے ہر قسم کی صحبت سے زیادہ مرغوب ہوتی ہے، اپنے اوپر بیگانی نظریں دیکھہ کر وہ اپنے ہنر چھپا لیتا ہے، اور یوں صحبت میں اس کی بہت سی خوبیاں پوشیدہ رہتی ہیں" - (کلیو چفسکی : "تاریخ روس")

بیرونی اثرات اور ملک کی نشو و نما نے اقتصادی حالت بہت بدل دی ہے، "جنگلوں" میں محنت کرنے پر روسی مجبور نہیں، دوسری نسلوں کے شمول نے روسی طبیعت اور نفسی کیفیات میں رنگا رنگی پیدا کردی ہے، مگر پھر بھی یہ قدیم سلافی خصوصیات قوم کے بڑے حصے میں پائی جاتی ہیں، اور روسی کسانوں میں اب تک ہو بہو موجود ہیں - آگے چل کر جب روسی ناول نویس ہمیں روسی زندگی کی تصویریں دکھائیں گے، تو ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ روسی فطرت کو ان چند خصوصیات پر محدود کرنا اُس کے حق میں نا انصافی ہے، مگر ہمیں کبھی انھیں بھولنا نہ چاہئے، اس لئے کہ اگر یہ سطح پر نظر بھی نہ آئیں تو یہ اُن کے معدوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر ہم نے ان کو ذہن نشین نہ کیا تو ہم روسی زندگی کے بہت سے معمے حل نہ کرسکیں گے، ناولوں اور ڈراموں کے بہت سے کیرکٹر ہمیں مصنوعی معلوم ہوں گے، جن فکروں میں وہ مبتلا ہیں ان کی اہمیت کا ہمیں احساس نہ ہوگا —

یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے روسی ادب باقاعدہ نشو و نما نہیں پاسکا، انھیں نے اُس میں انفرادیت کا رنگ بھی گہرا کردیا ہے - دوسری قوموں نے رفتہ رفتہ اپنے ادب کا ذخیرہ اکٹھا کیا ہے، اُن کا ادب ایک عمارت ہے جو اینٹ سے اینٹ جوڑ کر صدیوں میں تیار ہوئی؛ روسی ادب ایک طلسمی محل کی طرح حیرت انگیز تیزی سے وجود میں آگیا، اس کی ہستی محض جوہر ہی جوہر ہے، اور اُس کا سارا

سرمایہ چند عظیم‌الشان شخصیتیں، جن میں سے ہر ایک نے الگ رنگ اختیار کیا، جو ایک دوسری سے، اور اپنی قومی تاریخ سے بالکل بے نیاز رہیں، دفعتاً نمودار ہوئیں اور دفعتاً ناپید ہوگئیں - کلیو چفسکی نے روسی افراد کی جو تعریف کی ہے وہ در اصل بالکل صحیح ہے، اور جس قدر ہم روسی ادب کی نرالی روش پر غور کرتے ہیں، اُس کے قول کی صداقت ظاہر ہوتی جاتی ہے - "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود -" روسی ادب کی کل تاریخ اس ایک مصرع میں بیان ہوجاتی ہے، اور اسی وجہ سے کہ روسی طبیعت میں تیزی ہے، استقلال نہیں، روسی ادب کی بے نیازی اور جدت پسندی کو انتہائی شدت پر اسی انفرادیت کے مادے نے پہنچایا ہے جو روسی افراد کو تنہا اور سوسائٹی کے جور و احسان سے بے فکر اور بے خبر رکھتا ہے —

انفرادیت کا لازمی نتیجہ انتشار ہوتا ہے - روسی ادب کی بے شمار خوبیوں کو دیکھتے ہوے ہم اس کی زیادہ شکایت تو نہیں کرسکتے، اس لئے کہ انفرادیت اور انتشار کے بغیر بہت ممکن ہے کہ یہ خوبیاں نمایاں نہ ہوتیں، لیکن روسی فطرت کی اس پوَرکتی ہوئی رگ نے کچھ خامیاں بھی پیدا کردی ہیں، جن کا اعتراف کرنا انصاف کا تقاضا ہے - پہلا نقص بیان ہوچکا ہے، یعنی یہ کہ روسی ادب کی کوئی مجموعی شکل اور مسلسل تاریخی نشو و نما نہیں - تنقید کے لئے معیار مقرر ہونا در کنار، کسی روسی کو اب تک یہ نہیں محسوس ہوا ہے کہ روسی ادب کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے - روسی ادب کی کوئی روایات نہیں قائم ہوئی ہیں، نہ کوئی ایسا نصب العین جو پشت در پشت ادب کے شیدائیوں کا ورثہ بن سکے - پُشکن کے علاوہ روسی انشا پردازوں میں کوئی ایسی جامع شخصیت بھی نہیں ہوئی ہے جس کا ادبی حلقوں پر ایک نسل سے زیادہ اثر رہا ہو، اور پشکن کی بھی وہ حیثیت نہیں جو جرمنی میں گوئٹے، یا انگریزی ادب میں شیکسپیر کی ہے - اس کی تلافی انفرادی عظمت نے ایک حد تک ضروری کردی ہے، لیکن بے اصول ہونے کے

اعتراض سے روسی ادب بالکل بری نہیں کیا جاسکتا —

اسی سلسلے میں ایک اور الزام بھی ہے ' جسکا اقرار کرتے ہوے زیادہ افسوس ہوتا ہے : روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی اور انفرادی حیثیت سے بھی بہت کم ایسے مصنف ہیں' جن کے حق میں دعوی کیا جا سکتا ہو کہ یہ حوصلہ ان کا مطمح نظر تھا۔ پشکن ' ٹالسٹائی ' دستۂفسکی کی تصانیف میں کبھی کبھی اسکی ایک جھلک سی دکھائی دیتی ہے' لیکن اس پر حزن مایوسی اور تقدیر پرستی حاوی رہتی ہے ' یا توجہ کسی اور مسئلے کی طرف منتقل کردی جاتی ہے جسکی دلچسپی یا اخلاقی اہمیت کچھ بھی ہو اس سے تشکیل زندگی کا مقصد کسی طرح بھی نہیں پورا ہو سکتا۔ انگلستان میں ناول نویسی قوم کی اصلاح کے لئے ایجاد کی گئی تھی ' اب بھی سنجیدہ ناول نویسوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی خاص عقیدے یا تخیل کے مبلغ نہ ہوں ' تب بھی قوم کے اُن افراد کو جو اُن کے زیر اثر ہیں' ایک فلسفۂ زندگی تعمیر کرنے میں مدد دیں' قومی زندگی پر نکتہ چینی کریں ' قوم کو اپنے دماغ اور دل اور ذہنیت کی اصلاح کرنے کی رغبت دلائیں ' یا کسی خاص معاملے میں اسکی ضرورت سمجھائیں - جرمن تہذیب میں محض گوئٹے کی شخصیت نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کردیا ' اور اپنی قوم کے لئے جو رومن کلیسا سے قطع تعلق کرچکی تھی ' اور جسکی روحانی ضروریات اس کا اپنا کلیسا اور کلیسائی تعلیم نہیں پوری کرسکتی تھی' ایک مکمل فلسفۂ زندگی فراہم کیا جو اب تک ایک مذہب کا کام دے رہا ہے - تشکیل زندگی کے لئے قومیت کا احساس لازم ہے ' اور اگر یہ احساس زیادہ شدید نہ ہوجاے تو اُس سے صرف ملک کی اندرونی زندگی میں ہم‌آہنگی نہیں پیدا ہوجاتی بلکہ قوم کو ذہنی اور روحانی نشوونما کی طرف رغبت دلانے کے لئے ایک محرک مل جاتا ہے - اور افراد میں تخلیق اور تعمیر کی آرزو بھڑک اُٹھتی ہے - اگر قومیت کا احساس نہ ہو ' یا ضروری

نہ سمجھا جاے تب بھی انسانیت کا تقاضا ہے کہ مجموعی زندگی کا ایک مقررہ نصب العین ہو جسے حاصل کرنے کی سوسائٹی ہمیشہ کوشش کرتی رہے - مگر قومی نصب العین اُسی وقت قائم ہو سکتے ہیں جب قوم کے افراد اُنھیں اپنی انسانیت اور ترقی کی شرط سمجھیں ' اور اُنھیں یقین ہو کہ قوم میں محو ہونے سے اُنھیں وہ نفسی اور روحانی تسکین حاصل ہوسکتی ہے جو اُنھیں اپنی آرزوئیں اپنی ذات تک محدود رکھنے سے نہیں مل سکتی - یورپ کی دوسری قوموں نے ذہنی انفرادیت - یعنی فرد کی ذہنی آزادی ' خودمختاری اور بےنیازی - قربان کرکے ایک قومی شخصیت تعمیر کی ہے ' ایک عظیم الشان ہستی جس میں انفرادیت کی تمام خصوصیات موجود ہیں - وہ اس قومی شخصیت کے کمال کو اپنا کمال سمجھتی ہیں - اُسی میں اُنکے مذہب - اخلاق ' جسمانی اور روحانی زندگی کا سامان ہے - مگر روسی فطرت نہ تو اپنی انفرادیت کے ایثار پر راضی ہوسکتی ہے ' نہ یقین کر سکتی ہے کہ قوم کی شخصیت میں فرد کو کبھی فلاح حاصل ہو گی - قوم اور ملک اُسکے نزدیک انسان نے چند سیاسی اور اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایجاد کئے ہیں - جب اُن کی اپنی کوئی ہستی نہیں تو وہ دوسروں کی ہستیاں کیا بنائیں یا سنواریں گے - چنانچہ روس میں باھمی زندگی نے کبھی صحیح معنوں میں ایک سوسائٹی کی صورت نہیں پائی ' روسی قوم نے بحیثیت مجموعی کبھی ترقی کرنے کی جدوجہد نہیں کی اور کوئی سیاسی تحریک ایک نہایت محدود حلقے کے باہر اثر نہیں کرسکی - روس کے خوشحال طبقوں کو پیٹر اعظم نے یورپین طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا اور یوں اُن کے لئے یورپین تہذیب کے دروازے کھل گئے ' اُنھیں اپنی انسانیت کو فروغ دینے کی کوئی خواہش نہیں تھی - روسی کسان انیسویں صدی میں جبراً آزاد کئے گئے ' اُنکو اس طرح سے زمینداروں کے پنجے سے رہائی ملی ' لیکن اُنھوں نے خود آزادی کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی ' ہمیشہ سے دنیا کی

ساري مصیبتیں خاموشی سے جھیلتے چلے آرہے تھے' اور اپنی اقتصادی حالت سے کبھی بےاطمینانی نہیں ظاہر کی۔ بولشوک انقلاب بھی کسی ایسی تحریک کا نتیجہ نہیں جس میں قوم کیا افراد کی بھی کثیر تعداد شریک ہوی ہو' یا اُسکے نصب العین سے ہمدردی رکھتی ہو۔ روس کی تاریخ میں سینکڑوں ایسے بیباک اور روشن ضمیر افراد ملیں گے جنھوں نے قوم کی بہبودی کے لئے کسی ایثار کو دشوار نہ سمجھا' کسی سزا کے خوف سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ مگر قوم نے کبھی اُن کی تباہی اور بربادی پر افسوس نہ کیا' نہ اُن کے ایثار سے محظوظ ہوئی اور نہ کسی عملی صورت میں ہمدردی ظاہر کی' اس لئے کہ روسی "ہر کوشش کی ناکامیابی فرض کر لیتے ہیں" روسی دماغ میں زندگی کے مسائل پر تنقید کرنے کے لئے بہت سامان ہے' تخلیق اور تعمیر کے لئے کچھ بھی نہیں۔ روسی ادب روسی فطرت کا صحیح عکس ہے —

لیکن روسی انشاپردازوں کی صفائی میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ علاوہ اُن کی اپنی طبیعتوں کے جو تخلیق کے مقابلے میں تنقید کی طرف زیادہ مائل تھیں' اور علاوہ اُس انفرادیت کے جو روسی دل کو اس قدر عزیز ہے' کچھ تاریخی واقعات بھی ایسے ہوئے جنھوں نے تشکیل زندگی کی امنگوں سے روسی ادب کو محروم رکھا۔ روسی قوم نے بحیثیت مجموعی ترقی نہیں کی' ماحول میں جو تغیر تبدل دوسری قوموں میں تدریجی نشو و نما نے پیدا کیا ہے وہ روس میں انقلابوں کے ذریعے سے ظہور میں آیا۔ پہلا انقلاب' جو مہلک ثابت ہوا' اُس وقت سے شروع ہوا جب پیٹر اعظم نے جبرا یوروپین طرز معاشرت رائج کرایا۔ پیٹر اعظم کو انسانیت اور تہذیب کے گہرے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا' نہ اپنی تحریک کے آخری نتائج کی پروا۔ روسی ریاست اور سربرآوردہ طبقوں کی تمام کوششوں سے نقل اور اصل کا فرق نہیں مٹ سکتا۔ یوروپین تہذیب روس میں بالکل سطحی رہی۔ اس لئے کہ روسیوں نے لباس اور طرز معاشرت بدلا تھا' اُن کی طبیعتیں وہی رہیں' دل وہی رہے۔ انھوں نے فرانسیسی اور جرمنی زبانیں سیکھیں' اپنے آپ کو فخریہ طور پر

یوروپین کہنے لگے - اس سے زیادہ تغیر بیرونی دباؤ - یا بادشاہ کا حکم - نہیں پیدا کر سکتا تھا - اس تغیر کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ روسی قوم کا وہی طبقہ جو رہبری کرسکتا تھا خود گم راہ ہو گیا ' تقلید نے اُس میں خود داری اور قومیت کا احساس بالکل مٹا دیا ' یہاں تک کہ وہ تمدنی اور تہذیبی سلسلہ قائم رکھنے کا فرض بھی بھول گیا - ممکن ہے یہ تجربہ اس قدر مہلک نہ ثابت ہوتا اگر قوم کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی ہوتی - لیکن روس کی دیہاتی آبادی پیٹر اعظم کے ذہنی جبر و قہر کی زد سے باہر تھی ' وہ اس انقلاب سے بے خبر اپنی پرانی وضع پر قائم رہی ' اور رفتہ رفتہ جب یورپین تہذیب کے اثرات خوشحال شہری طبقوں میں سرایت کرگئے تو امیر اور غریب میں علاوہ اقتصادی فرق کے تہذیبی تضاد بھی پیدا ہوگیا ' تعلیم یافتہ حلقے یورپ کی ترقی ' یورپین زندگی کی بھرک سے ایسے مرعوب ہوگئے کہ اُنھیں اپنی قوم سے شرم آنے لگی ' مگر وہ تعداد میں بہت کم تھے ' اُن کی اپنی روشنی ابھی تک بہت دھیمی تھی ' اور اگر وہ اس کی ہمت بھی کرتے کہ قوم کے رہبر بنیں تو وہ تفرقہ جو تہذیب اور طرز معاشرت نے شہری اور غریب دیہاتی کے درمیان ڈال رکھا تھا اُنھیں ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتا - بے بسی میں وہ قوم سے نفرت کرنے لگے ' اپنی قوم ' اپنی قدیم تہذیب اُن کی نظروں سے گرگئی ' تعمیر اور تشکیل زندگی کی اُمنگیں اُنھوں نے ایک ہمہ گیر فلسفۂ مایوسی میں ڈبودیں - " ہر کوشش کی ناکامیابی پہلے سے فرض کرلی " اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے - اوچھی اور سطحی تقلید کی ہوا پھیلتی رہی —

اُنیسویں صدی کے شروع میں جب مے مغرب کا نشہ کچھ اُترا ' اور روشن ضمیر روسیوں کو اپنی تہذیبی تہی دستی کا پورا احساس ہوا تو خانہ سازی کی اُمنگوں نے پھر جوش کیا - تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقوں کے لئے اب بھی موقعہ تھا کہ ملک کی ذہنیت درست کریں اور روسی قوم میں خودی اور شخصیت کا جذبہ پیدا کرکے اُسے بے معنی تقلید کے مہلک مرض سے بچائیں - لیکن یہ بیماری حد سے

گذر گئی تھی، اب صرف قوم کے مختلف اجزا کو ترتیب دینا نہیں تھا، بلکہ ایسی ریاست کا مقابلہ بھی کرنا تھا جو ان اجزا کو پریشان رکھنا چاہتی تھی، اور ذہنی اور سیاسی بیداری کو اپنی موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی، روس کا محدود روشن خیال طبقہ بالکل اس ریاست کے قابو میں تھا، اور سنہ ۱۸۲۵ ع کی ڈیکیمبرسٹ بغاوت کے بعد اُس نے یہ بھی دکھا دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے وہ اس طبقے کو بیخ و بن سے اُکھاڑنے پر تیار ہے - دوسری طرف قوم نے ایسی بے پروائی اور بیگانگی برتی کہ ایثار کی لذت جاتی رہی، اور روشن خیال طبقوں کو عام طور سے دل ہی دل میں اپنی اُمنگوں کا گلا گھونٹ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا - ڈیکیمبرسٹ بغاوت میں حاکموں کے ظلم اور قوم کی غفلت کا جو اندازہ ہوا وہ ایسا سبق تھا جسے حوصلہ مند قوم پرست کبھی نہیں بھولے - جہاں تک عمل اور تشکیل زندگی کا تعلق تھا انھوں نے اپنے دلوں کو تحمل اور رضا کی تعلیم دی اور ان میں سیاسی حوصلوں کو کبھی گیر نہیں کرنے دیا - ذہنی نشو و نما کے لئے انھوں نے اور راستے نکالے، جو اس قدر خطرناک نہ تھے اور جن میں ہمت افزائی اور تسلی کے لئے قوم کی طرف امید کی نگاہیں اٹھانا ضروری نہ تھا، نہ اس کی غفلت اور بے پروائی سے شرمندہ ہونے کا اندیشہ - روسی قوم اپنی صحیح اور تاریخی شاہ راہ سے بیشک گئی تھی، اسے گمراہ کرنے کے لئے اس کے ضمیر میں کافی مادہ موجود تھا - ہمیں اس کا افسوس تو ضرور ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ روسی قوم کی رہبری نہ کرسکا، لیکن روسی ادب اور انشا پردازوں پر زندگی سے بے تعلقی کا الزام لگاتے ہوئے تاریخی واقعات اور انسانی مجبوریوں کو نہ بھولنا چاہئے —

روشن خیال روسیوں نے اگر تخلیق اور تعمیر کی تمنائیں دل سے نکال دیں تو انھوں نے اس کا خمیازہ بھی بھگتا - انسان کو عام زندگی سے وابستہ اس کی آرزوئیں رکھتی ہیں، اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ آرزو کرے اور اپنی زندگی کو اپنے ماحول سے وابستہ رکھے، جو شخص روحانی تنہائی اختیار کرتا ہے اُسے اپنی روحانی

ضروریات اور فرائض سے رہائی نہیں ملتی ' بلکہ وہ قوت جسے سماجی فرائض کو ادائگی میں صرف کرنا اس کی فطرت کا تقاضا ہے اور کیفیتیں پیدا کرتی ہے جو اس کے لئے ایک مصیبت ہو جاتی ہیں - روسی طبعیت میں اپنی ذات کا احساس بہت ہے ' فطرتاً تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے وہ ان روحانی تکلیفوں کو بخوبی برداشت کر سکتی ہے جو تنہائی کی شدت کا لازمی نتیجہ ہیں - لیکن تنہائی کی شدت نے اس کے اجزا کی ہم آہنگی اور توازن میں فرق ضرور ڈالا ہے ' جو اس کے لئے کسی طرح سے فائدہ مند نہیں ثابت ہوا - انسان کو اپنی ذات کا احساس ضرور ہونا چاہئے ' لیکن اگر یہ احساس اسے عملی زندگی کی طرف مائل نہ کرے ' یا عملی زندگی میں اس کی مدد نہ کرے تو وہ طبیعت کی خامی یا ذہن کی بیماری ہے ' محض قوت مشاہدہ کی معجز نگاری نہیں - روسی ذہنیت میں اس بیماری نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی ' اور جس اخلاقی اور سیاسی پستی سے ملک کو بولشویک انقلاب نے نجات دلائی وہ سب سے زیادہ اسی ذہنی مرض کا نتیجہ تھی - روسی انشا پردازوں نے اس خصوصیت کو بہت خوبی اور سچائی سے ظاہر کیا ہے ' لیکن کبھی کبھی ان کی حقیقت نگاری بھی کھلنے لگتی ہے - جو بیان روسی طبیعت کے لئے صحیح ہے اور روسیوں کو اپنی فطرت کی حقیقی تصویر دکھاتا ہے ' وہ ہمیشہ ان طبیعتوں کے متعلق صحیح اور حقیقت نما نہیں ہوسکتا ' جنہوں نے مختلف ماحول میں تربیت اور نشو و نما پائی ہے ' یا جن کی ساخت اور افتاد دوسری قسم کی ہے ' اور انسانی فطرت کے بعید بو جھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول کے محدود دائرے سے گذر کر تمام بنی نوع انسان کو اپنا مخاطب اور اپنا موضوع بنائیں - اس نقطۂ نظر سے تقریباً تمام روسی انشا پردازوں پر کسی نہ کسی حد تک یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے انسان کی صحت سے زیادہ اس کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے ' اُن کی نگاہ کا رجحان انسانی پستی کی طرف ہے ' بلندی کی طرف نہیں ' یعنی انھیں پڑھکر ہم اُس

پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے بہ نسبت اس بلندی کے جس پر اس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اسے پہنچا سکتی ہیں ' اور حقیقت میں اگر انسان پست بھی ہے تو اس کا بلندی اور بزرگی حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہیں - مگر یہ ضرور ہے کہ جن مصنفوں نے پستی کے غار کو سب سے زیادہ تاریک دیکھا یا ہے اور اس کی سیر کے لئے ان کا ذوق جفا کشی بڑی کثرت اور بڑے انہماک سے انہیں لے جاتا ہے وہ بلندی کے خواب بھی اکثر دیکھتے ہیں ' اور ان خوابوں میں اصلیت اور یقین کی ایسی نا ثیر ہوتی ہے جو اعتدال پسند مصنفوں کے امکان اور تصور سے باہر اور بر تر ہو تی ہے - ذہن اور دل کی بیماریاں ' مایوسی اور بیکسی کی وہ فضا جس میں مثلاً معلوم ہو تا ہے کہ دمستئفسکی کا تصور ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے در اصل امید اور کامیابی اور فلک پیما بلند پروازی کی تمہید ہے ' یہ ایک ایسی منزل ہے جس سے گذرنا ہر فنی حس انسان کے لئے لازم ہے اور جس سے گذر کر ہم انسانیت کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں' اس جلوے کا عکس ہمارے دلوں میں محفوظ رہ سکتا ہے ' اور اگر ہم چاہیں تو انسانی زندگی کو اس سے روشن بھی کر سکتے ہیں- میکسم گورکی جن مفلس ' مصیبت زدہ اور بد چلن روسیوں کا ہم سے تعارف کرا تا ہے ان کی فطرت غربت اور بری عادتوں کی زنجیروں میں ایسی بری طرح جکڑی ہوئی ہے' ان کے دلوں کو برے اعمال اور ارادوں نے ایسا سیاہ کر رکھا ہے' ان کے ماحول میں راہ راست پر چلنے کی ترغیب دلا نے والے اثرات اتنے کم اور کمزور ہیں کہ ہمیں ان کے انسان ہونے کیا زندہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے ' لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بر بادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے جس پر اگر اپنی نظر قائم رکھ سکیں تو گورکی کے تمام ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں' اس کے بیماروں میں صحت کے وہ آثار' مردوں میں زندگی کی وہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں کہ انسانیت کا جوہر کبھی کم نہیں ہوسکتا' اس کے دشمن اسے چاہے

جتنا چھپائیں وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہیں ہوسکتا' اور جب کبھی وہ نظر آئے گا تو اس شان سے کہ ہم صرف دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی زندگی بھی اس سے روشن پائیں گے۔ گورکی نے انسانیت کا جو جوہر دریافت کیا ہے' وہ انسانی ہمدردی ہے' ایک جذبہ جو پست حیوانی زندگی کی تاریکی کو اُسی طرح سے ریزہ ریزہ کردیتا ہے جیسے بجلی کالی گھٹاؤں کے اندھیرے کو —

روسی ادب در اصل محض مایوسی اور حزن کا ترانہ نہیں' جیسا کہ اُس کے چند نقادوں کا دعویٰ ہے' مگر روسی انشا پردازوں نے زندگی کو زیادہ شوخ رنگوں میں دکھا کر اکثر خود اپنی امیدوں پر پردہ ڈال دیا ہے' اور ہمارے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے دلوں پر گذر چکی ہے' اور اس کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے کہ ہم یہ بار برداشت کرسکتے ہیں یا نہیں' وہ ہمیں دوزخ کی سیر کراتے ہیں اور بغیر جنت کا راستہ بتائے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرز عمل سے شکایت ہے مگر زیادہ تر اُن لوگوں کو جن کے خیال میں ادبی تصنیفات کا اصل مقصد دلچسپ ہونا' جذبات میں گدگدی پیدا کرنا' اور جب فرصت یا بیکاری کا وقت ختم ہوجائے تو یاد سے محو ہوجانا۔ سنجیدہ ناول نویسوں کا تتبع العین کبھی اور کہیں بھی ایسا حقیر نہیں ہوا ہے کہ وہ اس مذاق کا لحاظ کریں' لیکن روسی انشا پرداز اکثر ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ناولوں اور افسانوں سے حتی الامکان خاص دلچسپی کا عنصر بالکل نکال دیا ہے۔ روسی ناول وغیرہ عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں' اور صرف اس عبرت کا نہیں جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک فیبی تنبیہ کی شکل میں پیش کرتی ہے' بلکہ اُس عبرت کا جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولاں گاہ' محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے؛ اور صرف اس تعلیم کا نہیں جو ہمیں "آسائش دو گیتی" حاصل کرنے کی ترکیبیں سکھاتی ہے' بلکہ اس تعلیم کا جو خود غرضی اور ذاتی کامیابی کی ذلیل خواہشوں کے پنجے سے رہا کرکے دل کو زندگی اور جذبات کا مرکز بناتی ہے'

اس میں اتنی ہمت پیدا کرتی ہے کہ وہ "روح" کو نفس پر ترجیح دے سکے' اور اپنے سکون اور آسودگی کو ہمیشہ قربان کرنے پر تیار رہے - بہترین روسی ناولوں کا مقصد زندگی کی صحیح اور سچی تصویریں پیش کرنا ہے' جن میں ایک صحیح اور سچا فلسفہ بھی مضمر ہو' جن سے ذہن میں وسعت' دل میں درد' اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو - اس بلند حوصلے کے ساتھ ناممکن تھا کہ وہ ہر ہوالہوس کے مذاق کو اپنا معیار بنائیں اور محض لطف اور دلچسپی کا سامان مہیا کریں —

روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوششیں بہت نایاب ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی ایک فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات ضرور ہے جو بالکل نرالا' بہت معین اور بہت با اثر ہے - اگر ہم اسے اپنے یا کسی اور قوم کے معیار سے جانچیں تو ہر طرف مبالغہ' کج طبعی' خود بینی اور جہاں فراموشی کا گمان ہوتا ہے - انفرادیت' اور اس سے زیادہ ذات کا مشاہدہ' اور ذاتی نفسی مسائل میں غرق رہنا ایک خبط سا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی طبیعت (جو زیر بحث ہو) پاک نہیں نظر آتی - لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں تو ہمیں یقین ہوجائے گا کہ یہ کوئی دیدۂ و دانستہ کج روی نہیں ہے' نہ جدت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کرگئی ہے کہ مہمل یا ناگوار ہوجائے - روسی انشا پردازوں کا نصب العین انسان اور انسان کی ہستی کو کائنات میں ایک نیا درجہ' نئی اہمیت دینا' خالق اور مخلوق میں ایسی آشنائی اور بے حجابی کی رسم قائم کرنا ہے کہ کسی توسط کی حاجت نہ رہے - انسان کی موجودہ بے کسی اور روحانی بے مائگی دیکھتے ہوئے یہ تمنا کرنا ہمت کا کام ہے - اگر روسی انشا پرداز اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے ہوتے تو وہ "اہل کتاب" ہونے کا دعویٰ کرسکتے تھے' اور کوئی انصاف پسند اور حق پرست انسان ان کے دعوے کو باطل نہ قرار دیتا - وہ ناکامیاب رہے' لیکن انسانیت کی تعمیر صرف کامیاب روحانی اور اخلاقی تجربوں پر نہیں ہوتی - عظمت صرف انہیں کا حصہ نہیں اور نہیں ہونا چاہئے جو اپنی تمنائیں پوری کرلیتے ہیں' اس لئے کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ

کامیابی تمناؤں اور آرزوؤں کو محدود کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم اگر صرف کامیابی ہی کے قائل ہوں تب بھی اُن حوصلوں کی داد دینا ہمارا فرض ہے جنھوں نے بلند پروازی کا بیڑا اُٹھایا اور ناکامیابی یا شکست کی پروا نہ کی —

انسان جب کوئی مشکل ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ اپنی قوت اور امکان کا صحیح اندازہ کرلے - روسی انفرادیت، خودی کا مشاہدہ، ذات سے گہری وابستگی در اصل انسان اور انسانیت کی ایک سخت آزمائش ہیں، اور اس آزمائش کے کل لوازمات پوری کرنے کے لئے روسی نظر نے اپنی تحلیل میں انسانی ہستی کے کسی پہلو، انسانی فطرت کے کسی راز کو نہیں چھوڑا ہے - جستجو کے سلسلے میں بہت سی ناگوار باتیں دریافت ہوئیں جن کے اعلان کرنے میں روسی انشا پردازوں نے مطلق تکلف نہیں کیا ہے، بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سمجھے گی، بہت سے راز فاش کردیے جنھیں چھپانا ابھی تک ہر جگہ کا معمول تھا - ان پوشیدہ رازوں کے معلوم کرنے سے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات بہت بہتر سمجھ سکتے ہیں، اور کیریکٹر اور اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمے بہت آسانی سے حل ہوجاتے ہیں - روسی طبیعت میں جتنا ذوق جستجو سرگرم ہے اُسی قدر خامیوں، اور خرابیوں کا اعتراف کرنے کی ہمت بلند، اور اسی وجہ سے روسی انشا پردازوں کی صاف گوئی پر ہم کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور کبھی کبھی تکلیف بھی - یہ تکلیف اور معنی و مطالب سمجھنے کی دشواریاں جو اکثر روسی ادب کے مطالعے میں پیش آتی ہیں، ہمیں خوشی سے برداشت کرنا چاہئے - ان کی بنا محض طرز اور اسلوب اور تخیل کی جدت پسندی نہیں؛ ان سے ہم کو وہ ذہنی تجربہ اور دل کی وسعت حاصل ہوتی ہے جو انسانیت کا طغرائے امتیاز ہے - اگر ہم اس نیت سے روسی ادب کا مطالعہ کریں کہ اپنی انسانیت کو فروغ دیں تو اس کی عظمت کا ہم کو صحیح اندازہ ہوگا اور اس کے جوہر پرکھنے کی ہم میں صلاحیت بھی بہت زیادہ ہوجائے گی —

—— :•: ——

کبیر داس اور اُن کی شاعری

از

(جناب یوسف حسین خاں صاحب ' از پیرس)

کبیر داس کی شخصیت ' ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں ' بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی - جہاں تک صحیح تاریخی معلومات کا تعلق ہے ان کی زندگی اور موت ' دونوں ' بالکل تاریکی میں ہیں - سوائے ان رسمی کہانیوں کے جو عقیدت و نیاز نے ان کی زندگی کے چاروں طرف مختلف عہدوں میں ' جمع کیں اور کچھ نہیں ملتا' جسے مورخانہ تنقید مستند کہہ سکے- ان کے مفروضہ وجود کے متعلق ' اس کے عہد کی' ساری اسلامی تاریخیں خاموش ہیں - ضیاءالدین برنی ' تاریخ فیروز شاہی کا مصنف کہیں کبیر کا ذکر نہیں کرتا- ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس عہد کے مورخ ' دوسرے عہدوں کے شاہی مورخوں کی طرح ' باوجود اپنی مفصل بیانی کے ' کبیر جیسے شخص کو اتنی اہمیت نہ دیتے ہوں جتنی اہمیت ہمارے زمانے کا محقق اس فرد کو دیتا ہے جو سماج میں ذہنی یا اخلاقی زندگی کا ایک مخصوص اثر رکھتا ہو - یہ عیب ہندوستان ہی کی شاہی تاریخوں کا نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کی تاریخیں بھی جو شاہی اثر میں لکھی گئیں ' یہی خصوصیت رکھتی ہیں - ان میں بادشاہوں کے ذاتی

خانگی حالات کے متعلق ' لشکروں کی نقل و حرکت کے متعلق اور فوجوں کے باہمی بغض و حسد کے متعلق بہت کچھ ملے گا ' لیکن باشندوں کے رہنے سہنے کے حالات ' اُن کی ذہنی و اخلاقی یا معاشی زندگی کے بارے میں کہیں کچھ ضمناً مل جاے تو مل جاے - تاریخ کا یہ تخیل کہ وہ بادشاہوں کے حالات کے ساتھہ ' ملک کے باشندوں کی زندگی کی بھی ترجمانی کرے ' نیا تخیل ہے؛ چنانچہ اس امر پر تعجب نہیں کہ کبیر کا نام تک بھی ہندوستان کی چودھویں پندرھویں صدی عیسوی کی تاریخوں میں کہیں نہیں ملتا —

اس زمانے کی سب سے پہلی کتاب جس میں ہمیں کبیر داس کا ذکر ملتا ہے سکھوں کی مقدس کتاب ' جنم ساکھی ' ہے جو آدی گرنتھہ کا ایک جزو لاینفک ہے ' لیکن اس ذکر کو کوئی تاریخی شہادت نہیں کہا جا سکتا - گرنتھہ اور " جنم ساکھی " میں برابر گرو گوبند سنگھہ کے زمانے تک اضافے ہوتے رہے - ممکن ہے کہ کبیر کی زندگی کی کہانیوں کو ' جو گرو نانک اور ان کے جانشینوں کے زمانے میں شمالی ہند میں کافی مشہور تھیں ' جنم ساکھی میں بعد میں شامل کیا گیا ہو - ایک یہ بات بھی سمجھہ میں آتی ہے کہ ممکن ہے کہ کبیر کی شخصیت محض ایک فرضی ہستی ہو - عوامی تخیل نے اپنی امیدوں ' خواہشوں اور خیالوں کے رجحان کے مطابق ' طرح طرح کی روایتوں اور افسانوں سے ایک جیتا جاگتا مجسمہ بنا کھڑا کیا تاکہ اجتماعی زندگی کی بعض روحانی ضرورتیں اس سے پوری ہوں - ہمیں معلوم ہے کہ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے شمالی ہند میں پھیلنے کے بعد اور ان کے اثر سے ہندوؤں میں بھگتی کی تحریک پیدا ہوئی - یہ تحریک رد عمل تھی اس ٹھنڈی برھمنی تعلیم کا جس کا منشاء یہ تھا کہ انسانی عقل کی تشفی ہو نہ کہ انسانی دل کی - وجودیت (Pantheism) کے فلسفہ کی جو اپنشدوں کے زمانے سے برابر ہندوستان میں جاری رہا ' شنکر اچاریا نے دسویں صدی عیسوی میں باقاعدہ تدوین کی - اس نے 'برھما ستترا ' کی وجودی

تاویل کی اور اپنی شخصیت کے اثر اور اپنے فلسفیانہ استدلالوں سے سارے ہندوستان کی ذہنی زندگی پر اپنا سکہ بٹھا دیا - اس کی تعلیمات انتہائی وجودی نظریوں پر مبنی تھیں - اس کے خیال میں خارجی حسّی مظاہر ' انسان و روح ' اختلات و اجتماع یہ سب وجود برھما سے باھر نہیں بلکہ اسی میں جاری ساری ھیں اور اسی کے پرتو ھیں - ممکن ھے ' ان فلسفیانہ اور مابعدالطبیعی موشگافیوں سے ذہنئین کی ایک مختصر جماعت کی دماغی تسکین حاصل ھو جاتی ھو لیکن عوام الناس جو اپنے روزانہ چلن کے لئے ایک زندہ اخلاقی ' اور اعتقادی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ھیں ' ان کے لئے شنکر کا وحدت الو جودی فلسفہ ' جو اخلاق اور تعین الوھیت سے بالکل مبرّا تھا ' کافی نہ تھا * چنانچہ ھندوستان میں اسلامی اثر پھیلے وقت ھندو سماج دو

---

* یہاں ھم تحریک بھگتی کا ذکر محض ضمنی طور پر کرنا چاھتے ھیں - بھگتی کے متعلق یورپ میں دو نظریے پیش کئے گئے ھیں - پہلا نظریہ یہ ھے کہ بھگتی (مذھبی اعتقاد و خلوص) غیر ھندی چیز ھے - مسیحی اثر سے ھندوستان میں آئی اس نظریے کے بہترین ترجمان ویبر اور سر جی اے گریرسن ھیں ' دوسرا نظریہ یہ ھے کہ بھگتی ایک انسانی مظہر ھے - جہاں کہیں پرستش کا خیال موجود ھے وھاں یہ بھی پائی جاتی ھے - بعض قوموں میں اعتقاد کی تندی زیادہ تیز ھوتی ھے مثال کے طور پر سامی قوموں ھیں ' لیکن یہ کسی ایک قوم کا ٹھیکا نہیں - ھندوستان میں یہ مسیحی مذھب کے قبل سے موجود تھی - اس نقطۂ نظر کے ترجمان فرانسیسی ھندیئن موسیو بارتھ اور موسیو سیلوان ھیں - ھم موخوالذکر کے ھم خیال ھیں - اتنا ضرور ھے کہ چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں بھگتی نے اسلامی اثر سے ایک مخصوص صورت اختیار کر لی - اس عہد کے بھگت اعتقادی تعلیم کے ساتھ ذات پات کی مخالفت کرتے ھیں جو ھندی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ھوا - دو صدی کے اندر اندر ھندوستان کے کونے کونے میں بھگت مصلحین کا پیدا ھوجانا اور سب کا ھم آواز ھوکر ذات پات کے خلاف احتجاج کرنا صاف بتلاتا ھے کہ اسلامی اثر کی کارگذاری ناقابل انکار ھے - اس سلسلے میں رامانند ' کبیر ' راموداس ' نانک ' نامدیو ' ایکناتھ ' چیتنیا ' ولبھاچاریا اور

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بالکل مختلف گروہوں میں منقسم نظر آتا ہے - ایک تو ذہنیین کی جماعت جو شنکر کے ویدانتی وجودی فلسفے کو حقیقت اور علم کی بہترین تاویل سمجھتی ہے ' اور دوسرے عوام الناس جو توہم اور بت پرستی میں مبتلا تھے اور اسے اپنی اعتقادی زندگی کا بہترین اظہار خیال کرتے تھے - اسی دوسرے گروہ کی روحانی ترجمانی ' شنکر کے نظریوں کے خلاف ' گیارھویں صدی عیسوی میں ' رامانجا ' نے کی اسے وشنویت کا اصلی بانی کہہ سکتے ہیں - اسنے بھی شنکر کی طرح ' برہم شتر کی شرح لکھی اور وحدت الوجودی اصول کے خلاف ثنویت پر اپنے سارے فلسفے کی بنیاد رکھی - ' رامانجا ' کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اعلیٰ فلسفہ اور اعتقاد میں امتزاج پیدا کیا جاے - اس کے خیال کے مطابق ذات خداوندی (وشنو) کے دو پہلو ہیں - پرماتما جو سبب اول ہے اور وشیشا یعنی اس سبب اول کی صفات - وہ سنسار کو مایا (وہم) نہیں سمجھتا بلکہ اس کی حقیقت تسلیم کرتا ہے - اس کے نزدیک نجات کا صحیح اور واحد راستہ ' برخلاف شنکر کے ' اعتقاد ہے نہ کہ دلیل - رامانجا خود برہمن تھا اور کٹر ہندو تھا - ذات پات کے اصولوں کا سخت پابند تھا - یہاں تک کہ اس کے حلقے میں سواے برہمنوں کے اور کسی ذات والے کی رسائی ممکن نہ تھی - لیکن باوجود اپنی قدامت پسندی کے ' جیسا کہ اکثر تاریخ عالم میں ہوا ہے ' غیر دانستہ طور پر اس نے اُن بھگت مصلحین کے لئے راستہ صاف کر دیا جنھوں نے اپنی تعلیمات سے موجودہ ہندو دھرم کی بنیادیں استوار کیں - بھگت مالاکے بیان کے مطابق رامانجا کے بعد پانچویں روحانی پیڑھی میں ایک شخص پیدا ہوا جس نے اپنی ملحدانہ

(بقیہ حاشیۂ صفحۂ گذشتہ)

دادو دیال کے نام سے کون واقف نہیں ؟ - ان سب کی تعلیمات میں اسلامی جھلک صاف نظر آتی ہے - ان سب نے وحدانیت کے عقیدے کی تعلیم کی ' ذات پات کی بندشوں کو جھوٹ ٹھکوسلے سے تعبیر کیا اور برہمنی علوم کی منطقیت کے خلاف عقیدے اور خلوص کو نجات کا راستہ قرار دیا —

تعلیم سے ساری برھمن دنیا میں تہلکہ مچادیا - اسی شخص کا نام 'رامانند' ہے کہا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۹۹ صدی عیسوی میں پیدا ہوا اور سو سال کی عمر پائی اس حساب سے اس نے خلجی اور تغلقی عہد کے شمالی ہند میں اسلام کی دن دونی ترقی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی - رامانند نے شمالی ہند میں سفر کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر میں اسے مسلمانوں سے اچھا خاصہ ملنے جلنے کا موقع ملا - اس لئے کہ واپسی پر اس نے ذات پات کے خلاف سخت احتجاج شروع کی - چنانچہ بنارس واپسی پر اس کی جماعت نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا - رامانند نے فوراً اپنا نیا حلقہ قائم کیا جس میں ہر ذات کے لوگ شامل ہوسکتے تھے - اس کے بارہ مشہور شاگردوں میں چمار' نائی اور ایک مسلمان جلاھا کبیر ساتھہ ساتھہ نظر آتے ہیں - رامانند پہلا شخص ہے جس نے سنسکرت چھوڑ کر لوگوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینا شروع کی - ذیل کا بول 'رامانند' کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس میں اس کی ساری تعلیم کا خلاصہ موجود ہے :

جاتی پاتی پوچھے نہی کوے
ہری کو بھا جو سو ہری کو ہوے

رامانندی فرقہ آج تک موجود ہے لیکن وہ بدقسمتی سے ذات پات کی لا یعنی بندشوں کا ویسا ہی پابند ہے جیسے اور دوسرے ہندو فرقے - اسی فرقے کے لوگ اپنی بھگتی رام چندر جی کی طرف منسوب کرتے ہیں - اس کے چیلے کبیر نے اس کی تعلیمات کی تکمیل کی اور اپنی ذہنی اور اخلاقی ہمت سے ان سب وہموں کے خلاف بھی آواز بلند کی جو رامانندیوں میں باقی رہ گئے تھے —

بہر حال چاہے کبیر ایک واقعی تاریخی شخصیت رکھتے ہوں یا محض عوامی تخیل کی ایک تخلیق ہوں' کچھہ سہی' لیکن ان کے روحانی اور اخلاقی اثر سے تاریخ آنکھہ نہیں بند کرسکتی اور ان کہانیوں کو' جو شمالی ہند کے گاؤں گاؤں میں کبیر کی زندگی کے متعلق مشہور ہیں' محقق نظر انداز نہیں کرسکتا - کبیر کا نام ایک

اسلامی نام ہے - کہا جاتا ہے، اور کبیر پنتھیوں کا اس پر پورا اعتقاد ہے کہ کبیر بنارس کی ایک بیوہ برہمن کے پتر تھے - اس غریب ماں نے سماج کے ڈر سے، اور اپنی بے حیائی کو چھپانے کی خاطر، نوزائیدہ کبیر کو بنارس کے ایک تالاب کی لہروں کے سپرد کیا - ادھر سے کہیں ایک مسلمان جلاہا علی نامی اپنی بیوی یمہ (نعیمہ) کے ساتھہ جارہا تھا، اس کی نظر بچے پر پڑی - اس نے اپنی بیوی سے کہا بیوی کو رحم آیا اور دونوں بچے کو اپنے گھر لے گئے، ان دونوں کے کوئی اولاد نہ تھی - نعیمہ کو بچے سے ایسی محبت ہوگئی کہ اس نے اسے گود لے لیا - علی اور نعیمہ دونوں قاضی کے ہاں گئے تاکہ اس کے لئے کوئی نام تجویز کرائیں - بقول روایت قاضی صاحب نے قرآن میں فال کھولی تو سب سے پہلا لفظ کبیر ان کی نظر پڑا - یہ ہے کبیر کی وجہ تسمیہ - کبیر پنتھیوں کے بیان کے مطابق کبیر ۱۴۵۵ سمبت یعنی سنہ ۱۳۹۸ صدی عیسوی میں پیدا ہوے —

کبیر نے بڑے ہوکر اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا - چنانچہ بیجک میں وہ اپنے پیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوے، ان عام لفظوں میں جو شمالی ہند کے جلاہے استعمال کرتے ہیں، زندگی کے بھیدوں کو بیان کرتے ہیں :

اَس جلہا کا مرم نہ جانا - جنہہ جگ آنی پسار نہی تانا
سہی اکاس دو کاڑ کھنڈایا - چاند سورج دو نری بنایا
کہا ہیں کبیر کرم سے جوڑی - سوت کسوت بنے پھل کوری •

(رمینی ۲۸)

(اُس جلاہے کا راز کوئی نہیں جانتا جس نے دنیا میں آکر اپنا تانا پھیلایا ہے اُس نے زمین اور آسمان کے دوگڑھے کھودے ہیں اور چاند سورج کی دو نالیں بنائی ہیں - کبیر کہتا ہے کہ جلاہا اپنے کرم (قانون مکافات) کی وجہ سے اچھے سوت اور برے

• بیجک - بچار داس (مطبوعہ الہ آباد) میں ہر جگہ اسی بیجک سے حوالہ دیا ہے

سوت کا جوڑا بنتا ہے)

دوسری جگہ اسی موضوع پر کہتے ہیں

تو برہمن میں کاشی کا جلہا ۔ بوجھو مورو گیان†

ایک اور جگہ اپنے پیشے کا یوں ذکر کرتے ہیں :

جولہا بنھو ہو ہری نامہ — جاکے سُر نرمنی دھریں دھیانا
تانا تانے کو اھونتھا اینھو — چر کھی چریھوں بیدا
سر کھونتی ایک رام نرائن — پورن پرا گتے کامہ
چاند سورج دوی کوتا کینھوں — مانجھہ دیپ کیئو مانجھا
تینی لوک ایک کریگھا کینھو — دِگ سگ کینھوں تانا
آدی پرُش بیٹھا ون بیٹھے — کبیرا جوتی سمـــانا

(شبد ۴)

(اے جلاہے ہری کا نام بُنے جا جس پر دیوتا، انسان اور کامل لوگ اپنا دھیان دھرتے ہیں ۔ تانا تاننے کے بعد اس نے نال لے لی ۔ اس کی چرخی چاروں وید ہیں ۔ رام نرائن کا ایک کھونٹا بنایا ہے اور اپنا کام پورا پورا ظاہر کرتا ہے ۔ چاند سورج اس کے پاؤں رکھنے کی دو جگہیں ہیں ۔ بیچ کی روشنی سے اس نے مانجھا تیار کیا ہے ۔ تینوں عالموں کا کرگھا بنا کر تانے کا افقی راستہ بنایا ۔ جہاں جان بزرگ کی نشست ہے، وہاں اے کبیر تمام روشنی ہی ہے)

سکھوں کی مقدس کتاب آدی گرنتھہ میں ذیل کے اشعار کبیر کی طرف منسوب ہیں :

مُسی مُسی روے کبیر کی مائی — اے بالک کیسے جیونہی رگھو رائی
تاناں بانناں سب تجیو ہے کبیر — ہری کا نام لکھی لیو شریر

---

† کبیر گر نتھاوی ۔ صفحہ ۳۳ (مطبوعۂ کاشی ناگری پرچارنی سبھا)

جب لگ تا کا باهوں بیهی تب لگ بساوے رام سنیهی
اوچهی متی میری جاتی جولاها هری کا نام اهیوں مائیں لاها
کهت کبیر سنو هو میری مائی همارا ان کا ایک رگهو رائی

(کبیر کی ماں اکا تار رو رهی هے (اور کهتی هے) که اے راگهو کے راجا (رامچندر) یه بچه کیسے زندگی بسر کرے گا . کبیر نے تانا بانا سب چهوڑ چهاڑ اپنے جسم پر هری کا نام لکهه لیا هے - جب تک تاگا بنا جائیگا اس وقت تک محبت والے رام کا نام وه کیسے بهول سکتا هے - میری عقل اوچهی هے اور میری ذات جلاهے کی هے - میرا نسب بس هری کا نام هے - کبیر کهتا هے ' اے میری ماں سن ! همارا اور ان کا خدا ایک هے جو راگهو کا بادشاه (رام هے)

کبیر کا سارا کلام پوربی هندی میں هے - وه اُمی محض تهے - جن لوگوں میں پیدا هوے اور جن میں رهے انهیں کی سیدهی سادی بولی میں تعلیم دی - چنانچه وه خود کهتے هیں :

بولی همهاری پوربکی همیں لکهے نهیں کوے
هم کو تو سوئی لاکهے دهر پورب کا هوے (ساکهی ۱۹۴)

مسی کاگد چهوو نهیں کلم نهیں گهین هاتهه
چار یو جگ کو مهاتم مکهه هیں جنائی بات (ساکهی ۱۸۷)

(همهاری بولی پورب کی هے ' همیں کوئی بهی نهیں سمجهتا - همیں تو وهی سمجهے جو انتهائی پورب کا رهنے والا هو —

میں نے کبهی روشنائی اور کاغذ نهیں چهوا . کبهی هاتهه سے قلم نهیں پکڑا لیکن چاروں زمانوں کی بڑائیاں میں نے زبانی کهه دیں -

کبیر کی تعلیمات اور ان کے خیالات کے رجحان سے صاف نظر آتا هے که اگر چه ان کی پرورش ایک مسلمان کے گهر میں هوئی' انهوں نے هندو دهرم کی کافی

معلومات حاصل کر لی تھیں - رامانند کے چیلے ہو نے کے علاوہ وہ بچپن میں بنارس کے مشہور گوسائیں اشٹا نند کی صحبت میں بھی اپنا وقت گذار تے تھے ' کبیر اپنی آزاد روی اور مذہبی رواداري کے معاملے میں زیادہ آگے بڑھنے کی وجہ سے راما نندی فرقے میں زیادہ مقبول نہ رہے - وہ دو سرے رامانندیوں کی طرح اپنی بھگتی رام کی طرف منسوب کر تے تھے لیکن ساتھہ ساتھہ رحمٰن کو بھی بھو لتے نہ تھے - چنا نچہ ہم دیکھیں گے کہ کس طرح وہ بالکل بے تکلفی سے اللہ ' رام ' رحمن ' رحیم کو ایک ہی وقت میں بلا کسی تعریف کے یاد کر تے ہیں - معلوم ہو تا ہے ' آہستہ آہستہ کبیر کے خیالات میں مستقل تر تیب آ گئی اور انھوں نے اپنی تعلیم کا مقصد ' اسلام اور ہندو دھرم میں مفاہمت پیدا کر نا ٹھیرا یا - وہ ذات پات کي لایعنی تمیز کے قائل نہ تھے - نہ انھیں جاہلا نہ کٹرپن اور ہٹ دھرمی پسند تھی ' چنا نچہ وہ قاضی اور بر ہمن دو نوں کو سمجھا نے کی کوشش کر تے ہیں اور بعض دفعہ بے صبری میں برا بھلا کہنے لگتے ہیں —

جہاں تک بیجک سے پتہ چلتا ہے ' کبیر کا منشا یہ نہ تھا کہ کو ئی مستقل نیا مذہب بنا ئیں - وہ اصل میں چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان آپس میں ایک سماج کے افراد کی طرح صلح و امن سے رہیں اور اپنے خیالوں اور عقیدوں میں وسعت اور روا داری پیدا کر یں - بعض دفعہ یہ بھی معلوم ہو تا ہے کہ کبیر کے ہاں ہندوستانی سماج کا ایک مستقل تخیل ہے جس میں بھگتی یعنی خلوص و محبت کے ذریعے اسلام اور ہندو دھرم کے سارے ظاہری اختلافات فنا ہو گئے ہیں ' اور ترک (مسلمان) اور برہمن میں کو ئی مذہبی یا نسلي امتیاز باقی نہیں رہا - اس معاملے میں کبیر نے ' اسلامی جانب سے وہی فائدہ تصوف سے اٹھا نا چاہا جو اس مقصد کے لئے بھگتی سے اٹھایا - کبیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ تصوف ہی ایسي چیز ہے جو ہندوستان کے حالات میں اسلام کو مطابقت دے سکتا اور کھپا سکتا ہے - چنا نچہ کبیر کو شیخ تقي سہروردی ' جھوسی والے ' سے خاص عقیدت تھی اور ان کی صحبت سے مستفیض

و تے رہتے تھے - شیخ تقی سہروردی ایک بزرگ تھے شیخ شہاب الملت کے جانشین
ں کے متعلق مسلمان کبیر پنتھیوں کا خیال ہے کہ وہ کبیر کے پیر تھے اور ہندو
بیر پنتھی کہتے ہیں کہ کبیر اُن سے اسلامی عقیدوں کی کمزوریوں پر بحث کیا
تے تھے - غرض کہ کبیر نے اسلامی تصوف اور ہندو بھگتی کی بنیاد پر ایک نئی
ماوت کی تعمیر شروع کی - ان کے گرد چیلوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بن
ی - یہ جماعت بلا کسی مذہبی تفریق کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر
شتمل تھی —

کبیر نے اپنی تعلیم میں کسی قسم کی طرفداری نہیں کی - برائی چاہے ہندوؤں
ں ہو چاہے مسلمانوں میں، ان کے نزدیک برائی تھی - وہ مُلّاؤں سے بھی اتنے
ں بیزار تھے جتنے برہمنوں اور پروہتوں سے - انہوں نے سچائی کو کسی خاص قوم
نسل یا مذہب کا ٹھیکہ نہیں سمجھا اور انسانوں کے اختلاف کو حقیقت کے دو الگ
گ پہلوؤں سے تعبیر کیا - وہ کہتے ہیں :

(بھائی رے) دوی جگدیش کہاں تے آیا - کاہو کو انے بھرمایا
اللہ رام کریما کیسو - ہوی حجرت نام دھرایا
گہنا ایک کنک تے گہنا - انی مہاں بھاؤ نہ دو جا
کہن سنن کو دوی کری تھا پنی - اک نماج اک پوجا
واہی مہادیو واہی محمد برہما آدم کہئے
کو ہندو کو ترک کہاوے ایک جمین پر رہئے
بید کیتب پڑھیں وہ کُتبا وے مولنا وے پانڈے
بیگری بیگری نام دھرائے ایک مٹی کے بھانڈے
کہاہیں کبیر وے دونوں بھولے رام ہی کہنوں نہ پایا
وے کھسّی وے گائے کٹاویں بادا ہیں جنم گنوایا

(اے بھائی! دنیا کے دو مالک کہاں سے آے؟ مجھے بتاؤ کس احمق نے اللہ، رام، کریم، کیشو، ہری اور حضرت کے مختلف نام رکھے ہیں۔ تمام زیور سونے سے بنتے ہیں، ان میں دوسری دھات (فطرت) نہیں ہوتی ۔ کہنے سننے کو دو الگ الگ نشان ہیں، ایک کو نماز کہتے ہیں اور دوسرے کو پوجا ۔ وہی مہا دیو ہیں اور وہی محمد ہیں ۔ چاہے برھما کہو یا آدم کہو ۔ کوئی ہندو کہلاتا ہے اور کوئی ترک (مسلمان) رہتے دونوں ایک ہی زمین پر ہیں * ۔ ایک وید پڑھتا ہے دوسرا قرآن اور خطبہ پڑھتا ہے ۔ ایک مولانا کہلاتے ہیں دوسرے پانڈے ۔ ایک ہی مٹی کے مختلف برتنوں کے الگ الگ نام رکھہ دیے ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ دونوں (ہندو اور مسلمان) بھک گئے ہیں رام (حقیقت) دونوں میں سے کسی کو نہیں ملا ۔ ایک خصّی بکرے ذبح کرتا ہے اور دوسرا گاے ۔ دونوں نے اسی جھگڑے میں اپنی زندگی گنوا دی)۔

دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں :

رام گُہارے شکتی شیوا ایکے — کہو دھون کاہی نیورا
بید پران کیتب کران — نانا بھانتی بکھانا
ہندو ترک جینی جوگی — یہ کل کا ہو نہ جانا
چھاؤ درسن مہاں جو پروانا — تاسو نام من مانا
کہاہیں کبیر ہم ہیں پوبورے — ای سب کھلک سیانا

(شبد ۴۸)

---

* کبیر کے ہاں وطنیت کے تخیل کے ابتدائی نشان ملتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ان کی نظر سے وہ اجتماعی حقائق پوشیدہ نہ تھے جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگوں کے ایک ہی ملک اور آب و ہوا میں رہنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ انسانی زندگی میں اور انسانی خیال کی تاریخ میں آب و ہوا اور اس کا اثر ایک بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی شبد میں کبیر نے نہایت سادگی سے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ

رام، خدا، سکتی، سیوا سب ایک ہیں - بتلاؤ تو یہ عبادت کس لئے ہے؟ - وید، پران، کتاب اور قرآن اس کے بیان کے مختلف طریقے ہیں - ہندو، ترک، جین اور جوگی کسی کو بھی بھید نہیں معلوم - وہ جو چھہ درشنوں* سے ثابت ہوچکا ہے اس کا نام میرے دل نے قبول کرلیا ہے - کبیر کہتا کہ بس میں ہی ایک دیوانہ ہوں اور باقی ساری دنیا عقلمند ہے -

کبیر کی وسیع‌الخیالی مذہبی اختلاف کو محض عارضی تصور کرتی ہے - ان کے نزدیک انسانیت کی بنیاد ایک ہی ہے :

پیٹے کا ہوں بید پڑھایا　　سنتی کرائے ترک نہیں آیا
تھیا ہم تم ایکے لوہو　　ایکے پران پیا پے موہو
ایکے جاتی جنا سنسارا　　کواں جنیاں تے بھیو ننارا
(رمینی ۱)

(بھلا کس نے ماں کے پیٹ میں وید پڑھا ہے - مسلمان سنتیں کی کرائی نہیں پیدا ہوتا - وہاں ہم تم ایک ہی خون سے بنے ہیں - ایک ہی بیج نے ہمیں زندگی دی ہے - ایک ہی جننے والی نے ساری دنیا جنی ہے یہ کس علم نے (سب کو) الگ الگ کردیا) -

اسی مطلب کو وہ اور مختلف جگہوں میں یوں بیان کرتے ہیں :

گپت پرگٹ ہے ایکے سودرا　　کا کو کہئے براہمن سودرا
جھوٹھہ گربھہ بھولو متی کوئی　　ہندو ترک جھوٹھہ کل دوءی
جن یاہ چتر بنائیا　　سا نچھا ستر دھارا
کہا ہیں 'کبیر' تے جن بھلے　　لے چترا وت نہارا
(رمینی ۲۶)

---

* ہندو فلسفہ کے چھہ دستور یہ ہیں : سانکھیا، یوگ، نیایا، وشیشکا، میماسا (جسے عام طور پر پروا میماسا بھی کہتے ہیں) اور ویدانت (جسے اترا میماسا سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے) -

پوشیدہ ہو یا عیاں ہو، نشان (اصل میں) ایک ہی ہے - کسے برہمن کہئے اور کسے شدر کہئے ؟ - خود کو جھوٹے غرور میں مت ڈھو ڈالو - یہ جھوٹ ہے کہ ہندو مسلمان دو نسل سے ہیں - جس نے یہ تصویر بنائی ہے وہ صحیح بنانے والا ہے* - 'کبیر' کہتا ہے کہ وہ لوگ بہادر ہیں جو تصویر کو ویسا ہی دیکھتے ہیں جیسی کہ وہ بنی ہے)

دیگر سنتو راہ دونوں ہم ڈیٹھا

ہندو ترک ہٹا نہیں مانیں سواد سبھن کو میٹھا
ہندو برت ایکداسی سادھے دودہ سنگھاڑا سیتی
ان کو تیاگین من کو نہ ہٹکیں پارن کریں سگوتی
ترک روجا نماج گجاریں بسمل بانگ پکاریں
ان کو بہشت کہاں تے ہوئی ہے سانجھے مرگی ماریں
ہندو کی دیا مہر ترکن کی دونوں گھاٹ سوں تیاگی
وے حلال وے جھٹکے ماریں آگی دونوں گھر لاگی
ہندو ترک کی ایک راہ ہے ستگرو ایہے بتائی
کہاہیں 'کبیر' سنھو ہوسنتو رام نہ کہیو کھدائی
(شبد ۱۰)

(او بھلے لوگو! میں نے دونوں کا راستہ دیکھ لیا - غرور میں ہندو ترک ایک دوسرے کو نہیں مانتے - ہر کسی کو اپنا ہی مزہ میٹھا لگتا ہے - ایکداسی کا روزہ دودہ سنگھاڑے پر رکھتے ہیں کھانا نہیں کھاتے لیکن دل کو نہیں روکتے - ترک (مسلمان) نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے ' بسم اللہ پڑھتا ہے اور اذان

---

* "ستگر دھارا" اس معمار کو کہتے ہیں جس کا کام عمارت کے مختلف حصوں کو ناپنا ہے --

دیتا ہے - بھلا انھیں اس طرح جنت کیسے ملے گی ہر شام کو تو یہ مرغی ذبح کرتے ہیں - ہندو کی دیا اور مسلمان کی مہر دلی دونوں کے گھاٹوں سے رخصت ہو گئی ' مسلمان جسے حلال کہتا ہے ہندو اسے جھٹکا کہتا ہے - دونوں گھروں میں آگ لگ گئی ہے - (اصل میں) ہندو اور ترک ' دونوں کی ' ایک راہ ہے - سچے گرو نے مجھے یہ بتلایا ہے - کبیر کہتا ہے ' اے بھولے لوگو رام کہو یا خدا کہو (بات ایک ہی ہے) —

آدم آری سدھی نہیں پائی ماما حوا کہاں تے آئی
تب نہیں ہوتے ترک اوہندو ماپا کے رد ہر پتا کے بندو ا
تب نہیں ہوتے گائے کسائی تب بسم اللہ کن پھر ماتی
تب نہیں ہوتے کل اوجاتی دو چک بھس کون اتپائی
من ملے گی کھبیر پی نہ جانا متی بھلاں دوئی دین بکھانا

(رمینی ۴۰)

(آدم کو پہلے پہل یہ تک معلوم نہ تھا کہ ماما حوا کہاں سے آئیں نہ اس وقت کوئی ترک ہوتا ہے نہ ہندو ' ماں کے پیٹ میں اور باپ کے بیج میں نہ اس وقت گائی ہوتی ہے اور نہ قصائی ' اس وقت نہ کوئی بسم اللہ پڑھنے والا ہوتا ہے ' نہ اس وقت نسل ہوتی ہے اور نہ ذات ' نہ دوزخ نہ جنت - دل کو اب تک اس مسئلے کی خبر نہیں ' بھکی ہوئی عقل دونوں مذہبوں کو بیان کرتی ہے) —

کبیران مذہبی رسموں کے قائل نہیں جو اپنی وجہ وجود کھو چکنے کے بعد زندگی کی راہ میں روڑے بنکر اٹکتی ہیں - اس موضوع پر وہ اپنی سیدھی سادی زبان میں کہتے ہیں :

اللہ رام جیو تیری نائیں جن پر مہر ہو تم سائیں
کامنڈی بھومی سر نائے کاجل دیہہ نہائے

کا اجو جپ منجن کینھے کا مہجد سر ناے
ہر دیا کپت نماج گجا ر یں کا حج منکہ جا ے
ہندو اکادسی کریں چو بیسوں ر و جا مسلما فا
گیا رہ ماس پکا ہو کن ٹا ر ے ا کا ہی ما ہ نیا فا
جو کہدا یا مہجد بستو ھے ا رر ملک کہیکیرا
پورب دسا ہر ی کو با سا پچھم ا للہ مکا ما
دل مہاں کھوجو دل ہی مہاں کھوجو ا یہیں اللہ را ما
بید کیتب کہو کن جھو نٹھا جو نٹھا جونہ بچھارے
سبہ گپت ایک ایک کرے جانے وے دوجاھی کے مارے
کبیر پو نگرا اللہ را م کا سو گرو پیر ہما را

(شبد ۹۷)

(اللہ اور رام جی تیرے ہی نام ہیں - جس پر چاہے مہر بان ہو جا ' تو ہی مولا ہے - بھلا منڈاے سر کو جھکا نے میں کیا ہے ؟ بھلا پانی سے جسم دھو نے میں کیا رکھا ہے ؟ وضو میں اور پوجا سے پہلے دالت صاف کر نے میاں کیا ہے ؟ مسجد میں سر جھکا نے سے کیا فائدہ ؟ تم نمازیں جھو ٹے دل سے پڑھتے ہو - حج کو جا نے سے کیا حاصل ؟ ہندو ایکداسی کے چوبیس دن فاقہ کر تا ہے - مسلمان روزے رکھتا ہے - (بھلا مجھے کوئی بتاے تو سہی کہ) برس کے گیارہ مہینے کس کے لئے ہو تے ہیں اگر صرف ایک ہی مہینہ مقدس ہے - اگر خدا صرف مسجد ہی میں رہتا ہے تو اور ملک کس کا ہے ؟ ہری کے رہنے کا مقام پورب ٹھہرا ' اللہ مغرب (مکہ) میں رہتا ہے - اسے دل ہی میں ڈھونڈو اسے دل ہی میں ڈھونڈو - یہیں تمہیں کریم اور رام ' دونوں ملینگے - کس سے کہوں کہ وید اور قرآن دونوں جھو ٹے ہیں ' اور جو فکر نہیں کر تا وہ بھی جھو ٹا ہر دل ایک ایک کر تا ہے لیکن انہیں غیر کے خیال نے ہلاک کر رکھا ہے-کبیر اللہ اور رام ' دونوں کا فرزند ہے-وہ ہمارا گرو اور پیر ہے)

ظاهری مذهبی اور رسمی پابندیوں کو کبیر جھوٹ خیال کرتے ہیں - اصل بھید ان میں نہیں -

جھوٹ کا منڈان ہے دھرتی اسمانا
دسھوں دساوا کی پھند ہے جیو گھیرے آنا
جوگ جاپ تپ سنجما تیرتھہ برت دانا
نو دھا بید کیتب ہیں جھوٹے کا باتا
کاہے کے بچھنیں پھرائے کاہو کرامتی
من بڑے لے رہے ہندو ترک جاتی (شبد ۱۱۳)

(زمین اور آسمان جھوٹ سے ڈھکا ہوا ہے - دسوں طبقے جھوٹ کے پھندے میں گرفتار ہیں اور دل جھوٹ سے گھرا ہوا ہے - جوگ، آہستہ آہستہ گنگنا کر عبارت کرنا، ریاضت، ضبط نفس اور تیرتھہ، روزہ، خیرات سب جھوٹ ہے - نو وید • اور قرآن جھوٹ کے پردے ہیں کسی کے لئے مقدس الفاظ (میں سچائی ہے) اور کسی کے لئے معجزوں میں - ہندو اور ترک دونوں ذاتیں غرور میں مبتلا ہیں) -

زندگی کے بھید کے متعلق کہتے ہیں :

جن کلمہ کالی ساہی پڑایا گُدورت کھوج تنہوں نہیں پایا
کرمت کرم کرے کرتوتا بید کیتب بھئے سب ریتا
کرم تے سو جو گربھہ اُتارا کرم تے جو نامھیں کو دھریا
کرم تے سُنتی اور جنئیو ہندو ترک نہ جانے بھئیو

(شبد ۳۹)

(جس نے کال جگ میں کلمہ پڑھایا اسے بھی قدرت کے راز نہیں معلوم تھے

• کبیر کی مراد یہاں چھہ ویدی علوم کی شاخوں اور تین شعر سے ہے (تین شتر ھرانتا، کرھے، اور دھرم۔ھیں) -

معجزے، کرم کا قانون، مذہبی رسمیں، وید، قرآن محض رواج ہیں - بھلا یہ کیا قانون کرم کا نتیجہ ہے کہ آواگون کا غرور پیدا ہوتا ہے ؟ - کیا یہ قانون کرم کی بدولت ہے کہ مختلف نام رکھے جاتے ہیں ؟ - کیا قانون کرم کی پابندی ہے کہ سنتیں کرائی جاتی ہے اور جنیو ڈالا جاتا ہے - اصل میں ہندو اور ترک دونوں بھید سے نا آشنا ہیں) -

اور پھر فرماتے ہیں :

سنتو دیکھت جگ بورانا

سانچ کہوں تو مارن دھاویں جھوٹھیں جگ پتیانا
نیمی دیکھا دھرمی دیکھا پرات کرہیں اسنانا
آتم مارن پشا نہیں پوجیں انی مہاں کچھو نہ گیانا
بہتک دیکھا پیر اولیا پڑھیں کیتب قُرانا
کے مریہ تدبیر بتاویں انی مہاں ہے جو گیانا
پیتر پاتھر پوجن لاگے تیرتھ گربھ بھلانا
مالا پھیریں ٹوپی پہیریں چھاپ تلک انومانا
ساکھی شبدے گاوت بھولے آتم کھبری نہ جانا
ہندو کہیں موہی رام پیارا ترک کہیں رحمانا
آپس مہاں دولری موے مرم کا ہو نہیں جانا
کہا ہیں 'کبیر' سنو ہو سنتو ای سبھہ بھرم بھلانا

(شبد ۴)

اے بھلے لوگو! ذرا دیکھو تو دنیا کیسی دیوانی ہے - گر سچ کہتا ہوں تو مجھے مارنے دوڑتی ہے - دنیا جھوٹ میں یقیں رکھتی ہے - میں نے اسے دیکھا جو مذہبی رسمیں اور دھرم پر عمل کرتا ہے - اسے بھی دیکھا جو اپنے کو پاک کہتا ہے اور ہر

صبح اشنان کرتا ہے وہ نفس کو مارکر بتروں کی پرستش کرتا ہے- اس میں ذرا سی بھی عقل نہیں - میں نے بہت سارے پیر اور اولیاء دیکھے -

جو قرآن اور (دوسری) کتابیں پڑھتے ہیں - بھلا یہ اپنے مریدوں کو کیا نجات کی تدبیر بتلا ئیں گے - خود اِن کے پاس کونسا علم ہے ؟ - جو چمڑے اور پتھر کی پرستش کرتے ہیں (وہ سب) تیرتھوں کے غرور کے باعث گمراہ ہوگئے - یہ مالا اور ٹوپی پہنتے ہیں ' تلک کا نشان لگاتے ہیں اور منطق چھانٹتے ہیں* - یہ ساکھی اور شبد گاتے گاتے بیتگ گئے اور اپنی روح کی کوئی خبر نہیں معلوم - ہندو کا دعوی ہے کہ اسے رام پیارا ہے اور مسلمان کہتا ہے اسے رحمن سے محبت ہے - دونوں لڑ لڑ کے اپنی جانیں کھوتے ہیں - دونوں میں سے کسی کو بھی بھید نہیں معلوم - کبیر کہتا ' اے بھلے لوگو! سنو! یہ سب دھوکے اور بھول کی باتیں ہیں —

مسلمانوں کی مذہبی رسموں کے متعلق کہتے ہیں : —

کافر پاتھر جوری کے ' مسجد لی چنائے
تا چڑھی ملا بانگ دے ' کیا بہرا ہوا کھدائے (گرنتھاولی)

نواجو سوئی جونیائی بچھارے ' کلمہ اٹھی جانے
پانچھو مُسی مصلا بچھاوے ' تب تو دین پچھانے (گرنتھاولی)

روجا دھرے نواجو گجاوے ' کلمہ بہشت نہ ہوئے
ستری کھنڈ گوت ہی بھیتر ' جو کرپی جانے کوئے (گرنتھاولی)

---

* انومانا مذہبی منطق کے آٹھ ذاتوں میں سے ایک ہے —

ساتھ ھی ھندوں کی بت پرستی کی رسموں پر ' جنھیں جاھل اصل مذھب سمجھتے ھیں ' سختی سے تنقید کرتے ھیں —

پاھن پوجے ھری ملے تو میں پوجوں پہار
تا تے یہ چاکی بھلی پیس کھاے سنسار
پاھن کیری پوتری کری پوجا کرتار
واھی بھروسے مت رھو بوڑو کالی دھار (کرنتاولي)

کبیرن بھگتی بگاڑیا کنکر پھتر دھویا
انتر میں وش رکھی کے - اموت ڈارنی کھویا (ساکھی ۲۵۱)

پھر ھندو مسلمان دونوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے ھیں :

جوگی گورکھ کرے - ھندو رام نااچارے
مسلمان کہے ایک کھدائے کبیر کو سوامی گھٹی گھٹی رھیو سمائے
(گرنتھا ولی)

کبیر جس عہد میں پیدا ھوے وہ سیاسی اور اجتماعی حیثیت سے شمالی ھند کا بڑی گڑبڑ کا زمانہ تھا - مسلمانوں کے ملنے جلنے سے نئے نئے خیالات اور ساتھ ھی نئی نئی اجتماعی مشکلیں پیدا ھوئی ھوں گی - اس قسم کے زمانے میں فرد کو خود کا شعور ھوتا ھے ' اجتماعی بے چینی ذھنی اور اعتقادی بے چینی پیدا کرتی ھے فرد زندگی کی روایتی اور مقررہ قدور پر فرد نظر ثانی کرتا ھے - بعض پرانی باتیں چھوڑتا ھے ' بعض نئی باتیں کہتا ھے - اس کا عمل سراسر اس کی ذھنی ھمت و خلوص پر مبنی ھوتا ھے ' اس لئے وہ جس چیز کو اچھا یا برا کہتا ھے ' صاف صاف اور کھلم کھلا کہتا ھے - کبیر اپنے زمانے میں اس قسم کے

فرد کی نما ئندگی کرتے ھیں - وہ صفات کوئی سے مطلق نہیں شرماتے - مثال کے طور پر ذیل کا شبد ھے :

کاجی تم کون کیتب بکھانا

جھنکت بکت رھھو نسوں متی ایکو ھینن جانی
سکتی انومانے سُنتی کرتوھو میں نہ بدوں گا بھائی
جو گُھدا تیری سُنتی کرتوھے اپو کتی کیوں نہ آئی
سُنتی کرائے ترک جو ھونا عورتی کو کا کھئے
اردھ شریر و ناری بکھانی تاتے ھندو رھئے
گھلی جنئیو برھمن ھونا مہری ھی کا پھرایا
ھندو ترک کہاں تے آیا کن یہ راہ چلائی
دل مہاں کھوجی دیکھو کھوجاوے بھستی کہاں کنھا پائی
کھیر، تھا اوت رام کی پکڑی انت چلے پچھتائی

(شبد ۸۴)

(اے قاضی ! یہ تم کونسی کتاب بیان کرتے ھو ؟ دن رات بکواس کرتے ھو اور تمھارے نفس کو مطلق کسی بات کا علم نہیں - تم بڑے منطقی ھو اور تم سُنتیں کرتے ھو - بھائی میں بحث نہیں کرتا لیکن اگر خدا چاھتا کہ سُنتیں کی جائیں تو لوگ سنتیں کئے کرائے کیوں نہیں پیدا ھوتے - اگر ترک ھونے کے لئے سُنتیں لازمی ھیں تو پھر عورت کو کیا کھوگے ؟ عورت جو آدھا جسم کھلاتی ھے ھمیشہ ھندو ھی رھی گی - اگر جنئیو سے برھمن بنتا ھے تو عورت کو کیا پہناتے ھو ؟ ھندو و ترک کہاں سے آے ؟ کس نے یہ راستہ نکالا ھے ؟ او ڈھونڈنے والے اسے دل میں ڈھونڈ - بہشت کہاں ھے ؟ کسے ملی ؟ اگر کبیر رام کے نام پر بھروسہ نہ کرے تو اسے پچھتانا پڑیگا) —

کبیر کا اصل پیغام مذہبی تفرقوں کو مٹانا ہے - اس موضوع پر اس نے بہت کچھہ کہا ہے اور جو کچھہ کہا ہے بہت زوردار طریقہ سے کہا ہے - اس آدمی کی طرح کہا ہے جو محسوس کر کے کہتا ہے اس موضوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بیجا نہ ہوگا اگر ہم ذیل میں چند مثالیں کبیر کی شاعری سے پیش کریں —

نہیں مہادیو نہیں محمد ہری حضرت کچھو ناہیں
آدم برہما نہیں تب ہوتے نہیں دھوپ نہیں چھائیں
اسیا سے پیغمبر ناہیں سہس اٹھا سی مُنی
بید کیتب نہ سمرتی سنجم نہیں جون پر ساہی
بانگ نماج نہ کلمہ ہوتے رامو نا ہیں کُھدائی
لکھہ چوراسی جیا جنتو ناہیں ساکی سبد نہ بانی
پورن برہما کہاں تے پرگٹے کر تم کن اپرا جا
(شبہ ۲۲)

(نہ مہادیو کچھہ ہے اور نہ محمد کچھہ ہے - ہری اور حضرت بھی کچھہ نہیں ایک وقت ایسا تھا جب نہ آدم تھا اور نہ برہما تھا - نہ سورج تھا اور نہ سایہ - نہ اسی ہزار پیغمبر تھے اور نہ چوراسی ہزار مُنی تھے - نہ وید تھا نہ سمرتی، نہ ضبط نفس نہ روح اور نہ نفس - اذان، نماز، نہ کلمہ تھا — نہ رام تھا اور نہ خدا - نہ چوراسی لاکھہ جانور قسموں نہ ساکی نہ شبد اور نہ بانی* - پرش اور برہما† کہاں ظاہر ہوے ہیں اور کرم کے قانون کو کس نے پیدا کیا ؟)

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کبیر ذہنیتوں کے خلاف رد عمل کی نمائندگی کرتے ہیں - اُن کے خیال میں کتابی علم انسانی دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں -

---

* ساکوی، شبد اور بانی ہندو شاعری کے مختلف وزنوں کے نام ہیں - بانی خصوصاً سرسوتی (انصاف وعلم کی دیوی) کی تعریف میں استعمال کی جاتی ہے —

† پرش سے مراد شخص خدا اور برہما سے مراد شخص خدا -

وہ کہتے ہیں :

پڑھی پڑھی پنڈت کرو چترائی　　نج مکتی موہی کاہو بجھائی
کہاں بے پُرش کون سو گاؤں　　پنڈت موہی سناوا ہوئا نہو
چري بید برہمے نج ٹھانا　　مکتک مرم انھوں نہیں جانا
دان پُن ان بہت بکھانا　　اپنے مرن کی کھبری نہ جانا
ایک نام ہے اگم گنبھیرا　　تھواں استھر داس کبیرا
چیونٹی جہاں چڑھي سکے　　رائی نہ ٹھرائے
اوا گوں کی گم نہیں　　تہاں سکلو جگ جائے

(رمینی ۳۴)

(پڑھتے پڑھتے پنڈت تیز فہم ہوگیا ہے - ذرا مجھے نجات کا راستہ بتادے پُرش کہاں رہتا ہے ؟ کس گاؤں میں ہے ؟ پنڈت مجھے اس جگہ کا نام بتادو - برہما چاروں ویدوں پر قایم ہے لیکن نجات کا راستہ ان ویدوں کو بھی نہیں معلوم - وہ خیرات اور نیکی پر لمبے لمبے وعظ دیتا ہے - اسے خود اپنی موت کے متعلق کچھہ نہیں معلوم - ایک نام جو بہت گہرا ہے اور جسکی تہ تک رسائی نہیں - کبیر داس کا قیام وہیں ہے - جہاں ایک چیونٹی تک نہیں چڑھہ سکتی ایک رائی کا دانہ نہیں ٹھہرسکتا اور جہاں آنے جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں - ساری دنیا وہیں جارہی ہے

پھر کہتے ہیں : —

پنڈت بھولے پڑھی گُنی بیدا　　آپو اپن پو جانو نہ بھیدا
سانجھا ترپن اور شات کرما　　ای بھوروپ کوہین اس دھرما
کائتری جگ چاری پڑھائی　　پوچھو جاے مکتی کن پائی
اور کے چھُٹے لیت ہو سینچا　　تم تے کہو کون ہے نیچا
کل مرجا دا کھو ئے کے　　کھو جنی پر نر بان

(رمینی ۳۵)

(پنڈت باوجود وید پڑھنے سمجھنے کے گمراہ ہوگیا - اسے اپنے آپ کا بھید نہیں معلوم - شام کے وقت وہ پرکھوں کو چڑھاں چڑھاتا ہے اور چھہ کرم کرتا ہے اور ان باہری روپوں کو مذہب سمجھتا ہے - چار جگ سے عبادت کی جارہی ہے بھلا کوئی پوچھے نجات کسے ملی؟ کوئی دوسرا چھولے تو تم پانی کا چھینٹا دیتے ہو- مجھے یہ بتاؤ تم سے نیچا کون ہے؟ - نسل کے سارے امتیاز چھوڑ دو اور نجات کو ڈھونڈو)

کبیر درویش اور قاضی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

در کی بات کہو دریشا — بادشاہ ہے کونے بھیشا
کہاں کو نیچ کہاں کرے مکاما — میں تو ہی پوچھوں مسلمانا
لال جرد کی تانا بانا — کون صورتی کو کرھو سلاما
کاجی کاج کرھو تم کیسا — گھر گھر جیہاہ کراو ہو بھینسا
بکری مرگی کن پھر مایا — کس کے حکم تم چھری چلایا
درد نہ جا نھو پیر کہا و ھو — بنتیا پڑھی جگ بھر ماؤ
دن بھر روجا رھت ھو — رات ھنت ھو گائے
یا ھے کھوں وا بندگی — کیوں کر کھشی خدائی
(رمینی ۴۹)

(اے درویش مجھے اندرونی بات بتلاؤ - بادشاہ کا لباس کیا ہے ؟ - وہ کہاں جاتا ہے اور کہاں ٹھہرتا ہے ؟ اے مسلمان میں تجھ سے پوچھتا ہوں - لال اور پیلا تانا بانا ہے - وہ کونسی صورت ہے جسے تو سلام کرتا ہے؟ اے قاضی! تم کیا کام کر رہے ہو؟ - تم نے ہر گھر میں بھینسوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے - بکری اور مرغی پر چھری چلانے کو تمہیں کس نے کہا؟ - تم رحم کرنا نہیں جانتے اور پھر بھی پیر کہلاتے ہو* بیت پڑھ پڑھ کر تم دنیا کو دھوکا دیتے ہو - دن میں روزہ رکھتے

---

* پیر کے معنی مرشد اور ہندی میں درد - یہاں یہ لفظ دانستہ طور پر ذو معنی استعمال کیا گیا ہے -

ہو اور رات میں گائے ذبح کرتے ہو - ایک طرف قتل اور دوسری طرف عبادت - بھلا ایسے سے خدا کیسے خوش ہوگا ؟) -

کبیر پنتھیوں کی مقدس کتاب بیجک میں جو کبیر داس کی طرف منسوب کی جاتی ہے ' اکثر جگہ تضاد ملتے ہیں - بعض جگہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پر مایوسی اور شبہ چھایا ہوا ہے ' بعض جگہ اعتقاد و اعتماد کی تعلیم ملتی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ کبیر داس دوسرے سدھار کوں اور بچار کرنے والوں کی طرح روحانی زندگی کے مختلف دوروں سے گذرے ہیں - یا یہ کہ بیجک بجائے خود کسی ایک آدمی کا کلام نہیں - اس میں کبیر کے چیلوں کے خیالات ' مختلف زمانوں میں ' شامل ہوتے گئے - اس مجموعہ کی لسانی وحدت بڑی حد تک قابل شبہ ہے - یہاں ہم بیجک کے متن کے متعلق بحث نہیں چھیڑنا چاہتے - یہ مسئلہ بجائے خود ایک مستقل مطالعہ کا منتظر ہے - ذیل میں ہم چند ایسی مثالیں دیتے ہیں جہاں کبیر پر مایوسی اور شبہ کا غلبہ نظر آتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی اس کرشمہ سازی کو خوب سمجھ لیا تھا جو انسان کو کسی حالت میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی - ہر یقین کے ساتھ شبہ پیدا کر دیتی ہے اور ہر عیش کے ساتھ اس کے متنا سب کلفت -

تن دھری سکھیا کا ہو نہ دیکھا جو دیکھا سو دکھیا
بتّے بتّے سب کوئی دکھیا کیا گرہی کیا بیراگی
جوگی جنگم تے اتی دکھیا تپسی کو دکھہ دونا
سانچھہ کہوں تو سب جگ کھیجے جھوٹھہ کہا نہیں جاے
کہا نہیں کبیر تے بھو دکھیا جنھہ یہ راہ چلائی

(شبد ۹۱)

(میں نے کسی کو انسانی جسم میں آرام سے نہ دیکھا - جس کسی کو دیکھا دکھیا دیکھا - راستہ بھر ساری مخلوق تکلیف اٹھاتی ہے - چاہے وہ خانداں والا ہو

یا بیراگی ہو - جوگی اور سادھو غمگین ہیں اور ریاضت کرنے والے کی تکلیفیں دگنی ہیں - اگر سچ کہتا ہوں تو ساری دنیا غصہ ہوتی ہے اور میں جھوٹ کہہ نہیں سکتا - کبیر کہتا ہے کہ جس نے یہ عالم ایجاد کیا وہ بھی غمگین ہے) —

جھولے کی تشبیہہ کو اسی مطلب کے لئے یوں استعمال کرتے ہیں :

لوبھ موہ کے کھمبا دو من سے رچیو ہنڈول
جھولہیں جیو جہاں جہاں لگی کتھوں نہ دیکھوں ٹھور
چتر جھولی چترائیا جھولہیں راجہ سیس
چاند سورج دو جھولیں انھوں نہ اجنا بھیو
لکھہ چوراسی جیو جھولہیں رہیست دھریا دھیان
کوڑی کلپ جگ بتیل آجاھوں نہ مانے ھاری
دھرتی اکاس دو جھولہیں جھولہیں پونا نیر
دیہہ دھرے ھری جھولہیں ٹھاڑھے دیکھیں ھنس کبیر

(ھنڈولا ۳)

(نفس پرستی اور خواہش دو کھمبے ہیں جن میں دل کا جھولا پڑا ہے - ساری دنیا کی زندگی بغیر رکے ہوئے اس میں جھول رہی ہے - عاقل عقل میں جھول رہا ہے - بادشاہ اور عوام جھول رہے ہیں - چاند اور سورج دونوں اپنی ہستی سے ناواقف جھول رہے ہیں - آٹھ لاکھ ہستیاں جھول رہی ہیں - راوی کا بیٹا دھیان میں مشغول ہے - صدیوں پہ صدیاں گذر گئیں - آج بھی (زندگی) شکست کا اعتراف نہیں کرتی - زمین اور آسمان دونوں جھول رہے ہیں ہوا اور پانی بھی جھول رہے ہیں - ہری خود جسم کی شکل میں ظاہر ہو کر جھول رہے ہیں - کبیر یہ دیکھتا ہے اور ہنستا ہے) -

کبیر خود، در اصل، اسلام اور ہندو دھرم کے بیچ میں جھول رہے تھے۔ انھوں نے پوری طرح سے اپنے آپ کو ایک مذہب سے وابستہ نہ کیا۔ اسی لئے وہ دونوں طرف نامقبول رہے۔ لوگ انھیں 'نگورا' کہتے تھے۔ بعض دفعہ وہ یہ سب دیکھکر رنجیدہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

بھائی رے بہت کیا کہے کوئی برے دوست ہمارے
کاڑن بھاجن سنوارن آپو۔ جیوں رام رکھے تیوں رہئے

(ساکھی ۱۸۶)

(اے بھائی! بہت کیا کہوں۔ میرا مشکل سے ہی کوئی دوست ہوگا اکیلا زمین کھودتا ہوں، اکیلا بھاگتا ہوں، اور اکیلا ہی خود کو سنوارتا ہوں بس ویسے رہئے جیسے رام چاہے۔

دوسروں پر اپنی نااعتمادی کو یوں ظاہر کرتے ہیں:

کلی کھوٹا جگ آندھرا سبد نہ مانے کوئے
جاکھی کھوں نت آپنا سو اُٹھی بیری ہوئے

(ساکھی ۱۸۷)

(زمانہ نابکار ہے۔ جہاں تاریک ہے۔ کوئی میری باتوں کو نہیں مانتا جس کسی کو اپنا دوست بتاتا ہوں وہی دشمن بنکر اٹھہ کھڑا ہوتا ہے)

کبیر ہندوں اور مسلمانوں، دونوں کی خوشامد کرتے ہیں اور انھیں سیدھے راستہ پر لانا چاہتے ہیں۔ ذیل کی ساکھی کے طرز ادا میں خلوص اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے —

کتو مناوں پائیں پڑی کتو مناوں روئی
ہندو پوجے دیوتا ترک نہ کاہو ہوئی (ساکھی ۱۹۸)

(کتنی دفعہ میں خوشامد میں پاؤں پڑے۔ کتنی دفعہ میں رویا۔ لیکن ہندو کو اپنے دیوتا پوجنے پر اصرار ہے اور مسلمان کو کسی کی کچھہ پروا نہیں)۔

کبیر مایوسی میں یوں چلا اٹھتے ہیں :

کہاہیں کبیر ہماہیں ہیں بورے ۔ اے سب کھک سیا نا

(شبد ۴۸)

لیکن ایک مصلح کی اعلیٰ سیرت اپنی ساری اندرونی و جدانی قوتوں کے ساتھہ پھر اُبھر تی ہے اوراور اسے کُلی مایوسی سے بچا لیتی ہے - باوجود مخالف حوادث کے اور باوجود ان اثروں کے جو زمانہ اس کے خلاف بیدردی سے استعمال کر تا ہے ' کبیر کی خود اعتمادی قایم رہتی ہے - ان کا سچائی پر ایمان ہے اور انہیں یقین ہے کہ سچ بالآخر کامیاب ہو گا - چنا نچہ وہ کہتا ہے :

بلہاری واہی دودہ کی - جا میں نکرے گھی

آدھی ساکھی کبیر کی - چار بید کا جیو (ساکھی ۱۳۱)

(میں اسی دودہ کے قربان جس میں سے گھی نکلتا ہے . کبیر کی آدھی ساکھی (آدھا مصرع) میں چاروں وید کی جان موجود ہے) -

دھرا تو موتن بھیا پدھی نہ چینھے کوئے

جنھہ یا سبد و ویکیا چتر دھنی ہوئے سوئے (ساکھی ۶۲)

(میرا راگ نیا ہے - میرے لفظ کوئی نہیں سمجھتا - جو میرے لفظوں کو سمجھہ گیا بس وہ مالا مال ہو جا ئیگا) —

چارون بید پڑائے کری ہری سوں نہ لایا ہات

بالی کبیرا لے گیا پنڈت ڈھونڈ ہے کھیت •

چاروں وید پڑھنے کے بعد بھی اسے ہری نہیں ملا کبیر بالی لے گیا اور پنڈت ابھی کھیت ہی ڈھونڈھہ رہا ہے —

کبیر ذات پات کی تقسیم کو اجتماعی زندگی کے لئے بہت مضر سمجھتے ہیں

• گرنتھا ولی صفحہ ۳۳ —

انھوں نے کھلے کھلے لفظوں میں اس ادارے کی برائیاں بیان کی ھیں - جس طرح انھیں انسانوں کی تقسیم مذھبی خیالوں کی بنیاد پر گوارا نھیں اسی طرح ذات پات کو وہ بالکل غیر انسانی رواجوں پر مبنی بتلاتے ھیں کبیر کی یہ انقلابی تعلیم از منۂ وسطیٰ کی ھندوستانی تاریخ خیال میں بڑی بھاری اھمیت رکھتی ھے - بڑی حد تک دوسرے بھگت شاعروں کی تعلیمات کی جڑ کبیر کی ھی شاعری میں ملے گی ھم ذیل میں بیجک سے چند مثالیں نقل کرتے ھیں :

جو تو کرتا برن بچارا　　جنمت تینی تو نڈا تو سارا
جنمت سدرا موے پنی سدرا　　کر تم جنیو گھالی جگ دھندرا
جو تو برھمن برھمنی جایا　　اور راہ تے کاھے نہ آیا
جو تم ترک ترکنی جایا　　پیت ھی کھے نہ سنتی کرایا
کاری پیاری دو ھو گئے　　تا کر دودہ دیھو ملکائی
چھو فڑ کپت فرا دھک سیانی　　کہا ھیں کبیر بھجو سارنگ پانی

(رمینی ۹۲)

(اگر تو ذات پات پر غور کرے تو معلوم ھو جاے کہ تینوں ذاتوں کے آدمی ایک ھی طرح سے پیدا ھوتے ھیں جو سدرا پیدا ھوتا ھے وہ سدرا مرتا ھے - اپنا بنایا ھوا جنیو تان کر دنیا اندھیرے میں پڑ گئی - اگر تو برھمن برھمنی سے پیدا ھوتا ھے تو کسی اور دوسرے راستہ سے کیوں نہیں پیدا ھوا؟ اگر تم ترک ترکنی سے پیدا ھوے تو ماں کے پیٹ سے سنت کئے کرائے کیوں نہیں آئے - اگر تم ایک کالی اور ایک پیلی گاے کا دودہ دھو تو کیا بعد میں تمیز کر سکتے ھو فریب اور عقلمندی کے دعوے چھوڑو - کبیر کہتا ھے اس کی پرستش کرو جسکے ھاتھہ میں کمان ھے (رام) -

دیگر　　نانا روپ برن ایک کینھا　　چاری برن اُھی کا ھو نہ چینھا
نشت گئے کرتا نہیں چینھا　　نشت گئے اور ھیں من دینھا
نشت گئے جن بید بکھانا　　بید پڑھے پے بھید نہ جانا (رمینی۹۳)

(جس نے مختلف ذاتوں کو ایک پیدا کیا وہ چاروں میں تمیز نہیں کرتا - جنھوں نے خالق کو نہیں پہچانا وہ تباہ ہوے - جو اپنا دل دوسروں کو دے دیتے ہیں وہ بھی تباہ ہوے - جو وید کی تفسیریں کرتے تھے وہ بھی تباہ ہوے- انھوں نے وید پڑھا لیکن راز نہیں جانا) —

بوڑھی گئے نہیں اپو سنبھارا اونچ نیچ کہو کاہی جو ہارا
اونچ نیچ ہے مدھم پانی ایکے پون ایک ہے پانی
ایک متیا ایک کنبھارا ایک سبھن کا سرجن ہارا
ایک چاک سبھ چتر بنائیا نا د بند کے مدہ سمائیا
ہنس دیہہ تجی نیارا ہوئی تا کرجاتی کہے دھون کوئی
سیاہ سپھید کی راتا پیارا اُمارن ہرن کی تاتا سیارا
ہندو ترک کی بوڑھو بارا ناری پرش کا کرھو بچارا

(پپرا مستی - بیجک)

(وہ جو اونچ اور نیچ ذات کا ذکر کرتے تھے وہ ڈوب گئے، خود کو نہ سنبھال سکے - اونچ نیچ کی تمیز کی باتیں معمولی آدمی کیا کرتے ہیں - اصل میں پانی اور ہوا ایک ہیں (ان میں کوئی رتبے کا امتیاز نہیں) ایک ہی مٹی ہے اور ایک ہی کمہار ہے اور سب کا پیدا کرنے والا بھی ایک ہی ہے - ساری شکلیں ایک ہی چاک سے بنی ہیں اور سب میں ایک ہی بیج (جوہر) سمایا ہوا ہے - جب ہنس* جان و جسم چھوڑ کر اُڑ جاتا ہے تو اس وقت اس جسم کی کونسی ذات ہوتی ہے؟ یہ جان کالی ہے یا سفید، لال ہے یا پیلی، رنگ دار ہے کہ بے رنگ، گرم ہے کہ ٹھنڈی؟ یہ جان ہندو ہے کہ ترک، بوڑھی ہے کہ جوان، عورت ہے کہ مرد؟ بھلا اسی بات پر غور تو کرو)

ذات پات کی برائی کے ساتھ کبیر، برھمنوں کی ظاہری پاکی اور صفائی

---

* ہنس کو کبیر نے اکثر روح کے معنوں میں استعمال کیا ہے —

اور چھوت چھات کا ذکر نہایت طنزیہ طریقے سے کرتے ہیں

کہو دھون چھوتی کہاں تے اپجا تب ہی چھوتی سم سی
ناہے بندے ردھرا کے سنگے گوت ہی مہاں گوت سپچے
استِ کنول ہوے پہمی آیا چھوتی کہاں تے اپجے
لکھہ چوراسی نانا باسن سو سنجہ سری بھوما نتی
ایکے پات سکل بیٹھاے چھوتی لیت دھون کاکی
چھوتی ہی جیون چھوتی ہی انچوں چھوتی ہی جگت اُپایا
کہا ہیں کبیر تے چھوتی بہرجت جا کے سنگ نہ مایا
(شبد ۴۱)

(ذرا مجھے بتاؤ تو سہی یہ چھوت کہاں سے آئی ؟ تم نے کیسے چھوت چھات پر یقین کرلیا؟ جب باپ کا بیج اور ماں کا خون ملتے ہیں تو جسم کے اندر جسم پیدا ہوتا ہے - آٹھہ پنکھوڑیوں والا کنول کا پھول زمین سے پیدا ہوتا ہے (یہ بتاؤ چھوت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ چوراسی لاکھہ برتن سب مٹی کل کر مٹی بن جاتے ہیں (دنیا میں) سب ایک ہی کنارے پر بیٹھے ہیں، بھلا تم کیوں چھوت مانتے ہو ؟ تم چھوت کھاتے ہی ہو، چھوت پیتے ہو - چھوت سے دنیا پیدا ہوئی - کبیر، کہتے ہیں کہ جن کے ساتھہ مایا نہیں وہ چھوت چھوڑ دیتے ہیں) -

پھر کہتے ہیں :

پانڈے بوجھی پیا ہو پانی

جھی مٹیا کے گھر مہاں بیٹھے تا مہاں سشٹی سمانی
چھپن کوٹی جا دزو جہاں بھینجے منی جن سہس اٹھاسی
پیگ پیگ پیگمبر کاڑے سو سبھہ سو سری بھو مانتی
مچھہ کچھہ گھر پار بیانے ردھر نیر جل بھریا
تھہ یا نیر نرک بھی آوے پسو منش سب سوریا
ہاڈ جھری جھری گوڈ گری گری ہوہ کہاں تے آیا

سوے پانڈے جینوں بیٹھے متیا ہیں چھوتی لگایا
بید کتیب چھانڈی دیبو پانڈے ای سبھہ من کے بھرما
کہاں ہیں کبیر سنو ہو پانڈے ای سبھہ تمہرے کرما

(شبد ۴۷)

(اے پنڈت ! پانی پینے سے پہلے ذرا سوچو تو جس متی کے گھر میں تم بیٹھے ہو ساری دنیا اس میں سمائی ہوئی ہے - یاد رو (کرشن جی کے اسلاف) کے چھپن قلعے اور چوراسی ہزار مٹی ڈوب گئے - قدم قدم پر پیغمبر دفن ہیں اور وہ (سب کے سب) سڑ سڑا کر مٹی ہو گئے - پانی ' مچھلی ' کچھوے ' گھڑیال کی شکلوں میں خون سے بھرا پڑا ہے - دریاؤں کے پانی میں جھنم بھی چلی آتی ہے - جانور اور انسان اس میں سڑتے ہیں - ہڈیاں جھڑتی ہیں اور گوداگلتا ہے (تو دودھ بنتا ہے) ورنہ دودھ کہاں سے پیدا ہو؟ - اے پنڈت ! تم کھانے کو زمین پر بیٹھتے ہو لیکن زمین کی مٹی میں چھوت ہے - اے پانڈے ! وید اور دوسری کتابیں چھوڑو ان میں سوائے دل کی الجھن کے اور کچھ نہیں-کبیر کہتا ہے' اے پنڈت! سنو! یہ سب کچھ تمہارے کرموں کا نتیجہ ہے-)

'کبیر داس' اور دوسرے برہمنی اداروں کی طرح ' تیر تھ' کو محض بیکار اور روحانی زندگی کے خلوص کے لئے غیر ضروری سمجھتے ہیں —

جیو گھات نہ کیجئے بہری لیت وے کان
تیر تھ گئے نہ بانچیہو نوئی ہیرا دیہو داں

تیر تھ گئے یتنی جنا چت چینچل من چور
ایکو پاپ نہ کاٹیا لاوٹی من ۵س اور

تیرتھہ گئے تے بھی موے جو نڈے پانی نہاے
کہا ھیں کبیر سنتو سنو رچھس ھوے پچھتاے

قیرتھہ بھئے وں بیاری رھی جگن جگ چھاے
کبیرن ' سول لکا ندیا کیوں نہ ھلاھل کھاے

(ساکھی ۲۱۳ - ۲۱۶)

(زندگی کو تباہ مت کرو ورنہ تم کو شرمندگی اٹھانا پڑیگی - تیرتھہ جا کر تم بچ نہیں سکتے چاھے کروڑوں ھیرے خیرات میں دیدو - تین آدمی تیرتھہ کو چلے ' ان کے خیالات پریشان تھے اور دل میں چور تھا - ان کا ایک گناہ بھی نہیں ھٹا اور دس من اور اکھٹا ھو گئے - جب وہ تیرتھہ نہانے چلے تو ڈوب کے مر گئے - اے بھلے لوگو! سنو جو کبیر تمسے کہتا ھے - انھیں شرمندگی تھی کہ وہ راکشش بن گئے - تیرتھہ زھریلی بیل کی طرح ھر زمانے میں پنپتا رھا ھے - کبیر نے اس کی جڑ نوچ لی ھے - اب تیرتھہ زھر کیوں نہیں کھا لیتا)

ایک اور جگہ اسی مضمون کو یوں بیان کیا ھے :

کا کاسی کا مگھر اوسر ھردے رام بس مورا
جو کاسی تان تجے کبیرا رام ھیں کچن نہو را (شبد ۱۰۳)

(کاشی کیا ھے؟ مگھر * کی اوجڑ زمین میں کیا رکھا ھے؟ رام تو میرے دل میں بستا ھے - اگر کبیر اپنا تن کاشی پر نثار کر دے تو وہ رام کو کب اپنا نیاز دے گا)

کبیر کے کلام سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ اس کی ذھنی ساخت بڑی حد تک ھندو فلسفۂ و تہذیب کے زیر اثر عمل میں آئی - اس کی الہیاتی اور ما بعدالطبعی

---

* ضلع گورکھپور میں ھے - ھندوؤں میں متبرک جگہ سمجھی جاتی ھے —

تاویلوں میں ہندو رنگ کی جھلک غیر مشتبہ طور پر نظر آتی ہے - اس کے ہاں 'مایا' کا اکثر ذکر ملتا ہے - یہ ضرور ہے کہ اس کا 'مایا' کا تخیل قدیم فلسفیا نہ برہمنی تخیل سے جدا گانہ ہے —

فلسفیا نہ حیثیت سے 'مایا' خارجی دنیا کی ساری ایجابی قدور کی مطلق نفی ہے - عالم الم و صفت اور اس کی ساری ظاہری شکلیں فریب نظر ہیں - لیکن کبیر کے ہاں ایجابی دنیا ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے اس کے پاس ایک مخصوص مذہب یا اخلاق ہے - اس اخلاق میں مایا کی تاویل بالکل دوسری ہے - مایا ایک قوت ہے جو زندگی کے اخلاقی ضابطے کو ' جس کی بنیاد اعتقاد پر ہے ' درہم برہم کر نا چاہتی ہے - یہ قوت بھگت کو اپنے مقاصد سے ہٹا کر بیکار اور غیر اہم باتوں میں مشغول کر دیتی ہے- کبیر مایا کو نہایت شاعرانہ انداز میں پیش کر تے ہیں - اکثر اوقات یہ ایک دلفریب حسینہ ہے جس کے غمزۂ وادا کی ہوش ربا ئی اور طنطنۂ و ناز کی صبر شکنی غریب بھگت کے لئے بڑے سخت امتحان کا موجب بن جاتی ہے - ہم ذیل میں اس موضوع پر کچھ مثالیں نقل کر تے ہیں :

مایا مہا ٹھگنی ہم جانی

تریگن پھانس لئے کر ڈولے بولے مدھری بانی

کھسو کے کملا ہوے بیٹھی سیو کے بھون بھوانی

پانڈا کے مورتی ہوے بیٹھی تر تھو و مہان پانی

جوگی کے جوگنی ہوے بیٹھی راجا کے گھر رانی

کاہو کے ہیرا ہوے بیٹھی کاہو کے کوڑی کانی

بھگتا کے بھگتنی ہوے بیٹھی برھما کے برھمانی

کہاہیں کبیر سنو ہو سنتو ای سبھہ اکتھہ کہانی (شبد ۵۹)

(مایا بڑی بھاری ٹھگنی ہے- میں اسے خوب اچھی طرح جانتا ہوں- وہ ہاتھہ میں

تین پھندے لئے پھرتی ہے اور میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے - کیشو (وشنو) کے ہاں وہ کملا (لکشمی کا نام) ہے - شیو کے ہاں بھوانی ہے - پنڈت کے ہاں بت ہے - اور تیرتھ میں وہ پانی (کی شکل اختیار کر لیتی ہے) جوگی کے ہاں جوگنی ہے اور راجا کے ہاں رانی - ایک کے ہاں ہیرا ہے اور دوسرے کے ہاں کانی کوڑی - بھگت کے ہاں بھگتنی ہے اور برہمن کے ہاں برہمنی - کبیر کہتا ہے اے بولے لوگو! سنو! یہ سب کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے)

اس کے عشوہ و ناز کو یوں بیان کیا گیا ہے :

کھیلتی مایا موہنی جنیہ جیر کیئو سنسار
رچیو رنگ تے چنری کوئی سندری پہرے آے
سو بھا ادبد روپ واکی مہما برنی جاے
چندابدنی مرگ لوچنی مایا بد کا دیئو ادھار
جاتی ساتی سبھہ موہیا گچ گتی ایسی واکی چال
نارد کو مُکھہ مانتی کے لینھو بسن چھپاے
ارب کھیلی گرب تے اُلٹی چلی مسکاے
سیوسن برہما دوڑی کے دونوں پکڑے جاے

(چاچر نمبر ۱ بیجک)

(حسین مایا جس نے عالم کو زیر نگین کر لیا ہے ' کھیلتی ہے - اس نے ایک سرخ لباس جس پر سفید بوٹیاں ہیں پہن رکھا ہے - وہ ایک حسینہ کی طرح اسے پھنکر آتی ہے - اس کی آن بان غضب کی ہے - اس کی شان بیان سے باہر ہے - چاند کا سا مکھڑا ' ہرن کی سی آنکھیں ' اس نے اپنے رخسار پر چھوٹا سا سیاہ تل کا نشان لگالیا ہے - زاہد اور پارسا سب کے سب اس پر عاشق ہوگئے ہیں - اس کی چال ہاتھی کی سی ہے - اس نے نارد * کا منہ تھک کر اپنا بدن (اس کے قابو سے) چھین

---

* یہ ایک مشہور رشی ہیں - رگ وید کے بعض منتران سے منسوب کیے جاتے ہیں -

لیا ۔ وہ غرور میں مست، مسکراتی مڑ مڑ کے اتراتی ہوئی چلتی ہے۔ شیو اور برہما کی طرف دوڑ کر جاتی ہے اور دونوں کو گرفتار کرلیتی ہے)

'کبیر' باوجود مایا کے جوبن اور شباب کے اسے ایک بوڑھی جادوگرنی سے تشبیہ دیتے ہیں :

بوڑھیا ہنسی بولے میں نت ہیں بالی — سو سو تروٹی کہو کونی نالی
دانت گیال مورے پان کھات — کیس گیل مورے گنگ نہات
نین گیل مورے کجرا دیت — بیس گیل پر پرش لیت
جان پر شوا مورا ہار — ان جانے کا کرو سنگار
کہا ہیں 'کبیر' بوڑھیا آنند گاے — پوت بیتا رہیں بیٹھی کھاے

(بسنت ۴، بیجک)

(بوڑھی جادوگرنی ہنستی ہے اور کہتی ہے : میں ہمیشہ کنواری (بارہ برس کی) رہوں گی، کوئی عورت مجھ سے زیادہ جوان نہیں۔ میرے دانت پان کھاتے کھاتے ضائع ہوگئے ۔ میرے بال گنگا اشنان کرتے کرتے گرگئے ۔ کاجل لگاتے لگاتے آنکھیں خراب ہوگئیں ۔ میری ساری جوانی دوسروں کے شوہر ہڑپ کرنے میں گئی ۔ عقلمند میرے شکار بنتے ہیں ۔ جاہلوں سے میں اپنا سنگار کرتی ہوں ۔ کبیر کہتا ہے : بوڑھیا مزے لے لے کر گاتی ہے۔ اس نے بیٹے اور بھائی دونوں کو ہڑپ کرلیا)

مایا کو خاص طور پر ان لوگوں کے دلوں کو ڈانوا ڈول کرنے میں مزہ آتا ہے جو دنیا جہان چھوڑ کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہوتے ہیں –

اے مایا رکھو ناتھہ کی بوری — کھیلن چلی ہیرا ہو
چتر چکنیا چنی مارے — کاہو نہ راکھے نیرا ہو
موٹی بیر دگمبر مارے — دھیان دھرنتے جوگی ہو
جنگل میں کے جنگم مارے — مایا کنھوں نہ بھوگی ہو
بید پنڈتے بھیدیا مارے — پوجا کرنتے سامی ہو.....

ساکت کے گھر کرتا دھرتا بھگت کے چیری ہو
کہا ہیں 'کبیر' سنھو ہو سنتو جوں آوے توں پھیری ہو

(کہرا - ۱۲ بیجک)

(مایا رگھو ناتھ کے پیچھے باؤلی ہو رہی ہے' وہ شکار کرنے نکلتی ہے' چن چن کے سارے بانکے طرحداروں کو ہڑپ کرلیا - اپنے پاس کسی کو وہ رہنے نہیں دیتی- اس نے منی' سورما' زاہد مرتاض اور مراقبہ کرنے والے جوگی پر فتح پالی - جنگلوں میں پھرنے والے سادھوؤں کو' جو اس سے منہ موڑ چکے تھے' اس نے رام کرلیا - وید پڑھتے ہوے پنڈت اور پوجا کرتے ہوے سوامی کو اس نے مار لیا - سکتی کے ماننے والے کے گھر میں وہ سارا کرتا دھرتا اپنے ڈسے لے لیتی ہے اور بھگت کے گھر میں چیلی بن جاتی ہے - کبیر کہتا ہے' اے بھلے لوگو! سنو! جب وہ آے تو اسے (اُلٹے پاؤں) واپس کردو)

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

رام تیری مایا ن فد بجاوے
کتی متی واکی سمجھی پرے ناہیں سر نر منی ہیں نچاوے

(شبد ۱۳)

(اے رام! تیری مایا نے بڑا شور مچا رکھا ہے - نہ اس کی چال اور نہ اس کی ذہنیت کسی کی سمجھ میں آتی ہے - اس نے دیوتا' آدمی اور رشیوں سب کو نچا رکھا ہے)

مایا کی چالیں اور گھاتیں گہری اور سخت سہی لیکن انسان اعتقاد و یقین کے ذریعے اس پر قابو پاسکتا ہے - چنانچہ، کبیر کہتے ہیں :

مایا موہ کٹھن سنسارا اہے بچار نہ کاہو بچارا
مایا موہ کٹھن ہے پھندا ہوے بپیلی سو جن بندا
رام نام لے بیڑا تارا سو تو لے سنسار ہیں پارا (رمینی ۷۶)

(مایا اور خواہش سارے عالم کو مصیبت میں ڈالے ہوے ہیں۔ کوئی اس بات پر سوچتا نہیں ۔ مایا اور خواہش کا ایک بڑا سخت پھندا ہے ۔ جو اس بات میں تمیز کرے وہ خاص بندہ ہے ۔ جو رام کا نام لے کر اپنا بیڑا ڈالے گا تو وہ دنیا کو سلامتی سے پار کرلے گا)

رام کی بھگتی کرنے والوں نے شروع ہی سے ہندو سماج کی معاشرتی اصلاح اور تزکیۂ اخلاق کی طرف توجہ کی ۔ تنتری عہد کی بے اعتدالیوں اور آزادیوں نے ہندو سماج میں قابل شرم بد اخلاقیاں پیدا کردی تھیں ۔ 'رامانند' کی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھے ہوے تھیں ۔ انھیں کرشن جی کی بھگتی سے' جس کے ساتھ 'پرانوں' کے زمانے سے شاہرانہ تخیل آفرینی شامل تھی' ذرا خطرہ تھا ۔ معلوم ہوتا ہے اپنے گرو کی طرح 'کبیر' کو بھی یہ خطرہ برابر محسوس ہوتا رہا ۔ 'تنترا' عہد کی اخلاقی فراجی کے بعد' ایک مصلح کے لئے' رادھا اور گوپیوں کی شوخیوں اور چھلوں' کرشن جی کے راز و نیاز اور رنگ رلیوں پر سارا مذہبی اور اعتقادی خلوص صرف کرنا' لازمی طور پر ایک طرح کی ذمہ دارانہ احتیاط اور جھجک کا موجب ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ کبیر کے ہاں کرشن جی کا ذکر بہت کم ہے اور وہ بھی محض ضمنی طور پر ۔ لیکن باوجود اپنی سخت اخلاقیت کے 'کبیر' نفس کشی کے لئے چلوں اور ریاضت کی مشقوں کو لایعنی خیال کرتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک انسانی اخلاق کی تکمیل اور زندگی کی نجات کے لئے یہ سب ضروری نہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

جوگی کہے جوگ ہے نیکو دتیا اور نہ بھائی
چنڈت منڈت ہونی جٹادھر نتھو کہاں سدھی پائی (شبد ۳۸)

(جوگی کہتا ہے جوگ بڑی اچھی چیز ہے ۔ اے بھائی! اس کے برابر اور کچھ نہیں ۔ کوئی چوٹی بڑھتا ہے ' کوئی سر مونڈتا ہے ' کسی نے خاموشی کا عہد کیا ہے ' کسی نے جٹیں رکھی ہیں ۔ ان میں کسی کو مطلق (راز کی) خبر نہیں)

دیہہ ہلائے بھگتی نہ ہوے　　سوانگ دھرے نہ بھوبدھی جوے
دھنگی دھنگی بھلو نہ مانا　　جو کہو موہی ہر دیا جانا
مکھہ کچھو آن ہر دیا کچھو آنا　　سپنیہو کا ہو موہی نہیں جانا

(رمینی ۶۷)

(جسم کو ہلانے سے بھگتی نہیں ہوتی - بہت سے لوگ طرح طرح کے سوانگ بھرتے ہیں - بھلائی کے مانگنے کے لئے دھینگا مشتی کی ضرورت نہیں - اگر محبت کی بات کہو تو دل اُسے فوراً سمجھہ لیتا ہے - ان کے منہ میں کچھہ ہے اور دل میں کچھہ - انہوں نے خواب تک میں محبت کو نہیں دیکھا)

طنز یہ طریقے سے کہتے ہیں :

جٹا توڑی پھرا وبن سیاں　　جوگ جگتی کے گرب دھیلی
آسن اڑ ئے کون بڑائی　　جیسے کوا چیل مڈرائی

(رمینی ۷۱)

(جٹائیں رکھہ کر اس نے ایک مالا پہن لی ہے - جوگ پر عمل کر کے غرور سے پھولا پڑتا ہے - آسن پر بیٹھہ کر اڑنے میں کونسی بڑائی ہے - (یہ تو بس ایسا ہی ہے) جیسے چیل کوے منڈلاتے پھرتے ہیں)

ایسا جوگ نہ دیکھا بھائی　　بھولا پرے لئی غفلائی
مہادیو کا پنتھہ چلاوے　　ایسو بڑو مہنت کہاوے
ہاٹ بجارے لاویں تاری　　کچے سدھن مایا پیاری

(رمینی ۶۹)

(اے بھائی ! میں نے ایسا جوگ نہیں دیکھا - وہ غفلت میں بھٹکتا پھرتا ہے - ' مہادیو ' کے نام سے ایک فرقہ نکالتا ہے اور چاہتا ہے کہ بڑا مہنت کہلایا جائے بازار ہاٹ میں مراقبہ کر کے بیٹھتا ہے - وہ کچا سدھ ہے اور اسے مایا سے الفت ہے)

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں ' کبیر مابعدالطبعی نظریوں ' برہمنی فلسفۂ و تصوف کی موشگافیوں اور علم و قانون کو روحانی زندگی کی پوری تسکین کے لئے کافی نہیں سمجھتا - انسانی شعور کی گہرائیوں میں ایک ایسی چیز ہے' جسے بغیر ایمان و یقین کے چین نہیں پڑتی - وہ اس خیال کو یوں گاتا ہے :

سمرتی * آہی گنن کو چینہا پاپ پن کو مارگ کینہا
سمرتی بید پڑھے اسرارا پاکھنڈ روپ کریں ہنکارا
پڑھیں بید اور کریں بڑائی سنسن گانٹھی اجھوں نہیں جائی
پڑھی کے شاسترا جیو بدھ کری منڈی کاٹی اگمن کے دھری
کہا ہیں کبیر پاکھنڈے بہتک جیو ستائے
امبھو بھاؤ نہ درسئے جیت نہ آپو لکھا یا (رمینی ۳۱

(سمرتی آئی اور اس نے صفات کو پہچانا - اس نے گناہ اور نیکی کا راستہ مقرر کیا - یہ لوگ برابر سمرتی اور وید پڑھتے رہتے ہیں - یہ ریاکار ہیں - اپنی تعریف میں پھولے ہوئے ہیں - یہ وید پڑھتے ہیں اور شیخی مارتے ہیں - ان کی شبہ کی گنٹھی اب تک نہیں سلجھی - شاستر پڑھ پڑھ کر یہ لوگ اپنی جان برباد کرتے ہیں - جانوروں کے سر کاٹ کے بتوں کو پیش کرتے ہیں- کبیر کہتا ہے : یہ ریاکار ہیں - یہ بہت سی جانوں کو ستاتے ہیں' انھیں اندرونی تجربے کی روشنی نہیں دکھائی دے سکتی' جب تک کہ زندگی میں وہ خود کو نہ پہچانیں)

اندھو درین بید پرانا درین کہا سہارس جانا
جس کھر چندن لاوے بھارا پریمل باس نہ جانے گنوارا
کہا ہیں کبیر کھوجے اسمانا سونہ ملا جہی جائے کہانا (رمینی۳۲)

---

* تدوین شدہ علوم کو سمرتی کہتے ہیں - اس کے مقابلے میں ' سوتی' ہے جس کے معنی ہیں سنا ہوا یا وہ علوم جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں - بعض ' سرتی' سے الہامی احکام بھی مراد لیتے ہیں ' وید سرتی ہے اور دھرم شاستر سمرتی -

(اندھوں کے لئے وید اور پران آئینے ھیں - چمچے کو اصلی سزے کی کیا خبر؟ اس گدھے کی طرح جسپر صندل کی لکڑی لدی ھوئی ھو' ایک بد مذاق نہیں جانتا کہ عمدہ خوشبو کیا ھے؟ کبیر کہتا ھے کہ آسمان ڈھونڈھنے سے بھی وہ نہیں مل سکتا جو شبہ کو دور کر سکے)

کبیر داس کے ھاں خدا کی وحدانیت کا تخیل متعین ھے- ان کے خدا کی شخصیت بڑی حد تک بالکل ویسی ھی ھے' جیسی کہ اسلامی خدا کی - واقعہ یہ ھے کہ ھندوستان کی خیالی اور روحانی تاریخ میں کبیر سے پہلے خدا کبھی اس قدر متعین اور اخلاقی شکل میں نہیں پیش کیا گیا - یہ نہیں کہ وحدانیت (Monotheism) کا تصور قدیم ھندی آریائی تاریخ میں نہ پایا جاتا ھو - رگ وید میں پرجاپتی اور وشوا کرما' سارے عالم کے مالک اور قادر مطلق بتلائے گئے ھیں' لیکن ساتھ ھی دوسرے خدا مثلاً : ورنا' سریا' اندرا' اور 'وشنو' کبھی قادر مطلق بتلائے جاتے ھیں' اور کبھی ایک دوسرے کے ماتحت - معلوم ھوتا ھے کہ پرستش کرنے والا اپنی فوری ضروریات کے لحاظ سے' جس خدا کی تعریف کرتا ھے' اسے اور سب دوسروں سے بڑھا چڑھا دیتا ھے - اور پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آریائی ذھنیت مطلق وحدانیت کو زیادہ اھم نہیں سمجھتی تھی - وحدت الوجود کا تصوفانہ رنگ اور برھما (اصول افرینش)کا فلسفیانہ تخیل ابتدائی ویدی زمانے ھی سے ھندی آریوں کا سب سے زیادہ گہرا اور موثر مگر کہنہ ذھنی رھا ھے - ویدی زمانے کے بعد برھمنی عہد میں برھما کا تخیل اور قربانی کی رسمیں ھندوستان کا مذھب تھا - بھگوت گیتا میں وحدانیت کی جو دھندلی سی جھلک ھے وہ بھی فلسفیانہ واحدیت (Monism) اور وجودیت (Pantheism) کے رنگ میں ملوث ھے - اسلامی آمد کے بعد خالص وحدانیت کا راگ ھندوستان کے کونے کونے میں گایا جانے لگا - ھر جگہ مصلحین یہی الاپتے سنائی دیتے ھیں - کبیر خدا کو اسلامی اور ھندی دونوں ناموں سے یاد کرتے ھیں - ان کے ھاں صاحب کا استعمال بہت ھے - مثلاً :

صاحب سوں سب ہوت ہے بندے تیں کچھہ ناہیں
رائی تے پروت کرے پروت رائی مائیں
بھن بھنتا تھل کرے تھل کر بھن بھویا
صاحب ہاتھہ بڑائیا جس بھاوے تس ہوئے
سائیں تجھہ سے باہرا کوڑی ناہیں بکائے
جا کے سر پر تو دھنی لاکھوں مول کرائے

(وچناولی صفحہ ۲)

دوسری جگہ ہے :

اب تو جو جھے ہی بنے مڑ چلے گھر دور
سر صاحب کو سونپئے سوچ نہ کیجے سور
سر رکھے سر جات ہے سر کاٹے سر سوئے
جیسے باتی دیپ کی کاٹی انجیارا ہوئے
تیر تپک سے جو لڑے سو تو سور ہوئے
مایا تجی بھگتی کرے سو رکھا وے سوئے

(وچناولی صفحہ ۴۸)

کبیر خدا کی وحدانیت کے متعلق کہتے ہیں :

سنجم سہت بھاؤ نہیں اھواں سود ھوں ایک کہ دوجا
گورکھہ رام اکو نہیں اھواں نہ وھاں بید بچارا
مایا باپ گرو جا کے ناھیں سو دھوں دوجا کہ اکیلا

(شبد ۴۳)

(جس کا کوئی ساتھی اور شریک نہیں وہ ایک ہے کہ دوسرا اور بھی

کوئی اس کے سوا ہے وہاں نہ گورکھہ ہے * نہ رام - نہ وید بچارے کا گذر ہے (یا وید کے متعلق کوئی سوچ بچار نہیں کرتا) اس کے نہ ماں ہے نہ باپ ' نہ گرو - تو سمجھے بتا کہ وہ اکیلا ہے کہ کوئی دوسرا بھی ہے ؟

کبیر کہتے ہیں کہ خدا ' جیسا کہ عام طور ہندؤں کے تمام فرقوں کا عقیدہ ہے' وتاروں کی شکل میں نہیں آتا - نہ اوتار خدا ہوسکتے ہیں :

ہے پرتی پال کال نہیں واکے — نہ کہوں گیا نہ آیا
کیا مکسود سچھہ کچھہ ہونا — سنکھا سر نہ سنکھا را
ہے دیال دروہ نہیں واکے — کہا ہو کہوں کو مارا
وے کرتا نہیں براہ کہاے — دھرنی دھر و نہیں دھارا
ای سب کاج صاحب کے نامیں — جھوٹھہ کہے سنسا را
کوہب پھوری جو باہر ہوے — تا ہی پتیجے سبھہ کوئی
ہر فاکس نکھہ و ودر بداری — سو نہیں کرتا ہوئی
باون روپ نہ بالی کو جانو — جو جانیجے سو مایا
گوپی گوال نہ کو کل آیا — کرتے کنس نہ مارا
ہے مہربان سبھنکو صاحب — نہیں جیتا نہیں ہارا
وے کرتا نہیں بدہ کہاے — نہیں اُسر کو مارا
ای چھل بل سب مایا کیدھا — جتا ستا سبھہ تا را
دس اوتار ایسر ی مایا — کر تا کے جن پو جا
کہا ہیں کبیر سنیو ہوسنتو — اپجے کھپے سو د و جا

سب کے پالنے والے کو موت نہیں - نہ وہ آتا ہے نہ جاتا بولا ، چھوا یا کچھوا بانٹنے سے اسکا کیا مقصد ہو سکتا ہے ؟

---

* گورکھہ ناتھہ جوگیوں کے ایک مشہور فرقے کے بانی ہوے ہیں -

اس نے سنکھا راکشش* کو نہیں مارا - وہ بڑا رحم والا ہے - وہ کسی سے دشمنی نہیں رکھتا - مجھے بتاؤ اس نے کسے قتل کیا ہے ؟ وہ خالق نہ سور+ کہلایا جاسکتا ہے نہ اسے اس سانپ کی حاجت ہے جو دنیا کو اپنے پھن پر اٹھائے ہوئے ہے - صاحب ایسا نہیں - دنیا جھوٹ کہتی ہے - جو کھمبے کو چیر کر نکلا تھا' اور جس پر ساری دنیا کا عقیدہ ہے' خالق نہیں ہو سکتا - نہ وہ' جس نے ہرنیا کی پو‡ کا پنجوں سے پیٹ پھاڑ دیا تھا' خالق ہے - جو بالشتئے کی شکل میں راجہ بالی$ کی جانچ کے لئے آیا تھا وہ بھی خالق نہیں - یہ سب مایا ہے - غلط فہمی کی وجہ سے دنیا گمراہ ہو رہی ہے - مایا نے دنیا کو بہکا دیا ہے - خالق اس گوالے کے جنم میں گوکل نہیں آیا جس کے ساتھ گوپیاں تھیں - خالق نے کنس§ کو نہیں مارا - صاحب ساری دنیا کے لئے مہربان ہے - نہ وہ کبھی جیتتا ہے اور نہ کبھی ہارتا ہے - خالق کا نام بدھ نہیں - اس نے راکشش کو نہیں مارا - یہ سارا شور مایا نے مچا رکھا ہے - نیک کردار اور پارسا سب بھٹکے ہوئے ہیں - دسوں اوتار مایا کی شان ہیں - بس خالق ہی کی پرستش کرنی چاہئے - کبیر کہتا ہے :اے بھلے لوگو! جو چیز پیدا ہوتی

---

* ناگوں کے آٹھ سرداروں میں سے ایک ہے - اس نے دیوتاؤں پر فتح پاکر ان سے وید چھین لیا تھا - وہ وید کو سمندر کی تہ میں رکھنے لے گیا' لیکن وشنو جی وہاں سے اسے چھین لائے —

+ براہ وشنو کا تیسرا اوتار ہے—

‡ ہرنیاکس پو ایک راجا تھا' جس کے متعلق برہما نے پیشین گوئی کی تھی کہ نہ اسے کوئی دیوتا اور نہ انسان مارسکے گا - اس کی بد کرداریوں کے باعث وشنو جی نے ایک پتھر کے کھمبے سے نراسنہا (آدھے آدمی اور آدھے شیر) کی شکل میں نکل کر اسے ہلاک کیا —

$ بالی بندروں کا بادشاہ اور اندر کا بیٹا تھا —

§ راجہ کنس متھرا کا بادشاہ تھا - کرشن جی کا چچا اور دشمن - کرشن جی نے اسے ہلاک کیا —

ہے اور فنا ہوتی ہے وہ خالق نہیں کوئی دوسری چیز ہے —
کبیر کی پرستش کا مرجع خلوص خدائے واحد ہے، جو سب کا خالق ہے

اک سادھے سب سادھیا سب سادھے اک جائے
جیسے سینچے مول کو پھولے پھلے اگھائے
جو یہ ایک نہ جانیا بھو جنے کا ہوئے
اکے تے سب ہوت ہیں سب تے ایک نہ ہوئے

(وچناولی صفحہ ۲۹)

یہ سچ ہے کہ کبیر داس کی شاعری کی بڑی خصوصیت تخریبی اور تنقیدی ہے، لیکن ان کے خیالات ایک مستقل تعمیری پہلو سے عاری نہیں۔ انھوں نے سماج کے اداروں کی حالت ایسی پائی کہ اصلاح کی خاطر ان کی تخلیقی ذہنی قوت کا بڑا حصہ تنقید کے نذر ہوگیا۔ بنانے سے پہلے انھوں نے دیکھا کہ انھیں بہت کچھ ہٹانا اور گرانا ہے۔ خدا کی وحدانیت کی ایجابی تعلیم کے علاوہ ان کی شاعری کا تعمیری پہلو ان کی بھگتی کی تعلیم میں نظر آتا ہے۔ وہ بھگتی کو محض خشک مذہبی عقیدے سے تعبیر نہیں کرتے۔ ان کا کلام غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ ؤ خلوص وجدانی کیفیتوں اور محبت کے ابلتے ہوے چشموں سے نکلتا ہے۔ وہ پریم کا راگ الاپتے ہوے ذرا بھی ہچکچاتے نہیں۔ اور ساتھ ہی کرشنوی شاعروں کے بر خلاف محبت و خلوص کے نصب العین کو پستیوں سے ملوث نہیں ہونے دیتے۔ اس موضوع کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے وہ تشبیہ کی زبان استعمال کرتے ہیں اور چکور کو بطور مثال پیش کرتے ہیں :

گھی ٹیک چھوڑے نہیں جیبھہ چونچ جری جائے
ایسو تپت انگار ہے تہی چکور چبائے
چکور بھروسا چندر کے نگلے تپت انگار
کہیں کبیر داہے نہیں ایسی وستو لگار

(ساکھی ۴۰ - ۴۱)

(وہ ٹیک کو پکڑکے پھر چھڑتا نہیں - چاہے اس کی زبان اور چونچ جل ہی کیوں نہ جاے - باوجود یکہ انگارا بہت گرم ہے' لیکن چکور اسے چبالیتا ہے - چاند کے بھروسے پر چکور دسکتا ہوا انگارا نگل لیتا ہے - کبیر کہتے ہیں کہ چکور مطلق جلتا نہیں کیونکہ محبت ایسی ہی چیز ہے) پھر کہتے ہیں کہ ہر کس و ناکس محبت و خلوص کی جانچ میں پورا نہیں اُتر سکتا - اس میدان کی ٹھوکروں کے لئے ذرا دل گُردہ درکار ہے :

گیان سنپورن نہ بھیدا ہردا نہیں جڑاے
دیکھا دیکھی بھگتی کا رنگ نہیں بھڑاے
کامی کرو دھی لالچی ان تے بھگتی نہ ہوے
بھگتی کرے کوئی سورما جاتی برن کل کھوے
جل جیون پیاری ماچھری لو بھی پیارا دام
ماتا پیارا بالکا بھگت پیارا نام

(وچناولی صفحہ ۱۰)

(کامل علم کی تمیز اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ دل میں لگن نہ لگی ہو - دیکھا دیکھی کے اعتقاد و خلوص کا رنگ نہیں جمتا - عیاش ' مغلوب الغضب اور لالچی سے بھگتی نہیں ہوسکتی - بھگتی برتنے کے لئے سورما ہونا چاہئے - ذات پات اور نسل کو کھودینا چاہئے - جیسے مچھلی کو پانی' بخیل کو دولت اور ماں کو اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے' اسی طرح بھگت کو نام (حقیقت) سے محبت ہوتی ہے)

اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ان کے کلام سے نقل کی جاسکتی ہیں -

جاگت پریم نہ سنچرے سو گھت جان مسان
جیسے کھال لہار کی سانس لھت بنو پران (وچناولی

—— o ——

روم روم پیو پیو کرے مکھہ کی سر دھاناھیں
جو جاگت سو سو پن میں جیوں گوت بھیتر سوانس (وچناولی)

—— o ——

جب لگی مرنے سے ڈرے تب لگی پریم نہیں
بڑی دور ہے پریم گھر سانجھہ لیھو من مانھیں (وچناولی)

—— o ——

جل میں بسے کمودنی چندا بسے اکاس
جو ہے جاکو بھاوتا سوتا ھی کے پاس (وچناولی)

—— o ——

انکھیاں تو بھائیں پری، پنتھہ ھنار ھنار
جیھڑ یا چھالا پڑا، نام پکار پکار
نینن تو جھری لائیا رھت بسے نسو باس
پپیا جیوں پیو پیو رٹے، پیا ملن کی آس (وچناولی)

—— o ——

اصلاحی شاعری کے علاوہ کبیر داس کی طرف ٹھکرسلے یا "الٹے" بھی منسوب ھیں۔ ھم ذیل میں چند مثالیں بیجک سے نقل کرتے ھیں:

تریور ایک مول بنو ٹھاڑے بنو پھولے پھل لاگا
ساکھا پتہ کچھو نہیں واکے اسٹ گگن مکھہ کا جا
پو بنو پتہ کرہ بنو تو بنا بنو جبھیا گن گاوے

گاوئی ہار کے دیکھہ روپ نہیں ستگر و ہو ئی لکھا وے (شبد۲۴)

(ایک پیڑ بغیر جڑ کے کھڑا ہے - اس میں بغیر پھول کے پھل لگتے ہیں - نہ اس پیڑ میں شاخیں ہیں نہ پتیاں - اور اس کا منہ (چوٹی) اتنا اونچا ہے جتنا آٹھواں آسمان - بغیر جڑ کے پتے ہیں، بغیر جسم کے ہاتھہ ہیں، بغیر زبان کے وہ گن گاتا ہے - گانے والے کی نہ شکل ہے نہ منہ - بچا گرو ہی اس مسئلے کو سمجھائے گا)

دیکھی دیکھی جی اچرج ہوئی اے پہ بوجھے برلا کوئی

دھرتی الٹی اکاسھیں جاے چیونٹی کے مُکھہ ہستی سمائے

بنو پونے جو پر بت اڑے جیا جنتو برچھا بوڑے .....(شبد۱۰۱)

(دیکھہ دیکھہ کر میرے دل کو تعجب ہوتا ہے - میرے ان شبدوں کو بہت کم سمجھہ سکتے ہیں - زمین الٹ کر آسمان پر چلی گئی ہے اور چیونٹی کے منہ میں ہاتھی سما گیا ہے - پہاڑ بغیر ہوا کے اُڑ رہے ہیں - سارے جاندار اور درخت ڈوب گئے)

ہم نے کبیر کی شاعری کے تنقیدی اور تعمیری دونوں پہلوؤں کا ایک مختصر سا خاکا پیش کرنے کی کوشش کی ہے - ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اصلاحی ہے اور ان کے خیالات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ، عمومی تخیل کو اپیل کرنے والے اور خلوص پر مبنی ہیں - کبیر کے ہاں تصنع مطلق نہیں - ان کا کھرا پن بعض دفعہ رسمی شائستگی کی مقررہ حدود کی پروا نہیں کرتا - ' کبیر ' ' رامانند' کے بعد پہلے شخص ہیں ' جنھوں نے عوام کی زبان میں اپنی تعلیمات پیش کیں - عوام کی طرح سوچنے اور محسوس کرنے کی کوشش کی - ان کی بڑائی کو تلسی داس جیسے شخص نے " وانڈر پتر " میں تسلیم کیا ہے —

سروستو کبیر نے کیا سیش بچا سو سوردا لاہا

تلسی رام نام پد کاہا

(کبیر نے سب کچھہ کہہ دیا - جو باقی بچا وہ سور* لےگیا - تلسی کے لئے بس رام نام کے شعر گانا رہ گیا ہے) -

اس وقت کبیر کی طرف ۴۴ قلمی نسخے منسوب کئے جاتے ہیں- ان میں سے بعض چھپ چکے ہیں - ایک نسخہ " گرنتھہ محمد بودہ " کے نام سے موسوم ہے- اس کے بعض حصے پرمانند کبیر پنتھی نے اپنی کتاب" کبیر منشور" میں شایع کئے ہیں- یہ محمد صاحب اور کبیر کا ایک مکالمہ ہے- نہ معلوم یہ خیالی مکالمہ خود کبیر کی زبان میں ہے یا ان کے چیلوں میں سے کسی کی تصنیف ہے - زبان اور انداز کو دیکھتے ہوے یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کی تصنیف ہے - نمونے کے طور پر ہم ذیل میں کچھہ حصے نقل کرتے ہیں :

محمد بچن:

پیر محمد سخن جو کھولا — الله هم سے پر دے بولا
هم ابدی الله فرمانا — وطن لاهوت مورا ستها نا
ان بھیجے روح بارہ هزار — امت کے هم هیں سردار
تم بو جھو سو کون هو بھائی! — اپنو اسم کهو سمجھا ئي

کبیر بچن:

کهو بھا ئی کہا فرماے — کہاں تے آے کہاں کو جاے
هے حیران نظر نہ آے — کیا نصیحت الله فرماے
کہرا † چھوڑو مہر دل آے — تب تم سا چے پیر کہاے

---

* سورداس (۱۴۸۵ و ۱۵۶۳) کی اکبر کے دربار میں آمد و رفت تھی- اس نے کرشن جی کی مدح میں گیتوں کا بڑا انبار چھوڑا ہے- اس کے علاوہ اس کے بھجن آج تک شمالی ہند میں گاے جاتے ہیں- عبدالرحیم خانخاناں اس کے قدر دانوں میں ہوا ہے' اس نے سورداس کے ۶۵ ہزار اشعار کا مجموعہ اپنے حین حیات جمع کر لیا تھا —

† قہر -

محمد بچن:

پیر محمد بو لے بانی — اگم بھید کہو نہ جانی
جونا نہ دیکھو اپنے نینا — کیسے مانوں کور کو بینا
جون راہ تے تم چل آؤ — تون راہ مو کو بتلاؤ

کبیر بچن:

سنو محمد کہواں بجھائی — صاحب تمکو دیئوں بتائی
تم اپنو پھر ماں چلائی — کھدکو بھید تم دھروچھپائی
چارو کلمہ پرگھٹ بھاکھو — پنچواں کلمہ گپت جوراکھو
پنچواں کلمہ علم فکیری — جاکے پڑھے کفر ہو دوری
ہم کاشی کو جات ہیں بھائی — تم لوں اپنو کول بجائی
تم پر دیا سمر تھی کیری — پنچواں کلمہ دل میں پھیری

اور آخر میں:

چلے سیر کو دونوں پیرا — ایک محمد ایک کبیرا

اس مکالمے کا مصنف کوئی سہی، لیکن اسکی تہ میں جو رواداری کا ایک مخصوص ذہنی رویہ کار فرما ہے، وہ کبیر داس کی تعلیمات کی اصل روح کی ترجمانی کرتا ہے —

حافظ کی شاعری کی ابتدا

از

(جناب بشیر احمد قادر صاحب بی۔ اے، لاہور)

حافظ نے جب ہوش سنبھالا تو اُس وقت شیخ ابو اسحاق (۷۴۲ ھ - سنہ ۷۵۴ ھ) شیراز میں پوری طرح امن سے حکمرانی کر رہا تھا - ابو اسحق کی عیش پرستی مشہور تھی، چنانچہ خود خواجہ صاحب کہتے ہیں :

نخست باد شہے همچو او ولایت بخش
که جان خویش بپرورد و داد عیش بداد

اس کے دربار میں عبید زاکانی (المتوفی سنہ ۷۷۱ ھ) اور خواجو کرمانی (المتوفی ۷۵۳) دو شاعر موجود تھے - پھر ابھی نصف صدی ہی گزری تھی کہ شیخ سعدی کے اخلاقی اشعار اور مجازی غزلوں نے شیراز کیا بلکہ تمام ایران کو ہلادیا تھا - حافظ وہیں پیدا ہوے اور وہیں پرورش پائی —

دوسری طرف بغداد میں سلمان ساوجی (المتوفی سنہ ۷۶۹ ھ یا ۷۷۸ ھ) غزلیات اور قصیدے میں اپنا کمال دکھا رہے تھے اور ابن یمین اصفہان میں —

جب حافظ بڑے ہوے تو انہی شاعروں کی گونج اس کے کان میں پڑی - عبیدزاکانی محض لغو گو تھا - شیخ سعدی کا رنگ مقبول ہوچکا تھا - سلمان صرف قصیدے کے مرد میدان تھے اور ابن یمین نے تو صرف شیخ سعدی کے میدان اخلاقیات کو لے کر ترقی دی - اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی غزلوں میں زور دکھاتے ہیں، لیکن فہ

اتنا کہ حافظ کے لئے قابل تقلید بن سکتا - اب رہا خواجو کرمانی - خواجہ صاحب نے ان کا تتبع کیا؟ چنانچہ جب شاعری شروع کی تو کہتے ہیں :

استاد غزل 'سعدی' ست پیش ہمہ کس اما

دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

اس شعر میں نہ صرف انھوں نے خواجو کی پیروی کو مانا ہے ' بلکہ یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ ان کے نزدیک اگر اور کوئی شخص قابل تقلید ہے تو وہ صرف شیخ سعدی ہیں' جس سے واقعی انھوں نے اچھی طرح استفادہ کیا —

حافظ نے شاعری کس حالت میں' کیوں اور کب شروع کی ؟ ہمیں اس کے متعلق کچھہ زیادہ معلوم نہیں - شاعری' انسان یا تو طبیعت کی اپج سے کرتا ہے یا کسی طمع سے - خواجہ صاحب فطرتی شاعر بھی تھے اور اس کے ساتھہ ہی ساتھہ ممکن ہے کہ دولت اور شہرت کی طمع بھی ہو - ابو اسحق ایک سخی دل آدمی تھا - سنہ ۷۵۳ ھ میں اس کے بیٹے کا ختنہ ہوتا ہے - خواجو کو جو ایک تہنیت نامہ لکھہ کر لایا تھا' ایک اشرفیوں سے بھرا ہوا طبق صلے میں دیا' پھر کیا تھا' خواجہ صاحب کے لئے دونوں عنصر موجود تھے اور ترقی کرنے کا بڑا میدان تھا - چنانچہ حافظ کی شاعری لوگوں کے نزدیک ایک خدائی عطیہ تھا' جسے کوئی آدمی اکتساب نہیں کرسکتا - اور ان کی شاعری کی ابتدا کے متعلق بہت سے مختلف النوع قصے مشہور ہو گئے' جن کا تبصرہ کرنا' اس مضمون کا مقصد ہے —

(۱) پہلا بیان شیخ سعدی' حافظ کے چچا کے متعلق ہے —

کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے چچا سعدی کے ساتھہ ایک کمرے میں بیٹھے تھے - سعدی' کچھہ شعر اخلاق صوفیہ میں لکھنا چاہتے تھے' لیکن ابھی تک صرف ایک ہی مصرع لکھا تھا کہ کسی خاص ضرورت کی وجہ سے اُنھیں باہر جانا پڑا - حافظ کے دل میں ولولہ اٹھا - اس نے آگے بڑہ کر مصرع پڑھا اور اپنی طرف سے ایک اور مصرع لگا کر اس شعر کو پورا کردیا اور چلا گیا —

جب سعدی واپس آئے تو دیکھا کہ شعر پورا ہوچکا ہے، لیکن حافظ موجود نہیں۔ اس نے اُسے بلایا اور شعر کی تصنیف کے متعلق استفسار کیا۔ حافظ نے اقرار کرلیا کہ وہ شعر اسی نے لکھا ہے۔ اس پر سعدی نے کہا: "اچھا اب تم ہی اس غزل کو پورا کردو" اور اسے اپنا حریف سمجھ کر بد دعا دی کہ "خدا کرے تمہارا کلام پڑھنے والے مخبوط الحواس ہوجائیں —

(ب) دوسرا بیان مؤلف میخانہ کا ہے۔ مصنف کہتا ہے:

کہتے ہیں کہ جب وہ مکتب میں پڑھتے تھے تو وہاں نزدیک ہی کسی بزاز کی دکان تھی، وہ بزاز خود صاحب مذاق تھا، اس لئے ہر روز اس کی دکان پر شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ حافظ کو بھی ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنے کا شوق ہوا، لیکن چونکہ اس فن میں مہارت نہیں رکھتے تھے اس لئے تک بندی شروع کی۔ لوگوں نے انھیں سخنورا سمجھ کر ستانا شروع کیا اور ہر طرف ان کی لغو گوئی مشہور ہوگئی۔ تقریباً دو سال تک وہ اسی تک بندی میں مشغول رہے، لیکن جب لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ایک دن، ماہ رمضان المبارک میں انھیں اپنے کام سے بہت پشیمانی ہوئی اور اس کام سے توبہ کرنی چاہی، چنانچہ وہ بابا کوہی* کے مزار پر جاکر خوب روئے۔ کئی دن تک وہاں زاری کرتے رہے۔ آخر کار تیئیسویں رات انہوں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں: "حافظ! اتنہ کہ اب تیری مراد پوری ہوجائے گی" اور ایک سفید لقمہ اپنے منہ سے نکال کر حافظ کے منہ میں ڈال رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "اس لقمے کو نگل جاؤ کہ تمام علوم کے دروازے تم پر کھل گئے ہیں۔ تم فصاحت و بلاغت میں تمام عالم میں لاثانی ہوگے اور تمہارے کلام کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے" —

---

* بابا کوہی: شیخ علی بابا متخلص بہ کوہی، شیخ ابو عبداللہ محمد خفیف شیرازی (الملقب بہ شیخ کبیر المتوفی سنہ ۳۷۱ ھ) کے مرید تھے۔ سنہ ۴۴۲ ھ میں فوت ہوئے۔ شیراز میں مدفن ہے۔ ان کا دیوان برٹش میوزیم میں ہے۔ (حواشی میخانہ)

کہا جاتا ہے کہ حافظ کہتے تھے کہ وہ لقمہ جو اس بزرگ نے دیا ' بے انتہا لذیذ تھا - حافظ نے بڑھ کر ان کا نام و نشان پوچھا' معلوم ہوا کہ وہ امیرعلیہ السلام ہیں - صبح اٹھے تو حافظ کا قلب ان کے دیدار پر انوار سے متجلی تھا - دل میں جوش پیدا ہوا اور یہ غزل تصنیف کی :

دوش وقت سحر از غصہ نجا تم داد ند — وند راں ظلمت شب آب حیا تم داد ند
بے خود از شعشعۂ پرتو ذا تم کرد ند — بادہ از جام تجلیء صفا تم داد ند
چہ مبارک سحرے بودو چہ فرخندہ شبے — آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم داد ند
من اگر کام روا گشتم و خوشدل چہ عجب — مستحق بودم و ایں ہابہ زکاتم داد ند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد — کہ بداں جورو جفا صبر و ثباتم داد ند
ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد — اجر صبرے ست کز ان شاخ نباتم داد ند
ہمت حافظ و انفاس سحر خیز ان بود — کہ ز بند غم ایام نجا تم داد ند *

جب شہر میں آئے تو لوگوں نے معمول کے مطابق ان سے شعر مانگے - انھوں نے یہ غزل سنائی - لوگوں کو یقین نہ آیا اور کہا کہ اس زمانے میں ہمارے خیال میں کوئی شخص بھی ایسی اچھی غزل نہیں لکھ سکتا ' ہم کیسے مان لیں کہ یہ تمھاری ہے- حافظ نے کہا کہ بہت بہتر کوئی اور طرح دو ' لوگوں نے ایک طرح دی ' حافظ نے ایسی ہی نفیس غزل پھر لکھ دی - بس اب کیا تھا ' تمام شہر میں مشہور ہو گئے †

اب میں ان دونوں قصوں کا 'جو ' حافظ ' کی شاعری کی ابتدا کے متعلق مشہور ہیں ' فرداً فرداً ذکر کرتا ہوں :

---

* دیکھو دیوان حافظ قاسمی پریس صفحہ ۱۴۶ - تقریباً یہی قصہ اور یہی ہم شاخ نبات کے قصے میں بھی درج کر آئے ہیں' صرف یہ فرق ہے کہ مکتب' ' بزاز ' تک بلدی اور پشمانی کے بجائے وہاں شاخ نبات کا عشق تھا - دیکھو رسالۂ اردو بابت جنوری سنہ ۱۹۲۹ ع -

† دیکھو میخانہ ' ترجمۂ حافظ صفحہ ۸۱ - ۸۲ -

(۱) جہاں تک مجھے تحقیق ہوا ہے ' یہ کہانی سب سے پہلے کسی شخص نے ' کلکتہ ریویو ' کی چھبیسویں جلد (سنہ ۱۸۵۶ ع) میں لکھی تھی - اس کے بعد ' مولانا حالی مرحوم ' نے حیات سعدی میں لکھی - پھر ' حیات حافظ ' میں حافظ ' اسلم نے درج کی اور آجکل عوام میں مشہور ہے - لیکن اس کہانی کی ابتدا شاید کسی ترکی شرح یا تاریخ سے ہوتی ہے' کیونکہ فارسی تواریخ اور تذکروں میں کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا —

جس شخص نے رسالۂ مذکور میں یہ کہانی لکھی ہے ' کہانی ختم کرنے کے بعد کہتا ہے :

> " ہم اس کہانی کی سچائی کے متعلق کوئی تائیدی بیان نہیں پیش کر سکتے - البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ' حافظ ' کے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا ہی مصرع عربی میں ہے ' جو اس نے ' شیخ سعدی ' کی تقلید میں لکھا ہے - ' حافظ ' کے شارح اور خاص کر ' قسطنطنیہ ' کے شیعہ اس کہانی کو سچ مانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ سعدی کی بددعا قبول ہوگئی ہے اور کہتے ہیں کہ ' جو کوئی شخص ' حافظ ' کے اشعار پڑھتا ہے ' مخبوط الحواس ہو جاتا ہے ' دوسری طرف ہم کہنے کو تیار ہیں کہ ' سعدی کی دعا بالکل بے اثر رہی ' اگرچہ اس کہانی کی سچائی میں بھی ہمیں بہت شک ہے " * -

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قصہ محض من گھڑت ہے - خود لکھنے والا بھی اس کہانی کی صداقت کا قائل نہیں - مولانا حالی مرحوم نے بھی اس کہانی کو غلط ٹھیرایا ہے -

---

* دیکھو رسالۂ مذکور صفحہ ۴۰۲ - ۴۰۵ —

لیکن ' حافظ اسلم ' اس کہانی کو سچ بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں :

خواجہ کے ایک چچا بھی تھے' جن کا نام سعدی تھا (یہ شیخ سعدی ' گلستان و بوستان کے مصنف نہیں ہیں) وہ ایک صوفی منش شاعر اور بڑے باکمال تھے * -

یعنی ان کے نزدیک یہ سعدی اور ' شیخ سعدی ' دو مختلف ہستیاں ہیں - لیکن اس کہانی سے کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سعدی ' شیخ سعدی نہیں ہیں - مصنف اسے بھی " مصلح قوم " اور " اخلاقی استاد " وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے جو فارسی شاعری میں سوائے شیخ سعدی کے کسی کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے —

(ب) دوسری کہانی عام اعتقاد کے رو سے مان لیں تو مان لیں' لیکن تاریخ اسے کسی طرح بھی قبول نہیں کرسکتی - امیر علیہ السلام کا خواب میں آنا ' ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کہانی کسی شیعہ صاحب کی تصنیف ہے - اس کے علاوہ جو الفاظ حضرت علی کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں' مثلاً:

(۱) ایں محرم سر اسرار سرور و ساقی شراب طہور است - ایں آں کسے کہ حضرت رسالت در شان او فرمودہ کہ " انا مدینۃالعلم و علی با بہا "

(۲) امیر مردان ' امیرالمؤمنین و قاتل الکفرۃ والمشرکین " وغیرہ ' وغیرہ —

ممکن ہے کہ خواجہ صاحب کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے یہ کہانی گھڑ دی گئی ہو - اہل سنت کے نزدیک اگر کوئی شخص شراب طہور کا ساقی ہے تو وہ ' پیغمبر خدا صلعم ہیں نہ کہ حضرت علی *

---

* حیات حافظ صفحہ ۷ و صفحہ ۱۱ - ۱۲ بار سوم —

* فیضی ' اکبر کی ایک عرضداشت میں لکھتا ہے کہ چند احباب ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے - ان میں سے ایک نے کہا کہ کل اسی طرح حوض کوثر کے چاروں طرف خلفائے اربعہ بیٹھے ہوں گے اور مؤمنین کو آب کوثر پلاتے ہوں گے - اس مجلس میں ایک شیعہ جس کا نام مسعود صباغ تھا ' بیٹھا تھا - کہنے لگا کہ کیا یہ کوئی کرتے ہو - حوض کوثر مذور ہے اور اس کے ساقی مرتضیٰ علی " لسان الغیب " -

اس کے علاوہ یہ " بے نظیر صوفیانہ غزل جیسا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے خواجہ نے اس موقع پر لکھی ہے جب کہ ان کو شرح صدر حاصل ہوا ہے اور ان کا سینہ عرفان کے اسرار سے لبریز کردیا گیا ہے " ۔ اس لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ایسی غزل لکھنا مافوق فطرت ہے —

اس کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ' حافظ ' ابھی مکتب ہی میں پڑھتے تھے کہ تک بندی شروع کی - دو سال تک اسی میں مشغول رہے - بعد میں توبہ کی اور توبہ کرتے ہی سب سے پہلے یہ غزل لکھی - گویا کہ ' حافظ ' نے یہ کمال بغیر تحصیل علم کے حاصل کیا تھا —

لیکن دیوان میں ہزاروں جگہ خود ' خواجہ حافظ ' نے اپنے علم و فضل کی طرف اشارہ کیا ہے - چنانچہ کئی شعر پیش کئے جاسکتے ہیں :

علم و فضلے کہ بہ چل سال دلم جمع آورد ترسم آں نرگس مستانہ بہ یک جا ببرد

یعنی انھوں نے اپنی عمر کے چالیس برس اسی علم و فضل کی تحصیل میں گزارے —

دیگر : شرم می آیدم از خرقۂ آلودۂ خویش کہ بدیں فضل و ہنر نام کرامات بریم

یہ بات تو اب مسلم ہوچکی ہے کہ ' حافظ ' نہ صرف تخلص ہی میں ' حافظ ' تھے بلکہ قرآن مجید کے بھی حافظ تھے ' چنانچہ کئی جگہ دعویٰ کرتے ہیں :

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

اے چنگ فرو بردہ بہ خون دل ' حافظ ' فکرت مگر از عزت قرآن خدانیست

ایک جگہ فرماتے ہیں :

عشقت رسد بفریاد گر خود بسان ' حافظ ' قرآں زبر بخوانی با چاردہ روایت

اس جگہ انھوں نے اپنے علم و فضل کا بین ثبوت دیا ہے —

قرآن شریف پڑھنے کی سات مشہور قراتیں ہیں - خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد بعض آدمی قرآن مجید کے پڑھنے میں غلطیاں کرنے لگے - اکابر زمانہ

ئے یہ اتفاق کیا کہ جس شہر میں مصحف امیرالمومنین حضرت عثمان(رض) ہو ' اس جگہ کے ماہر ان قرآن اس مصحف کے رو سے تعلیم دیں - چنانچہ سات امام مختلف جگہوں میں مقرر ہوے - ان میں سے ہر ایک اس تہجی کے مطابق جو ان تک رسول کریم سے استادوں کے واسطے سے پہنچی تھی ' تعلیم دیتے تھے - ان سات اماموں میں سے ہر ایک کے دو راوی تھے - گویا کل چودہ راوی اور چودہ روایتیں ہوئیں - چنانچہ حافظ ان سب سے واقفیت ظاہر کرتے ہیں - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ' حافظ ' کی تعلیم کیسی ہوگی' ایک جگہ کہتے ہیں :

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد
لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ منقول کے علاوہ وہ معقول میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے - ان سب چیزوں کے علاوہ گلندام کے دیباچے کی عبارت ہمارے لئے کافی اور آخری شہادت ہے - کہتا ہے:

"محافظت درس قرآن و تحشیۂ کشاف* و مصباح و مطالعۂ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تجسیس دواوین عرب از جمع ابیات و غزلیاتش مانع آمدے"

اس فقرے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرآن مجید کا درس دیتے تھے ' کشاف اور مصباح پر حاشیہ لکھا تھا ' مطالع اور مفتاح ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتے تھے' عربی کے دیوانوں کی تلاش میں مصروف رہتے تھے - چنانچہ وہ تمام عربی شعر جو ان کے دیوان

* کشاف ' علامہ زمخشری کی مشہور تفسیر قرآن مجید اصلی نام محمود بن عمر تھا موضع زمخشر واقع خوارزم کے رہنے والے تھے اپنی عمر کا بڑا حصہ مکہ معظمہ میں صرف کیا اسی وجہ سے ان کا لقب جاراللہ ہوا سنہ ۴۶۷ ھ میں پیدا ہوے اور سنہ ۵۳۷ ھ میں انتقال کیا یہ فرقہ معتزلہ کے جید عالم تھے

مطالع قاضی ناصرالدین ابوالخیر عبداللہ ابن عمر لقب بیضوی کی تصانیف ہے وطن بیضا واقع شیراز کے مدت دراز تک قاضی رہے سنہ ۶۸۵ ھ یا سنہ ۶۹۱ ھ میں وفات پائی

مفتاح یعنی مفتاح العلوم ابویعقوب یوسف بن ابو بکر المقلب بہ سکاکی کی تصانیف ہے اسکو سراج الدین خوارزمی بھی کہتے ہیں سنہ ۵۵۵ھ میں پیدا ہوے اور سنہ ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔
(از قاموس المشاہیر جلد اول) -

میں ملتے ھیں، اس بات کو ثابت کرتے ھیں -

اس کے علاوہ خود غزل کا مضمون اور اسکی زبان بتاے دیتی ھے کہ یہ غزل ابتدائی نہیں ھوسکتی- البتہ دیوان میں چند ایسی غزلیں ملتی ھیں، جن میں وہ چاشنی اور نمکینی، ترکیبوں کی بندش اور چستی، حتی کہ صوفیانہ رنگ، جن کی وجہ سے حافظ آجکل مشہور ھیں، بالکل غائب ھے- میں ان کو حافظ کی ابتدائی غزلوں میں سے شمار کرتاھوں، ان میں سے ایک یہ ملاحظہ فرمائیے :

اے در چمن خوبی رویت چو گل خود رو — چین شکن زلفت چوں نافۂ چین خوشبو
ماہ است رخت یا روز، مشکست خطت یا شب — سیم است برت یا عاج، سنگ ست دلت یارو
لعلت بہ در دنداں بشکست لب تشنہ — زلفت بہ خم چوگاں بہ ربود دلم چوں گو
آں رائحۂ زلف ست، یا لخلخۂ عنبر — یا غالیہ می سایہ دربا غچۂ حسن او
گفتی سخن خود را با یار بباید گفت — اے کاش توانستم گفتن سخنے با او
بد گوے تو آں باشد کز یار کند منعت — گر یار نکو باشد مشنو سخن بدگو
باسایہ ازیں می باش تا راز نگردد فاش — نیکو د بد اگر باشی بادلشدگاں نیکو
استاد غزل سعدی ست پیش ھمہ کس اما — دارد سخن حافظ طرز روش خواجو •

اسمیں انھوں نے دعوی کیا ھے کہ وہ خواجو کی پیروی کرتے ھیں- تمام دیوان دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ آخر عمر تک انھوں نے خواجو کی پیروی کی، حتی کہ سنہ ۷۹۰ھ کے لگ بھگ جب انھوں نے ساقی نامہ لکھا تو وہ بھی خواجو ھی کی پیروی میں تھا†-

مگر خواجو کے علاوہ خواجہ حافظ نے سعدی اور دیگر شاعروں کی غزلوں کے جواب بھی لکھے ھیں اور ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں باندھا ھے سب سے زیادہ عمدہ مقابلہ مولانا شبلی مرحوم نے شعرالعجم میں کیا ھے اسکے علاوہ حیات حافظ میں کچھہ مقابلہ درج ھے، امید ھے کہ کسی دوسرے مضمون میں ان پر روشنی ڈالی جائیگی-

---

• دیوان حافظ کانپور (پاکٹ ایڈیشن) صفحہ ۳۵۰ -

† دیکھو دیباچہ سودھاکر صاحب لیکن پہلا قاعدہ ساقی نامہ بظاھر خواجو کرمانی نے مثنوی ھماے ھمایوں میں لکھا -

حافظ اور ابن یمین

تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا کہ رسالۂ نگار کے مئی سنہ ۱۹۲۷ ع کے نمبر میں کسی شخص آرگس نے حافظ اور ابن یمین کے تعلقات پر ایک مضمون لکھا تھا، جس سے حافظ کے حالات میں ایک نیا باب کھل گیا ہے - اگرچہ صاحب مضمون نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے بہت کوشش کی ہے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکے - اب میں چند خیالات اس مضمون کے متعلق لکھتا ہوں —

پہلا اعتراض جو مسٹر آرگس حافظ کی شاعری پر کرتے ہیں، وہ یہ ہے :

" حافظ کی شاعری کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے- اگر ایک وقت وہ ایک صوفی با صفا ہیں تو دوسرے وقت ایک رندِ لا اُبالی... کسی جگہ نکات تصوف بیان ہو رہے ہیں، کہیں فلسفیانہ معمے حل کئے جا تے ہیں اور کہیں نہ تصوف ہے نہ حکمت، نہ شریعت ہے نہ طریقت - ایک اہمال ہے نا قابل تاویل، ایک بے راہ روی ہے منزل سے کوسوں دور "- صفحہ ۶۱

اس بیان کی تائید میں انھوں نے ایک قصہ درج کیا ہے جو 'حبیب السیر' میں ملتا ہے - مشہور ہے کہ عماد فقیہ (شاعر) اور 'شاہ شجاع' (بادشاہ - سنہ ۷۶۰ ھ سنہ ۷۸۶ ھ) کے تعلقات بہت خوشگوار تھے - لیکن حافظ، فقیہ کے زہد کی وجہ سے ان سے مخالفت رکھتے تھے - اس لئے عموماً 'شاہ شجاع' حافظ کے شعروں پر اعتراض کیا کرتے تھے - ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ تم ایک غزل کے ایک شعر میں کچھ اور ہو دوسرے میں کچھ اور علیٰ ھذا القیاس * —

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے فارسی شاعری کی حقیقت کو ابھی

---

* دیکھو حبیب السیر - قصہ کے لئے دیکھو حیات حافظ صفحہ ۲۳ - ۲۵

تک نہیں سمجھا - شروع سے لے کر آج تک جتنے فارسی شاعر گزرے ہیں ' تقریباً سب نے غزل لکھی ہے - سنائی' ' عطار ' ' سعدی' غزل لکھنے میں ماہر ہیں' ' عرفی فلسفیانہ خیالات کا استاد ہے ' ' نظیری ' اور دیگر شعرا عشق مجازی کی وارداتیں لکھتے ہیں- لیکن ان میں سے ہر ایک کا دیوان لےکر ہر ایک غزل کو غور سے دیکھیے سوائے چند کے سب غزلوں میں مختلف خیالات پائے جائینگے - ' مولانا شبلی فرماتے ہیں :

" غزل کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ عشق و محبت کے کسی معاملے یا واردات کا مسلسل بیان نہیں ہوتا - ہر ایک شعر الگ ہوتا ہے اور اس میں کوئی مفرد خیال یا واقعہ ادا کر دیا جاتا ہے " —

اب یہ کہنا کہ حافظ نے ایک ہی غزل میں مختلف خیالات ادا کئے ہیں' جو ان کی شاعری کی بے مایگی کا ثبوت ہے تو یہ بات تاریخ کی روشنی میں بالکل بے سروپا ہے -

اس سے بڑھکر اعتراض جو مسٹر آرکس نے حافظ کی شاعری پر وارد کیا ہے وہ ان کا رندانہ اور مجازی رنگ ہے - کہتے ہیں :

" وہ شخص جس نے سب سے پہلے کیفیات حقیقی کو جذبات غیر حقیقی سے جدا کیا اور حقیقت و اسرار کو غیر معصوم جذبات کی آمیزش سے بچایا' وہ ابن یمین ہے ..... ابن یمین کا یہ رنگ بھی ہے کہ کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھکر میخانے کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر وہ یہاں بھی صوفی قائم رہتے ہیں - نہ کبھی رندلاأبالی کی طرح کسی کی پگڑی اچھالتے ہیں نہ ان کا خرقۂ و سجادہ کبھی رہن سے ہوتا ہے اور نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان کردیتے ہیں " - صفحہ ۶۴

---

† شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۷۴

یعنی مجازی رنگ جو حکیم سنائی (المتوفی سنہ ۵۴۵ھ) سے شروع ہوکر
" حافظ ' پر منتہاے کمال کو پہنچتا ہے ' مسٹر آرکس کے نزدیک کچھہ وقعت نہیں
رکھتا - اس مجازی رنگ کے بانی حکیم سنائی ہیں ' جن کا دیوان چھپ چکا ہے -
میں چند مثالیں درج کرتا ہوں :

ساقیامے دہ کہ مے عشق رابد نام نیست ویں دلم را طاقت اندیشۂ ایام نیست
پختۂ عشقم ' شراب خام خواہی زاں کجا ساز کار پختہ جانا جز شراب جام نیست

ساقیامے دہ کہ جز مے نشکند پرہیز را تا زمانے کم کنم ایں زہد رنگ آمیز را
زاہدان و مصلحان مرنزہت فردوس را دیں کردہ ' لاأبالی جان عشق انگیز را

در دل آں را کہ روشنائی نیست در خرابات آشنائی نیست
پسرا خیز و جام بادہ بیار کہ مرا برگ پارسائی نیست
جرعۂ مے بجان و دل بخرم پیش کس مے بدیں روائی نیست

" سنائی کے ہاں غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے - زہد خشک
کا خاتمہ ہوتا ہے اور رندی و مستی کی داغ بیل ڈال دی
جاتی ہے - صومعہ چھوڑ دیا جاتا ہے ' میخانہ آباد کیا جاتاہے-
زاہدی سےاعتزال ہوتا ہےاور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے"-

سنائی کے بعد عطار (المتوفی سنہ ۶۲۷ھ) آتے ہیں - ان کے دیوان کا ایک
قلمی نسخہ پروفیسر شیرانی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے - میں ذیل میں
نمونے کے طور پر چند شعر درج کرتا ہوں :

ما رہ ز قبلہ سوے خرابات می کنیم اندر قمار خانہ مناجات می کنیم
اے ساقی اہل درد ' دریں بزم حاضرند مے دہ کہ کار مے ز ملاقات می کنیم

دیکھو وحدت وجود کے مسئلے کو کس طرح بیان کرتے ہیں :

به هشیاری، مے از ساغر توانستم جدا کردن کنوں از غایت مستی، مے از ساغر نمی دانم
بدمسجد، بتکر از بت سازمی دانستم، اکنوں دریں خمخانۂ رنداں بت از بتگر نمی دانم

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بات جس کو مسٹر آرگس، ابن یمین کی صفت اعلیٰ قرار دے رہے ہیں، وہ ان کی شاعری کو نا قابل قبول بنا رہی ہے - ایک جگہ مولانا شبلی فرماتے ہیں * :

" غزل کی عام مقبولیت اور دلاویزی کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس میں مجاز کا پہلو غالب رکھا جاے اور اسی قسم کے حالات اور معاملات بیان کئے جائیں جو ہوس پیشہ عشاق کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں "۔

خواہ ہم مولانا شبلی کے اس بیان کی تصدیق کریں یا اس سے انکار کریں ہمیں ہر حالت میں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ شاعر جنھوں نے عشق حقیقی کو مجازی رنگ میں پیش کیا، قوم کے سامنے مقبول ہوے - چنانچہ عراقی، مغربی، جامی عطار، سنائی، سعدی وغیر ہم، جن کو اسی صفت نے قوم کے ناخواندہ لوگوں سے بھی واقف کرادیا - دوسری طرف انوری، ظہیر فاریابی، خاقانی، سلمان ساوجی، کمال اسمٰعیل کی غزلوں کو لو - عام آدمی جانتے تک نہیں کہ انھوں نے قصائد کے سوا کبھی غزلیں لکھی بھی تھیں یا نہیں - اسی زمرے میں ابن یمین داخل کئے جانے کے قابل ہیں - میں نے ان کی دو تین مثنویوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، جو ان کے قلمی دیوان میں درج ہیں، ان میں نہ کوئی دقیق خیال ہے اور نہ کوئی عمدہ بندش اور محاورات ہیں - یہی حالت ان کی غزلوں کی ہے - بہ استثنائے چند سب معمولی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ابن یمین صرف قطعات کی وجہ سے مشہور ہیں- اور غزلگو کی حیثیت سے اس سے کوئی واقف نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان غزلیات

---

* سوانح مولانا روم صفحہ ۳۳ طبع دہلی —

اس قدر گوشۂ عزلت میں ہے —

صاحب مضمون کے خیال کے مطابق ' حافظ کی غزلوں میں جو خامی پائی جاتی ہے - اسکے دو وجوہ ہیں :

(الف) ان کی تعلیم معمولی تھی - صرف ایک چھوٹے سے مکتب میں تعلیم پائی - غریب تھے اور عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے -

(ب) دوسری وجہ ان کی تک بندی تھی' جس کا سلسلہ دو سال تک قائم رہا —

(بہ حوالۂ میخانہ)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ' حافظ' ہی کا کمال تھا کہ اس نے غزل کے دائرے کو وسیع کردیا - ورنہ ابن ' یمین ' جیسوں نے بجائے ترقی کے اسے اس کے اصلی معیار سے بھی پست کردیا - مولانا ' شبلی ' فرماتے ہیں * :

" اس وقت (یعنی ساتویں صدی ہجری) تک غزل میں عشق و محبت اور محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا - ' خواجہ حافظ' نے اس دائرے کو وسیع کردیا - ہر قسم کے ' رندانہ ' ' سوقیانہ ' ' اخلاقی ' اور ' فلسفیانہ ' خیالات غزل میں ادا کئے - اور چونکہ زبان پر بے انتہا قدرت تھی ' اس لئے کسی قسم کے خیال کے ادا کرنے میں زبان کی لطافت اور رنگینی میں فرق نہ آیا - " یہ غزل گوئی کی معراج تھی' جس کے بعد غزل کو یہ رتبہ کبھی نہ حاصل ہوا اور نہ ہوسکتا تھا " —

اور یہ خیال کہ ان کی تعلیم معمولی تھی ' ہماری تحقیق کے بالکل خلاف

---

* دیکھو شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۷۲ - لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ ' حافظ ' سے پہلے بھی رندانہ اور مجازی رنگ غالب تھا مثلاً ہم نے اوپر ' سنائی ' اور ' عطار ' کی غزلوں کے جو نمونے پیش کئے ہیں' ان سے یہ بات صاف ظاہر ہے - البتہ زبان جتنی صاف ' حافظ ' کی ہے ' کسی فارسی شاعر کی نہیں —

ھے - میں نے اس سے پیشتر ثابت* کیا ھے کہ خود ان کا دعوی ھے کہ وہ علم و فضل میں کمال رکھتے ھیں - مثلاً :

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس کے علاوہ محمد گلندام کی شہادت کافی ھے - وہ کہتا ھے کہ حافظ کو عربی زبان میں کمال تامہ حاصل تھا اور دیگر علمی اور ادبی مصروفیات میں مشغول رھتے تھے —

ایک اور جگہ مسٹر آرگس' اس سلسلے میں فرماتے ھیں

" حافظ کی ابتدائی زندگی نہایت آزادی' سیر و سیاحت' رند مشربی میں گزری اور وہ مدتوں اِدھر اُدھر پھرا کئے " - صفحہ ۶۳

لیکن یہ دعوی بھی بالکل غلط ھے - حافظ نے اگر کوئی سفر کیا ھے تو بالکل معمولی - وہ شیخ سعدی(رح) کی طرح سیاح نہیں تھے اور نہ ان کا حوصلہ ایسے کاموں کے لئے وسیع تھا —

جہاں تک موجودہ معلومات مہیا ھوسکتی ھیں' ان کی رو سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ وہ ایک دفعہ یزد گئے تھے اور وھاں سے ناکام واپس آئے - مؤلف میخانہ لکھتا ھے† :

" آوردہ اند کہ آں سر غزل دیوان ارباب یقین از شیراز کم بر آمدہ اند' مگر ایں کہ یک نوبت ازانجا بہ یزد رفتہ و از یزد باز بہ شہر مذکور آمدہ آرام گرفتہ اند" —

یزد کا حکمراں شاہ نصرۃ الدین یحییٰ' تھا جس کی حافظ نے بہت جگہ تعریف کی ھے - لیکن حافظ کو کبھی شاہ یزد سے کچھہ حاصل نہ ھوا - چنانچہ ایک جگہ

---

* " دیکھو حافظ کی شاعری کی ابتدا —

† میخانہ صفحہ ۸۴

لکھتے ھیں

شاہ ھرموزم ندید و بے سخن صد اطف کرد　　شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ھیچم نداد

اس کے علاوہ تاریخ فرشتہ سے معلوم ھوتا ھےکہ ایک دفعہ حافظ نے شاہ دکن کے بلانے پر آمادگی ظاھر کی لیکن ابھی ھرمز تک ھی پہنچے تھے کہ دل اُچاٹ ھوگیا اور واپس آگئے اور ایک غزل لکھہ کر بھیج دی - یہ کہانی سچی ھو یا جھوٹی' لیکن جو غزل پیش کی جاتی ھے اس سے تو یہی معلوم ھوتا ھے کہ حافظ سفر دریائی سے بہت پرھیز کرتے تھے - چنانچہ فرماتے ھیں :

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمے بفروش دلق ماکزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں در و درج ست　　کلاہ دلکش ست اما بہ درد سر نمی ارزد

.....

بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوے سود　　غلط گفتم کہ ھر موجش بہ صد گوھر نمی ارزد

برو کنج قناعت جو' بکنج عافیت بینش　　کہ یکدم تنگدل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ دور دور سے پیغام آتے تھے لیکن جانے کی کبھی خواھش نہیں کی - ایک دفعہ والیء بغداد' سلطان احمد جلایر' کے بلانے پر لکھتے ھیں :

گرچہ دوریم' بیاد تو قدح می نوشیم　　بعد منزل نبود در سفر روحانی

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں شیراز سے بے حد محبت تھی' چنانچہ کہتے ھیں:

نمی دھند اجازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیم باغ مصلی و آب رکنا باد

اور غالباً اسی وجہ سے لکھا ھے کہ

من کز وطن سفر نگزیدم بہ عمر خویش　　در عشق دیدن تو ھوا خواہ غربتم

اب اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ھوسکتا ھے کہ انھوں نے اپنی عمر میں بہت ھی کم سفر کئے' البتہ ان کی رندانہ زندگی کے متعلق ایک قطعی فیصلہ پیش کرنا بہت مشکل ھے —

جہاں ہم ان کو رند کہہ سکتے ہیں وہاں وہ صوفی بھی کہلائے جا سکتے ہیں، اگر توفیق ہوئی تو آئندہ کبھی اس موضوع پر بحث کروں گا - آزادی کے متعلق مسٹر آرکس نے پھر دھوکا کھایا ہے - وہ 'حافظ' کو آزاد سمجھتے ہیں، حالانکہ تقریباً تمام تذکرے متفق ہیں کہ انھوں نے شادی کی اور اولاد پائی - اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تمام عمر تنگدستی میں گزاری اور کبھی فراغت نصیب نہ ہوئی - چنانچہ دیوان میں متعدد مثالیں اس بیان کی تائید میں مل سکتی ہیں - چند ان میں سے یہاں درج کرتا ہوں :

زمانہ گر بہ زند آتشم بہ خرمن عمر — بگو بسوز کہ بر من بہ برگ وکاہے نیست
حافظ ارسیم وزرت نیست ہر وشا کر باش — چہ بہ از دولت لطف سخن و طبع سلیم
من کہ دارم در گدائی گنج سلطانی بہ دست — کے طمع در گر دش گردون دوں پرورکنم
حافظ غبار فقر و قناعت زرخ مشوے — کایں خاک بہتر از عمل کیمیا گرے
گوہر معرفت اندوز کہ با خود بری — کہ نصیب دگر آفست نصاب زر وسیم

اس تنگدستی کی حالت میں وہ خود داری کے جذبے سے غالب آکر کہتے ہیں :

ما آبروے فقر و قناعت نمی بریم — با بادشاہ بگوے کہ روزی مقدر ست
حافظ آب رخ خود بر در ہر شعلہ مریز — حاجت آں بہ کہ بر قاضی حاجات بریم

حافظ کی رندانہ اور سیاحی زندگی پر مسٹر آرکس بہت زور دیتے ہیں کیونکہ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حافظ اسی سیر و سیاحت کی حالت میں خراسان پہنچے اور ابن یمین سے ملے - چنانچہ فرماتے ہیں:

"حافظ اپنی سیر و سیاحت کی حالت میں خراسان پہنچے اور ابن یمین کے ہاں فروکش ہوے - وہاں وہ مدتوں ایک محبوب مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے - اس کے بعد بحث طلب یہ امر رہ جاتا ہے کہ حافظ کی شاعری اُس وقت کس پایے کی تھی، مگر یہ سوال ایسا ہے، جو جواب بھی اپنے ساتھ لاتا ہے -

حافظ کا سنہ ولادت معلوم نہیں ہے، لیکن اتفاق اسی پر ہے کہ ان کی پیدائش سنہ ۷۲۱ ھ سے پہلے نہیں ہوئی۔ ابن یمین کا انتقال سنہ ۷۶۵ ھ میں ہوا - اس لئے ظاہر ہے کہ ابن یمین کے انتقال کے وقت حافظ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۴۴ سال کی رہی ہوگی ... اور حافظ کی شاعری کی عمر صرف تین چار برس کی" ص ۶۵

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی شہادت ایسی نہیں جس سے ہمیں معلوم ہو کہ حافظ خراسان گئے۔ صاحب مضمون نے تائید میں دیباچے کی مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی ہے :

" مدتے بہ حدود اقالیم خراسان و ترکستان و ہندستان رسیدہ"

لیکن یہ عبارت بالکل غلط نقل کی گئی ہے اور یقیناً عمداً ایسا کام کیا گیا ہے۔ ورنہ وہاں صاف یہ عبارت موجود ہے : " ... بنا بر ہیں غزلہائے جہانگیرش بہ اندکی مدتے بہ حدود اقالیم خراسان و ترکستان و ہندوستان رسیدہ"۔ اتنی صاف عبارت میں سے اپنے مطلب کا فقرہ نکالنا صرف مسٹر آرگس کا ہی کام تھا!

اس کے علاوہ حافظ اور ابن یمین کی ملاقات کے ثبوت کے لئے وہ ابن یمین کا مندرجۂ ذیل شعر دیوان ابن یمین سے پیش کرتے ہیں :

چہ غم از طعنۂ اغیار ترا ابن یمین که چو حافظ بجہاں یار و نگارے داری

یہ شعر واقعی دیوان ابن یمین میں ملتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ حافظ سے مراد حافظ شیرازی ہی ہو - رشید یاسمی مؤلف حالات ابن یمین * اپنی کتاب میں شک ظاہر کرتا ہے کہ یہ ضرور نہیں کہ یہ حافظ شیرازی ہی ہو۔ کیونکہ اگر دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے، جیسا کہ مسٹر آرگس کا دعویٰ ہے تو ضرور تھا کہ حافظ بھی

---

* ابن یمین کے حالات میں مکمل کتاب رشید یاسمی نے فارسی میں لکھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ حال ہی میں صوفی پریس سے شایع ہوا ہے۔ ۱۲

ابن یمین کا ذکر کرتے۔ اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اُسی زمانے میں حافظ نام کا ایک اور شخص بھی گذرا ہے - چنانچہ دیوان کمال خجندی (رح) میں کئی جگہ اس حافظ کا ذکر آتا ہے - جس کے متعلق مستر براؤن (جلد سوم - ترجمۂ کمال خجندی) کا خیال ہے کہ وہ ایک عراق کا گویا تھا - اس بیان کی تائید خود مندرجۂ ذیل کمال کے قطعات سے بھی ہوتی ہے * :

اے ' حافظ ' عندلیب آهنگ — آهنگ تو رفته هم به فرسنگ
که زهره بر آسمان زند عود — سهلست تو بر زمین پیش جنگ
(دیگر) ' حافظا نیک خوان و نیک نویس — هر که حق گوید ت شنو سخنش
چنگ را پیش بر کنار زدن — بسر خود که بر زمین بزنش
(دیگر) پیش چنگ دلخراشت صوفیان را حافظا — نعرها باید بوقت نقش بنمودن زدن
ارد شیر دیوانگر در مجلسے آرید جنگ — مردم مجلس فرا خواهند فرمودن زدن

ان حالات کی روشنی میں ہمیں کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا کہ حافظ اور ابن یمین کا گہرا کیا کوئی معمولی تعلق بھی ہو - اس کے بعد مستر آرگس کی فرضی حاشیہ آرائی کہ حافظ نے ابن یمین کے ہاں مہمان کی حالت میں کئی سال بسر کئے بالکل لغو معلوم ہونے لگتی ہے - یقیناً یہ تمام بیان محض مستر آرگس کے تخیل کا پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ اس کی کوئی اصلیت نہیں —

تاریخی حیثیت سے بھی ' حافظ ' کا خراسان جانا بالکل نا ممکن سا معلوم ہوتا ہے - ہمیں دیوان میں کہیں خراسان کا ذکر نہیں ملتا ' اس لئے علاوہ سنہ ۷۳۶ ھ (وفات سلطان ابو سعید) کے بعد خراسان میں ایک مدت تک بد امنی رہی اور اس کے کافی عرصے بعد سر بداروں کی حکومت رہی - سیاسی حیثیت سے

---

* دیوان کمال خجندی کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر شیرانی کے کتب خانے میں موجود ہے ۱۲ —

شیراز اور خراسان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ پھر نہ اینجو خاندان اور نہ مظفری خاندان کا سربداروں سے کوئی تعلق تھا۔ اس لئے حافظ کا خراسان جانا اور ابن یمین سے ملنا محال سا نظر آتا ہے —

لیکن جب ہم اصل تاریخ کی طرف دیکھتے ہیں تو سب معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ ہم اس سے پہلے کئی اور جگہ ثابت کر چکے ہیں کہ حافظ کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۲۶ ھ ہے۔ دوسری طرف ابن یمین کی وفات کا سن ۷۴۵ ھ نہیں بلکہ سنہ ۷۶۹ ھ ہے۔ سنہ ۷۴۵ ھ صرف دولتشاہ نے دیا ہے، جو بالکل ایک ضعیف راوی ہے۔ رشید یاسمی یوں رقمطراز ہے:

در کتاب منتظم ناصری تالیف مرحوم اعتمادالدولہ، در ضمن وقایع سال سنہ ۷۶۹ ھ این جملہ را دیدم: "وفات ابن یمین" صفحہ ۶

علاوہ اس کے جب دیوان قطعات کا مطالعہ غور سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی قصائد خواجہ علی مؤید کی تعریف میں ہیں یہ سربداروں کا آخری بادشاہ تھا، جس کی مدت سلطنت سنہ ۷۶۶ ھ سے لیکر سنہ ۷۸۰ ھ تک ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابن یمین کی وفات کم از کم سنہ ۷۶۶ ھ کے بعد واقع ہوئی ہو گی۔ مجمل فصیحی (تصنیف سنہ ۷۴۵ ھ) میں بھی زمانۂ وفات سنہ ۷۶۹ ھ درج ہے اور اس کی تائید میں یہ قطعہ لکھا ہے:

۷۶۹

برد از تاریخ ہجرت، ہفتصد با شصت ونہ،
روز شنبہ ہشتم ماہ جمادی الاخریں
گفت رضوان حور را بر خیز و استقبال کن
خیمہ بر صحرائے جنت بر زند، ابن یمیں،

چنانچہ جب ہم اس روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ، ابن یمین، کی وفات کے وقت، حافظ، کی عمر تہنتالیس سال کی ہوچکی تھی اور باوجود

تاریکی حالات کے اس قدر صاف ہے کہ 'حافظ' کی شاعری سنہ ۷۵۰ ھ سے کچھ عرصے پہلے شروع ہوجاتی ہے اور سنہ ۷۵۴ ھ سے پہلے کی کہی غزلیں دیوان میں موجود ہیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ 'ابن یمین' کی وفات کے وقت، 'حافظ کی شاعری کی عمر اُنیس سال کی تھی نہ کہ جیسا کہ مسٹر آرگس بیان کرتے ہیں صرف تین چار برس کی —

ایک جگہ مسٹر 'آرگس' فرماتے ہیں:

"ابن یمین کا دیوان تقریباً نایاب ہے اوراس کا کہیں پایا جانا اس قدر مستبعد سمجھا جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صاحب 'ید بیضا' ایک نسخہ اس کے دیوان کا دال کی ردیف تک دیکھنا بیان کرتے ہیں' لیکن مولانا 'شبلی' کو اعتبار نہیں آتا اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی غالباً قطعات کا دیوان ہوگا ..... الغرض سربداروں کے ہنگامے میں 'ابن یمین کی غزلیات کا دیوان گم ہوگیا ..... لیکن یہ ممکن نہیں کہ 'ابن یمین' کا دیوان کسی جگہ موجود ہی نہ ہو' چنانچہ اس کے دیوان کا نہایت قدیم نسخہ میری نگاہ سے گزرا ہے" صفحہ ۶۵ - ۶۶

یہ واقعی مشہور ہے کہ 'ابن یمین' کا دیوان غزلیات نایاب ہے - جس شخص نے 'ابن یمین' کے کلیات کو مرتب کیا ہے' وہ دیباچے میں لکھتا ہے کہ 'ابن یمین' کا دیوان گم ہوگیا لیکن بعد میں جو کچھ یہاں میں تھا' اسی سے مرتب کیا گیا ہے - چنانچہ موجودہ کلیات یہی مختصر کلیات ہے' جو محض یاد سے لکھا گیا - جو خیال صاحب مضمون نے مولانا 'شبلی' کی طرف منسوب کیا ہے' وہ واقعی 'شعرالعجم' (جلد سوم) میں موجود ہے' لیکن مولانا کو دیوان 'ابن یمین' کا دیوان گم ہوگیا تھا' لیکن اس کے نسخے بعد میں لکھے گئے تھے چنانچہ پنجاب "یونیورسٹی

لائبریری(لاہور) میں ابن یمین کے کلیات غزل ومثنوی کے تین عمدہ نسخے موجود ہیں۔
میں نے ان تینوں نسخوں کا بغور مطالعہ کیا ہے —

(۱) نسخہ نمبر اول : — سب سے پہلے مناجات ہے :

اے خدا وند قادر ایکتا مبدء کون و خالق اشیا

پھر نعت شروع ہوتی ہے :

صل علی محمد شاہ سریر اصطفی صل علی محمد ماہ منیرا ہتدا

اِن کے بعد غزلیات کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلی غزل کا یہ مطلع ہے :

چوں جا نیافت در حرام وصل، جان ما بارے بہ یاد دوست برآید زبان ما

آخیر میں ایک ترجیع بند ہے :

چو نور ذات در تابد ز ذرات
دو عالم محو گردد در یکے ذات (۹ بند)

ایک مخمس ہے جس کا پہلا بند یہ ہے :

تاچند عمر خویش بہ خوباں بسر کنیم من بعد بار عشق مجازی حضر کنیم
در سینہ ہر چہ ہست ز غیر بدر کنیم اے دل بیاز دنیا و عقبیٰ گزر کنیم
با یار دوست از ہمہ قطع نظر کنیم

ایک مستزاد ہے :

با جمع بتاں صحبت سنگیں چہ خوش آید در گلشن زیبا
در کاسۂ زربادۂ رنگین چہ خوش آید ہمچو گل رعنا

اس کے بعد چند رباعیات اور قطعات ہیں، جن کے بعد ایک لمبی مثنوی شروع ہوتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :

پیش ازاں دم کہ بود کون و مکاں بود آں گنج گرانمایہ نہاں

اس مثنوی کا نام مجلس افروز ہے :

نسخۂ جاں فریب، دلسوزست نام ایں نسخہ مجلس افروزست،

آخر میں بالکل مکمل ہے - تاریخ سنہ ۱۰۷۹ ھ درج ہے (لائبریری نمبر A B $\frac{VI}{22}$ 33) -

(۲) دوسرا نسخہ بالکل اسی طرح ہے - لیکن آخر سے خستہ اور چند ورق غائب ہیں - نسخہ پرانا ہے (لائبریری نمبر A B 1 $\frac{VI}{227}$ 33 A) -

(۳) تیسرا نسخہ شروع میں بالکل پہلے دونوں کی طرح ہے - لیکن آخر سے مکمل نہیں - غزلیات بھی کئی غائب ہیں - نہ کوئی مثنوی ہے اور نہ دیگر چیزیں - نسخہ پرانا نہیں (لائبریری نمبر P I $\frac{VI}{833}$ 151) -

اس کے علاوہ بانکی پور لائبریری میں بھی ابن یمین کے دو نسخے موجود ہیں - پہلے نسخے میں تمام قطعات و غزلیات و مثنوی وغیرہ موجود ہیں - دوسرا نسخہ صرف غزلیات و مثنوی کا ہے *

چنانچہ اب صاف ظاہر ہے کہ ابن یمین کا دیوان غزلیات نایاب نہیں ہے - اور اگر انھوں نے دیوان ابن یمین کا ایک نسخہ حاصل کر لیا ہے تو کوئی تعجب خیز امر نہیں-

ان سب باتوں سے مسٹر آرکس یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

> " ابن یمین کا دیوان ان کی وفات سے چند سال پیشتر گم ہوا اور یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ ابن یمین کے یار و نگار بنے ہوے، ہر وقت اُن کے ساتھ رہا کرتے تھے - پھر اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ممکن ہے یہ گمشدہ کلام حافظ کے ہاتھ لگا ہو اور اس میں ردوبدل کر کے حافظ نے ' اپنا لیا ' ہو (علی الخصوص اس وقت جب کہ ان کی غزل گوئی کا شہرہ ہی اس واقعے کے بعد ہوا ہو) تو یہ ماننا ہی پڑیگا

---

* دیکھو فہرست کتاب خانہ مرتبۂ عبدالمتقدر خاں جلد اول صفحات ۲۰۶-۲۰۸ - نمبر ۱۳۷ - ۱۳۸

کہ حافظ کا صوفیانہ رنگ یکسر ابن یمین سے ماخوذ ہے
اور ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی
کی گئی ہے'' ۔ صفحہ ۶۶۰

ہم اس سے پیشتر ثابت کر چکے ہیں کہ ابن یمین کا سال وفات سنہ ۷۶۵ ھ نہیں جیسا کہ صاحب مضمون کا خیال ہے' بلکہ وہ سنہ ۷۶۹ ھ میں فوت ہوتا ہے - دوسری طرف حافظ کی شاعری سنہ ۷۵۴ ھ سے پانچ چھ سال پہلے شروع ہو چکی تھی —

مسٹر آرگس اپنے دعوے میں یہ غزل پیش کرتے ہیں :

ابن یمین :

ساقی بریز جرعۂ وصلت بہ جام ما — کز شربت فراق تو تلخ ست کام ما
اے باد اگر بہ کوے نگارم گزر کنی — زنہار عرضہ دہ بہ سکانش پیام ما
مستیم جاوداں ز لب لعل آں نگار — زاہد خبر نیافت ز عیش مدام ما
شاید برابری نکند در دم حساب — مال حلال زاہد و آب حرام ما

حافظ :

ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بہ کام ما
اے باد اگر بہ گلشن احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جانان پیام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

اس مقابلے سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ حافظ نے یہ غزل ابن یمین ہی کے جواب میں لکھی' لیکن یہ کہنا کہ انھوں نے اُس کو چرالیا تھا' بالکل لغو ہے - اس غزل کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۷۵۰ھ کے لگ بھگ ہے' اسی غزل میں ایک شعر ہے :

دریاے اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

حاجی قوام سنہ ۷۵۴ ھ میں فوت ہوے ہیں - پس معلوم ہوا کہ یہ غزل حافظ

نے ابن یمین کی وفات کے بعد نہیں بلکہ خود اس کی زندگی ہی میں لکھی - اور اگر جیسا کہ مسٹر آرگس کا دعویٰ ہے کہ ابن یمین کا گمشدہ دیوان ' حافظ ' کو مل گیا ہوتا اور اُس میں سے انھوں نے رد و بدل کر کے یہ غزل لکھ دی تو صاف ظاہر ہے کہ یہ بات مشہور ہو جاتی ' کیونکہ ابن یمین اس وقت تک زندہ تھے - لیکن ' حافظ ' کو اگر ابن یمین کا گمشدہ دیوان ہاتھ لگ گیا تو کیوں انھوں نے دوسری غزلوں کو بھی رد و بدل کر کے اپنے دیوان میں داخل نہیں کیا - مسٹر آرگس کوئی ثبوت اس کے متعلق نہیں دے سکتے ' کیونکہ ہمیں صرف اس غزل کے سوا اور کوئی غزل ایسی نہیں ملتی' جس میں ' حافظ ' نے اتنا رد و بدل کیا ہو - اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ' حافظ ' نے نہ صرف ابن یمین کی ایک غزل کو رد و بدل کیا ' بلکہ ' سعدی ' اور ' سلمان ' اور دیگر شعرا کی غزلیات اور اشعار کو بھی رد و بدل کر کے اپنے دیوان میں داخل کرلیا - چنانچہ ان کی مثالیں مضمون کے آخر میں بکثرت دی جائیں گی —

مسٹر آرگس ' دونوں غزلوں کو درج کرنے کے بعد دونوں کے مقابلے کی طرف رخ کرتے ہیں اور ہر حالت میں ابن یمین کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن بامذاق آدمی فوراً سمجھ سکتا ہے کہ محاورات اور ترکیبوں کی بندش جو ' حافظ ' کا مایۂ ناز ہیں ' ابن یمین کے ہاں بالکل مفقود ہیں - ابن یمین نے مطلع میں صرف معمولی اور پا افتادہ خیال کہ " ہم کو شربت وصل پلاؤ کہ فراق سے ہم بہت تلخکام ہو رہے ہیں" بیان کیا ہے - ' حافظ ' نے ان ہی ظاہری الفاظ کو لیکر معنوں کو بالکل تبدیل کردیا ہے - وہ تو صرف شراب کے طالب ہیں - وصل اور ہجر کے متعلق انھیں کوئی سروکار نہیں - وہ تو حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو کامیاب قرار دیتے ہیں —

دوسرے شعر میں جیسا کہ صاحب مضمون کا خیال ہے' ابن یمین نے آداب عشق کو ملحوظ رکھا اور اپنا پیغام اس کے کُتوں کو پہنچانا چاہا' لیکن

فکر هر کس بقدر همت اوست

حافظ، اگرچہ عاشق ہیں لیکن بے آبرو نہیں۔ ایک جگہ مولانا اسلم فرماتے ہیں: *

خواجہ کے دو صدی پیشتر سے فارسی شعرا کو غزلیات اور فحش ہجویات کہنے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہاں تک یہ بات عام ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے اہل کمال اس کے مرتکب ہوتے تھے اور ان کے دامن کمال پر اس سے کوئی دھبا نہیں آتا تھا۔ 'ابوالعلائی' 'گنجوی' 'حکیم انوری' 'حکیم سوزنی' یہاں تک کہ حکیم سنائی' بھی اس سے نہ بچ سکے۔ سب تو سب 'شیخ سعدی' جیسا اخلاق کا معلم اور دنیا کا ناصح بھی اپنا جبہ و دستار پھینک کر اس دریا میں بے خوف کود پڑا اور وہ وہ کرشمے دکھائے کہ اللہ کی پناہ۔

مگر ایک خواجہ صاحب ہیں جن کا کلام ان لغویات سے بالکل پاک ہے' جو ان کے کمال متانت اور سنجیدگی کی دلیل ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کلام میں کوئی مکروہ اور کثیف لفظ تک نہیں آیا۔ 'فیضی' اپنے کلام کی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہوئے کہتا ہے:

بداں سے ماند ایں پاکیزہ گفتار کہ در دیوان حافظ نام سگ نیست

شیخ محمد یحییٰ لکھتے ہیں کہ "غالباً فیضی کی نظر سے خواجہ کا یہ شعر نہیں گزرا:

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنے

مگر ہمارے پاس دیوان کے جس قدر نسخے ہیں ان میں سے صرف ایک نسخے میں یہ شعر ہم کو ملا' ورنہ ہر ایک میں مقطع اس طرح پر ہے:

مزاج دہرتبہ شد دریں بلا 'حافظ' کجاست فکر حکیمے و رائے برہمنے

وہ مقطع در اصل امیر خسرو کا ہے"

'ابن یمین' کا تیسرا شعر معمولی ہے' اس کے مقابلے میں 'حافظ' کا شعر

---

* دیکھو خیابان حافظ صفحہ ۷۸ - ۷۹ —

بالکل صوفیانہ ہے - یہ 'ابن یمین' سے ماخوذ نہیں بلکہ 'عراقی' (اور درحقیقت ہر ایک صوفی شاعر) کے ہاں ایسے کئی شعر مل سکتے ہیں - مثلاً :

بیار ساقی ازاں مے کہ ساغر او را زعکس چہرۂ تو ہر زماں دگر رنگ است
پنہاں چہ شوی کہ عکس رویت در جام جہاں نمائے پیدا ست
در جام بادہ دیدہ عکس جمال ساقی آوازۂ شنیدہ از زخمۂ چغانہ

چوتھے شعر میں ابن یمین کا پہلا مصرع بالکل سست ہے لیکن 'حافظ' نے محاورے سے اسی فقرے کو ایسا چست بنادیا ہے کہ 'ابن یمین' کے ہزاروں شعر اس پر قربان کر دیے جانے کے قابل ہیں

اس کے بعد صاحب مضمون نے 'حافظ اور ابن یمین' کے مختلف شعروں کا مقابلہ کیا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ 'حافظ' نے بالکل 'ابن یمین' کے رنگ اور خیالات کی نقل کی ہے - یہ اشعار تعداد میں پندرہ ہیں' جن میں سے کئی تو غلط ہیں - پھر ان پندرہ شعروں کے مقابلے سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بالکل اسی طرز کا پیرو ہے - کئی جگہ ایسے شعر کا مقابلہ کیا گیا ہے' جو در حقیقت کسی دوسرے شاعر سے ماخوذ ہوتا ہے .....

مثلاً حافظ کا یہ شعر :

بعد صد سال اگر بر سر خاکم گزری سربر آرد ز گلم رقص کنان عظم رمیم

مسٹر آرگس کے نزدیک 'ابن یمین' کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

بعد صد سال اگر بر سر خاکم گزرد بادل سوختہ و سینۂ بریاں خیزم

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'حافظ' کا پہلا مصرع اور 'ابن یمین' کا پہلا مصرع دونوں ایک ہی ہیں' لیکن یہ خیال 'سعدی' سے ماخوذ ہے :

مردہ از خاک لحد رقص کنان بر خیزد گر تو بالائے عظامش گزری عظم رمیم

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ 'حافظ' کا یہ مشہور شعر:

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ابن یمین سے ماخوذ ہے جو کہتا ہے:

روز اول کہ بنام ہمہ کس قرعہ زدند قرعۂ عشق بنام من مسکیں اُفتاد

در حقیقت حافظ نے یہ خیال ابن یمین سے نہیں بلکہ قرآن مجید کی آیت سے لیا ہے:

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات و الارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان - انہ کان ظلوماً جھولا (سورۂ سبا)

"پہلے ہم نے امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا - اُنھوں نے اسے قبول نہ کیا کہ اسے برداشت کریں اور اس سے ڈرے - پھر انسان نے اسے اٹھایا - انسان ستمگار اور نادان ہے" -

اب دیکھئے کہ 'حافظ' نے لفظ امانت کو قائم رکھا - اس کی تہ میں بڑا راز مضمر ہے - قرآن مجید کی مختلف تفسیروں میں لفظ امانت کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں - اسی لئے حافظ نے ان تمام چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوے 'امانت' کو قائم رکھا - حالانکہ ابن یمین نے اسے عشق سے تعبیر کیا - اور قرآن کے معنوں کو ایک خاص دائرے میں محدود کردیا - اس کے علاوہ ابن یمین کے شعر میں دیگر مخلوقات کے انکار کا ذکر تک بھی نہیں اور حافظ نے آسمان کے انکار کا ذکر کردیا ہے - پھر مسٹر آرگس فرماتے ہیں کہ مسکین کے لفظ سے لفظ انسان کی بموجب آیۂ "ظلوماً جھولا" پوری پوری تفسیر کردی - لیکن مسکین کسی طرح بھی لفظ جھول کو ادا نہیں کرسکتا - مسکین کے لفظی معنی "بسیار بے حرکت و بے قوت" کے ہیں اور عام محاورے میں غریب و تنگدست سے مراد لی جاتی ہے - اس کے بر عکس 'جھول' سے مراد 'نادان' کے ہیں - جیسا میں نے آیۃ کے ترجمے میں لکھا ہے - دیوانہ جو حافظ نے استعمال کیا ہے وہ پاگل کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا بلکہ نادان سے مراد ہے اور یہ استعمال اردو

اور فارسی میں عام ہے —

یہ خیال ابن یمین ہی کے ساتھہ انوکھا نہیں بلکہ کئی فارسی شعرا نے اسے ادا کیا ہے ۔ مثلاً :

آن بار کہ از بردن او عرش اِبا کرد　　با قوت تو حامل آں بار تواں کرد

شیخ سعدی فرماتے ہیں :

من آں ظلوم و جہولم کہ ہم تو فرمودی　　چہ آید از ضعفا اے کریم و ز جہال
مرا تحمل بارے چگونہ دست دہد　　کہ آسمان و زمیں بر نتافتند و جہال

خود خواجہ صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں :

بار غم او عرض بہر کس کہ نمودم　　عاجز شد و ایں قرعہ بہ نام زسر افتاد

اب صاف ظاہر ہے کہ صاحب مضمون کا یہ دعویٰ کہ حافظ کا شعر اصل واقعے کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل نہیں کرتا ' غلط ہوجاتا ہے ۔ انصاف سے دیکھا جائے تو یہ نقص خود ابن یمین کے شعر میں پایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے —

آخر میں صاحب مضمون نے حافظ اور ابن یمین کی دو غزلوں کا مقابلہ کیا ہے' جن کو میں ذیل میں درج کرتا ہوں :

(۱) ابن یمین:

تا کہ من چہرۂ آں ماہ لقا می بینم　　نا مسلمانم اگر جز بخدا می بینم
ہر کجا می شنوم بوے ترا می شنوم　　ہر طرف می نگرم بوے ترا می بینم
ہیچ کس نیست کہ از زلف تو بوے آورد　　مگر ایں خاصیت از باد صبا می بینم
مشکل است اے دل من جاں بہ سلامت بردن　　من کہ آں چشم پر از عین بلا می بینم
پرسشے کرد غمش ابن یمین جان مرا　　طرفہ شاہے کہ در احسان گدا می بینم

حافظ :

در خرابات مغاں نور خدا می بینم　　ایں عجب بیں کہ چہ نورے زکجاسی بینم

جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو — خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم
سوز دل، اشک رواں، آہ سحر، نالۂ شب — ایں ہمہ از اثر لطف شما می بینم
خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن — فکر دور ست ہمانا کہ خطا می بینم
کس ندیدست ز مشک و ختن و نافۂ چیں — انچہ من ہر سحر از باد صبا می بینم

(۲) ابن یمین :

عاشقاں را بہ سر کوے تو جاں خواہد بود — دایما نعرۂ و فریاد و فغاں خواہد بود
عاشق زار کہ مشتاق جمال تو بود — تا قیامت بجمالت نگراں خواہد بود
گر مرا از سر کوے تو بہ جنت ببرند — دل سودا زدہ ام بے تو چہ ساں خواہد بود
گر حجاب رخت از پیش نظر برخیزد — ہمہ جا چہرۂ مقصود عیاں خواہد بود
تیر دل دوز تو در سینۂ من کرد گزر — ہر چہ از سوے تو آید گزراں خواہد بود

حافظ :

تاز میخانۂ وسے نام و نشاں خواہد بود — سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود
چشم آنم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد — تا دم صبح قیامت نگراں خواہد بود
عیب مستاں مکن اے خواجہ کزیں کہنہ رباط — کس ندانست کہ رحلت بچہ ساں خواہد بود
برو اے زاہد خود بیں کہ ز چشم من و تو — راز ایں پردہ نہانست و نہاں خواہد بود
بر سر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ — کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

لیکن اگر ایسی غزلوں سے ہم ایک شاعر کو دوسرے کا چور بنائیں تو بالکل نا انصافی ہے - حافظ کی کئی غزلیں ایسی ہیں جو انھوں نے دوسروں کی پیروی میں لکھیں اور کئی ایسی ہیں جن کی پیروی دیگر شعرا نے کی - ان کی مثالیں بعد میں درج ہوں گی -

جس نتیجے پر مسٹر آرگس پہنچتے ہیں وہ یہ ہے :

"مجموعہ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ 'حافظ' کی صوفیانہ شاعری یکسر ابن یمین سے ماخوذ ہے ... اگر کوئی فرق ہے تو

صرف اتنا کہ ابن یمین تصوف کے حدود میں رہتے ہیں اور حافظ چونکہ قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے یہاں حقیقت و مجاز اور رندی و پارسائی دونوں مخلوط ہوگئے ہیں - ابن یمین جس مسئلے کو بیان کرتے ہیں وہ عین حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور شاعرانہ خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی - حافظ کہیں ان کی نقل میں کامیاب ہوتے ہیں اور کہیں محض لطف شاعری رہ جاتا ہے ... الغرض حافظ کا تصوف ابن یمین کی نقل ہے جو بعض جگہ مطابق اصل ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا - کیونکہ حافظ کو تصوف سے صرف مقالاتی نسبت ہے" - (صفحہ ۷۱)

لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ آے ہیں؛ حافظ اور ابن یمین کا صوفیانہ رنگ بالکل مختلف ہے - حافظ اس خاصیت میں سعدی اور عطار و سنائی و عراقی کے پیرو ہیں؛ حالانکہ ابن یمین نے تو دوسری طرف مجاز اور حقیقت کو بالکل مخلتف کردیا، جس کی حافظ نے کبھی پیروی نہیں کی - یہ حافظ کی معراج تھی نہ کہ بے قدرتی کہ انہوں نے اس رنگ کو ایسا نبھایا کہ تمام دنیا کے سامنے مقبول ہوا اور اس کے سامنے سعدی اور عطار، سنائی اور مغربی و عراقی کے شعر ماند پڑگئے —

یہاں بہتر ہوگا اگر میں رشید یاسمی (مؤلف ابن یمین) کی راے بھی نقل کردوں - کہتا ہے :

"(ابن یمین) دریں دو قرن یا دو سی سال ہمیشہ خوب شعر نمی گفتہ است - مخصوصاً غزل را کہ چنداں فن او نمودہ است - و بطور اتفاق غزلیات خوب در دیوانش پیدا می شود غزلیاتے بہ شیوۂ سعدی، و ظہیر، فاریابی دیدہ می شود برائے مثال چند غزل اختیار می شود

بیا ماہ رویا شکر لب نگارا　　کشایش دہ از بند غم جان مارا
صبا گر رساند بمن بوے زلفت　　دہم جان بہ شکرانہ باد صبارا

بر سپہر حسن رویت آفتا بے دیگرست　　لیکن از شعر سیا هش سائبا نے دیگر ست
درد عشقش چوں نہاں دارم کہ بر رویم سرشک　　شرح آں را خوشخطے از سیم بر سطح زرست

ہر کہ بازلف تو اندر دام نیست　　ہمچو من پیوستہ بے آرام نیست
گر چہ باشد سرو ہم بالاے تو　　راستی را چوں تو در اندام نیست
با تو جز خوبی نشانے دیگر ست　　تا چہ چیز است آنکہ اورا نام نیست
در ازل آغاز کرد ابن یمین　　مستیء کش تا ابد انجام نیست

درمیان بعضے غزلیات او اشعارے دیدہ می شود کہ سبکر طلوع سبک حافظ ہستند :

سالہا شد کہ بسوے تو بسر می بازم　　زار می سوزم و با درد غمت می سازم

وغزلیاتے کہ مستقیماً بر اثر اشعار سعدی می روند :

اے از تو ہزار فتنہ بر پاے　　بنشین وقبائے بستہ بکشاے
از آئینۂ دل سیاہم　　زنگی کہ زہجر تست بزدائے
چوں از لب تو سخن سرایم　　طوطی نبود چو من شکر خائے

صفحہ ۱۴۷ ، ۱۴۸

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلف، ابن یمین کی غزلوں کا رتبہ بلند نہیں سمجھتا - اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ابن یمین نے غزلیات میں شیخ سعدی کی پیروی کی تھی - چند ایسی غزلیں بھی ہیں جن کا طرز بیان بعد میں حافظ کے کلام میں ملتا ہے - لیکن باوجود اس کے مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے :

" ہم ابن یمین وہم جانشین او حافظ ہریک دریک راہ

معینے وز سامدار ادبیات شمردہ می شود و باقی راہ ہارابہ
نا اہلاں و شعر باقان بے تفکر می گزارند - حافظ در غزل و
ابن یمین درقطع " (صفحہ ۱۳۰)

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف حافظ کو غزل کا استاد مانتا ہے اور ابن یمین کو صرف قطعات کا۔ غزل میں اس کا رتبہ بالکل معمولی ہے —

ان کے علاوہ مسٹر آرکس ایک اور اعتراض حافظ کی شاعری پر کرتے ہیں

" ابن یمین کے دیوان میں صوفیانہ رنگ کے ساتھہ انبساطی
وخمریاتی شاعری بھی پائی جاتی ہے، مگر یہ بات کس قدر
عجیب ہے کہ وہ خرابانی ہونے کے بعد بھی اپنی دلق پارسائی
کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ ایک چھینٹ بھی اس پر نہیں
پڑسکتی - حافظ نے یہ رنگ بھی انہیں کی شاعری سے اخذ
کیا مگر وہ بہک گئے اور ان کی شاعری ان کی رندانہ و سے
خوارانہ زندگی کا آئینہ ہو کر رہ گئی " (صفحات ۷۱ ، ۷۲)

لیکن اس جگہ بھی صاحب مضمون سے وہی لغزش ہوئی - اس کے نزدیک ابن یمین پہلا شاعر تھا جس نے خمریاتی رنگ کو پھیلایا اور پھر حافظ نے اس سے اخذ کیا - لیکن یہ رنگ عطار، سنائی وغیرہ میں عام ہے - ہم پہلے کئی مثالیں دے چکے ہیں - ملاعراقی اور سعدی کے ہاں بھی اس رنگ کی کافی بہتات ہے - ان کے علاوہ عمر خیام کے ہاں بھی یہ رنگ کافی طور پر نمایاں ہے - پس یہ بہتر ہوگا کہ ہم کہیں کے حافظ نے ان مذکورۂ بالا شاعروں کی خمریاتی اور انبساطی شعروں کو سامنے رکھکر شعر لکھے ہیں - ورنہ ابن یمین کے کلام میں ان رنگوں کی بہت کمی ہے اور نہ وہ اتنا قادر کلام تھا کہ حافظ اس کی پیروی کرتا -

پھر مسٹر آرکس فرماتے ہیں :

حافظ جب شراب کی مدح کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

انھوں نےجو کچھھ کہا ھے اسی وقت کہا ھے جب وہ سرشارتھے۔
لیکن خوش عقیدہ حافظ پرستوں نے ان کے ھر شعر کو
حقیقت کی حدود میں داخل کردیا - حالانکہ ان کا ساغر
وھی کلوار کی دکان کا کوزہ ھے اور ان کی شراب وھی
معمولی تلخ اور بد بو دار پانی - برعکس اس کے جب
ابن یمین اس رنگ میں کہتا ھے تو اس کی شان ھی
دوسری ھوتی ھے - ملاحظہ ھو :— "

اگر مستی کنم عیبم مگوئید — کہ شب تا صبح در میخانہ بودم
ھر کسے مخمور ابن مے بودہ باشد گوئیا — بادہ ارزاں گشت چوں ما ساقی دوراں شدیم
از دست یار ساغر وحدت کشیدہ ایم — در بزم لا مکاں ز مکین و مکاں جدا
بادۂ رندان ما در ساغر و پیمانہ نیست — مستی ایں مے پرستاں از خم و خمخانہ نیست
ز چشم مے پرست تو عشاق مے پرست شدند — ھمہ سبوکش بزم مے الست شدند
گر نمی نوشم مے از جام و صالش دمبدم — ھر دم از خود رفتن و با خود خروشیدن چراست

صفحہ ۷۲

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ھے کہ مسٹر آرگس نے ھر جگہ فاش غلطی کی ھے ۔ اُن شعروں کی بنا پر جن میں شراب وغیرہ کا ذکر ھو ' حافظ ' کو میخوار کہنا بڑی غلطی ھے - اگر یہی معیار قائم کیا جاے تو پھر ' عراقی ' جامی ' اور ' عطار ' سب اسی صف میں شمار کئے جائیں گے جو صریحاً غلط ھے ۔ جہاں ھمیں دیوان ' حافظ ' میں ایسے شعر ملتے ھیں :

حافظ چہ خدا را عاشق و رندست و نظر باز — بس طور عجب لا زم ایام شباب ست

وھاں ھمیں ایسے شعر بھی ملتے ھیں :

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق و رزیدن — منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

سب سے زیادہ ھمیں دیباچۂ گلندام کی شہادت کافی سے زیادہ ھے - کہتا ھے :

"چون از شائبهٔ شبهت و غائلهٔ شهوت مصون و محروس بود، دست تصرف بیگانه به دامن عصمت شان نرسید و دامن چادر عفت شان را کسے به سر انگشت خیانت فرو نکشید و رخسار احوال شان از خجلت عار و ضجرت طعن مرصون عصمت و حرز عفت محفوظ بماند۔ بیت :

گرمن آلودہ دامنم چہ عجب همه عالم گواه عصمت اوست"

اب میں چند شعر ایسے لکھتا ہوں، جو ابن یمین کے شعروں سے بھی زیادہ واضح ہیں :

بیاو معرفت من شنو کہ در سخنم زفیض روح قدس نکتهٔ سعادت رفت

خمها همه در جوش و خروشند ز مستی وان مے که در انجاست حقیقت، نه مجازست

مرو بخواب که 'حافظ' به بارگاه قبول ز ورد نیم شب و ورد صبحگاه رسید

من اگر رندم وگر شیخ چه کارم باکس حافظ راز خود و عارت وقت خویشم

به هیچ دور نخواهند یافت هشیارش چنین که 'حافظ' ملامست بادهٔ ازلست

در حق من به دُرد کشی ظن بد مبر کالوده گشت خرقهٔ و لے پاک دامنم

دوستان عیب نظر بازی حافظ مکنید که من او راز محبان خدا می بینم

گو هر معرفت اندوز که باخود ببری که نصیب دگران ست نصاب زر وسیم

شراب بے خمارم بخش یارب که با او هیچ درد سر نباشد

خود مست وحدت ز جام الست هر آنکو چو 'حافظ' مے صاف خورد

اے که دائم به خویش مغروری گر ترا عشق نیست معذوری

مستیء عشق نیست در سر تو رو که تو مست آب انگوری

ساقیم خضر ست و مے آب حیات توبه از مے چون کنم هیهات هیهات

ان سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ابن یمین کے شعر اس کی پار سائی پر دلالت کرتے ہیں تو یہ شعر اُن سے زیادہ معیار کے ہیں —

اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں 'حافظ' کا مقابلہ دیگر شاعروں کے کلام سے کروں اور دکھاؤں کہ کس حد تک، ہم 'حافظ' کو ابن یمین کا "چور" کہہ سکتے ہیں —

(۱) حافظ اور خواجو

خواجو کا اصلی نام کمال‌الدین ابوالعطاء محمود بن علی ہے - مثنوی گل و نوروز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش ۱۵ شوال سنہ ۶۷۹ ھ میں ہوئی - اس کی تاریخ وفات عام طور پر سنہ ۷۴۲ ھ مشہور ہے، لیکن اسکی ایک مثنوی 'کمالنامہ' ہے جو سنہ ۷۴۳ ھ کی تصنیف ہے - تحقیق یہ ہے کہ وہ سنہ ۷۵۳ ھ میں فوت ہوا -

خواجو تصوف سے بھی آشنا تھا - چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ علاءالدین سمنانی (المتوفی سنہ ۷۳۷ ھ) کا مرید تھا اور کمالنامہ انہی کی فرمایش سے لکھا گیا تھا - فرماتا ہے :

هرکه به ره علی عمرانی شد　　چون خضر به سر چشمهٔ حیوانی شد

از وسوسهٔ و غارت شیطان و ارست　　مانند علاء الدین سمنانی شد

'خواجہ' حافظ نے اپنی شاعری کی ابتدا 'خواجو کی تقلید سے کی' جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے -

استاد غزل سعدی ست نزد همه کس، اما　　دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

چند شعر مقابلے کے لئے درج کرتا ہوں :

خواجو :　　'حافظ' :

دل دریں پیر زن عشوه گر دهر مبند　　مجو درستی عهد از جهان ست نهاد

کیں عروسی ست که در عهد بسے داماد ست　　که این عجوز عروس هزار داماد ست

یہ غزل حافظ نے خواجو کی پیروی میں لکھی ہے، اس شعر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حافظ نے کس حد تک خواجو کے خیالات و طرز ادا کو لیا -

(۲) که بر کنم دل از رخ جانان که مهر او　　عشق تو در وجودم و مهر تو در دلم

با شیر در دل آمد و با جان بدر شود　　با شیر در بدن شد و با جان بدر شود

(۳) ایاصبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی
نسیم صبح سعادت برآں نشاں کہ تو دانی
بداں زمیں گزرے کن بداں زماں کہ تو دانی
گزر بہ کوے فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی
چو مرغ درطیراں آئی و چوں بہ اوج رسی
تو پیک حضرت شاہی مراد و دیدہ بہ راہ ست
نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی
بہ مردے بہ بغرماں بر ہر آں کہ تو دانی
چناں مرو کہ غبارے بدو رسد ز گزارت
بگو کہ جاں ضعیفم ز دست رفت خدا را
بداں طرف چو رسیدی چناں بداں کہ تو دانی
ز لعل روح فزایت بہ بخش ازاں کہ تو دانی
من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر ندانست
تو ہم ز روے کرامت بخواں چناں کہ تو دانی

(۴) خرقہ رہن خانۂ خمار دارد پیر ما
دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما
اے ہمہ رنداں مرید پیر ساغر گیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما
گر شدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست
در خرابات مغاں ما نیز ہم منزل شویم
ہم چنیں رفت ست از روز ازل تقدیر ما
کایں چنیں رفت ست از روز ازل تقدیر ما
مادل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم
عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش ست
اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما
عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما
از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
تیر آہ ما ز گردوں بگزرد جاناں خموش
کز کماں نرم زخمش سخت باشد تیر ما
رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما

جب ہم ان دونوں غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے تتبع کی حد کردی - ان تمام شعروں کے خیالات ایک ہیں اور کئی جگہ تو مصرع بھی بالکل ایک - لیکن باوجود اس کے حافظ کے شعر خواجو سے ہزار گنا بہتر ہیں جو لطف حافظ کے شعر ایک با مذاق آدمی کو دیتے ہیں وہ خواجو کے اشعار میں ہرگز ہرگز نہیں ملتا - اسی قسم کا مقابلہ حافظ اور ابن یمین کی پہلی غزل کا ہے جس کی بنا پر مسٹر آرگس نے حافظ پر سرقے کا الزام لگایا تھا - وہاں بھی حافظ نے ابن یمین کے خیالات کو لے کر کہیں بالکل اسی کی زبان میں اور کہیں اپنی زبان

میں ادا کیا ہے ' لیکن باوجود اتنی تقلید کے صاحب مذاق آدمی دونوں میں بخوبی فرق کرسکتا ہے - اور پھر وہ سرقہ نہیں کیونکہ ابن یمین اس وقت زندہ تھا - اگر وہ سرقہ ہے تو یہ غزل بھی خواجو کے دیوان کا سرقہ ہے —

(۲) حافظ اور سعدی

شیخ شرف الدین 'سعدی' شیراز کے مشہور شاعر تھے - سنہ ۵۷۱ ھ میں پیدا ہوے اور سنہ ۶۹۱ ھ میں فوت ہوے - مدرسۂ نظامیہ بغداد میں تعلیم حاصل کی - علامہ ابن جوزی (المتوفی سنہ ۵۹۷ ھ) آپ کے استاد تھے - شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر رہ کر فیوض باطنی حاصل کئے - عمر کا بہت سا حصہ سیر و سیاحت میں گزارا - مشہور آدمی ہیں -

سعدی غزل کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں - خسرو لکھتا ہے :

خسرو سرمست اندر سافر معنی بریخت شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

حافظ : استاد غزل سعدی ست نزد ہمہ کس ... (الخ)

اب میں چند شعروں میں دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں :

'سعدی' 'حافظ'

تا نفخ صور یار نیاید بہ خویشتن سر ز مستی بر نگیرد تا بہ صبح روز حشر

ہر کو فتاد مست محبت ز جام دوست ہرگز چوں من در ازل یک جرعہ خورد از جام دوست

گر کام دوست کشتن سعدی ست باک نیست میل من سوے وصال و قصد او سوے فراق

اینم حیات بس کہ بمیرم بکام دوست ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم در مذہب ما بادہ حلال ست و لیکن

شراب با تو حلال ست و آب بے تو حرام بے روے تو اے سرو گلندام حرام است

اے بلبل اگر فالی من با تو ہم آوازم بنال بلبل اگر با منت سر یاری ست

تو عشق گلے داری من عشق گلندا ہے — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

آن نہ خال ست و زنخدان وسر زلف پریشاں — لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد

کہ دل اہل نظر بردہ کہ سریست خدائی — کہ فام آں نہ لب لعل و خط زنگاری ست

فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن ست — من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

فریاد سعدی از دل نامہربان دوست — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

بخدا کہ گر بمہرم کہ دل از تو بر نگیرم — بروائے طبیب از سر کہ خیال سرندارم

بروائے طبیب از سر کہ دوانمی پذیرم — بخدا رہا کنم جاں کہ زجاں خبر ندارم

بندہ ام گر بلطف می خوانی — اگر بہ لطف بخوانی مزیدا لطافت ست

چاکرم گر بقہر می رانی — وگر بقہر برانی درون ما صافت ست

ان کے علاوہ ہمیں کئی ایسے شعر ملتے ہیں جہاں حافظ نے سعدی کے شعر ہی کو صرف معمولی تبدیلی سے اپنا نبالیا ہے۔ مثلاً :

(۱) سعدی

بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ نکوگفتی — سگم خواندی وخوشنودم جزاک اللہ کرم کردی

اس کے مقابلے میں حافظ کہتے ہیں :

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکوگفتی — جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(۲) جزایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب — جزایں قدر نتواں گفت در جمال تو میب

کہ مہربانی از ان طبع و خو نمی آید — کہ حال مہر و وفا نیست روے زیبا را

(۳) کجا خود شکر ایں نعمت گزارم — من از بازوے خود دارم بسے شکر

کہ زور مردم آزاری ندارم — کہ زور مردم آزاری ندارم

ذیل میں چند غزلیں ہم قافیہ درج کرتا ہوں :

سعدی — حافظ

(۱) بوی کہ صبوحی زدہ ام خرقہ حرام ست — گل در بر و مے در کف و معشوقہ بہ کام ست

اے مجلسیاں راہ خرابات کو ایست — سلطان جہانم بہ چنیں روز غلام ست

هر کس بجهان خرسیء پیش گرفتست
گو شمع میار یدا دریں بزم که امشب

مارا غمت اے ماہ پری چہرہ تمام ست
در مجلس ما ماہ رخ دوست تمام ست

بر خیز که در سایهٔ سروے بنشینم
گو شم همه برقول نے ونغمهٔ چنگ ست

کا نجا که تو بنه نشینی بر سر و قیام ست
چشمم همه بر لعل اب و گردش جام ست

دام دل صاحب نظرانست خم گیسو ست
در مجلس ما عطر میا میز که جا نرا

واں خال وبنا گوش مگر دانهٔ و دام ست
هر لحظه زگیسوے تو خوشبوے مشام ست

باچوں تو حریفے بچنیں جاے دریں وقت
د ر مذ هب ما باده حلال ست و لیکن

گر باده خورم خمر بهشتی نه حرام ست
بے روے تو اے سر و گلندام حرام ست

با محتسبم عیب مگو ئید که ا و نیز
با محتسبم عیب مگو ئید که ز نهار

پیوسته چو ما د رطلب عیش مدام ست
د ر مجلس ماسنگ میانداز که جام ست

غیبت نگذارد که بگو یم که مرا کُشت
از ننگ چه گوئی که مرا نام زننگ ست

تا خلق ندا نند که معشو قه کدام ست
وز نام چه پرسی که مرا ننگ زنام ست

د ر دا که به پختیم دریں سوز فها فی
تا گنج غمت در دل ویرا نه مقیم ست

وانرا که خمر ز آتش مانیست که خام ست
پیو سته مرا گنج خرابات مقام ست

سعدي مهر اندیشه که در کام نهنگاں
حافظ منشیں بے مے و معشوقه زما نے

چوں در نظر دوست نشینی، همه کام ست
کا یام گل و یا سمن و عید صیام ست

(۲) عشق ورزیدم وعقلم بسلامت برخاست
د ل دو نیمم شدو دلبر بملا مت برخا ست

هر که عاشق از و حکم سلامت بر خاست
گفت با مانشیں کز تو سلامت بر خاست

..... الخ

(۳) زمن مهرس که ازدست اودلت چون ست
زگریه مردم چشوم نشسته در خون ست

از و بپرس که انگشتهاش در خون ست
به بیں که در طلبت حال مردماں چون ست

..... الخ

(۴) غلام آں سیکروحم که بامن سرگراں دارد
بتے دارم که گرد گل زسنبل سائبان دارد

جوابش تلخ پنداری و شکر بر زباں دارد بہار عارضش خطے بخون ارغوان دارد
..... الخ

طوالت کے خوف سے میں باقی مثالوں کو نظر انداز کرتا ہوں - ورنہ خواجہ صاحب نے شیخ سعدی کی کئی غزلوں کے جواب لکھے ہیں اور کئی غزلوں میں تو خیالات اور طرزادا تک بھی ملتے جلتے ہیں —

(۳) حافظ اور سلمان ساؤجی

سلمان ساؤجی ' کا نام ' خواجہ جمال الدین سلمان بن خواجہ علاءالدین محمد ' ساوہ ' ان کا اصلی وطن ہے ' جس کی نسبت سے یہ ' ساؤجی ' کہلاتے ہیں ' سلمان ' پہلی عمر میں اپنے باپ کی طرح حکومت کی طرف سے اچھے عہدے پر مامور تھے - لیکن اس نے شاعری کے لئے سب کو چھوڑ دیا —

اس کی مثنوی ' فراق نامہ ' سے جو سنہ ۷۶۱ ھ میں ختم کی ' معلوم ہوتا ہے کہ ' سلمان ' سنہ ۷۰۰ ھ میں پیدا ہوا تھا ' کیوں کہ وہ کہتا ہے :

کنوں سالم از شست و یک در گذشت بساط نشاطم فلک در نوشت

' سلمان ' تمام عمر ایلخانی دربار میں رہا - امیر ' شیخ حسن بزرگ " ایلخانی (المتوفی سنہ ۷۵۷ ھ) ' شیخ اویس ' (سنہ ۷۵۷ ھ - ۷۷۶ ھ) اور پھر ' سلطان حسین ' (سنہ ۷۷۶ ھ - ۷۸۴ ھ) تینوں کی مدح کی - دیوان میں کئی قصیدے ان کی مدح میں ملتے ہیں - اس کی پہلی نظموں میں سے وہ قصیدہ ہے جو اس نے وزیر ' غیاث الدین ' (المتوفی سنہ ۷۳۶ ھ) کی مدح میں لکھا —

' سلمان ' نے ' شاہ شجاع (المتوفی ۷۸۶ھ) کی مدح میں بھی دو قصیدے لکھے ہیں ' جب اس نے عارضی طور پر ' تبریز ' پر فتح پائی تھی - ' شاہ شجاع ' نے بھی ' سلمان ' کو بہت پسند کیا - سنہ ۷۷۸ ھ یا سنہ ۷۷۹ھ میں وفات پائی —

' سلمان ' درباری شاعر ہونے کی وجہ سے اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے اور غزل کی نسبت قصیدوں کی طرف بہت مائل تھے اور اسی میں اس نے کمال

حاصل کیا - 'خواجہ صاحب' 'سلمان' کی نسبت فرماتے ہیں :

حکیم فکر من از عقل کرد دوش سوال — کہ اے یگانۂ آفاق' خالق رحمان
کدام گوہر نظم ست در جہاں کہ ازو — شکست رونق بازار ولولوء مرجان
جواب داد کہ بشنو زمن ولے مشنو — کہ ایں قصیدہ فلاں گفت و ایں غزل بہمان
سر آمد فضلاے زمانہ دانی کیست — ز روے صدق و یقیں فوز راہ کذب وگمان
شہنشہ فضلا' باد شاہ ملک سخن — جمال ملت و دیں خواجۂ جہاں سلمان

اب میں چند غزلیں اور اشعار مقابلے کے لئے لکھتا ہوں :

سلمان	حافظ
صبح محشر کہ من از خواب گراں برخیزم	مژدۂ وصل تو کو! کز سر جاں برخیزم
بجمال تو چو نرگس نگراں بر خیزم	طائر قدسم و از دام جہاں بر خیزم
چو شوم خاک' بخاکم گزرے کن چو صبا	بر سر تربت من بے مے و مطرب منشیں
تا ز ہویت ز زمیں رقص کناں بر خیزم	تا ز ہویت ز لحد رقص کناں بر خیزم
بر نخیزم ز سر کوے تو تا جاں دارم	سر و بالا بنما اے بت شیریں حرکات !
ور رسد کار بجاں از سر جاں بر خیزم	کہ چو 'حافظ' ز سر جان و جہاں برخیزم

در ازل عکس مے لعل تو در جام افتاد — عکس روے تو چو در آئینۂ جام افتاد
عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد — عارف از پرتو مے در طمع خام افتاد
جام را از شکر لعل لبت نقلے کرد — غیرت عشق زبان ہمہ خاصاں ببرید
راز سر بستۂ خم در دہن عام افتاد — از کجا سر غمش در دہن عام افتاد
خال مشکیں تو در عارض گندم گوں دید — در خم زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ
آدم آمد ز پے دانۂ و در دام افتاد — آہ کز چاہ برآں آمد و در دام افتاد

دام زلف تو ببر حلقہ طنابے دارد — آنکہ از سنبل او حلقہ تابے دارد

چشم مست تو بهر گوشه خرابے دارد — باز با دل شدگاں ناز و عتابے دارد
خون چشم من ازاں ریخت که قاطن نهرم — چشم من کرده بهر گوشه رواں سیل سرشک
که برش مردم صاحب نظر آبے دارد — تا سهی سرو ترا تازه به آبے دارد

شاهداں ست که دارد خط سبز و لب لعل — شاهد آں نیست که سوے و میانے دارد
شاهد آں ست که این دارد و آنے دارد — بندهٔ طلعت آں باش که آنے دارد
گر قلم قصد کند سر زنشش نقوان کرد — مدعی گو برو ونکته به حافظ مفروش
که قلم نیز بهر حال زبانے دارد — کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد
هوس گوشهٔ آبے اگرت می باشد — چشمهٔ چشم مرا اے گل خنداں دریاب
گوشهٔ دیدهٔ ما آب روانے دارد — که به امید تو خوش آب روانے دارد

اب میں چند غزلوں کے صرف مطلع لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جاے کہ حافظ نے کس حد تک سلمان کی پیروی کی —

سلمان	حافظ
جاں شیریں گر قبول چوں تو جانانے بود	در ازل هر کو به فیض دولت ارزانی بود
کے به جانے باز ماند هر کرا جانے بود	تا ابد جام مرادش همدم جانی بود (...الخ)
همچناں مهر توام موئس جانست که بود	گو هر مخزن اسرار همانست که بود
همچناں ذکر توام ورد زبانست که بود	حقهٔ مهر بداں مهر نشانست که بود (...الخ
بر دمد صبح نشاط از مطلع جاں غم مخور	یوسف گم گشته باز آید به کنعاں غم مخور
ویں شب سودا رسد روزے به پایاں غم مخور	کلبهٔ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور (...الخ)

آخر میں میں دونوں کے چند متفرق اشعار پر مقابلے کو ختم کرتا ہوں —

سلمان	حافظ
مکن ملامت رنداں دگر به بد نامی	گر چه به نامی ست نزد عاقلاں
که هرچه پیش تو ننگ ست نزد ما نامست	ما نمی خواهیم ننگ و نام را

دروں صافی ز اهل صلاح و زهد مجوے — راز درون پرده ز رندان مست پرس
که این نشانهٔ رندان دردی آشام ست — کیں حال نیست صوفی عالی مقام را
اے گنج نو شدارو در خستگان نظر کن — یا رب این باکه تواں گفت که آں نوشیں لب
مرهم بدست و مارا مجروح می گزاری — کُشت مارا و دم عیسیٰ مریم با اوست
خواهی که روشنت شود احوال درد من — خواهی که روشنت شود احوال سر عشق
در گیر شمع را وز سر تا به پا بپرس — از شمع پرس قصه ، زباد صبا مپرس
ما ئیم بسته دل را در لعل دلکشا یت — زیں زهد و پارسائی بگرفت خاطر من
آں لب بخنده بکشا تادل شود کشاده — ساقی پیالهٔ ده تادل شود کشاده

---

(۴) حافظ اور ظهیر فاریابی

ظهیر ، فاریاب کا رهنے والا تها ، جو ترکستان کا ایک شهر هے - علوم درسیه میں کمال پیدا کیا ، شاعری کے آغاز میں نیشا پور آیا اور ' طغاں شاه بن محمد ' کی مداحی کی - چنانچه کئی قصیدے همیں کلیات میں ملتے هیں - پهر ماژندران گیا اور یهاں کے سلاطین کی مدح میں قصائد لکهے - پهر آذربایجان پهنچ کر ' جهان پهلوان ' یلدگز کے دربار میں رسائی حاصل کی - اس نے ' ظهیر ' کی بهت قدر دانی کی - اس کے مرنے کے بعد ' قزل ارسلاں ' کے دربار میں پهنچا ، جس کی مدح میں ظهیر کا یه شعر مشهور هے :

نه کرسی فلک نهداند یشه زیر پاے — تا بو سه بر رکاب قزل ارسلاں دهد

بالآخر کسی بات پر قزل ارسلاں سے ناراض هوا اور ' اتابک ' بن ' جهان پهلوان ' کے درباریوں میں داخل هوا - آخر عمر میں ظهیر نے ترک دنیا اختیار کیا اور تبریز میں گوشه نشین هو کر بیٹه گیا - سنه ۵۹۸ ھ میں فوت هوا —

خواجه ' حافظ ' نے نه صرف سعدی اور خواجو کی پیروی پر اکتفا کی ، بلکه ظهیر ' کی غزلوں کے بهی جواب لکهے هیں - چنانچه چند مثالیں درج کی جاتی هیں :

ظهیر	حافظ
بامم من نفس مردہ دلاں ایں همہ نیست	حاصل کار گہ کون و مکاں ایں همہ نیست
مستیٔ مرگ بدیں خواب گراں ایں همہ نیست	بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں همہ نیست
چشم من از همہ آثار تراسی بیند	از دل و جاں شرف صحبت جانان غرض ست
گر تو منظور نباشی دگراں ایں همہ نیست	همہ آفست وگرنہ دل و جاں ایں همہ نیست
سایہ پرورد چمن نیستم اے ابر بہار	بر لب بحر فنا منتظریم اے ساقی
برگلستان من آسیب خزاں ایں همہ نیست	فرصتے دان کہ زاب تا بہ دہاں ایں همہ نیست
قامت او کہ علامات قیامت دارد	مفت سدرۂ طوبیٰ ز پیٔ سایہ مکش
پیش جلوہ ات اے سروراں ایں همہ نیست	کہ چو خوش بنگری اے سروراں ایں همہ نیست
لیلیٰ ایں ناز همہ بر دل مجنوں دارد	زاہد! ایمن مشو از بازیٔ غیرت ز نہار
ورنہ معشوقی و اوبا دگراں ایں همہ نیست	کہ رہ صومعہ تا دیر مغاں ایں همہ نیست
تا تو در شیشۂ و خم بادہ کنی، عید آمد	از تہتک مکن اندیشۂ و چوں گل خوش باش
بادہ پیش آر کہ ماہ رمضاں ایں همہ نیست	ز انکہ تمکین جہان گزراں ایں همہ نیست
وقت تنگست 'ظہیر' از دہن یار بگو	نام 'حافظ' رقم نیک پذیرفت ولے
ورنہ وصف کمر او بمیاں ایں همہ نیست	پیش رنداں رقم سود و زیاں ایں همہ نیست

شبے اگر گذرت بر مقام ما افتد	همائے اوج سعادت بدام ما افتد
نزول زہرہ ز گردوں بہ بام ما افتد	اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد
هزار عاشق بیدل کہ رو بدو دارند	بدبارگاہ تو چوں باد را فنا شد راہ
کجا بفکر جواب سلام ما افتد	کے اتفاق مجال سلام ما افتد
زمان مستیٔ ما آں زماں بود اے ماہ	حباب وار بر اندازم از نشاط کلاہ
کہ از عذار تو عکسے بجام ما افتد	اگر ز روے تو عکسے بجام ما افتد
چہ شہد وصل تو دنداں چنیں فرو بردیم	چو جاں فدائے لبت شد خیال ہے بستم

که ترسم آنکه مبادا ز کام ما افتد — که قطرۂ ز زلالت به کام ما افتد
هزار نامه فرستادم و نشد که یکے — به نا امیدی ازیں در مرو، بزن فالے
بدست دل بر عالی مقام ما افتد — بزن که قرعۂ دولت به نام ما افتد
ز بس شکایت عامت بداں رسید، ظہیر، — شبے که ماه مراد از افق طلوع کند
که حرفہاے صحیح از کلام ما افتد — بود که پرتو نورے به بام ما افتد
ز خاک کوے تو هر گه که دم زند حافظ
نسیم گلشن جاں در مشام ما افتد

یہاں تک ہم نے 'حافظ' کا مقابلہ ان شاعروں سے کیا ہے' جن کی اس نے تقلید کی ہے - اس مقابلے سے صاف ظاہر ہے کہ 'حافظ' نے صرف ابن یمین کی ہی ایک غزل کو رد و بدل نہیں کیا' بلکہ ایسی مثالیں دوسرے شاعروں میں بھی موجود ہیں - اور صرف ایک غزل کی بنا پر 'حافظ' کو ابن یمین کے رنگ کا چوریا مقلد کہنا بالکل غلط ہے - اب میں آخر میں کمال خجندی اور حافظ کا مقابلہ کرتا ہوں - جس سے صاف ظاہر ہوگا کہ نہ صرف 'حافظ' بلکہ دیگر شعرا نے بھی دوسرے شاعروں کی غزلوں کے ایسے رد و بدل کئے ہیں —

'کمال خجندی اور حافظ'

'شیخ کمال الدین مسعود' المشہور بہ کمال خجندی' 'حافظ' کے ہمعصروں میں سے تھے - ایک دفعہ حج کو گئے اور واپس آکر 'تبریز' میں قیام کیا - اس کے زہد و عبادت کو دیکھ کر 'سلطان حسین بن سلطان اویس' سنہ ۷۷۶ھ- سنہ ۷۸۳ ھ) نے 'تبریز' میں ایک خانقاہ اس کے لئے تعمیر کروائی' جس کا اشارہ ہمیں اُس کے دیوان میں بھی ملتا ہے :

گر گوشۂ بسازد سلطان حسین باز — در قلب شہر نبود کس را بما نزاعے
با مطربان خوشگو شام و صباح باشد — در گوشۂ حسینی عشاق را سماعے

لیکن جب ' تو غتمش خاں ' سنہ ۷۸۷ ھ میں ' تبریز ' آیا تو وہ اسے اپنے ساتھہ ترکستان لے گیا ' جہاں کمال چار برس تک رہا - بعد میں وہ ' تبریز ' واپس آیا جہاں ' میران شاہ ' پسر امیر تیمور حکمراں تھا - اس نے اس کی بہت عزت کی آخر کار سنہ ۸۰۳ ھ میں فوت ہوا —

مولانا جامی کہتے ہیں کہ اس کی عبادت ضرب المثل تھی اور اس نے شاعری محض بناوٹ کے لئے شروع کی تھی ' تاکہ اپنی عبادت کو چھپا سکے - چنانچہ خود کہتا ہے

این تکلفہا ے من در شعر من ''کلمینی یاحمیرا'' من ست

وہ خواجہ عبیداللہ کے مرید تھے —

حافظ اور کمال کے تعلقات کے متعلق ہمیں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی غزلیں بھیجتے تھے - ' دولتشاہ ' اور ' آتشکدہ ' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ کمال نے یہ غزل لکھہ کر حافظ کو بھیجی :

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بہ چشم وانگہے دزدیدہ در ما می نگر گفتم بہ چشم

گفت اگر سر در بیابان غم خواہی نہاد تشنگاں را مژدۂ از ما بہ بر ' گفتم بہ چشم

گفت اگر یابی نشان پاے ما بر خاک راہ برفشاں آنجا بد امن بہ گہر ' گفتم بہ چشم

گفت اگر گردد دلبت خشک از دم سوزان ما بازمی سازش چو شمع از گریہ تر گفتم بہ چشم

گفت اگر گردی شبے از روے چوں ما ہم جدا تا سحرگاہاں ستارہ برشمر ' گفتم بہ چشم

گفت اگر داری خیال دُرّ وصل ما ' کمال ' قعر این دریا بہ پیما سر بسر ' گفتم بہ چشم

' خواجہ حافظ ' نے غزل کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کو بہت پسند کیا اور کتنی دیر تک پڑھتے رہے اور کہا کہ واقعی اس شخص کا رتبہ بہت بلند ہے —

ان کا کلام رندانہ ہے ' اگرچہ زبان میں لطافت ' حافظ ' سے کم ہے - ' کمال ' کے ہاں بہت سے فخریہ اشعار ملتے ہیں :

این از شعرا ے ما تا خر وان از فضلا ے ما تقدم

دیوان تو گر کسے بخواند در پیش سخنور ان عالم

زین گفته رود ' ظهیر ' ازجاے چه جاے ظهیر انوری هم
گوینده قصیدهٔ تو خام ست پخته سخنان نا مسلم
این خام ولے چو نقرهٔ خام آن پخته ولے جو پخته شالغم ... الخ

ان اشعار کی زیادتی کی وجه یه هے که کمال در باری شاعر نه تهے - دیوان میں کہیں ایک قصیده نہیں ملتا - صرف چند قطعات هیں ' جن میں اس نے اپنے محبوں اور مہربانوں کی تعریف کی هے ' لیکن ان میں کسی قسم کا تملقی رنگ نہیں پایا جاتا هے - ایک اور جگه کہتا هے :

هفت بیت آمد غزلهاے ' کمال ' پنج گنج از لطف او عشر عشیر
هفت بیتیهاے یاراں نیز هست هر یکے پاک و روان و دلپذیر
لیکن از هر هفت شاں حک کردنی ست چار بیت از اول و ۲ از اخیر

معلوم هوتا هے که ' کمال ' اور ' سلمان ' کا بہت تعلق رها هے ' کیونکه همیں قطعات اور غزلیات میں کئی جگه ' سلمان ' کا نام ملتا هے —

' کمال ' از هر مژه اشکت مگر همرنگ ' سلمان ' شد
که از اشعار مردم برد معنیهاے رنگیں را

دیگر: یکے شعرسلمان زمن بنده خواست که در دفترم زاں سخن هیچ نیست
بدو گفتم این گفتهاے جواب کزاں ساں درے در عدن هیچ نیست
من از بهر تو می نوشتم ولے سخنهاے او پیش من هیچ نیست

ذیل میں چند غزلیں درج کرتا هوں ' جو ' کمال ' نے ' حافظ ' کے تتبع میں لکهی هیں —

' حافظ ' (۱) ' کمال '

ستارهٔ بدرخشید و ماه مجلس شد شبے که روے تو مارا چراغ مجلس شد
دل رمیدهٔ مارا انیس و مونس شد به سوختن دل پروانه وش مهوس شد
غبار من که به مکتب نرفت و خط ننوشت دو چشمت از دل و دیں انچه داشتم ' بردنه

به غمزه مسئله آموز صد مدرس شد
تو انگرے که به مستان نشست مفلس شد

طرب سرائے محبت کنون شود معمور
به کیمیائے نظر چوں تو خاک زر سازی

که طاق ابرو یار منش مهندس شد
تفاوتے نکند گر وجود ما مس شد

ببوے او دل بیمار عاشقاں چو صبا
دگر مرا به خیالت ز بے کسی چه ملال

دائے عارض نسرین و چشم نرگس شد
چه غم رفیق و بلا یار و درد مونس شد

لب از ترشح مے پاک کن برائے خدا
خوش ست طرب وساقی ومن به یکدو حریف

که خاطرم به هزاراں گنه موسوس شد
دریں شمار که کردم رقیب سادس شد

کرشمهٔ تو شرابے به عاشقاں پیمود
کسے که عاقل و هشیار دید مے و بهوش

که علم بے خبر افتاد عقل بے حس شد
چودید شکل تو از هوش رفت و بے حس شد

خیال آب خضر بست و جام کیخسرو
بنقش ابروے تو نیست درسراچهٔ حسن

به جرعه نوشیء سلطان ابوالفوارس شد
که دست صنع دراں طاقها مهندس شد

چو زر عزیزو شریف ست شعر من آرے
ز مے به دور تو پرهیز ما فه از ما بود

قبول دولتیاں کیمیائے هر مس شد
دریں قضیه سبب زاهد مدرس شد

ز راه میکده یاراں عناں بگردانید
'کمال' نسخهٔ رندی بسے مطالعه کرد

چرا که 'حافظ' ازیں راه رفت و مفلس شد
که در دقائق علم نظر مدرس شد

نه شد به طور غزل همعنان ما 'حافظ'
اگر چه در صف سلطان ابوالفوارس شد

'کمال' کی غزل کے مطالعے سے معلوم هوتا هے که یه غزل 'کمال' نے 'حافظ' کی غزل کے جواب میں لکھی هے اور پھر یه بھی کہا هے که 'حافظ' میرا مقابله نهیں کرسکتے - یه ان کی معمولی عادت هے' جو شاید آزاد مزاجی کی وجه سے حد سے زیاده هے —

'حافظ' (۲) 'کمال'

آں سیه چرده که شیرینیء عالم با اوست
آں چه رویست که حسن همه عالم با اوست

چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست
دل نه تنها مست در آں کوے که جان هم با اوست

گر چه شیرینی دهناں پادشها نندولے
دم عیسی که به رنجور شفامی بخشید

آں سلیمان زماں ست که خاتم با اوست
دم نقد از لب اوجوے، که ایں دم با اوست

روے خوب ست و کمال هنرو دامن پاک
خانهٔ دل به خیال لب او دار شفاست

لاجرم همت پاکان دو عالم با اوست
چند نالد دل مجروح که مرهم با اوست

خال مشکیں که براں عارض گندم گوں ست
دهنش گر چه زما خاتم دلها دز دید

سّر آں دانه که شد رهزن آدم با اوست
چوں بخندد همه دانند که خاتم با اوست

دلبرم عزم سفر کرد خدا را یاراں!
گو بیارید بمن شادیء بگریخته را

چه کنم بادل مجروح که مرهم با اوست
چه کنم شادیء بیدوست که صد غم با اوست

باکه ایں نکته توان گفت که آں سنگیں دل
صاحب درد ز طوفان بلا جاں نبرد

گشت مارا و مریم عیسی مریم با اوست
نوح هر جا که رود دیدهٔ پرنم با اوست

« حافظا » از معتقد انست گرامی دارش
روے زیبای تو در دیدهٔ گریان کمال

ز انکه بخشایش بس روح مکرم با اوست
کعبهٔ حسن و جمالست که زمزم با اوست

آخر میں ' یه غزل درج کی جاتی هے جس سے معلوم هوگا که همعصر شاعروں میں کہاں تک تقلید هوتی هے —

« حافظ »

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
بیا ساقی که بیخ غم به دور گل برانداریم

فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
مئے گلگوں طلب داریم و مل در ساغر اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد که خون عاشقاں ریزد
سر رقص و سر اندازیست سرو و لاله را تا هم

من و ساقی بهم سازیم و بنیادش بر اندازیم
سهی سروے به دست آریم و در پایش سر اندازیم

چو در دستست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
گراز شوق جمال گل، بکف بر لاله جام مل

که دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم
گله بر آسماں انداخت، ما زاں برتر انداریم

صبا! خاک وجود ما بآن عالی جناب انداز
بود کان شاهخوبان را نظر بر منظر اندازیم
یکے از عقل می لافد، دگر طامات می بافد
بیا کاین داور یها را بپیش داور اندازیم
بهشت عدن اگر خواهی بیابا ما به میخانه
که از پای خمت یکسر بعرض کوثر اندازیم
شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم
نسیم عطرگردان را شکر در مجمر اندازیم
بیا جانان! منور کن ز رویت مجلس ما را
که در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم
بخندانی وخوشخوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ که ماخود را بملک دیگر اندازیم

به آواز رباب ونے بنوشیم آشکارا مے
به شهر آوازۂ رندي و میخواری درافگنیم
همین دم باشد اے واعظ که تاقاضی خبر یابد
کشیم او را ز محراب و ترا از منبر اندازیم
بخاک پاے خود چندان بده فرصت سرما را
که بر گیریم ازیں پاے و بہ پاے دیگر اندازیم
کمال از موج غم چون نیست گرداب (جهان؟) خالی
بیاتا بر لب دریاے باده لنگر انداز یم

ترقیء اُردو

از

(جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب 'کیفی')

آثار زمانہ

نہیں احساس کیا احباب کو موجودہ حالت کا
ہے رفتار زمانہ میں چلن بجلی کی سرعت کا
زمانہ جدت آئیں ہے - زمانہ جدت آئیں ہے
بڑا ہے بانگ بے ہنگام افسانہ قدامت کا
غلط ہے یہ سمجھنا اس سے جو کچھہ ہوچکا اب تک
وہ سب ہے لغو اور بیکار - دفتر ہے حماقت کا
پہنتے تھے جو تم بچپن میں کپڑے اب نکمے ہیں
جوانی اور اُس میں فرق ہے قد اور جسامت کا
مناسب جو کبھی پوشاک تھی اب ہے وہ ناکارہ
یہی عالم مہذب قوم کی ہے ہر اداارت کا
جو قومیں زندہ ہیں - پابند تغئیر و تمدن ہیں
رہے گا اُن کے سر پر بوجھہ آئینی اطاعت کا
طبیعی زندگی جس طرح ہے تغئیر کا معرض
ادب پر بھی ہے عاید حکم تغئیر اور جدت کا

کل اور کل

جو کل تھا وہ نہیں ہے آج - پھر کیسی ہے یہ کل کل
کہ ہم اس کو نہ مانیں گے ہو جس میں رنگ جدت کا
ہمیں بھی تو پڑی ہے کل کی، لیکن فرق اتنا ہے
کہ دیروز ازل ہے ایک - اک فردا قیامت کا
ہمیں ہے عاقبت کی فکر - مستقبل کا سانسا ہے
اُنھیں ماضی کی رٹ ہے اور وظیفہ ہے قدامت کا
جو ہونا تھا ہوا - اچھا ہوا - اب اس کو جانے دو
جو آخر بیں ہے انساں اُس کے سر سہرا سعادت کا
"مبارک بندہ ہے جو مرد آخر بیں ہے*" سن رکھو
یہ ہے قول سلف، جوہر بھرا ہے اس میں حکمت کا

قدامت

کبھی اردو زباں کی آپ نے تاریخ بھی دیکھی
کہ تھا معیار کیا پہلے - اور اب کیا ہے فصاحت کا
زباں تھی میر و مرزا† کی جو تھی یکرنگ وفاجی‡ کی؟
تو پھر بیوقت کا یہ راگ کیوں گایا قدامت کا
قدامت کے اگر ہو مدعی تو شوق سے بولو:
"جگہ" کو "جاگہ" اس میں کیا ہمن کوں سحل، حجت کا

---

* ع "مرد آخر بیں مبارک بندہ است" -

† میر محمد تقی "میر" وفات سنہ ۱۸۱۰ ع - مرزا رفیع سودا - وفات سنہ ۱۷۸۴ ع —

‡ یک رنگ تخلص - غلام مصطفیٰ خاں نام - طبقۂ اول کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں - "تاجی" تخلص - سید محمد شاکر نام - نادر شاہ کے حملے کے وقت زندہ تھے —

وهي بولو زباں، هاں "هاں! سمجھ بچ مطلب آوے هے"
همیں کیا "کاروہ لیویں نین سیتی" بصیرت کا
کرو "باتاں سجن سیں" جس طرح اسلات کرتے تھے
کرو "انجواں" سے دریا برد سارا ملک بھارت کا
سخن اسلات کا تھا خوب یعنی اُس زمانے میں
یہی تھا اقتضا شان فصاحت اور بلاغت کا
بہت اچھا ہوا، جو کچھہ ہوا ہے اگلے وقتوں میں
سزاوار اهانت هے نہ مستوجب شکایت کا
محقق اُن دفینوں میں جواهر ڈھونڈ سکتے هیں
کلام اُن کا هے اک سرچشمہ تاریخی افادت کا
مگر دوراں کا درد سر یہ کس کے ساتھے جائیگا
تغیر هوچکا هے، هورها هے، کس قیامت کا
وہ احساسات کے بندے تھے، هم کو کام کرنا هے
یہی هے امتیاز اُن کی، همارى ڈھلی حالت کا
وہ اپنے وقت میں جو کہہ گئے هم کو هے فخر اُس پر
سخن تھا ان کا عکس اس وقت کی موجودہ حالت کا
ضرورت هی کچھہ ایسی آپڑی، طرز عمل اپنا
نہ هو احساں فراموشی، نہ شیوہ هی بغاوت کا

جدت اولیں

بنایا اولیں انسان کو جب دست قدرت نے
ملائک کو هوا ارشاد سجدے اور حرمت کا
جھکیں سب حضرت آدم کے آگے، حکم ربی تھا
اُٹھایا اهرمن نے عذر لیکن اس پہ بدعت کا

کہا اب تک خدا کو سجدہ ہم کرتے رہے سارے
منافق یہ نیا ارشاد ہے رسم قدامت کا
سزا میں اس کی وہ راندا گیا قہر الٰہی سے
ملا گردن کشی کا ثمرہ اُس کو طوق لعنت کا
مفصل دیکھنا ہو تو کلام اللہ * میں دیکھو
یہ پہلا واقعہ ایجاد و وجدت سے بغاوت کا
یہ تم خود سوچو وہ ابلیس یا اللہ کے پیرو ہیں
جو یہ جھگڑا اُٹھاتے ہیں قدامت اور جدت کا

تجدید قدیم

جو کل کا سا نہیں ہے آج، کیوں کل آج کا سا ہو
جو بدلی ہے تو بدلیگی، ہے دنیا نام جدت کا
نہیں تو عالم ایجاد کیوں سب اس کو کہتے ہیں؟
لغت ایجاد وجدت کا جو ہم معنی ہے بدعت کا
سند کے نام سے سمجھے کہ چھوٹے سو بکھیڑوں سے
سند پر ہی اگر ہے حصر اُن کی بحث و حجت کا
تو فرمائیں سند لائیں گے کس اُستاد پیشیں سے
سخن پر اُن کے، جن کا نام ہے ممدوح خلقت کا
"تفن" "نمبر" "فریم" "افشا" و "غالب" اور "ناسخ" نے
جو باندھا، تو قدامت نے کیا صاد اس پہ صحت کا؟

---

* سورہ بقر—

+ "افشا": ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں تفن

"غالب": سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پرے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر (نمبر) سہرا

"ناسخ": ترے رخسار تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے
فریم آئینے کی نبتی ہے ہالہ ماہ کامل کا

وہ آغاز تغیر تھا، نہ فرمایا گیا اس پر
یہ استعمال ناجائز، ہے سقم اس میں غرابت کا
مزے سے ذوق "اُڑائیں فیر" اور "انشا" تفن چکھیں
تذر، توس اور بسکت میں ہے ان کو عذر حلت کا

مولویت اور تصرفات زبان

کہیں یہ دھن سمائی کشف اور قاموس لے بیٹھے
سبق رٹنے لگے اعراب کی تحقیق و صحت کا
سکون و کسر سے زیر و زبر عالم کو کر ڈالا
رہا مسلک یہی ہر اجتہاد آئیں کی اُمت کا
لغت کی لغویات آکر ہوئیں حاوی تصرف پر
کنوتا کر دیا اردو زبان کو مولویت کا
وہیں ماخوذ کو چھوڑا، پڑے ماخذ کے قضئے میں
نیا اُن کو مرض یہ ہوگیا اردو کی صحت کا
نہ سمجھے لفظ جو اردو میں آیا، ہوگیا اردو
جنھیں اُن کو نہیں موتی یہ "دریاے لطافت"* کا

زمانہ بدل رہا ہے

کُنہالی میں ہے ملک اس وقت اردو بھی اُسی میں ہے
وہی ہوکر رہے گا حکم جو ہوگا مشیت کا
بہت نازک ہوا کرتا ہے ایسا وقت قوموں کو
نہیں باتوں سے چلتا کام، ہے موقع یہ ہمت کا
نظر اُس کی رہے اس پر جو وقت اب آنے والا ہے
لیا ہے اپنے ذمے جس نے فرض اردو کی خدمت کا

---

* نام کتاب مصنفۂ سید انشا مرحوم صفحہ —

کریں کیا ہوگئی ہے کچھہ سے کچھہ صورت زمانے کی
نہ اطمینان اگلا سا، نہ ہے عالم فراغت کا
"یہ ہے نا اہل، اسے اردو سے مطلب؟ کیوں سکھاتے ہو!"
عمل اور قول ایسا تھا کبھی اہل قداست کا
یہاں اب سارے ہندستان کو اردو سکھانا ہے
نہیں یہ ایک دو کا کام، ہے ساری جماعت کا
کبھی دل کے پھپولے پھوڑنے سے شغل رہتا تھا
ہمارے سر پہ بوجھہ اب آ پڑا ہے کس قیامت کا
ضرورت ہے زباں میں سارے علم و فن سما جائیں
سوال اپنا سلف کی روح سے خود ہے اعانت کا

زبان کا فعل منصبی

زباں کی وسعتیں پہنائے عالم سے فزوں تر ہیں
بنا پر اس کی قایم قصر ہو علم اور حکمت کا
زباں ہے ترجماں علم و تجارب اور تخیل کی
ہے وسعت ان کی معیار مسلّم اُس کی وسعت کا
یہ فرماتے ہیں علم السنہ کے جاننے والے
خیال و نطق کے بارے میں کیا مذکور سبقت کا
بغیر الفاظ کے فعل تخیّل غیر ممکن ہے
تم اب خود دیکھہ لو رتبہ ہے کس کو اوّلیت کا
زباں کی وسعت و تنگی خیال و نطق پر حاوی
عرض یہ تو وہ جوہر، ہے یہ سنگم طرفہ حیرت کا
زباں وہ کیا جو کردے ذہنیت کو پست اور عاجر
شعور اور مدرکہ پر ڈال دے پردہ جہالت کا

تمدن ارتقا کا ہم‌ردیف - اُس کا مرادف ہے
زبانِ زندہ ہے اردو تو کیا جھگڑا قدامت کا
جو بدعت ہی اسے کہنا ہے، کہئے بدعت حسنہ
ترقی کے منافق ہی اگر ہے فتووں حضرت کا

تغیرات سابق دلیل تجدید

اگر تبدیلیاں اس میں ہوئی ہیں اور بھی ہوں‌گی
جب ایسا ہوچکا ہے تو یہ ماتم کیا ہے جدت کا
وہی تھی کیا زبان ذوق و آتش، ناسخ و مومن
چمن جس میں کھلایا میر اور مرزا نے جودت کا
ولی اور آبرو* کے متبع آیا یہ دونوں تھے
اسے بھی دیکھیں، گر ہے شوق تحقیق صداقت کا
نہ وطواط اور سکا کی† کے وہ اندھے مقلد تھے
چلن "خذما صفا" کا رکن تھا اُن کی عقیدت کا
نہ اگلوں سے اگر تجدید و اصلاح زباں ہوتی
تو اب تک ہم میں رہتا نقص لثغہ اور لکنت کا
سبق اصلاح کا ہم کو بزرگوں نے سکھایا ہے
جو کوئی معترض ہو اس پہ، آئینہ ہے حیرت کا

---

* ولی تخلص - شمس‌الدین نام (اس میں اختلاف ہے) اورنگ زیب کے عہد میں دہلی آئے - وفات سنہ ۱۷۴۲ ع —
آبرو تخلص - شاہ مبارک نام - خان آرزو سے مشورۂ سخن کرتے تھے - طبقۂ اول کے شعرا میں ہیں —

† رشیدالدین وطواط - مصنف مفتاح‌السحر - وفات سنہ ۱۱۸۲ ع۔
سکا کی لقب - ابو یعقوب یوسف بن ابوبکر نام - مصنف مفتاح‌العلوم وفات سنہ ۱۲۲۹ ع۔

لئے بیٹھے ہو تم اُس کو جسے وہ چھوڑ بیٹھے تھے
اصول اُن سے نہ تھا بیگانہ اصلاح اور جدت کا
جو وہ دو گز بڑھے، دس گز بڑھو یہ تم کو لازم ہے
سپوتوں کے کرو کام اور تمغالو سعادت کا

عہد حاضر میں تغیر لا بد

عوارض نو بہ نو تجدید کا پیغام لائے ہیں
عبث جھگڑا اُٹھانا ہے قدامت اور جدت کا
جو قوموں کے تغیر میں ہوا ہے حکم ربانی
نہیں محتاج وہ ہرگز سند کا اور شہادت کا
خدا نے اُس کی حالت کو نہ بدلا ہے نہ بدلے گا
نہیں جس قوم کو دھیان آپ ہی تغئیر حالت کا*
ترقی اور تغیر زندگی کی شرط اول ہے
بد یہی امر ہے یہ، اس میں کیا ہے دخل حجت کا

لا یسعۂ عمل

زباں میں جس کو وقعت گلیہ کی ہو کلی حاصل
وہی اک قاعدہ موزن ہے قانون قدرت کا
قواعد کون سے ہیں وہ؟ یہی تحقیق کرنا ہے
ہر اک قانون بن سکتا نہیں قانون قدرت کا
ہے یہ بھی دیکھنا، کرنا ہے کیا آئندہ نسلوں کو
مشاغل اُن کے کیا ہوں گے؟ تقاضا کیا طبیعت کا؟
غرض جو کچھ بھی ہوگا ہو، مگر یہ دھیان رکھنا ہے
کہ ہیہ ہی بگڑ جائے نہ اردو کی لطافت کا

---

* ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم —

جو اردو پن ہی زایل ہو گیا، کیسی وہ پھر اردو
یہ سب کچھہ ہے سوچنا فرض ارباب لیاقت کا
رہے اردو کی اردو، کام بھی نکلیں سبھی اُس سے
نظر ہے ان اصولوں پر، نہ ہو اندیشہ بدعت کا
جو اپنائے وطن ہیں اہل اردو کی ترقی کے
نہیں ہاتھوں میں اُن کے خدشہ اردو کی حفاظت کا
اہم یہ فرض ہے، وقعت کو اس کی وہ سمجھتے ہیں
وکالت اک طرف، احساس ہے اُن کو کفالت کا
بزرگوں کے بنائے کو بڑھانا کام ہے اُن کا
یہی ہے فرض اُولیٰ اور تقاضا بھی دیانت کا
تمہارے بعد آنے والے اس کو خوب جانچیں گے
سلف کا عزم کیا بالفعل تھا اردو کی خدمت کا
مفصل عرض ہوگا اہل اردو کو جو کرنا ہے
ذرا موقع ملے "کیفی" کو اطمینان و فرصت کا

———— : ✱ : ————

باغِ کہن

مثنوی آبرو

[شاہ مبارک آبرو، ابتدائی دور کے مشہور شاعر ہیں - ان کی یہ مثنوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کسی بیاض سے نقل کرکے عنایت فرمائی ہے - اگرچہ یہ نظم آج کل کے ذوق اور تہذیب سے کسی قدر گری ہوئی ہے لیکن ادب و معاشرت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے- اُس وقت کی زبان کا رنگ تو خیر معلوم ہوتا ہی ہے لیکن اس کا پتا بھی لگتا ہے کہ ان کے زمانے میں شریف گھرانوں کے کم سن لڑکوں کا کیا لباس ہوتا تھا - اس مثنوی میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے - ایڈیٹر]

ہے سزاوار ثنا وہ باکمال — جلوہ گر جن نے کیا حسن اور جمال

خوبرویوں کو سکھائیں خوبیاں — ناز کو تعلیم کیں محبوبیاں

عاشق اور معشوق کو پیدا کیا — ایک کا دل ایک پر شیدا کیا

دیکھو قدرت اس کی اے اہل وفاق — کیا عجب واقع ہوا ایک اتفاق

ایک دن میں گھرستی ہوکر اداس سیر کرنے کو اُٹھا تھا آس پاس
دیکھتا پھرتا تھا دلی شہر کو کوچۂ و بازار، باغ و نہر کو
ناگہاں ایک خوب صورت مل گیا دیکھتے ہی اس پہ میرا دل گیا
کیا بیاں کیجے کہ وہ تصویر تھی دل کے حق میں مایۂ تسخیر تھی
چشم و ابرو، رنگ رو، یہ خوب تھا عضو عضو اس کا ہر ایک محبوب تھا
قد و قامت تھا نپٹ ترکیب دار خوب لگتا تھا بہت روشن† کٹار
لیکن اپنے حسن سے تھا بے خبر ترک آرائش کو بوجھا تھا ہنر
سر اوپر پگڑی تو فا معقول تھی برمنے جامہ نہ تھا ایک جھول تھی
جو کہ اس کو دیکھتا انکھیاں ملا اس کے تئیں کہتا ہوا اور بھاگتا
تب کہا دل نے کہ اب صد حیف ہے ہے یہ ایسی سے و یوں بے کیف ہے
قصد کر نزدیک اُس کے میں گیا حکمتوں سیتی لیا باتوں لگا
جب ہوا با یک دگر واقع کلام تب لگا کہنے کہ کیا ہے تیرا نام
تب کہا میں نے اسے اے نیک خو کہتے ہیں میرے تئیں کو آبرو
نام سنتے ہی کیا اُٹھہ کر سلام خوش ہوا، ہنس کر لگا کرنے کلام
بات تیری شہر* آفاق ہے دل ترے اشعار کا مشتاق ہے
مدتوں سے شوق رکھتے ہیں ہمن‡ کچھہ عنایت کیجئے اپنا سخن
بات اپنی کر چکا جب وہ تمام سنتہی جب ہوچکا اس کا کلام

---

* پہلے زمانے میں "یہ" بمعنی "کیا" استعمال ہوتا تھا —

† روشن کٹار بمعنی چمکدار کٹار - یہ محاورہ اب بھی استعمال ہوتا ہے - ہاں کٹار باقی نہ رہنے کی وجہ سے اب چھری کہنے لگے ہیں - بازاری لوگ معشوق کو "کٹارا" اب بھی کہتے ہیں - میرے خیال میں یہاں بھی جگہ "جیسے" ہونا چاہئے —

‡ ہمن، بمعنی ہم

تب کہا میں نے کہ یہ میرے سخن — وصف میں خوباں کے ہیں سرتا پیں*
یا بیاں ہے ان کے رنگ و روے کا — ذکر ہے یا خال و خط و موے کا
یا طرح ہے ان کے سانحہ و ہود کی — یا طرح اُن کے زیان و سود کی
یا کہ باتیں زینت و پوشاک کی — یا طرح ہے شوخی و ادراک کی
سو تو وہ طرحیں تمھیں آتی نہیں — دل سے وہ باتیں تمھیں بھاتی نہیں
پس مرے اشعار کو بوجھوگے کیا — لے کے ان بیتوں کو تم سوجھوگے کیا
تب کہا ان نے کہ ان طرزوں کے تئیں — دلبری و ناز کی طرحوں کے تئیں
پیار سے مجھ کو سکھاؤ ایک ایک — طور خوبی کے بتاؤ ایک ایک
جہل کا برطرف ہو جاوے خلل — علم ہو تو میں کروں اس پر عمل
شاعری موقوف کی میں نے تمام — اب میں سیدھی طرح کرتا ہوں کلام
تجھ سا جو لڑکا کہ وہ بے بوجھ† ہو — اس کے دل میں اس طرح کی سوجھ ہو
گرچہ معشوقی کا ہے|تجھ دل میں دھن — تو سجن کانوں سے ان باتوں کو سن
اوّلاً رکھو سر اُپر پٹے مدام — بال رکھو دونوں طرف کے سب تمام
سر کو پیشانی کے اوپر سے منڈا — کنپٹی پر استرے کو مت چلا
دھوکے پھر سکھلا، کنگھی سے صاف کر — تیل دے کے گوندھ رکھو موباف کر
بال گوندھے ہوں تو چیرا مت اتار — خوب نہیں لگتے کسی کو زینہار
روشنی ‡ لے کر کے تو مکھڑے کو مل — دھوپ ہو تو گھر سے باہر مت نکل
زعفران اور تیل چنبیلی کا لے — کاٹ کر اُس بیچ رس لیمو کا دے
یہ دوا ہو روز استعمال کر — چوپ، جھائی ہو تو یوں پھر چال کر $

---

* اب سرتا پیا یا سرتا پا استعمال ہوتا ہے —
† نہ جاننے والا ۔ نادان کا ترجمہ ہے —
‡ غازہ ۔ اس کے بنانے کی ترکیب خود آگے دی ہے —
$ چال کر: طریقہ اختیار کر —

یہ دوا ہر روز پاتے کو لگا — رات کو مل صبح اُٹھہ حمام جا
آنکھوں میں اپنی سجن! سرمہ لگا — کم نما • رکھہ • مت لگا لے بہت سا
دے بہت† آنکھوں کا کالا منہ نہ کر — ہیجڑوں کے طور سیتی در گزر
ہاتھہ میں پہنچی پہن تعویز دار — آستیں سیتی رکھہ اُس کو آشکار
مل مسی دانتوں منے ریختی جما — خرخنا کر لب کے تئیں بیڑا چبا
دل چلا چاہے تو پہن انگشتری — زیب دے ہاتھوں کو اے رشک پری
شصت‡ اگر خرش رنگ، خرش اسلوب ہو — تو انگوٹھی بیچ رکھنا خوب ہو
تنگ پر جامہ تلے تعویذ باندھ — بیچ میں بازو کے کر تجویز پھاندہ$
کربلا کی ایک سمرن مول لے — دانہ اُس کا آبدار و گول لے
کربلا کی ایک گلے تسبیح ڈال — سچ بنا اور اپنی چھب تختی نکال
کربلا کی خاک کا گہنا بنا — رکھہ گلے کے بیچ اس کو تو سدا
جب سجے چیرا، تو تو سجدار سچ — جو نہ آوے خوب§ تو نکدار سچ
سچ پر ہو آکا و پیچھا تک بلند — اس طرح کی باندہ جو ہووے پسند
سچ پر ہو آکا زیادہ کج نہ ہو — پاجیوں کی طرح تیری سج نہ ہو
بھوں سے تک پگڑی کا کج تو دور رکھہ — سر کو چاروں طرف سے بور پور رکھہ
سو طرح کی پگڑیاں دیکھے ہیں ہم — لیکن ایک پہنچے برابر ہوگی کم
جو کہ ایک پہنچا ہو اپنے بھاؤ پر — سج ہو اپنی دھج میں ایک نیچے اوپر

• کم نما : عجیب ترکیب ہے، معنی صاف ہے . یعنی "ایسا کہ دیکھنے میں کم معلوم ہو" —

† دے بہت : بمعنی بہت دے کر - بہت لگاکر —

‡ شصت : نکھنہ

$ پھاندہ : پھندا، گرہ —

§ اگر یہ اچھا نہ معلوم ہو —

جوکہ پہلے - پہن تو بس ایک تہہ — خوش قدوں کو خوب لگتی ہے وہ ہی

گھیر دامن کا ہو نو گز یا کہ دس — اس قدر نیمہ و تنپدہ ہو کہ بس

چولی اونچی کر تک ایک تو فات سے — زیب دے دامن کے تئیں سنجات سے

بند اکورے اور نیچی تا کمر — بانھد اور ھاتھوں ستی زیادہ نہ کر

باندہ پٹکا سات گز کا دے کے بل — صاف بندھی ہو، نہوئے چل بچل†

چین کو چاروں طرف سیتی دبا — کھینچ کرکے نیچے پٹکے کے چھپا

ایک آنچل چاک میں دامن کے چھوڑ — اس میں سج لگتی ہے معشوقی کی زور

پھیر پاجامہ پہن مشروع کا تو — اس کے تئیں مغزی لگا کر کے اُتو

نے بہت ہو تنگ وہ اور نے کشاد — معتدل معقول نے کم نے زیاد

باندہ نیچے چین کے شروار بند — ریشمی، خوش طرح کو کرلے پسند

پھر دوپٹہ ایک پلے دار‡ لے — رنگ اس کا لال بوٹے دار لے

گاہ گاہے ڈال لیجے سر اُپر — گاہ گاہے باندہ لیجے در کمر

گاہ گاہے نیم رخ لیجے چھپا — چشم و ابرو اور منہ دیجے بتا

جھانولی$ کی طرح دیکھلا جا کبھی — دیکھ کر عاشق کو شرما جا کبھی

پھیر اپنی رکھہ کمر میں ایک کٹار — پر سنہری ہووے جمدھر آبدار

نیمچے کا ساز جھلکاری کا کر — دے نفر کے ھاتھہ شمشیر و سپر

سونت دامن§ آستیں کو خوب چن — خرچ کر خوبی، جو ہوے تجھہ میں گن

---

* ایسے کپڑے کو کہتے ہیں، جس میں آدھا زر اور آدھا ریشم ہو - اس کا دوسرا نام نیم زری ہے —

† ٹیڑھا سیدھا یا اونچا نیچا —

‡ پلو دار —

$ دونوں ہاتھوں سے گھونگٹ اٹھا کر جھلک دکھانا —

§ دامن سونتنا: دامن کو اس طرح کھینچ کر صاف کرنا کہ سلوٹ نہ رہے —

عطر لے کر اپنے کپڑوں کو لگا — شان سیتی بیٹھہ اور حقہ منگا
ہاتھہ میں رکھہ اپنے تو صاحب رومال — پونچھتا رہ دم بدم مکھڑا و گال
مسکرا دے اولاً تب بات کر — جب سخن کر سو ادا کے ساتھہ کر
بھوں چلی جاوے سخن سازی کے ساتھہ — گرم رکھہ انکھیاں نظر بازی کے ساتھہ
ہاتھہ کی حرکت بھی ایک مقدار رکھہ — گاہے گاہے بات کہنے میں کڑک
چال چلنے میں اٹک درکار ہے — پر لٹکنے کا بھی ایک مقدار ہے
چال میں خواہے اٹک، خواہے مٹک — وہ طرح کر جس سے ہو دل کی اٹک
بیٹھنے میں بھی لٹک کے ساتھہ بیٹھہ — عشوہ و ناز و مٹک کے ساتھہ بیٹھہ
سو طرح کی بات جب ملحوظ ہو — تجھہ سے تب مل کر کوئی محظوظ ہو
شوق والے کو سبھوں میں تاڑ لے — ایک نگہ میں جیو اس کا کاڑ لے†
اب زمانے میں اُجالے‡ ہیں کچھہ اور — سیکھہ کر ہندوستاں زاؤں کا طور
کھوڑتے ہیں خوبصورت کے تئیں — دل میں رکھتے ہیں کدورت کے تئیں
غیر صحبت مل کے مت تو پی شراب — آدمی اس طرح جاتا ہے خراب
پر خبر رہنا کہ کوئی خندہ $ نہ ہو — ہوا ہوس ناپاک دل گندہ نہ
جس کو تو جانے کہ عاشق زور§ ہے — غرق تیرے عشق میں سر پھوڑ ہے
اس ستی کچھہ مانگنا درکار نہیں — آپ سیتی لا نہ دے سو یار نہیں

• ایک حد تک —

† کاڑھنا بمعنی نکالنا —

‡ اب زمانے کی کچھہ اور روسی ہے، یا زمانے کا کچھہ اور رنگ ہے - ہمیشہ طنزاً استعمال ہوا ہے —

$ جس طرح عورت کے لئے خندی بولتے ہیں، پہلے زمانے میں اس معنی میں مرد کے لئے خندہ کہتے تھے - عبدالرحمن خاں 'احسان' کا شعر ہے :

نام بندہ ہے اسم زن بندی — یہ تو خندہ ہے اور وہ خندی

§ پہلے زمانے میں اس طور کا قافیہ باندھنا جائز تھا - سودا کا شعر ہے :

ساقی سیمیں تری شب دیکھہ کے گورو گورو — شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

بادشاهی کا ترا دربار ہے　　کوئی خوش دل ہے، کوئی بیمار ہے
ایک کو خدمات ہیں دربار کی　　ایک کو تدبیر کاروبار کی
ایک کو خدمت منے رہنا مدام　　ایک کو ملتا نہیں مجرا سلام
پس شہنشاهی کو لازم ہے کہ سب　　حکم کے تابع ہوں اور مانیں ادب
جب کہ جانے تو کہ کی اب خط نے دھوم　　سو نے ٹھوڑی پر کیا آکر ہجوم
اوّلاً کر قصر* اور پیچھے منڈا　　کام معشوقی کا ان طرحوں چلا
سب ستی مل آشنائی کی طرح　　بھول جا سب دل ربائی کی طرح
اس قدر تو لے برن اپنا بنا　　اور بے خوبوں† کے تئیں باتیں سنا

دو جہاں میں ہو نہ محتاجی کبھو
دین دنیا بیچ رکھہ لے آبرو

---

* کترواںا —

† بے خوبوں بمعنی معشوق جس میں خوبی نہیں ہے —

افغانستان کی زبانیں

از

(جناب محمد حسن خاں صاحب بی - اے، سابق رئیس تدریسات افغانستان)

قرآن حکیم میں الوان و السنہ کے اختلاف کو عالموں کے لئے آیات یعنی نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔ انسانی رنگوں کا تعلق بیشتر نسلوں کے ساتھ ہوتا ہے اور علم‌الانساب میں زبان کو نسل کی تعیین میں بہت دخل ہے - سیاست اور مدنیت میں بھی اس کا اثر پایا جاتا ہے یہ سب چیزیں باہم ایسی مربوط و منوط ہیں کہ ان کی آمیزش، آویزش اور ایک دوسرے پر غلبے کا مطالعہ ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے - ایک ہم جوار ملک کی زبانوں سے واقفیت جو ہمارے ساتھ دینی، نسلی یا سیاسی یکجہتی میں مشترک ہو، غالباً فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہوگی —

افغانستان میں بارہ زبانیں بولی جاتی ہیں - فارسی تقریباً تمام ملک میں، پشتو شرقی اور جنوبی حصوں میں، ازبکی یا ترکی مزار اور میمنہ میں، نورستان (قدیم، کافرستان) میں دو زبانیں، جو در اصل ایک ہی لسان کے دو شعبے ہیں، دیگانو جلال‌آباد کے نواح میں، ارمڑی لوگر وغیرہ کی برکی قوم میں، پشئی اور پراچی کوہستان اور بخراب کے بعض علاقوں میں، شغنی شغنان کے آغا خانی شیعوں میں، پنجابی ہندوؤں اور سکھوں میں، عربی بعض عربوں میں، جو سارے ملک میں منتشر ہیں اور جہاں کہیں رہتے ہیں، وہیں کی زبان میں گویا ہیں، اسی طرح عبرانی ہرات اور بلخ کے یہودیوں میں باہم تکلم کے وقت مروج ہے —

پنجاب میں جو رقبے اور آبادی کے لحاظ سے مساوی ہے، ایک ہی زبان مستعمل ہے صرف پانچ دریاؤں کے درمیان تلفظ و لہجے میں تفاوت واقع ہوجاتا ہے مگر پہاڑی آبادی میں یہ فرق زیادہ نمایاں ہے - اسی سے افغانستان کی کثرت السنہ کا سبب معلوم ہوسکتا ہے - دریا ایک ایسا حائل ہے جو کشتی، پل، شناوری اور ایک موسم میں پیدل بھی عبور ہوسکتا ہے مگر بلند پہاڑوں پر سے گذرنا چونکہ ہمیشہ دشوار ہے اور برف باری میں محال، اس لئے دروں میں مختلف زبانیں قائم ہوجاتی ہیں - جو سلسلۂ جبال پنجاب میں سے ہوکر کشمیر اور چترال سے چکر لگاتا ہوا افغانستان میں پہنچ جاتا ہے ایسی اقوام کا مسکن ہے، جو نہ صرف ایک ہی خاندان کی زبانیں بولتے ہیں بلکہ وہ اپنے جسموں اور چہروں کی بناوٹ اور رنگت میں بھی مشابہ ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ ایک ہی تنے کی ٹہنیاں ہیں، اصل سے دور جاکر ان پر فارسی کا پیوند لگ گیا ہے - مثلاً نورستان میں سنسکرت کی دو شاخیں زبان زد ہیں، ریزہ کوہستان میں ایک قسم کی ہندی بولی جاتی ہے اور اس کے متصل کوہستان پنجشیر اور کوہ دامن میں فارسی، حالانکہ اکثر باشندے اسی گھرانے کے ہیں --

افغانستان چونکہ ہندوستان کی شاہ راہ رہی ہے، جہاں سے فاتحین کو عبور و مرور کرنا پڑا ہے، اس لئے وہ حصے جہاں سے لشکر گذرتے تھے، انھیں کی زبانوں میں رنگے گئے اور گوشہ گیر قبائل اپنی ہی پرانی بولی بولتے رہے؛ کیونکہ محاربات کی ہلچل کا اثر ان تک نہیں پہنچتا تھا - اگرچہ دور جاکر سب آریائی نسل میں مختلط ہوجاتے ہیں مگر نزدیک ان کا رابطہ پنجابی اور پہاڑی اقوام کے ساتھ ہے، جو کشمیر اور شملے کے درمیان آباد ہیں - جنوب اور مشرق میں ہندی اقسام کی زبانوں پر پشتو کا غلبہ محکم ہوگیا اور شمال و مغرب میں فارسی مستولی ہوگئی، اس لئے انھی دو کا تذکرہ فی الحال مناسب ہے :

فارسی

افغانستان کی فارسی میں بھی ایران کی نسبت بہت فرق ہے - بعض کلمات ترکی کے داخل ہوگئے ہیں، جن کی شناخت عموماً حرف قاف سے ہوتی ہے، جو ترکی کے خاص حروف میں سے ہے- مثلاً: قیل (اونچا) قالاق (چوٹی) شالاق (درد مند) اشپلاق (سیٹی) ارچق (کھرنڈ) اسپلق (انگلی مارنا) پچق (دبانا) چار پلق (چار زانو بیٹھنا) اشتق (بچھ) اشاق (بچے کا رونا) قیماق (بالائی) قرت (گھونٹ) قروت (خشک چھاچھ) قابو، قیمہ، قینچی، چاقو وغیرہ بھی ترکی ہیں، جو فارسی کے توسط سے اردو میں بھی پہنچ گئے ہیں- حرف کات بھی ترکی مصادر کی علامت ہے، اس لئے اکثر کلمات جن میں کات ہے اور فارسی میں مستعمل ہیں، پہچانے نہیں جاتے کہ ترکی ہیں یا ہندی- مثلاً کتک (سالن) چُماک (سکڑنا) پُندک (غنچہ)- احتمال ہے کہ یہ لفظ پنجابی ہو، کیونکہ بعض جگہ پھولنے کو پھونڈنا کہتے ہیں اور کابلی فارسی میں تو پھولنے اور سوجنے کے لئے یہی پُندیدن مروج ہے اور آما سیدن کو صرف پڑھے لکھے ہی سمجھتے ہیں —

البتہ ہندی کلمات سے (ٹ) اور (ڈ) کی ثقالت کو رفع کر کے (ت) اور (د) استعمال کرتے ہیں اور بھ، پھ، جھ وغیرہ سے (ہ) کی تخفیف ہوجاتی ہے - لڑائی ، جھگڑا ، پھیکا ، پنکھا ، جھک مارنا (جک زدن - جک ، چھا چھہ بنانے کے آلے کو بھی کہتے ہیں) جھڑکی ، بھنڈارہ ، بھیڑ بھاڑ ، سکھالا (پنجابی میں کشایش کو کہتے ہیں - ایک کوھستانی کابل کے بازار میں کھڑا کہتا ہے : در پنجابندارۂ سردم است، بیر و بار نمیر شود در سکالہ میروم-) سوٹہ ، ڈنڈا ، ڈنڈی ، کٹہ (بڑے سوٹے کو کہتے ہیں) کُٹہ ، (بڑے کتے کو کہتے ہیں) گھاس ، لکڑی (صرف محاورے میں آتا ہے : مثل کاس لکڑی برباد شدند) سات و بات (لات و گزات) گھنا ، کہنا (صرف اس طرح آتا ہے کہ " ایں گپ ہماں کہنا شد " یعنی اس بات کی وہی کہانی ہوئی - گپ بات کو کہتے ہیں اور سخن کی بجائے عام یہی مستعمل ہے-) پنجاب

میں کہتے ہیں "ایشکے" یعنی واہ واہ - کابل میں کہتے ہیں: اشک فلان !- یعنی شاباش فلان - لنگوٹہ پگڑی کو کہتے ہیں اور پہلوانوں کے لباس کو چوتہ ' گھتنہ (پاجامہ) گھانی ' ڈھال (ڈھلواں) مہین اور باریک دونوں فارسی میں بولے جاتے ہیں جنجال ' خنجا خنج (کھپا کھچ)

بُتہ (بوٹا) ' کابل میں درخت صوت اُسے کہتے ہیں جس کے تنے کی لکڑی مضبوط ہو' جیسے اخروٹ ' سیب' بادام وغیرہ؛ اور بُتہ اسے کہتے ہیں جو نرم ہو اور چھوٹا بھی ہو' جیسے گیہوں' چاول اور گلاب وغیرہ کا پودا - اس طرح یہاں فارسی کو ایک وسعت حاصل ہو گئی ہے جو ایران میں نہیں ہے - کابل میں آخر کلمے کے الف اور (ہ) میں بہت تمیز ہوتی ہے - بانکا (بانکہ) کاکہ بد معاش نوجوان کو کہتے ہیں اور کا کا چچا کو - اکثر ہندوستانی ایک معمر کابلی کو چچا کے خطاب سے سخت آزردہ کر دیتے ہیں - اسی طرح دادہ باپ کو کہتے ہیں اور دادا دائی کو' اس میں بھی کبھی کبھی اجنبی لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے - پنجابی زیادہ تر حرکت اور سکون کو منعکس کر کے مضحکہ بن جاتے ہیں - قید خانے میں میری بلی کھو گئی - ایک فوجی کمپنی ہماری نگرانی کے لئے متعین تھی - ایک پنجابی قیدی نے ہمدردی سے ایک سپاہی سے کہا کہ پشک تو نہیں دیکھی؟ وہ ہنسکر چلدیا - کیونکہ پشک بلی کو کہتے ہیں اور پشک فوج کی بھرتی کو- یہ اس لفظ کا مرادف اس طرح ہو گیا کہ پشکل مینگنی کو کہتے ہیں اور آٹھ جوانوں میں سے ایک کو منتخب کرنے کے لئے جسے ہشت نفری کہتے ہیں' دیہات میں اسی سے قرعہ ڈالتے تھے - ایک اور پنجابی نے دوسرے سپاہی سے پَشک کی بابت پوچھا تو وہ بھی اسے مزاح سمجھا - پھر پَشک کہہ کر دیکھا' اس کے بعد پُشک کہہ کے دریافت کیا تو سپاہیوں نے اس کی خوب ہنسی اُڑائی- آخر اشارے سے بتایا تو وہ سمجھے اور پھر انھوں نے بلی کا صحیح لفظ بتایا اور پنجابیوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے غلط کہا تو اس پر پھر قہقہہ لگا' کیونکہ غلط لڑھنے کو کہتے ہیں اور

کابل کے ان پڑھ بھی غلط بلاتے ھیں —

اختلاف السنہ کے لطائف میں مرچ کی ایک مکمل گردان بن جاتی ھے ۔ پنجابی میں مَرچ کہتے ھیں ' کابل میں مُرچ ۔ پھر پشتو میں بعض جگہ مَرچ اور دوسرے مواضع میں مِرچ اور مُرچ تو سب مل کر یہ ھوا :

مِرچ ۔ مَرچ ۔ مُرچ ۔ مُرچ ۔ مُرچ ۔ مُرچ —

دکہ (دھکا) ' تیلہ (تھیلہ) مگرفارسی میں " دکہ خوردن" دل صدمہ کھانا ھے اور جسمانی اعتبار سے تیلہ بمعنی دھکا استعمال ھوتا ھے ۔ جہاں تک میری معلومات میں گنجائش ھوسکی ھے ' تقریباً ایک ھزار ھندی اور ترکی کے کلمات کابلی فارسی میں مروج ھیں ' جو کتابوں میں ابھی مندرج نہیں ھوے اور دونوں کا دخل شاید مساوی ھو گا ' کیونکہ ھندی الفاظ جو میں نے جمع کئے تو پانچ سو کے قریب نکلے ' پھر انگریزی الفاظ بھی آگئے ھیں ' کیونکہ جیسے تعلق دوسری زبانوں کے ساتھہ رھا ھے ' اس کے ساتھہ بھی بہت رہ چکا ھے اور اب بھی کچھہ ھے ' مگر انگریزی کو بگاڑ کر اس کی شکل اپنی فارسی کی طرح بنا لی ھے اور جس طرح کابل کے لوگ یہ نہیں جانتے کہ ھم ھندی الفاظ بول رھے ھیں ' اسی طرح انھیں یہ خبر نہیں ھوتی کہ یہ انگریزی لفظ ھیں —

کرنیل ' جرنیل ' کپتان ' سرجن میجر ' برگد (بمعنی برگدیر) پلتن وغیرہ فوجی الفاظ عام تھے ' مگر حضرت امان اللہ خان کے عہد میں ان کی جگہ پشتو نے لے لی اور جن کے لئے اپنا لفظ نہ ملا ' عربی سے مستعار لے لیا ۔ مشر پشتو میں بڑے یا افسر کو کہتے ھیں ۔ دلگی مشر ' بلوک مشر اور ڈولے مشر تو سو تک سپاھیوں کے افسروں کے لئے ھیں ۔ کنڈک مشر ' (کرنیل) نہنڈ مشر (برگدیر) ' فرقہ مشر (جرنیل) لوا مشر یعنی جھنڈے کا سردار اور اس سے آگے سپہ سالار اور نائب سالار ھیں —

ٹرس (ٹرش) ' سیمت (سیمنٹ) ' لیر (ریل) انجن ' ماشین وغیرہ بہت

سے انگریزی الفاظ عام ہیں۔ میز کا لفظ ہندوستان کی طرح افغانستان میں بھی بولا جاتا ہے جو پرتگالی لفظ ہے۔ برندہ برامدہ سے نکل کر انگریزی میں ورانڈہ ہوا، وہاں سے پنجابی میں ہرانڈہ بنا تو کابل میں ہرندہ۔ سودا، لمایت بھی کابل میں بولے جاتے ہیں اور انگریزی پھولوں کے نام اکثر محاورے میں آگئے ہیں، جیسے: پتونیہ، بربینہ، جربیہ (جربنیم) وغیرہ —

ترکوں نے کابل میں آکر اور افغانوں نے ترکی سے مراجعت کرنے پر ایسے عربی کلمات کو ترویج دی جو پہلے دوسرے معنوں میں مستعمل تھے۔ مثلاً، تقدیر (قدردانی)، عدہ (تعداد اور تعداد بمعنی حاضری) قطعہ (براعظم)، خریطہ (نقشہ)، خط مشی (روش)، قسم (حصہ) تشکیل، تجسم، تثبت، اثبات وجود، حاضر ہونا) تشکر (شکریہ)، موفقیت (کامیابی)، مظفریت (فتح)، ہیئت (جماعت)، جمعیت (سوسائٹی)، شرکت کمپنی تاجران)، استقامت (روبرو رفتن)، نطق (تقریر)، طرح (تفریق)، متنوع متفرق)، متفرق (پراگندہ)، بشریت (بنی نوع انسان)، غریب (عجیب)، نجیب شریف، خصوصی (پرئیویٹ)، عمومی (پبلک)، مفکورہ (آئڈیل)، عقیدہ (رائے)، فکر (خیال)، تشویق (ترغیب)، ملت (قوم)، مجلہ (رسالہ)، جریدہ (اخبار)، فوق العادہ (غیر معمولی)، حتمی (ضروری)، شرف (آنر)، مضبوط (کانفسکیشن یعنے ضبطی) سیاست (حکمت عملی)، صحیفہ (صفحہ)، تقاعد (پنشن)، وظیفہ (فرض، ڈیوٹی) متفکر (مدبر - عاقل)، اساسی (اصولی)، تاسیس (بناکردن) غیر موجود (غیرحاضر) اخطار (تنبیہ)، مجازات (سزا)، مکافات (انعام)، تکدیر (توہین)، ادسان (ورزش)، اکمال (تکمیل)، مصروف (صرف ہوگیا)، ممنون (خوش)، متشکر (شکرگزار)، شفاہی (زبانی)، مکتوب (خط) خط (سطر یا لکیر)، دقت (غور)، جدیت (سرگرمی)، جدی (متین)، اثر (تصنیف)، تصنیف (صنفوں میں تقسیم کرنا)، تسہیلات (آسانی)، معلومات (واقفیت)، ملازم (مامور)، مادون و سافوق (ماتحت و بالادست)، آمر (افسر) —

وسعت تو ہوئی مگر ایسے بیسیوں کلمات نے افغانستان کے تعلیم یافتہ اور عام طبقوں میں ایک طرح کی مغائرت پیدا کردی اور جس طرح لباس کے تفاوت نے ایک تفرقہ پیدا کردیا اسی طرح زبان نے اس مغائرت کو اور بڑھادیا - یہ باتیں زیادہ تر تحریر میں آتی تھیں اور افغانستان کے اخبار اور اشتہار عوام کی سمجھ سے بالا ہوتے تھے - اگرچہ عصفور کی منقار میں حشیش کی ضرب المثل کا طعنہ دے کر کابل کے سنجیدہ لوگ ان جدتوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر نئی پوشاک کی مانند یہ سیلاب بھی روکے نہیں رکا - کالر، نیکٹائی کی طرح تقریر و تحریر ایسے غیر مانوس کلمات کی زنجیروں سے جکڑی گئی جن کو امام غزالی نے سخت گناہ قرار دیا ہے - نتیجہ رجعت ہوا —

بچہ سقا کے آنے پر جس طرح دفعۃً کابل سے تمام یوروپین لباس کا نام و نشان مٹ گیا، زبان بھی پچھلے پاؤں پلٹی، ٹوپی سے جو افغانی کہلاتی تھی، اس طرح ڈرنے لگے جیسے سانپ کا کاٹا رسی سے اور سودا کی نصیحت پر عمل چندے ملتوی ہوگیا :

بر سر بنہ کلاہ مباد کہ گردنت زاہد ز بار گنبد دستار بشکند

اور مہر ولخاں کا کہنا ہوا :

تا شود قبرش زیارت گاہ ارباب ریا خویش را زاہد بزیر گنبد دستار کشت

اس کے ساتھ ہی تقریر و تحریر میں یکبارگی پرانے الفاظ داخل ہوگئے اور کاتب و متکلم سب کے سب جدید کلمات سے خوف کھانے لگے - نرالے امیر نے اپنے منشی کو صحیح حکم دیا کہ آئندہ وہ باتیں فرمانوں میں لکھی جائیں جن کو میں سمجھ سکوں، کیونکہ جن کو میں نہ سمجھوں انھیں وہ ان پڑھ کیسے سمجھ سکتے ہیں، جن کے لئے اکثر احکام لکھے جاتے ہیں - پھر ایک دفعہ دربار میں للکارا کہ موٹے لغت ہرگز استعمال نہ کئے جائیں اور سب تِرت فِرت موقوف ہو - (تِرت فِرت یا جِرت فرت ظاہری شان و شوکت کو کہتے ہیں) —

یہ تو ایک عارضی انجام تھا مشکل اور اجنبی کلمات عربی کی ترویج

کا، مگر اس سے یہ گمان نہ ہو کہ کابل کے ادیب اور شریف بلکہ متوسط درجے کے لوگ قدیم اور مستند فارسی کا مذاق نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ کہنے کی جرات کی جاسکتی ہے کہ جس ہندی فارسی کو امیر خسرو نے ایرانی فارسی پر ترجیح دی تھی وہ حریت کی طرح اردو اور انگریزی سے شکست کھا کر کابل میں پناہ گزیں ہو گئی تھی۔ ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی شاعر بلکہ خاتم الشعرا مرزا بیدل اپنے وطن میں پامال ہو کر افغانی جذبات پر دو صدیوں سے حکمرانی کر رہا ہے۔ سردار غلام محمد خان طرزی نے ساٹھ ہزار روپے کی لاگت سے دیوان بیدل ایسا خوش خط لکھوایا اور مرصع کرایا تھا کہ جس کی نفاست دیکھ کر امیر شیر علیخاں کے ولی عہد کا دل للچانے لگا تھا۔ اگرچہ بیدل کا تمام کلام جہاں گہرا ہے وہاں بلند بھی ہے (عمیق ایسا " ز بحر فکرتم بیدل موج خیز معنی ہا ست " اور منیع ایسی " کو ہم وکتل دارم ") پھر بھی کابل کی محفلوں میں اور کوئی کلام ایسا پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا اور گویّے موقع و محل کے مناسب اس کے اشعار پڑھتے اور حضار کو محظوظ کرتے ہیں۔ بادشاہی مجلسوں سے لیکر عام لوگوں کی محفلوں تک کی رونق بیدل ہی کی غزلیات سے ہوتی ہے۔ نہ صرف ان میں ہر آن کے موافق بلکہ ہر زمان کے مطابق مضامین گائے جاتے ہیں —

ظاہری عالموں کی ہجو تو شاعروں کا وتیرہ ہی رہا ہے مگر بیدل کے گانے والے اس میں سے بھی مناسب اشعار انتخاب کر لیتے ہیں —

عذر مستاں گر فسون ساری باشد چہ سود۔ محتسب خر کرہ است اے بیخود ان گوسالہ نیست

پھر مجذوبوں کی حقیقت کو یوں آشکارا کرتے ہیں —

انبیا صاحب دعوت بودند صورت و معنیء الفت بودند
عمر ہا از اثر سعی وفاق عرصہ دادند طریق اخلاق
تا توزاں شیوہ مکرم گشتی غولیت محو شد آدم گشتی
گر جنوں رسم ہدایت میداشت جذبہ، در خلق سرایت میداشت

و گرایں شیوہ بقانوں میپوند ہمہ کس امت مجنوں میپوند

پھر جو لوگ دیوانوں کے پیچھے عقیدت کے مارے مارے پھرتے ہیں اس طرح مورد ملامت ہوتے ہیں —

طفلی ہست در آب و گل شاں کز مجانیں بشکیبد دل شاں

بڈھوں کو چڑانا اور جوانوں کو بہلانا منظور ہوتا ہے تو ایسے شعر چن لئے جاتے ہیں —

ایں قدر ریش چہ معنی دارد غیر تھویش چہ معنی دارد

آدمی خرس چہ ظلم است آخر مرد حق میش چہ معنی دارد

حذر از زاہد مسواک بسر عقرب و نیش چہ معنی دارد

وراثت اور ثروت کی تحقیر کرتے ہوئے ہمت کی یوں تقدیر کی ہے —

رمز آشنائے معنی ہر خیرہ سر نباشد طبع سلیم فیضی است ارث پدر نباشد

امروز قدر مردم مقدار مال و جاہ است آدم نمیتواں گفت آنرا کہ خر نباشد

چیں کدورتے ہست بر جبہۂ نگیں ہا تحصیل نامداری بے درد سر نباشد

تعلیم و ترتیب کے تازہ ترین اصولوں کی اس طرح اشاعت کی جاتی ہے —

فرو تا خورشید امکاں گرم از خود رفتہ اند یک قدم باہر چہ جو شد ذوق آگاہی گزیں

در تماشا گاہ ہستی کور نقواں زیستی محرم آں جلوہ شویا مرگ ناگاہی گزیں

ہر دو عالم شوخی پست و بلند ناز اوست گر نگاہ قاصر نباشد ماہ تا ماہی گزیں

اعتبار اندیشہ بیدل ندامت ساز کن شمع محفل بودن آساں نیست جانکاہی گزیں

شرف و عز نفس کی تلقین اس طرح فرمائی ہے —

بے فقر آشکار نگردد عیار مرد بخت سیاہ بود محک اعتبار مرد

پاس وقار و سد سکندر برابرست جز آہن و چو تیغ نہاید حصار مرد

اینجا در آب تیغ بخواں فوطہ خوردن است آئینہ تا کجا بود آئینہ دار مرد

بیش است عزم شیر بگا و بلند شاخ بر خصم بے سلاح دلیریست عار مرد

سیاسی افغار کی موجود کی میں ایسے اشعار بہت سنے جاتے ہیں -

دارد ہمن دل شدہ امشب سر جنگے گلہرگ کمانے پر طاؤس خدنگے
پیش کہ برم شکوہ ازآں نرگس کافر بیچارہ شہیدے زدم تیغ فرنگے
مشکل کہ ز فکر عدم خویش برائیم داریم سرے و بگریباں نہنگے

بعض اوقات فروں کی طرف کنایہ کرکے یہ اشعار سنائے جاتے ہیں -

مطلبے گر بوداز ہستی ہمی آزار بود ورنہ درکنج عدم آسودگی بسیار بود
سردہ ہم فکر قیامت دارد آرمیدہ چقدر دشوار است
دنیا الم غفلت وعقبیٰ غم اعمال آسودگی ازما دوجہاں فاصلہ دارد

اگرچہ کابل میں بیدل کے سوا اور شعرا کو چنداں وقعت نہیں دیجاتی پھر بھی وطنی اور مقامی استادوں کا کلام تفوع یا چاشنی کے طور پر درمیان میں استعمال ہوتا ہے - منجملہ بہت سے شاعروں کے ایک ولی طواف ہے یعنی پھیری کرکے انگور بیچنے والا ' جس کے دیوان کا نسخہ موجود ہے مگر اس سے اس کی بے علمی بہت کم مترشح ہوتی ہے' البتہ ایک دفعہ امیر شیر علی خاں نے اس سے کچھ شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس کا امی ہونا ثابت ہوگیا - پہلے تو ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے —

بمقابل دو چشمت دل مبتلا نشستہ چہ دلاوراست ایں دل کہ دم بلا نشستہ

پھر اظہار مطلب کیا —

چوں الف عریانم اے صاحب اثاث بے لباسم نے لباس و نے لباس

افغانی ترکستان میں ' تے ' ' دے ' یا ' بدے ' سے نکلا ہے اور 'نے' سہ کی طرح بولا جاتا ہے —

اب بھی کابل میں بہت سے قدیم اور جدید قسم کے شاعر موجود ہیں جو کبھی ان ہندی محاوروں کو بھی استعمال کر لیتے ہیں جو عام رواج میں آچکے ہیں —

تن مدہ اختلاط چسپاں را جامۂ تنگ زود چیر شود

کابلی فارسی میں ہندی افعال کی پھروی میں خواهد بودند - خواهد رفتم - خواهد آمدی وغیرہ ایراد ہوتے ہیں - مگر تحریر میں نہیں آتے البتہ خلات اس خیال کے کہ شعر وسخن میں استعارے پرانے تیر و کمان ہی کے موزوں ہیں افغانستان میں بندوق اور گولی فعل و قول میں یکساں رواج پاگئی ہے -

دانی کہ چہ گفت ماشہ در گوش تفنگ

حرف سر گوشی جوانے را بکشتن مید هد

(ماشہ بندوق کے گھوڑے کو کہتے ہیں)

ایک ہراتی جوان نے ایک قصیدے میں تھوڑا عرصہ ہوا اپنی صنعت کا یوں اظہار کیا تھا —

نفس وحیدے کہ نیست در طرفین زمین از سہ نژادے جہاں ہمچوولے آز اصفیا
۱ ۲ ۳

چار ململ از مکیں پنج قطعہ از مکان شش روہی سلطنت گشتہ بوے مہتدا
۴ ۵ ۶

ہفت قوی ہشت جز و در تن با شو کتش نہ عرض وہ حواس چیدہ شد از ماسوا
۷ ۸ ۹ ۱۰

ہرات کی فارسی البتہ ایران کی زبان سے بہت قریب اور ہزارہ جات کے لاکھوں مغل تو اسے اس لب و لہجے سے بولتے ہیں کہ کابل میں اس کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے پھر پرانی ترکی کے الفاظ اسے اور مشکل بنا دیتے ہیں - مثال کے طور پر ایک دو واقعے لکھے جاتے ہیں - امیر عبدالرحمن خان نے جب اس علاقے کی سرکشی کے بعد اسے فتح کیا تو باغی گرفتار ہوکر سپہ سالار کے سامنے آتے اور یہ فریاد مچاتے تھے : بد کردی بر پدر خور لعنت کردی جک زدی گندگی خوردی - متکلم کی میم کے بجائے مخاطب کی یا کو ایسے موقعے پر پیش کر ناجس مزید عقوبت کا باعث ہوسکتا تھا قیاس کیا جا سکتا ہے —

ان لوگوں میں بعض اشخاص نجومیوں کی حیثیت رکھتے ھیں جو بھیڑ کے کندھے کی ھڈی دیکھہ کر عجیب و غریب پیشین گوئیاں کرتے ھیں انھیں اوقی کہتے ھیں اور عام باتوں میں جو گتھی پڑجاتی ھے تو اس کے سلجھانے کے لئے انھیں کی طرف رجوع کی جاتی ھے۔ ھزارہ جات میں دو چیزیں شاذ ھوتی ھے ایک تو چیچک، دوسرے داڑھی وغیرہ کے بال، اس لئے استرے کی شکل اکثروں کی نظر سے نہیں گذرتی۔ ایک نے کہیں استرا پڑا پالیا تو حیران ھوکر اوقی سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا ھے۔ اس نے جواب دیا کہ "چوچۂ ارہ اے ھر گایت کتہ شوہ دندوں موکشہ (آرہ کا بچہ ھے جب بڑا ھوا تو دانت نکالے گا) —

اسی طرح کسی نے سیہہ دیکھہ لی تو اپنے گھر آکر اس کی یوں تعریف کی: اتہ آیہ بسہ دم مو یک شے دیدی بغندک بوچار دورش جنگلک کلہ گکش دُر موشد بُر مو شد سونے از مو تونخ موکرد دل از مویک ساخ موشد (باپ ماں پیاری لڑکی میں نے ایک چیز دیکھی گول مول تھی اس کے چاروں طرف جنگل، اس کا سر اندر جاتا تھا باھر آتا تھا، میری جانب تکتا تھا، میرا دل ایک کیفیت پیدا کرتا تھا) —

یہ مختصر حال افغانی فارسی کا ھے اگرچہ کئی اور اقسام بھی قابل ذکر ھیں مثلاً گردیز میں عین افغانی قبائل میں ایسے فارسی بولنے والے رہتے ھیں جو اب تک عتیق پہلوی بولتے ھیں اور زمر کی اولاد کہلاتے ھیں۔ ان کے نزدیک ھی ایک موضع گبر منگل ھے جہاں خالص پشتو بولی جاتی ھے۔ اب کچھہ توجہ افغانی یا پشتو کی جانب مناسب ھے —

پشتو

حضرت امان اللہ خاں کے عہد میں چونکہ بادشاہ پشتون تھا، پشتو کی ترویج و ترقی اس اعتبار سے کہ ع: ھم زبانی خویشی و پیوستگی است رئیس تدریسات عمومی افغانستان کی حیثیت سے میری راے میں نہایت ضروری تھی۔ اس لئے میں نے

یہ تحریک مدتوں جاری رکھی اور وقتاً فوقتاً بادشاہ اور وزرا کو اکساتا رہا یہاں تک کہ ایک مجلس شاہانہ صدارت میں قائم ہوئی اور مذاکرات کے بعد یہ فیصلہ ہوگیا کہ پشتو درباری سرکاری اور بازاری زبان قرار دی جاے ۔ خالص پشتو کا لغات ترتیب دینے کے لئے ایک ہیئت متشکل کی گئی جس کے لئے تمام ملک کے صحاری و جبال سے ارکان فراہم کئے گئے ۔ اس کمیٹی کے دو عہدہ داروں میں علمی تنازع کی وجہ سے جب دو فریق بن گئے تو میں تصفیہ کرنے کے لئے حکم مقرر کیا گیا اور طرفین نے رضامندی سے میرا فتوی قبول کرلیا ۔ باوجود اس کے جب مجلس عالی میں جہاں وزرا اور اسلامی سفرا بھی حاضر تھے یہ بحث پیش آئی کہ کابلی اور قندھاری زبانوں میں سے کونسی پشتو اختیار کی جاے تو میں نے ادب سے یہ عرض کیا کہ نوشیرواں نے فارسی سے ثقیل حروف نکال کر اسے نرم اور نازک بنادیا اور اس دن سے ایران نے سی حیث ملت روے بہتری نہیں دیکھا کیونکہ زبان کی ملائمت کے ساتھ جسم پر بھی اس کا لطیف اثر پڑتا ہے اسی لئے جرمن والدین اور اہل‌القریہ بچوں کو تاکید کرتے ہیں کہ اونچی آواز سے بولیں کیونکہ بلند اور سخت صدا سے سارے بدن میں استواری آجاتی ہے اور آہستہ بولنے سے سب اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں ۔ ارشاد نبوی صلعم ہے المرء باصغریہ قلبہ ولسانہ ۔ انسان اپنی دو چھوٹی چھوٹی چیزوں دل اور زبان سے مرد ہے ۔ کیونکہ ظاہری اور معنوی کمالات دل میں جاگزیں ہوکر زبان سے نکلتے اور فصاحت و شجاعت کا اثر دکھاتے ہیں ۔ بے شک قندھاری پشتو فارسی کے قرب کے سبب شیریں اور لطیف ہے اور کابلی پشتو کے مقابلے میں یہی اس کی کوتاہی اور نقص کی دلیل ہے بلکہ گستاخی معاف، قندھاری پشتو زنانہ سی ہے ۔ میں نے اس نسبت سے معذرت بھی چاہی پھر بھی عتاب شاہی نازل ہوا اور دو دفعہ بڑی شدت سے پستول میری طرف اٹھایا ۔ بعض حاضرین کرام نے فوری ہمدردی سے جو بعض حکما کے نزدیک انسانی نیکی کے فطری ہونے کا ثبوت ہے خسروی ہاتھ کو دونوں بار تھام لیا اور میں نے بھی جلدی سے باہر جاکر پناہ لی ۔ ایک خاص لطف

خسروانہ سے تھوڑی دیر کے بعد مجھے پھر افسر بلا لیا اور بڑی عنایت سے جان بخشی کردی —

اعلیٰ حضرت محمد نادر خاں اس وقت قتغن اور بدخشان کی طرف رئیس تنظیمیہ تھے جب واپس آئے تو کہنے لگے کہ پستول صرف تم پر ہی نہیں بلکہ مجھ پر بھی اُٹھایا گیا تھا ۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ کسی کو آزاد گفتگو کی مجال نہ رہی اور اسی میں افغانستان کے انقلاب کا راز مضمر ہے - جب بچہ سقا امیر ہوگیا تو ملک و ملت کی کایا ہی پلٹ گئی- وہ خود تاجیک تھا جن کی آبائی زبان فارسی ہے اور پشتو کے ساتھ اسے کوئی لگاؤ نہیں ہوسکتا تھا اور وہ اس کی بے شمار قوم بھلا فارسی کو کیوں ہاتھ سے دینے لگے تھے ۔ ہزارہ لوگ شیعہ ہیں جن کے مذہب اور زبان کا ایران کے ساتھ تعلق ہے - دوسری دس زبانوں کے بولنے والے اکثر فارسی جانتے ہیں مگر پشتو صرف افغانوں ہی تک محدود ہے اور ان کی تعداد تمام آبادی میں ثلث بھی نہیں اور پھر ان میں سے بھی بعض صرف فارسی ہی میں بات چیت کرتے ہیں جیسے کابل اور ہرات کے افغان اور شاہی خاندان - اس سے اندیشہ ہوا کہ جیسا کافرستان کا نام نورستان اور آمو پار کے ممالک کو جن میں بخارا خیوہ وغیرہ داخل ہیں روسیوں نے ازبکستان ترکمنستان اور تاجیکستان موسوم کردیا یہ ڈاکوؤں کی سلطنت اگر سنبھل گئی تو افغانستان کو کوئی اور نام دے کر ایک نیا گل نہ کھلائے- کیونکہ افغان کے ساتھ تاجیک کو من حیث النسب کوئی رابطہ عقیدت نہیں- علاوہ بر آں افغانستان کے تاجیک سلطان محمود غزنوی کو اپنا ہمقوم قرار دیتے ہیں اور افغان اس کے مقابلے میں ایسا رفیع القدر شخص پیش نہیں کرسکتے - شہاب الدین غوری پر دونو قومیں ادعا رکھتی ہیں - اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ پشتو معرض خطر میں ہے مگر تاریخ ڈھارس بندھاتی تھی —

جیسا کہ دانتے وغیرہ نے اطالیہ کی ادبیات کو جب کہ وہ ملک معرض زوال میں تھا چار چاند لگا دئیے تھے افغانوں کے شعر و سخن نے مغلوں کے زمانے میں

بڑی آب و تاب دکھائی - واضح رہے کہ جتنی قوت مغلوں کی جنوبی معاربات میں صرف ہوئی اس سے زیادہ شمال میں کام آئی - صرف اکبر کے عہد میں زین خاں اور ٹوڈر مل کے سمیت بیس ہزار سپاہ کو افغانوں نے تلف کیا - اورنگ زیب کے وقت افغان بارے ہارے گویا آرام سے بیٹھے کہ فعل سے قوہ اور قول کی طرف راغب ہوں-

ارسطو نے قفس میں پرندوں کی نغمہ سرائی کو غمگینی پر مبنی نہیں سمجھا جیسا عام خیال تھا اور اس دلیل پر اس کی تردید کی کہ اگر مرغ کے زخم لگا ہو تو چہچہانے سے قاصر ہوتا ہے - ابن عربی نے عذاب الیم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بندگان خاص کو مصیبت میں ایک عذوبت یعنی شیرینی حاصل ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے اور وہ ایک لذت لئے ہوتا ہے - ہمارے ایک دھقان نے کہا کہ مزہ جب ہے کہ آدمی کھیت میں بیٹھا ہو نم نم مینہ برستا ہو اور نرم نرم تپ بھی چڑھی ہو - مجدد الف ثانی محی الدین عربی کی ذات کو مقبول اور ان کے کلام کو مردود کہتے ہیں اگر کوئی اس دھقان کی بات کو فضول سمجھے تو تعجب نہیں ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

عاشق کو فراق میں رنج کے ساتھ البتہ ایک لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور جدائی کا غم تو لازمۂ شاعری ہے جو وصل میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا - ایک افغان کہتا ہے :

د وصال په چینے مرمه وچی شنڈی د فراق له اندیشنے له تاب و تب

وصال کے چشمے پر خشک لب مر رہا ہوں فراق کے اندیشے کی تب و تاب سے

ایک افغان فارسی میں کہتا ہے :

ماتم و سور جہاں بسکہ بہم آمیزست خندۂ قہقہہ ہم اشک ندامت ریز است

مرج البحرین ہذا عذب فرات و ہذا ملح اجاج و بینہما برزخ - دو بحر میٹھے اور تازہ اور کھاری اور کڑوے مل رہی ہیں اور ان کے درمیان فاصلہ ہے - اس کی ایک تفسیر یہی دکھہ اور سکھہ ہے بلکہ الٓم کے حروف مقطعہ بھی

الم کی تائید و تشدید میں شاید علحدہ علحدہ پڑھے جاتے ہوں - غرض یہ ہے کہ جیسے خنساء نے غم وہم کے ہجوم میں مرثیے کہہ کر نابغہ کا مقابلہ کیا بعض قومیں بوی آزادی کھو کر اس کی تعزیت میں سرور سے گاتی ہیں —

ہندوستان کے افغانوں نے بہت سے دیوان پشتو میں لکھے - عجائب اللغات بہوں تالیف ہوئی جو پشتو کی بڑی ضخیم کتاب ہے - سرحد میں تفسیر معالم کا ترجمہ ہوا یہاں تک کہ انجیل بھی پشتو میں منتقل ہوئی مگر اس پر تنقید ایک آیت کی ایراد سے صحیح طور پر ہوسکتی ہے - انگریزی بائبل میں ہے - " جج نات " (Judgenot) یعنی عیب گیری نکرو اس کا ترجمہ پشتوں میں کیا " انصاف مت کرو - " ایک منسوخ کتاب کو اور زیادہ باطل کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور بیخبرانہ غلطی کیا ہو سکتی ہے - مغلوں کی سلطنت میں رشید الہیان وغیرہ فقہ کی کتابیں لکھی گئیں جو پشتون عورتیں تک پڑھتی ہیں اور بڑے بڑے افغانی شعرا تو تقریباً سب اسی عہد میں ہوے خوش حال خاں جو خٹک افغانوں کا سردار تھا ایک عمدہ گھوڑا اورنگ زیب کو نہ دینے کی وجہ سے قید میں ڈال دیا گیا جہاں اس کو اذیت پہنچائی گئی مگر اس نے گھوڑا دینا منظور نہ کیا آخر ایک تند خو اور کج طبع آدمی کو اس کا رفیق قید بنایا تو نا چار ہو کر بادشاہی خواہش کو پورا کیا - اس مصیبت میں اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے مختلف خیالات کا اظہار کرتا ہے —

ما وچہ د مغل پہ نوکرۍ کښ رکیبو نہ کړم د سرو د سپینو نال
ناحق زنجیر ونہ را پہ پښو کړل واہ واہ ھسے نوازش ھسے آمال

(میں نے کہا کہ مغل کی نوکری میں رکابیں سونے کی اور نعلین چاندی کی بناؤں گا - ناحق زنجیریں میرے پاؤں میں ڈالدیں - واہ واہ ایسی نوازش اور ایسی اُمیدیں) پھر اپنی قوم کو مغلوں سے استغنا برتنے کی ہدایت کرتا ہے —

پختانہ لرہ شړئی انڈیری بس ئی نہ غواړو و مغلو معجری شال

(افغانوں کے لئے اُن کے اپنے دیسی کپڑے کافی ہیں مغلوں کی مخملی سال ہم نہیں چاہتے) پھر اپنے رنج کے خاتمے کی دلیل پیدا کرتا ہے —

پس نہ زمی رازی پشکال

(جاڑوں کے بعد بہار آتی ہے) اپنے وطن میں پہنچ کر ہمیشہ افغانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرنے، ضمناً مغلوں سے آزاد رہنے کی ترغیب دیتا رہا:

تر منصب پورے خوشحال خٹک نوکر دو چہ منصب ورعنے لاڑشہ اُس بادشاہ دئی

(منصب تک خوش حال خٹک نوکر تھا۔ جب منصب اس سے جاتا رہا تو بادشاہ ہے)

چہ تنخواہ بہ مغل خورے یو ملک وم چہ تنخواہ نہ اُس نشتہ ملک یم

(جب مغل کی تنخواہ کھاتا تھا تو ایک ملک تھا، جب تنخواہ نہیں ہے تو اب ملک ہوں —

خوش حال خاں نے مختلف اقسام کی نظموں کے علاوہ نثر میں بھی فضیلت دکھائی ہے۔ تاریخ مرصع میں جو پشتو کی ایک عمدہ تصنیف ہے ایسے واقعات درج ہیں جو معاصرا فارسی اور انگریزی کتابوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی اولاد میں مدتوں شعرا ہوتے رہے جن میں سے ایک شیدا ہے جو اقارب کے عقارب ہونے کی ضرب المثل کو یوں بیان کرتا ہے —

ددر یاب لہ سرد جوشی دحباب زدہ چو شیدا قطع د اُمید بو یہ لہ خپلو

(دریاکی سرد جوشی سے حباب کا دل پھٹا جاتا ہے۔ شیدا انپوں سے قطع اُمید کرلینی چاہئے) اس کی ایک غزل کی دو بیتیں لکھی جاتی ہیں جو مجھے یاد رہ گئیں کیوں کہ یہ سب مضمون حافظے ہی کی مدد سے تحریر کررہا ہوں ورنہ ان سے بہتر مثالیں موجود ہیں:

ستا پہ سپین تندے اے جانان داشیبی خال دئی یا سحرو اذان تہ ولاڑ بلال دئی

(تیری سفید پیشانی پر اے جاناں یہ سبز خال ہے یا فجر کی اذان کے لئے بلال کھڑا ہے؟)

که چاپه دنیاکش جنت نه وی لیدلے بلا تشبیه دایو خوند ستار وصال دئی

اگر دنیا میں کسی نے بہشت نہیں دیکھا بلا تشبیہ یہ تیرے وصال کا ایک مزہ ہے)

خوشحال خاں کو بجا طور پر پشتو کا شیکسپیر رحمن کو حافظ اور حمید کو سعدی کہتے ہیں۔ اور یہ تینوں فی الحقیقت بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں - حمید نے گلستان بوستان اور انوار سہیلی وغیرہ کا پشتو میں نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں ترجمہ کیا - اس کا دیوان بھی اخلاقی نصائح اور نغائس سے مملو ہے - ایک جگہ کہتا ہے —

ناز و لے آزوے الله اخلی ادب او دسورے فغل نه نیسی رطب

(نازنین بچہ ادب حاصل نہیں کرتا اور سانے کی کھجور میں پھل نہیں لگتا)

رحمن روحانی امور کے علاوہ اپنے زمانے کے وقائع کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے :

اورنگ زیب هم یو فقیر وو یو توپی لے و و په سر

(اورنگ زیب بھی ایک فقیر تھا جس سر پر توپی تھی) چه لاس لے وه رسیده خراب کړ - د خورم ټول ټبر جب هاتھه پهڅا تو خورم کا سارا گھرانا برباد کردیا) باوجود اس کے عالمگیر کی وفات کو غروب آفتاب سے تشبیه دیکر اندیشه ظاهر کرتا ہے کہ اس اندھیرے میں دیکھئے کیا حوادث پیش آتے ہیں حافظ کے دیوان کی طرح افغان اس میں فال دیکھتے ہیں - بائیس سال ہوے علی ګړه کے هم مکتب مجھے لنڈن بھیجنے کا قصد رکھتے تھے کہ لسان الغیب نے یہ آواز دی :

در مصطبهٔ عشق تنعم نتوان کرد گر باش زر نیست بسازیم بخشتے

جب کابل کے محبس میں پڑا تو ایک معزز آدمی کسی خاندانی لڑائی کے سبب قید میں آیا - جب امیر حبیب اللہ مقتول نے اسے دربار میں بلایا تو جانے سے پہلے اس نے مجھ سے دیوان رحمن سے فال دیکھنے کی فرمایش کی جو عجیب

بر محل نکلی :

فال به حقه گورے رحمن دهر سڑے اعمال خپل فال شی

(رحمن فال کیا دیکھتے ہو ۔ ہر شخص کے اعمال اس کی فال ہونگے) چنانچہ اس کے کردار کے مطابق فیصلہ ہوا —

یہ تو مجمل حال ہے کابل اور پشاور کے درمیان کے شعرا - قندھار میں بھی لطیف الطبع شاعر اور ادیب گذرے ہیں - ایک صاحب آفند بڑا عالم تھا جس نے اصول فقہ پر کتاب لکھی اور مقامات حریری کی شرح تالیف کی - اپنے پوتے پر معما کہا ہے :

که لاس پورے دغ یه گلبدن کش له غیرت خال پر یو زی په سمن کش

(اگر گلبدن کے منہ پر ہاتھ پھیریں تو غیرت سے خال دامن میں گر پڑے)- افغان بچوں کے منہ پر خال سرمے سے بناتے تھے جو سیاہی کا نقطہ معلوم ہوتا تھا مع کو کہتے ہیں - اگر اس کو ہاتوہ یعنی ید لگایا جاے تو مخید ہوجاتا ہے - اگر خال یعنی نقطہ دامن میں نیچے آپڑے تو مجید ہوجاتا ہے - جو اس کا نام تھا)

امیر عبدالرحمن خان کا سپہ سالار سدو خان حوتک کہتا ہے :

دما عاشقی یه کورکش اژدهه دسترس لرم چه جان پرخپل جانان قربان کړم دهغه وس لرم

(عاشقی کے گھر میں تھوڑی سی دسترس رکھتا ہوں کہ جان اپنے جانان پر قربان کروں یہ میرے بس میں ہے)

تیغ ابرو کو کس طرح نباہا ہے :

ستا د دستورگی او به داهسے نه دی چه غیر له سر په سر لړی حباب

(تیری آنکھوں کا پانی ایسا نہیں ہے کہ سر کے سوا اس کے سر پر یعنی سطح پر اور کوئی حباب ہو -)

شرق قدیم کی بلندیء مضمون ملاحظہ ہو —

ستاد مخ مگرم لمر نه دیء نا جوړ چه مسیحی و علاج ته سفری و لاړ

(تیرے منہ کی وجہ سے کہیں سورج بیمار تو نہیں کہ مسیحا علاج کے لئے سفر پر گیا ہے)

چہ تائے لہ تاسرہ د یوسف حسن ترازو پسے د اسمان تہ مشتری و لاړ

(تجھ تیرے ساتھ یوسف کے حسن کو تولے ترازو کے پیچھے آسمان پر مشتری گیا ہے)

افغانوں کے ملی اشعار جنہیں بدلی یا لنڈی کہتے ہیں یعنی چھوٹی ابیات اکثر جوانوں کو ہزاروں یاد ہوتے ہیں اور ایسی آواز سے گاتے ہیں جو اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کر دور تک گونجتی ہے —

پہ تور تو پک یو شتلے شہ یے د نا مردی احوال د مرازہ مسینہ

(سیاہ بندوق سے تیرا مارا جانا بہتر ہے - اے محبوب تیری نامردی کی خبر مجھے نہ پہنچے) —

جدت طرازی بھی اکثر پائی جاتی ہے —

ستر گی دتہ کے تیانچہ دی غریب سڑی پہ لار تلم و دو شتمہ

(تیری تنگیں بھرے پستول ہیں مجھ غریب آدمی کو راہ جاتے ماردیا)

د کافر گل چہ شان کاڑہ سوے چہ را سمیڑے روز بہ نہمہ تیروی نہ

(کافر گل کی شان پر تیرھی ہوگئی ہو - جب سیدھی ہوگی تو آدھا دن گذرا ہوگا - شان سافند کو بھی کہتے ہیں اور آدھا دن گذرنا پشتو میں آدھی عمر بسر ہونے کے مساوی ہے - کافر گل سورج مکھی کو کہتے ہیں کیونکہ ایک بڑی چیز کو قلب موضوع سے کافر سے تشبیہ کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک نیک شخص دعا کرتا ہے خدا یا مجھے اتنا مال و اختیار دے کہ ایک کافر مسجد بناؤں اور ایک کافر ملا کو وہاں رکھوں - اسی طرح محاورہ ہے زشت یا بد شہ سڑہ دئی - زشت یا بد اچھ . آدمی کے بھلی نہ ایسی خوب قدمی ہے - یہ لنگڑیزی کے تقل وغیرہ الفاظ سے مشابہ ہے)

تجنیس کے علاوہ اس فرد میں عالی ہمسائی کمال داد ہے —

سر خما سر گرزی نہ ملی د تاج ہلے تلے تلی ځلاو سروتہ محتاج

سہرا سر تاج کی سرتاجوں کو تہیں سلتا ہلے تلے سروں کا محتاج ہے

تاج پہننے کے وقت جو سر جھکتا ہے یا اس کو پہن کر جو سر خم رکھنا پڑتا ہے میرا سر اسے قبول نہیں کرتا میرے سرو قد کا خود تاج محتاج ہے) —

اگر انھیں چند مثالوں کو غور سے پڑھا جائے تو ثابت ہوسکتا ہے کہ پشتو میں اکثر کلمات کا مادہ ہندی سے مشتق ہے اور بعض الفاظ تو بعینہ ہندی کے مروج ہیں - چونکہ پنجاب متصل ہے اس لئے پنجابی لا جرم زیادہ قربت رکھتی ہے اور اس کا مطالعہ ایک دلچسپ منظر پیش کرتا ہے - مثلاً قندھار میں شہ بولتے ہیں ' کابل میں اس خاص شین کو ایک علحدہ قسم کی (خ) میں مبدل کردیا جاتا ہے - وزیرستان سے اتر کر (چہ) اور وہاں سے پنجاب میں جاکر (اچھا) یا اچھا بن جاتا ہے - اسی طرح کوہ کش قندھار سے چل کر کوہ کے اور بنوں کے قریب کوہاٹ اور پنجاب میں کھوچ ہو جاتا ہے یعنی کہ میں —

یہ پشتو کا (ھ) اور (خ) اردو کے ان حروف سے مختلف ہے اور ان کا مخرج بیشتر تالو سے ہوتا ہے - اس سے پشتو کی دو بڑی قسمیں ہو گئی ہیں جنہیں پشتون اور پختوں سے موسوم کرتے ہیں - اتفاق سے جرمنی میں بھی پروسیہ اور باویریا کی زبانیں ایسی ہی منقسم ہیں مثلاً انگریزی نائٹ کو نشت اور خت بولتے ہیں - ایک بڑی مشابہت پشتو کی اردو سے یہ ہے کہ ماضی متعدی میں فعل مفعول کے تابع ہوتا ہے بخلاف دیگر السنہ کے جن میں فاعل ہمیشہ متبوع ہے -

میں نے نعرہ مارا - کس نے نعرے مارے؟ (ما نعرہ وکڑہ چا نعرے وکڑے ؟)

اس یگانہ مبا ثابت کے سوا اسم اور فعل کی جمع کا قاعدہ بھی یہاں یکساں ہے - نعرہ ' نعرے - مارا ' مارے - وکڑہ ' وکڑے - اردو کے (میں) کی بجائے پشتو میں ' زہ ' آتا ہے - میں آیا ' زہ را غلم - ' میں نے ' کی جگہ ' ما ' جیسے میں نے کھایا - ' ما و خوڑ ' ' کون ' کی بجائے ' خوک ' آتا ہے جیسے تاسو خوک یاست - تم کون ہو - کس کی جگہ ' چا ' جیسے تا سے چا و با لہ - تم کو کس نے بلایا - ' تاسو ' کا دھاڑ میں وزیرستان کی طرف ' تو سے ' اور یہی پنجاب میں ' تسی '

ہی جاتا ہے —

یہ طبیعی مجالست دو زبانوں کی جو افغانستان اور ہندوستان کی ملی‌السنہ ہیں ان دو ملکوں میں وداد و اتحاد کا موجب ہونی چاہئیں اور اعلیٰ حضرت محمد نادر خان کی بادشاہی سے ہر طرح کی اُمیدیں ہیں کہ یہ زبانی رشتہ قائم اور مستحکم ہوکر دلی ہوجائیگا کیوں کہ ان کی ولادت اور پرورش ہندوستان میں ہوئی اور انہوں نے اردو زبان جاننے کے علاوہ اخلاص سے بھرا دل پایا ہے۔ شاید اُن کا مقدم کام افغانستان میں پشتو کی ترویج کا ہو اور یہ بھی بتدریج تاکہ فوری تداخل سے پھر فساد برپا نہ ہو۔ بعد ازاں علمی و فنی اصطلاحات جن کی اُردو اور پشتو کو مساوی ضرورت ہے دونوں ممالک کی مشترکہ مساعی سے بہتر اور سہل تر طریقے سے بہم پہنچ سکتی ہیں —

تبصرے

ادب

صفحہ

مسدس حالی ۱۶۷

کردار اور انسانہ ۱۶۸

اردو زبان میں فارسی عناصر ۱۶۹

ادبیات — نظم

تابش خیال ۱۷۰

فوٹے رضا ۱۷۱

اُردو کے جدید رسالے

خاتون ۱۷۲

—o—

سرورق کا خاکہ ۱۷۲

ادب

مسدس حالی

(جدید ایڈیشن - مطبوعہ انتظامی پریس، دارالاشاعت کانپور
قیمت دو روپے چار آنے)

مسدس حالی ایک ایسی نظم ہے جس پر اردو زبان کو فخر ہے - اسے مقبولیت بھی ویسی ہی حاصل ہوئی جس کی وہ مستحق تھی - اب تک طرح طرح کے بیسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں - سب سے بہتر وہ تھا جو مفتی رحمت اللہ رعد مرحوم نے اپنے نامی پریس میں طبع کیا تھا - اب یہ نیا ایڈیشن جو خواجہ عبدالواحد صاحب کے اہتمام سے مطبع انتظامی میں طبع اور دارالاشاعت کانپور سے شایع ہوا ہے اس پر بھی سبقت لے گیا ہے —

یہ چھوٹا جیبی ایڈیشن ہے - کاغذ اعلیٰ درجے کا چکنا (آرٹ پیپر) لکھائی چھپائی نہایت عمدہ، لوح اور جلد بہت نفیس - علاوہ مولانا حالی کی تصویر کے مشہور اسلامی آثار اور مشاہیر اسلام کی ۱۶ تصویریں، اسلامی دنیا کے عروج کے دو نقشے اور شروع میں ایک تنقیدی مقدمہ ہے —

اس کتاب کی تیاری اور طبع میں خواجہ صاحب نے نہایت پاکیزہ مذاق سے کام لیا ہے اور ہر شخص اسے دیکھ کر خوش ہوگا - اگر اردو میں ایسی کتابیں چھپنے لگیں تو اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں ضرور اضافہ ہوجائے گا - ہم خواجہ صاحب کے

اس پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں - ہمیں اُمید ہے کہ ان کے دارالاشاعت سے جو کتابیں شایع ہونے والی ہیں اُن میں اسی نفاست ذوق کا خیال رکھا جائے گا - یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ رعد مرحوم کے نامی پریس کی جانشینی کانپور ہی کے ایک مطبع کو نصیب ہوئی - اردو کی سنگی چھپائی کی تاریخ میں رعد کا نام ہمیشہ یاد رہے گا - انتظامی پریس نے جس شان اور خوبی سے ابتدا کی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ کانپور کی اس شہرت اور نیک نامی کو قائم رکھے گا —

کردار اور افسانہ

(مؤلفۂ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم - اے، ال - ال - بی
مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد - دکن قیمت دو روپے چار آنے)

یہ دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ ہے - پہلے حصے پر اس سے قبل تبصرہ ہوچکا - اس کے تین حصے ہیں - پہلے حصے میں اشخاص قصہ، دوسرے حصے میں کردار نگاری اور تیسرے حصے میں اردو کے بعض مشہور افسانوں کے کردار پر بحث کی ہے - اگرچہ کوئی شخص ہدایتوں سے افسانہ نویس نہیں بن سکتا تاہم ان ضروری باتوں کا جاننا اُس کے لئے ضرور مفید ہے - تیسرے حصے میں محبوب الرحمان اور فخرالنساء کے کردار، میر انیس اور مرزا محمد کے کردار، مولانا نذیر احمد اور ان کے قصے کا نسائی کردار اور عمر و عیار کی سیر کو تفصیل اور خوبی سے بیان کیا ہے - کتاب بہت دلچسپ ہے اور مصنف سے لکھی گئی ہے، جو لوگ افسانوں کو غور سے پڑھنا چاہتے ہیں یا جن کو افسانے لکھنے کا شوق ہے ان کے لئے بہت کار آمد ہے —

کردار اور اس کا بیان افسانے کا سب سے بڑا اہم جز ہے - اس سے وہی عہدہ برا ہوسکتے ہیں جن میں بیان کی خداداد قابلیت اور مشاہدے کی قوت ہے - بڑی بات یہ ہے کہ انسان کے اعمال و افعال میں سے صرف انہیں پر نظر پڑے جو کردار کو نمایاں کرکے دکھا سکتے ہیں - یہ مصنف کی ذہانت اور ذوق پر منحصر ہے - اس کتاب کے پڑھنے سے اس کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں - اگرچہ پڑھنے والے کو بعض باتوں میں مؤلف سے اختلاف ہوگا لیکن اس مضمون پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ قابل مؤلف نے اس کے لکھنے میں پوری کوشش اور محنت کی ہے —

اردو زبان میں فارسی عنصر

(مقالہ از پروفیسر اے - ہرانی کوف)

یہ مقالہ ایک روسی پروفیسر نے ایک روسی اکاڈیمی کے رسالے میں شایع کیا ہے - جس میں انہوں نے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان ہندی ہے نہ ہندی کی شاخ ہے ' بلکہ فارسی اور ہندی دونوں کا مجموعہ ہے اور ایک قسم کی مخلوط زبان ہے —

اردو زبان کے وجود میں آنے کے متعلق دو خیال ہیں - ایک ہندی مسلمانوں اور ابتدائی یورپی ماہرین زبان کا - ان کی رائے وہی ہے جو مہر اتن اور سرسید احمد خاں کی ہے ' انہیں کی اتباع کارساں دتاسی نے کی ہے - جدید خیال کے لوگوں میں سب سے ممتاز هارنلی ' فیلاک اور گریرسن ہیں - پہلے خیال والوں کی رائے میں اردو فارسی ہندی سے مخلوط زبان ہے اور دوسرے خیال کے حامیوں کی رائے یہ ہے کہ یہ خالص آریائی زبان ہے ' جس میں فارسی عربی الفاظ کی بہت بڑی تعداد شریک ہوگئی ہے —

پروفیسر ہرانی کوف پہلے خیال کی تائید میں ہیں اور اس کے ثابت کرنے میں جو کوشش انہوں نے کی ہے وہ قابل غور اور لائق قدر ہے - وہ کہتے ہیں کہ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ فارسی عنصر علیحدہ کرنے کے بعد باقی ہندی الفاظ اور محاورے رہ جاتے ہیں ' اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندی عنصر الگ کرنے کے بعد باقی فارسی زبان رہ جاتی ہے - اردو میں ترکی اور انگریزی لفظ معدودے چند ہیں ' برخلاف اس کے فارسی عنصر بہت زیادہ ہے ' یعنی تقریباً پچاس فی صدی - رہے عربی الفاظ سو وہ فارسی کے توسط سے داخل ہوے ہیں — فارسی لفظ زندگی کے کسی خاص شعبے یا کسی خاص فن تک محدود نہیں ہیں بلکہ روز مرہ کے استعمال کے سادہ سے سادہ الفاظ بھی فارسی پاے جاتے ہیں- مثلاً سر ' چشم ' بازو ' پدر ' برادر ' مادر ' اسپ ' سگ وغیرہ —

اعلیٰ طرز تحریر یا دفتری تحریرات میں زیادہ تر فارسی لفظ استعمال ہوتے ہیں اس کے علاوہ اکثر اوقات گنتی (جیسے یکم ' دوم ' سوم ' صد وغیرہ) جمع (باشندگان ' افسران وغیرہ) مدارج صفات (بہتر ' بہترین وغیرہ) ' ضمیر خود ' ضمائر اشاری وغیرہ (جیسے ایں ' آں ' چنیں ' چناں ' چگونہ ' ہریک وغیرہ مفعول (مردہ ' دیدہ ' شنیدہ وغیرہ) ؛ بعض لاحقے (ناک ' دار وغیرہ وغیرہ) ' حروف سابقہ (بے ' بر ' در وغیرہ) حروف عطف (و ' نیز ' مگر ' چونکہ اگر وغیرہ) فارسی ہوتے ہیں - فارسی اضافت کا استعمال بھی عام طور پر ہوتا ہے - اکثر جملوں کی ساخت فارسی طرز کی ہوتی ہے-

ان سب کو یہ کہہ دینا کہ اردو میں یہ عناصر فارسی سے مستعار لے لیے گئے ہیں ' حقیقت کے خلاف ہے - جب ہم انیسویں صدی کے نصف اول کی اردو پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اتنی ہندی نہیں جتنی فارسی ہے - فاضل پروفیسر نے اردو شعرا کے کلام سے کئی مثالیں دی ہیں - اس کے بعد اس نے نکات الشعرا سے میر تقی میر کا قول ریختے کے متعلق نقل کیا ہے - ریختے کا لفظ اردو کے لیے ہندی یعنے غیر مخلوط زبان کے مقابلے میں استعمال کیا گیا تھا ' در حقیقت وہ فارسی زبان تھی - اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ریختے کے شاعر فارسی کے شاعر بھی تھے -

فارسی نے اردو کے بنانے میں اسی قدر کام کیا ہے جتنا ہندی نے' اور یہ امر تاریخی واقعات سے پورے طور پر ثابت ہے - ایرانی بولیوں کے بولنے والے ہندوستان میں چھٹی صدی سے آباد ہیں ؛ مغلوں کی حکومت میں فارسی دفتری اور درباری زبان تھی ؛ اردو شاعری کے سارے ڈھنگ اور اس کا عروض اور اس کے اصطلاحات وغیرہ سب فارسی ہیں - لہذا یہ امر قابل غور ہے کہ اردو ہندی کی ایک صورت ہے یا فارسی کی —

معلوم ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر اس مضمون پر ایک بڑی کتاب لکھ رہے ہیں اور یہ مضمون اس کا ایک مختصر خاکہ ہے —

قابل پروفیسر نے اردو میں فارسی کے اثر کو بڑی خوبی اور تحقیق سے دکھایا ہے اور اُن کے دلائل ایسے نہیں ہیں کہ ان کی تردید آسانی سے کی جاسکے —

ہمیں اس سے خوشی ہوی کہ روس میں بھی اردو زبان پر توجہ کی جا رہی ہے اور پروفیسر بوانی کوف خاص طور پر اس زبان کے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف ہیں —

ادبیات — نظم

قابش خیال

(مصنف جناب افسر صدیقی امروہوی- ملنے کا پتہ : شاہد علی' امجد علی امروہوی - رام سوامی سروان کمپونڈ متصل نیو ورک شاپ ' کراچی - قیمت ایک روپیہ ' حجم ۱۲۷ صفحات - لکھائی ' چھپائی ' کاغذ متوسط - سائز چھوٹا ۲۰ — ۳۰-)

یہ جناب " اصرح البیان ' بلیغ الکلام " افسر صاحب امروہوی کا وہ مجموعۂ کلام ہے - جو سنہ ۱۹۲۴ ع سے کہا گیا ہے اور جو ان کے مرحوم استاد حضرت شرق قدوائی مرحوم لکھنوی کے اصلاح شدہ ہے - جناب افسر پہلے مضطر خیرآبادی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے - پھر جناب قدوائی کے شاگرد ہوے اور قابض خیال کے نام سے یہ کلام چھپوادیا گیا ہے - شروع میں مصنف کی تصویر اور جناب اسرار احمد صاحب کرروی کا لکھا ہوا ۳۸ صفحے کا مقدمہ ہے ' مقدمے میں افسر صاحب کے کلام پر مبصرانہ نظر ڈال کر ان کے بعض اشعار کی خوبیوں کو واضح کیا ہے -

کیا اچھا ہوتا اگر مقدمے میں یا الگ مصنف صاحب کے کچھ حالات زندگی بھی ہوتے - کلام پاک و صاف ہے اور معنی آفرینی بھی ہے ' مغلق اور غریب و ثقیل الفاظ سے مبرا ہے - لیکن جدت اور موجودہ مذاق شاعرانہ سے بھی گرا ہوا نہیں - کہیں کہیں خفیف سی لغزشیں ہیں لیکن زیادہ تر اشعار پاکیزہ اور قابل تعریف ہیں —

نواے رضا

(مصنف جناب سید آل رضا صاحب ' رضا ' ملنے کا پتہ اور قیمت کہیں درج نہیں ' حجم ۱۱۲ صفحات ' لکھائی چھپائی نہایت پاکیزہ ' کاغذ گلابی عمدہ دبیز سائز بہت خوب صورت چھپی - جلد دیدہ زیب نئے طرز کی ' اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام ہے) —

سید رضا صاحب کا یہ مختصر دیوان غزلیات ان کے بھائی سید کاظم رضا صاحب نے شایع کیا ہے اور بہت سلیقے سے شائع کیا ہے - رضا صاحب جناب ' آرزو ' لکھنوی کے شاگرد اور اچھے شاعر ہیں - اگرچہ وہ کوئی خاص شہرت نہیں رکھتے مگر ان کے کلام میں مزہ اور گھلاوٹ ہے ' وہ اچھے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں —

شروع میں ان کے عزیز و سعادت مند بھائی نے ایک مختصر سا مقدمہ یا تقریب لکھی ہے - جس میں ان کے شاعری ' شاگردی اور مزاج شاعرانہ پر تبصرہ کیا ہے یہ مختصر دیوان قابل دید ہے —

اردو کے جدید رسالے

خاتون

(اڈیٹر مرزا مظفر حسین سیفی دہلوی ' مقام
اشاعت لشکر گوالیار - سالانہ چندہ چار روپے)

یہ ماہانہ رسالہ عورتوں کی ذہنی ' اخلاقی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے شایع کیا گیا ہے - مختلف قسم کے مضامین درج ہیں - بعض ان میں سے فی الحقیقت خواتین کے پڑھنے کے قابل ہیں - چند صفحے خوان نعمت اور حرفت و صنعت کے بھی ہیں - بہت مفید اور کارآمد ہیں - خوان نعمت میں بعض اچھے اچھے کھانے پکانے اور حلوے بنانے کی ترکیبیں ہیں - کون ہے جو اسے پسند نہ کریگا ؟ لطایف و ظرائف اور تمامی معمے بھی ہیں - خبروں کا بھی ایک حصہ ہے ' آخر میں عالم نسواں کی خبریں ہیں ' غرض رسالے میں دلچسپی کے سب سامان فراہم ہیں - چھپائی لکھائی بھی اچھی کردی جاے تو بہتر ہوگا —

سرورق کا خاکہ

یہ خاکہ حیدرآباد کے مشہور مصور عبدالقیوم صاحب نے تیار کیا ہے - اس کی خوبی دیکھنے کے بعد خود معلوم ہوجاتی ہے ' محتاج تشریح نہیں ہے - رسالہ سالگرہ کے سرورق کا خاکہ بھی آپ ہی نے تیار کیا تھا ' میں عبدالقیوم صاحب کا بہت شکرگزار ہوں کہ انہوں نے دلی شوق اور ہمدردی سے انجمن کا یہ کام کیا —

عبدالحق

اردو

حصہ ۳۹

جلد ۱۰

جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	روسی ادب (دوسرا باب)	جناب محمد مجیب صاحب بی اے آنرز (آکسن)	۳۶۳
۲	باغ و بہار (قصہ چہار درویش)	از اڈیٹر	۳۹۲
۳	اردو زبان کا ایک آنریش شاعر	جناب مقبول حسین صاحب احمدپوری	۴۱۶
۴	تنقید حیات حافظ	جناب بشیر احمد صاحب قار بی اے (آنرز)	۴۲۷
۵	اردو کے ان پڑھ شاعر	جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی	۴۵۶
۶	اساتذہ کی اصلاحیں	جناب حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم	۴۸۳

روسی ادب

دوسرا باب

پہلی کوششیں

از

جناب محمد مجیب صاحب - بی - اے - آنرز (آکسن)

ژلاجی مر بادشاہ کی ئف کے عہد میں (۹۷۰ - ۱۰۱۵) مذہب عیسوی کا روس میں پرچار شروع ہوا ' اور مذہب کے ساتھہ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا. اس وقت تک اُن سلاف نسلوں کی جو روس میں آباد ہو رہی تھیں کوئی اپنی تحریری زبان نہیں تھی ' اور بازنطینی کلیسا کے اُن مبلغوں اور سفیروں نے جو روسیوں کو عیسائی بنا رہے تھے سلاف زبان کی ایک شکل کو جو بلغاریہ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس میں یونانی زبان کے الفاظ کثرت سے تھے اس نئے کلیسا کی باضابطہ زبان قرار دیا. انجیل کا اس زبان میں ترجمہ موجود تھا ' اور یوں انھیں طالب علموں کو یہ نئی زبان سکھانے میں ایک آسانی بھی ہوگئی. کی ئف میں کلیسا کی بنیاد پڑتے ہی مذہبی بزرگوں کے مقولوں ' وعظوں اور خطوں کو نقل اور ترجمہ کرنے کی رسم جاری ہوگئی ' اور مذہبی رنگ کی تصانیف کا ذخیرہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگا —

عیسائی مذہب کی اشاعت کے ساتھہ جابجا خانقاہیں قائم ہونے لگیں . جیسا کہ اور ممالک میں بھی ہوا ہے ' روس میں رہبانوں نے اپنے زمانے کی یادگار زندہ رکھنے کے لئے وقائع نگاری شروع کردی - نسٹؤر کی تصنیف' جو ۸۶۲ سے ۱۱۱۰ ع

تک کے حالات بیان کرتی ہے وقائع نگاری کا پہلا نمونہ ہے . اکثر محققوں کی رائے ہے کہ نِس‌تُور در اصل ایک فرضی ہستی ہے ' اور اس کی تصنیف میں مختلف اجزا ہیں جن کی زبان اور طرزِ تحریر مختلف زمانوں اور مصنفوں کا پتہ دیتا ہے - نِس‌تُور کی روس کے بہت سے رہبانوں نے پیروی کی ' اور اس وقت سے لیکر سترھویں صدی تک کی روسی تاریخ رہبانوں کے وقائع میں ملتی ہی . لیکن افسوس ہے کہ ان وقائع نگاروں نے اصل واقعات لکھنے سے زیادہ اس شہر یا شاہی خاندان کی عظمت جتانے کا خیال رکھا جس سے ان کا تعلق تھا اور اس طرح سے اپنی تاریخی حیثیت بہت گرا دی - زبان کے رو سے ان مصنفوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اس سلاف زبان کے بہت سے الفاظ استعمال کئے جو بول چال میں رائج تھی ' اور اگرچہ ان کی زبان الفاظ اور نحو کے لحاظ سے خالص روسی نہیں کہی جاسکتی ' لیکن اس میں قومی عنصر اس قدر شامل ہو گیا تھا کہ وہ محض بازنطینی یا قدیم سلاف نہیں رہی .

وقائع اور خالص مذہبی تصانیف کے علاوہ سولھویں صدی سے پہلے کی دو تاریخی داستانیں ہیں ' " ئی‌گُور کے حملے کی داستان " اور " زدُون شچی‌نا " ' جو بڑی حد تک اول الذکر کی نقل ہے - " ئی گُور کے حملے کی داستان " کی‌ئف کے بادشاہ ئی‌گُور کی پرواُوت‌تسی نسل سے ' جو روس کے جنوب مشرقی حصہ میں آباد تھی ' ایک لڑائی کا قصہ سناتی ہے - ئی‌گُور جب اپنے بافکون کو لیکر روانہ ہوا تو اس نے راستے میں بہت سی بد شگونی کی علامتیں دیکھیں ' لیکن اس نے ان کی مطلق پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا چلا گیا. آخر کار پرواُوت تسی کے لشکر سے مقابلہ ہوا ' اور لڑائی میں ئی‌گُور نے شکست کھائی ' اگرچہ جنگ میں پرندے اور درندے روسی فوج کی اپنے اپنے طور سے حمایت کر رہے تھے ' اور خود روسی بھی انتہائی بہادری اور جاں‌فشانی سے لڑے - ادبی نقطۂ نظر سے اس داستان کا جوہر ئی‌گُور کی ملکہ یاروسلافنا کا نوحہ ہے ' جب وہ شہر پوتیفل کی فصیل پر بیٹھی ئی‌گُور

کا راستہ دیکھہ رہی تھی ' اور اس کے دل میں ہر طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے.

" یاروسلافنا کی آواز کوئل کی فریاد کی طرح گونجتی ہے : سورج نکلتے ہی گونجتی ہے :

" میں کوئل بن کر دریا کے کنارے کنارے اڑ کر جاؤں گی - میں اپنی سمور کی آستینیں کیالا دریا میں بھگوؤں گی : ان سے اپنے شہزادے کے زخم دھوؤں گی - اپنے سورما کے کاری زخموں کو .

یاروسلافنا پوتیفل کی فصیل پر آہ و زاری کرتی ہے .

" اے ہوا' بیدرد ہوا ! میری آقا' تو اتنی تیز کیوں چل رہی ہے ؟ تو اپنے ہلکے پروں پر خان † کے تیر کیوں اڑا کر لائی ' کہ میرے سورما کی فوج پر گریں؟ کیا وہاں ' اوپر بادلوں میں اڑنے سے تیرا جی نہیں بھرتا ؟ سمندر پر جہازوں کو جھولا جھلانے میں جی نہیں لگتا ؟ تونے میرے پیارے کو زمین پر کیوں لٹا دیا ؟

یاروسلافنا پوتیفل کی فصیل پر آہ و زاری کرتی ہے .

" اے شان‌دار دنیپر * ' تونے چٹانوں بھری پہاڑیوں کو چیر کر پولوتسی کے ملک تک اپنا راستہ بنایا ہے . تو سفیاتوسلاف ‡ کی کشتیوں کو لے گیا تھا ' جب وہ کوبیاک خان سے لڑنے گیا - آہ ' میرے آقا ' میرے شوہر کو میرے پاس پھر پہنچا دے ' اور میں تیرے دھارے میں سمندر کی طرف اپنے آنسو بہانا چھوڑ دوں گی .

یارو سلافنا پوتیفل کی فصیل پر آہ و زاری کرتی ہے .

" اے روشن سورج ' اے چمکتے دمکتے سورج ! تو اپنی گرمی سب تک

---

† پولوفتسی کا سردار . آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام کوبیاک تھا

* جنوبی روس کا ایک دریا .

‡ ڈی‌گور کا دوسرا نام ہے .

پہنچاتا ہے ' سب کے لئے چمکتا ہے. تو نے اپنی جلتی ہوئی کرنیں میرے شوہر کے جوانوں پر کیوں برسائیں ؟ تو نے ان خشک میدانوں میں ان کے ہاتھوں میں ان کی کمانیں کیوں سکھادئیں ؟ تو ان کو پیاسا کیوں کرتا ہے ' ان کے تیروں کو ان کے کندھوں پر بھاری کیوں کر رہا ہے ؟ " •

" ئی گوُر کے حملے کی داستان " بارھویں صدی کے آخر یا تیرھویں کے شروع میں تصنیف کی گئی ' اور " زدوُن شچی نا[۸] " روسیوں اور تاتاروں کی ۱۳۷۰ کی ایک لڑائی کا بیان ہے . یہ زمانہ اس قسم کی داستانوں کے لئے موزوں تھا ' اور غالباً یہ دو یادگاریں جو محفوظ رہیں اپنی جیسی بہت سی مثالیں رکھتی ہوں گی . لیکن پندرھویں ' سولھویں اور سترھویں صدی میں کلیسا نے ' اس خیال سے کہ ایسی کہانیاں بیدینی کا باعث ہوتی ہیں ' لوگوں سے ان کی یاد بھلانے کی بہت سخت کوشش کی ' اور عوام کے گھتوں کی طرح یہ بھی کٹر مذہبیت کے بھینٹ چڑھیں . روسی ادب کو اس طرح سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے .

تیرھویں صدی میں تاتاریوں کے کُشت و خون کے بعد ماسکو کی ریاست کا عروج ہوا ' اور اس کے ساتھ ہی وہ شگفتگی جو روسی قوم اور اس سے قبل کی تصانیف اور گیتوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے ' بالکل ناپید ہوگئی . وقائع نگاری تک کا انداز بدل گیا . نوف گورود[۸۸] ' ولاجی مر ' پسکوف اور دیگر بڑے شہروں کے وقائع نگار جو اپنی مقامی زندگی سے بیحد دلچسپی ظاہر کرتے تھے ماسکو کی ریاست کے گن گانے میں مصروف ہوجاتے ہیں ' اور روکھے سوکھے واقعات کے سوا کچھ نہیں لکھتے. سولھویں صدی میں پوپ سلوستر کی کتاب "گھر کا نظام" ' زار اِوان چہارم اور اس کے باغی امیر کُرب سکی[۸] کے خطوط ' اور کُرب سکی کی ایک تاریخ روس ہی اس دور کی ادبی یادگاریں ہیں جو تیرھویں صدی سے شروع ہوا اور اٹھارویں صدی میں پیتر اعظم کی اصلاحوں کی

---

[۸] • کروپوٹ کن : " روسی ادب " .

بدولت آخر کار ختم ہوا . سلوستر کی تصنیف ادب سے زیادہ روسی معاشرت کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے . اس میں روسی گھر گرستی والوں کو طرح طرح کے مشورے دئے گئے ہیں اور عیسائی مذہب کے مطابق ان کے جو حقوق و فرائض ہیں وہ سب سمجھائے گئے ہیں . روسی عورتیں اس کتاب کے نام سے جلتی ہیں ' کیونکہ اس میں شوہروں کو اجازت دی گئی ہے کہ بدمزاجی یا نافرمانبرداری کی سزا میں اپنی بیویوں کو مارا کریں . کتاب کے مصنف نے تاکید کردی ہے کہ ایسی چیز سے نہ مارنا چاہئے کہ بیوی کے زخم پڑجائیں یا ہڈی پسلی ٹوٹ جائے ' نہ ایسی جگہ پر کہ ہمسائے اس کے رونے پیٹنے کی آواز سن سکیں ' مگر معلوم ہوتا ہے یہ تاکید روسی عورتوں کے لئے باعث تسلی نہیں ہوئی ہے . " گھر کے نظام " کے علاوہ اس صدی کی دوسری ادبی یادگار ' زار اِوان اور کُرب سکی کے خطوط بھی " گھر کے نظام " کی طرح صرف ضمناً ادب میں شامل کئے جاسکتے ہیں ' کیونکہ زار اور اس کے باغی امیر کے درمیان سیاسی مسائل پر بحث ہوئی تھی ' اور دونوں نے نہایت بھونڈی ' بھدی اور پیچیدہ زبان میں اپنے خیالات ادا کئے ' اگرچہ زار اِوان کی عبارت میں اس کی طبیعت کے زور اور قوت کا کچھ عکس نظر آتا ہے . کُرب سکی کی تاریخ روس اِوان کے مظالم کی داستان سنانے کی غرض سے لکھی گئی تھی . زبان اور طرز تحریر کے رو سے اس کی کوئی وقعت نہیں .

پیتر اعظم (۱۶۸۲-۱۷۲۵) نے روسی ذہنیت پر دینی کے بجائے دنیاوی رنگ چڑھانا اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دیا تھا اور یہ اسی کی اصلاحوں کا نتیجہ تھا کہ روسی ادب کو کلیسا کے پنجے سے رہائی ملی . اس کی تخت نشینی کے ساتھ جس طرح روسی ریاست نے نیا جنم لیا ویسے ہی روسی ادب میں بھی نئی جان پڑ گئی . اس زبان کی جس نے انیسویں صدی میں اپنے جوہر دکھائے ' اس ذہنیت کی جس میں روسی تخیل نے پرورش پائی ' اس معاشرت کی جو روسی قوم نے بالآخر اختیار کی ' پیتر اعظم کے عہد میں بنیاد ڈالی گئی ' اور صحیح معنوں میں روسی ادب کی تاریخ اسی زمانے

سے شروع ہوتی ہے . پیتراعظم کو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن' اسے یقین تھا کہ تعلیم کے بغیر اس کی اصلاحیں بالکل سطحی رہیں گی اور ان میں مطابق اسلحکام نہ ہوگا' اس وجہ سے اس نے روسی زبان کی طرف بہت توجہ کی . اس نے روسی ابجد میں ترمیم کرائی' عربی ہندسے * رائج کئے' اور ملک میں علم کو فروغ دینے کے لئے درجنوں فرانسیسی اور جرمن کتابوں کے ترجمے کرائے اور انکو خود بھی پڑھا . روسی عوام اور شرفا کی رائے عموماً جدت اور اصلاح کے خلاف تھی' لیکن جیسا کہ لومونوسوف (۱۷۶۵ - ۱۷۱۱) اور کریژانچ کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے' روس میں پیتراعظم سے پہلے بھی اصلاح اور ترقی کے حوصلہ مند موجود تھے . خود پیتر کو ایک ایسا حامی اور مشیر ملا جو علمی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے روس میں یکتا تھا' یعنی فیوفان پروکوپووچ (۱۷۳۶ - ۱۶۸۱) نوشیورسٹی کا اسقف . وہ بہترین مقرر تھا' اور اس کی تصانیف' جن میں ایک دو ڈرامے بھی شامل ہیں' بہت جوشیلی اور ایک نئی زندگی کی امیدوں سے لبریز ہیں . پیتراعظم کا ہمعصر ایک اور خود آموختہ انشاپرداز تاجر پولوش نکوف تھا' جس نے اپنی تصانیف میں ریاست کو قوم کی اصلاح کرنے کی ترغیب دلائی' اور بادشاہ کو معاشیات کے صحیح اصول سمجھانے کی کوشش کی .

محض اس وجہ سے کہ وہ اپنی کمی اور کمزوری محسوس کرتے تھے' پیتراعظم اور قومی اصلاح کے حامیوں نے انشاپردازی کا ہتیار اٹھایا اور اسی کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا . لیکن شروع میں نہ تو یہ ہتیار ایسا تھا کہ اس کے وار کارگر ہوسکیں' نہ اسے استعمال کرنے والے ایسے ماہر کہ اس کی خامیاں دور کرسکیں . ابجد کی اصلاح اور بیرونی زبانوں کے ترجموں نے صرف ایک ہی مشکل

---

* ہندسے عربوں کی ایجاد ہیں اور اس وقت یورپ میں جو ہندسے مستعمل ہیں اسی وجہ سے عربی کہلاتے ہیں .

حل کی . روسی انشاپردازوں کو ابھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا تھا ' بہت سے مرحلے طے کرنا ' جن میں سب سے پہلا اپنے فن کو سیکھنا ' اور سکھانے کے لئے استاد تلاش کرنا تھا . " روسی زبان میں بھی نازک احساسات اور خیالات ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی ' اس لئے وہ ابھی تک قدیم سلاف اور مختلف عوام کی بولیوں کا ایک بے ترتیب مجموعہ تھی ' جس میں تقریباً ہر سلاف کے الفاظ اور محاورے بھی شامل ہوگئے تھے . اس پر طرہ یہ تھا کہ صرف و نحو کے کوئی قواعد بھی نہیں تھے جن کے مطابق اصلاح کی جاسکے. قدیم سلاف زبان کے اصول ترک کردئے گئے تھے ' کیونکہ ان میں جدید مضامین بیان کرنے کا امکان نہ تھا ' اور نئی روسی زبان کے قواعد ابھی معین نہیں ہوئے تھے . یوں روسی انشاپردازوں کی پہلی کوششیں زبان کو درست کرنے اور جدید اسلوب کے لئے موزوں بنانے میں صرف ہوئیں . روسی انشاپردازی کو خودمختار بننے کے لئے بڑے عرصے تک شاگردی اختیار کرنی پڑی اور اس کے استاد فرانسیسی شاعر ' نثار اور نقاد تھے " . *

روسی ادب کے اس دور کی چار ہستیاں بہ خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ انہوں نے جدید انشاپردازی کی بنیاد ڈالی اور اپنی کوششوں سے دوسروں کی مشکلیں قدرے آسان کردیں .

نواب † آنت یوخ کانتےمر (۱۷۰۹ - ۱۷۴۴) مولداویا کے ایک امیر کا لڑکا تھا جس نے روس میں سکونت اختیار کرلی تھی . کانتےمر نے ماسکو میں جدید طرز پر تعلیم پائی تھی اور شروع ہی سے پیترِاعظم کی اصلاحوں کا حامی تھا . جب پیتراعظم کے انتقال کے بعد قدامت پسند جماعتوں

---

* آوس سلوف سکی : " روسی ادب "

† روسی لقب " کنیاز " کا ترجمہ اکثر " پرنس " یعنی شہزادہ کیا جاتا ہے : یہ ترجمہ غلط ہے ' اور چونکہ اردو میں خاص طور سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے اس لئے اس کا ترجمہ " نواب " کیا گیا ہے ' جو عہدے اور درجے کے لحاظ سے بہت زیادہ صحیح ہے

نے اس کی تمام جدتوں اور اصلاحوں کو رد کردینے کا تہیہ کیا تو کاٹکوف نے ان کی عملی اور تحریری مخالفت کی ' لیکن اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی خاص اثر پیدا کرسکے . اسے اپنی قوم کی گمراہی اور قومی رہبروں کی تنگ نظری سے جو صدمہ پہنچا وہی اس کی تصانیف کا محرک تھا ' اور اسی کی وجہ سے اس کی تصانیف ماتمی لہجہ پاتی ہیں . اس کی سب سے قابل قدر ادبی یادگار ایک طنزیہ نظم ہے جس میں اس نے نئی روشنی کے مخالفوں اور ان کی ذہنیت کی ایک مضحکہ خیز تصویر کھینچی ہے . نظم کے "ہیرو" ایک رہبان کری توں ' اور تین رئیس ' سلوان ' لوکا اور سےدور ہیں . چاروں نئی روشنی اور جدید تعلیم کے مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں . کری توں کہتا ہے :

" فرقہ بندیاں اور الحاد ' یہ علوم کی اولاد ہوتے ہیں :
جو سب سے زیادہ غور کرتا ہے وہی جھوٹ بھی سب سے زیادہ بولتا ہے .
جو کتابیں پڑھتا ہے خود بخود اپنا دین کھو بیٹھتا ہے ...
جسے دیکھو باتیں بناتا ہے ' ہر بات کی وجہ ' دلیلیں مانگتا ہے '
اور کلیسا کے عہدہداروں کا ادب نہیں کرتا ...
لوگوں کے اخلاق گرگئے ہیں ' کوئی کواس * نہیں پیتا '
کیا مجال ہے کوئی بھوتا گوشت چھو بھی لے ... "

سلوان علوم پر دوسرا الزام لگاتا ہے :

" تعلیم " وہ کہتا ہے ' " ہم کو فاقے کراتی ہے . اس سے قبل
جب ہم میں سے کوئی لاطینی زبان نہیں جانتا تھا
ہم بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے .

---

* پھوہوں کا منشی شربت جو روس میں کثرت سے پیا جاتا ہے

جہالت میں ہمارے پاس روٹی افراط سے تھی : اب ہم نے
پرائی زبانیں سیکھ کر اپنی روٹی گنوادی ہے ...

بحث مباحثہ ' الفاظ میں اگلے پچھلے کا فرق کرنا' کمینوں کا کام ہے:
شریف آدمی تو بس کڑک کر " ہاں " کہتے ہیں یا گرج کر " نہیں

کان تے مرکی نظم پڑھنے سے ان دشواریوں کا اندازہ ہوتا ہے جو اس زمانے میں روسی انشاپردازی کو درپیش تھیں . وہ عروض کے کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کرتا. اس کی نظم کہیں مرجّز * ہے کہیں موزوں ' محض اس وجہ سے کہ اس وقت تک روسی نظم کے قواعد معین نہیں ہوئے تھے . اس کی زبان بھی کہیں بھاری اور پرانے طرز کی ہے ' کہیں پر ایسی روز مرہ جس پر بازاری ہونے کا شبہہ ہوتا ہے ' اور اس معاملے میں اس پر کوئی الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا ' کیونکہ روس میں در اصل ابھی تک کوئی ادبی زبان تھی ہی نہیں . عروض اور زبان کے قواعد بنانے کی خدمت ترِجیاکوفسکی اور لومونوسوف ' دو عالموں نے انجام دی .

وسیلئی کیریل لووچ ترج یا کوفسکی (۱۷۰۱-۱۷۶۹) اپنے زمانے کے بہترین عالموں میں سے تھا. اسے علم کا اتنا گہرا شوق تھا کہ ماسکو کے دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوکر وہ پیدل بھیک مانگتا ہوا پیرس گیا ' اور وہاں مختلف شرفا کی سرپرستی میں پڑھتا رہا . وطن واپس ہونے پر اس کے ادبی ذوق کی خبر ملکہ† تک پہنچی ' دربار میں اس کی رسائی ہوگئی اور رواج کے مطابق اسے خاص خاص موقعوں پر نظمیں پڑھنے کا حکم ملنے لگا .

فرانسیسی شاعروں کی نقل میں روسیوں نے بھی مرجز نظمیں لکھنی شروع کردی تھیں . ترج یا کوفسکی نے یہ ثابت کردیا کہ روسی زبان کی خصوصیات دیکھتے

---

* جس طرح نثر مرجز میں قافیہ نہیں ہوتا ' وزن ہوتا ہے ' اسی طرح عروض کے اس قاعدے میں قافیہ نہیں ہوتا اور الفاظ کے ارکان کے مطابق وزن ہوتا ہے. فرانسیسی نظم میں یہی قاعدہ رائج ہے .

† ملکہ اے لی زوے تا پتروفنا (۱۷۴۱ - ۱۷۶۱)

ہوئے نظم کو موزوں کرنے کا قاعدہ اختیار کرنا بہتر ہوگا ' گو وہ نظمیں جو اس نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لئے یا ملکہ کی فرمائش پر لکھیں نہایت مہمل تھیں ۔ موزوں نظم رائج کرانے کے علاوہ تریاکوفسکی نے روسی علم نحو میں بہت قابل قدر اضافہ کیا ' اور یہ بڑی حد تک اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ روسی نحو کے قواعد بہت جلد ایک مستقل اور معین شکل میں مدون ہوسکے ۔ ان علمی خدمات کے ساتھ ہی روسی ادب پر اس کا ایک اور احسان یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے اسی نے تعلیم یافتہ روسیوں کو ان کے ادب العلوم کی طرف متوجہ کیا اور انھیں اس کی خصوصیات اور خوبیاں سمجھائیں ۔ اس موضوع پر اس کے چند بہت اچھے مضمون اب تک موجود ہیں ۔

میخائل وسیلیویچ لومونوسوف (۱۷۱۲ - ۱۷۶۵) ایک خوشحال کسان کا لڑکا تھا ۔ بچپن ہی سے اس نے غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا ' اور شوق نے اسے علم کی جستجو پر ایسا مجبور کیا کہ سترہ سال کی عمر میں وہ اپنا پیدائشی شہر آرخانگل چھوڑ کر ماسکو چلا گیا ۔ یہاں اسے شروع میں بہت مصیبتیں اٹھانی پڑیں ' لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنی استعداد تسلیم کرالی ' اور جب وہ ماسکو کے دارالعلوم سے سند حاصل کرچکا تو ریاست کی طرف سے اسے جرمنی جاکر اپنے علمی حوصلے پورے کرنے کے لئے وظیفہ ملا ۔ جرمنی سے وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر علمی ذخیرہ لےکر روس واپس ہوا ۔ آوئی لر ' جرمنی کے مشہور عالم ریاضیات نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ علوم طبعی اور کیمیا میں اس نے جو کام کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت غیر معمولی ذہانت کا عالم ہے ۔ معدنیات اور طبعی جغرافیہ میں بھی اسے بہت ملکہ تھا : اور ان علوم کے علاوہ وہ ادب اور لسانیات کا بھی ماہر تھا ۔ شاعر پشکن نے بہت بجا کہا ہے کہ " لومونوسوف پہلا روسی دارالعلوم تھا "

لومونوسوف کی ذات سے روسی ادب کو جو فائدہ ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ اس نے روسی زبان کو کلیسا کی سلاف زبان سے بالکل علیحدہ کردیا ' اور اسے سلجھانے

اور صاف کرنے کا سلسلہ جو پیتراعظم کے زمانے سے شروع ہوا تھا اپنی کوششوں سے تکمیل کو پہنچایا . اس کے ساتھہ ہی اس نے بیرونی زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے اور انہیں اپنانے کے لئے قواعد بنائے ' اور نئی روسی زبان کے قواعد صرف و نحو ایک کتاب کی شکل میں شائع کئے جو اب تک سند مانی جاتی ہے . ان اصولوں کے مطابق اس نے طبع آزمائی بھی کی . معاصرین اسے بہترین یونانی اور رومن کلاسیکی شاعروں کا ہم پلہ قرار دیتے تھے ' اور گو اس رائے میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے ' پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ روسی شاعر ' خصوصاً انیسویں صدی کے نصف اول میں' اسے استاد مانتے رہے ' اور اس کی نظمیں زبان اور محاورے کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں . لیکن لومونوسوف در اصل عالم تھا . باوجود اس کی فصاحت اور بلاغت کے ہمیں اسے شاعر کی حیثیت سے نہیں جانچنا چاہئے. اس کے زمانے کی تعلیمی حالت ایسی تھی کہ ہر کس و نا کس کو جو تک بندی کرسکتا تھا عام رائے شاعر بنادیتی تھی ' اور لوگوں کو اس طرح خواہ مخواہ کے شاعر بنانے میں خود دربار بہت پیش پیش رہتا تھا . اس قدردانی سے روسی انشاپردازی کی کسی قدر ہمت افزائی تو ضرور ہوئی ' لیکن اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ اس قدردانی کی وجہ سے لومونوسوف جیسے عالم نے درباری شاعری کر اپنا وقت ضائع کیا ' اور روس میں علوم و فنون کو فروغ دینے پر اپنی پوری قوت صرف نہ کرسکا .

لومونوسوف کی نظمیں تعداد میں بہت ہیں ' مگر ان میں سے اکثر دربار کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں اور ان میں کوئی خاص خوبی نہیں ۔ اس کے کلام کا بہترین حصہ چند نظمیں ہیں جو اس نے حمد میں لکھیں. " حمد سحرگاہی " کا ایک بند ملاحظہ ہو :

" یہ ہیبت ناک کرۂ آتشیں تیرے نزدیک ایک چنگاری ہے .
ہاں ' جب تو اس چراغ کو روشن کرتا ہے' کہ تیری مخلوق'
جسے تو نے اپنے شوق سے بنایا ' جسے تو اپنی رحمت سے زندہ رکھتا ہے '

محنت کرسکے اور اپنی حاجتیں پوری کرے '

تو کوہ اور دشت ' صحرا اور دریا

رات کی تاریکی سے نجات پاتے ہیں ؛

ہماری نظروں کے سامنے تیری کائنات کا منظر

بے پردہ ہو جاتا ہے اور تیرے کرشمے دیکھ کر

ہمارے دلوں سے خود بخود آفریں کی صدائیں نکلتی ہیں :

" بے شک ہمارا خدا احسن الخالقین ہے ! "

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ لومونوسوف کے وقت تک روسی شاعری نے بہت کم نشوونما پائی تھی ؛ لیکن لومونوسوف کے کلام میں بڑی خوبی اس کی اپج ہے . اس نے کلاسیکی شاعری کو اپنا معیار قرار دیا تھا ' اور اکثر اس کی پیروی کرتا تھا ' مگر اس کی شاگردی میں بھی ایک متانت تھی جو اس کے معاصرین میں بہت کمیاب تھی ' خواہ وہ انشاپردازی میں طبع آزمائی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں . اس بیجا تقلید کی جو اس زمانے میں روسی ذہنیت کا ایک روگ بن گئی تھی الکسےئی پتروویچ سوماروکوف (۱۷۱۸ - ۱۷۷۷) ایک عبرت انگیز مثال ہے . سوماروکوف کو روس کا پہلا ڈراما نویس ہونے کا فخر حاصل ہے . اس نے نو المیہ اور تقریباً پچاس فرحیہ ڈرامے لکھے ' جن میں سے اس کے المیہ ڈرامے خاص طور سے مقبول ہوے . اس نے فرانس کے مشہور ڈراما نویس کورنے ئی * رسین † اور

---

* پی ئر کورنےئی (۱۶۰۶ - ۱۶۸۴) فرانسیسی ڈراما نویسی کا بانی . اس کے ڈراموں کے اشخاص قدیم یونان اور روما کے مشاہیر ہیں ' مگر ان کے کیرکٹروں میں فرانسیسیت کی آمیزش بھی ہے . کورنےئی کا موضوع عموماً اعلیٰ اور ادنیٰ جذبات کی جنگ ہے ' اور اس کے کیرکٹر دراصل جیتے جاگتے انسانوں کے عکس نہیں بلکہ مختلف اخلاقی خصوصیتوں کے مجسمے ہیں .

ژاں رسین (۱۶۳۹ - ۱۶۹۹) نے بھی کورنےئی کی طرح قدیم یونان اور روما کی شخصیتوں کو اپنے ڈراموں کے اشخاص بنایا . کورنےئی کے مقابلے میں اس کے پلاٹ بہت سلجھے ہوئے ہیں ' اور زبان میں بھی اسے زیادہ سلکھ ہے .

مولی‌ئیر ‡ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے ڈراموں میں زیادہ تر ان استادوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی . یہ استاد خود ' خصوصاً رسین اور کور نےئی تصنع اور مردہ قواعد کے بندے تھے ' سوماروکوت نے ان کی نقل کر کے اپنی طبیعت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ' اور یہی اس کی تصانیف کی سب سے نمایاں خامی ہے . معاصرین اس کے بلند پرواز طرز بیان اور دقیق فلسفے سے بہت مرعوب ہوتے تھے لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا معیار بہت گرا ہوا تھا ' اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جس کسی نے فرانسیسی افشاپردازوں کی کامیابی سے نقل اتارلی وہ عروج کی انتہا تک پہنچ گیا ' انھیں سوماروکوت کے ناقابل برداشت تصنع اور خیالات کی کھلی چوری سے شکایت نہیں ہوتی تھی .

آخر عمر میں سوماروکوت کو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ڈراما نویسی کے لئے اتنی موزوں نہیں جتنی کہانیاں لکھنے اور طنزیہ شاعری کرنے کے لئے . اس کے کلام کا یہ حصہ اس کے ڈراموں کے مقابلے میں بہت کم ہے ' مگر ادبی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے ڈراموں سے بہت بہتر ہے . سوماروکوت خود اس پر افسوس کرتا تھا کہ اس کا اصل ہنر اس کی نظروں سے اتنے عرصے تک چھپا رہا . یہ بیجا تقلید کی سزا تھی ' اور اس سزا کا ملنا انصاف کا تقاضا تھا . لیکن خطا سوماروکوت کی نہیں بلکہ اس کے ماحول' یعنی عام روسی ذہنیت' کی تھی .

پیترِاعظم کے مرنے کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی ' مگر اس تعلیم سے ان کی ذہنی نشوونما مطلق نہیں ہوئی. جیسا کہ فوِی‌ژن نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے ' اس زمانے کے بہت سے " جاہل شریف زادوں " کا خیال

---

‡ ژاں باپتسمت مولی‌ئیر (۱۶۷۳-۱۶۲۲) فرحیہ ڈراما نویسوں کا سرتاج مانا جاتا ہے. زبان اور محاورے کے رو سے اس کی عظمت رسین سے کچھ کم نہیں اور اس کے ڈراموں میں ایک حقیقت نگاری ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتی . اس کے اکثر کردار ضرب المثل بن گئے ہیں

تھا کہ " علم حاصل کئے بغیر بھی آدمی تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے ". لوگوں کے داؤں میں ایسے اعلیٰ حوصلے نہیں تھے جو وہ تعلیم کے ذریعے سے پورے کرتے ' اور عام مذاق کو راہ راست پر لانے والا کوئی رہنما بھی نہیں تھا . قدیم روس میں پڑھے لکھے لوگ کم تھے' کتابیں بہت کم تھیں' اور وہ بھی خالص مذہبی . پیتر اعظم نے ریاست کے تمام ملازموں کو اپنا علمی ذخیرہ بڑھانے پر مجبور کیا ' اور مطالعے کی وہ حدیں جو کلیسا نے مقرر کی تھیں بالکل توڑ دیں . اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ روس میں جہالت پہلے کی طرح ایک مایۂ ناز نہیں رہی ' " لوگ کتابوں کو دیکھ کر اس طرح نہیں جھجھکتے تھے جیسے دوافروش کی دوکان دیکھ کر " اور کتب بینی کی رسم بھی ایک مجبوری کے طور پر تسلیم کرلی گئی . لوگوں ریاست کے دباؤ یا ملازمت کے لئے امتحان پاس کرنے کی شرط سے علمی ذوق نہیں پیدا ہو سکتا تھا. ملازمت کے امیدوار اپنا مطلب حاصل کرنے کی غرض سے تھوڑا بہت پڑھ لیتے تھے مگر وہ معلومات جو اس وقت تک کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں بہم پہنچا سکتی تھیں بہت کم تھیں ' اور خاص خاص لوگوں کے سوا ان سے کسی اور کو دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی. تعلیم پھیلنے کا پہلا اثر یوں ظاہر ہوا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو' جن میں عورتیں اور لڑکیاں بہت پیش پیش تھیں ' عشقیہ گیتوں کا چسکا لگا ' اور ان گیتوں نے انہیں ان ادنے جذبات پرست ڈراموں اور شہوت انگیز ناولوں کی قدردانی کے لئے تیار کر دیا جو یورپ کے مختلف ممالک اور خصوصاً فرانس میں اس وقت ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لکھے اور پڑھے جاتے تھے . " علم اور ادب لطیف ' جنہیں متحد ہو کر زندگی کے مسائل کو سمجھانا اپنا خاص مقصد بنانا چاہئے ' ان لوگوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے ' اور ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم کے گران اور تلخ جزو کو الگ کر کے اسے خالص مسرت کا ذریعہ بنانا ممکن ہے ' اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہئے . " * چنانچہ ناولوں کے چرچے کے

* کلیوچنسکی : " مضامین اور تقریریں "

ساتھہ علم کی وقعت گھٹتی گئی ' لوگ انسانیت کے فرائض ' تہذیب اور شائستگی کے لوازمات سے بیگانہ ہوتے گئے ' اور لذت‌پرستی کے سوا انھیں اپنی زندگی کا کوئی مصرف نہیں نظر آیا جسے وہ قابل توجہ سمجھتے . یہ لذت پرستی جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی ' اور اس نے ان کے تصور میں زندگی کا نقشہ بالکل بگاڑ دیا . " ناول نے ان میں حقیقت بینی کی صلاحیت باقی نہیں رکھی ' اور جیسے بچوں کو ان کے گڈے گڑیا سچ مچ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ' ان لوگوں کے نزدیک ناولوں کی خیالی اور رومانی دنیا میں محو ہونا تجربہ حاصل کرنے اور زندگی کا مشاہدہ کرنے کے برابر ہوگیا . پشکن * کی ہیروئن تتیانہ کی طرح وہ سب رچرڈسن † اور روسو پر جان دینے لگے ... بیرونی ممالک کے ان شرفا کو ' جنھوں نے روس میں سکونت اختیار کی تھی ' روسی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں اکثر ایسی بیگمات اور شریف زادیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا جو چار پانچ بیرونی زبانیں بول سکتی تھیں ' موسیقی میں اچھی استعداد رکھتی تھیں ' اور فرانس ' انگلستان اور اطالیہ کے سر بر آوردہ ناول نویسوں کی تصانیف کا مطالعہ کر چکی تھیں . لیکن اس مطالعے کو ایسے علمی ذوق کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے جو غور و فکر کی ترغیب دلاتا ہے ...

" میں اس وقت جب جذبات پرست اور شہوت انگیز ناولوں کا دور دورا تھا ' آزاد خیالی کے فلسفے ‡ کا اثر روسی سوسائٹی میں سرایت کرنے لگا . یورپ

---

* پشکن کا ذکر روسی شاعروں کے سلسلے میں آگے آئیگا .

† رچرڈسن (۱۶۸۹ - ۱۷۶۱) انگریزی ناول نویس . ژان ژاک روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) فرانسیسی انشا پرداز .

‡ آزاد خیالی کے فلسفے سے وہ تخیل مراد ہے جس کو فرانس میں اٹھارویں صدی میں بہت تبلیغ کی گئی ' اور جس کا نصب‌العین انسانی ذہنیت کو جہالت ' تعصب اور مذہب کے آغوش میں پرورش پائے ہوئے اوہام سے آزاد کرنا تھا . بائل (۱۶۴۷ - ۱۷۰۶) وولتیر (۱۶۹۴ - ۱۷۷۸) ' روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) ' دی دے رو (۱۷۱۳ - ۱۷۸۴) اور دالمبر (۱۷۱۷ - ۱۷۸۳) وغیرہ اس کے مبلغ تھے .

کے کسی ملک میں یہ فلسفہ اپنی بری صورت میں اس طرح نہیں نظر آتا جیسے روس میں ... ملکہ کیتھرین (۱۷۶۲ - ۱۷۹۶) کی تخت نشینی کے وقت روس میں ایسے سمجھدار اور خوب اندیش مدبر موجود تھے جو اصلیت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس فلسفے سے ریاست، قانون اور عام زندگی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ... لیکن عام لوگوں میں یہ فلسفہ اس وجہ سے نہیں مرغوب ہوا کہ انھوں نے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے باندھے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ انھیں اپنی قوم کی ذہنیت اور اپنے ماحول پر نکتہ چینی کرنے میں مدد دیتا اور نکتہ چینی میں چٹپٹاپن پیدا کردیتا تھا . روس کے جدید ترین طرز پر تعلیم پائے ہوئے طبقوں نے نکتہ چینی کا وہ انداز جو یہ فلسفہ سکھاتا تھا بہت شوق سے اور بہت جلدی اختیار کرلیا ' خصوصاً اس وجہ سے کہ حسب حال ہونے کے علاوہ اس میں نمک مرچ بہت تھا . رات کے پتنگوں اور پروانوں کی طرح ان کی غور و فکر سے ناآشنا طبیعتیں اس زمانے کے شوخ اور بیباک ذہنی رہبروں کے مقولوں پر اندھا دھند ٹوٹ پڑیں ' اور ان کی عقل سلیم کا وہ حصہ جو عشقیہ نظموں اور ناولوں سے بچ رہا تھا ان مقولوں کی آگ نے جلا کر غارت کردیا ... " * اس تباہی کا الزام در اصل اس تخیل اور فلسفۂ حیات پر نہیں لگایا جا سکتا جو اس کا باعث ہوا ' کیونکہ وہ روسی جن کی عقل سلیم تباہ ہوئی حقیقت میں اس کے متعلق بہت سطحی اور اکثر غلط معلومات رکھتے تھے. " ڈراما نویس فوِن وی زِن کا بیان ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں نے حلقے قائم کئے تھے جن کی غرض فلسفیانہ بحث مباحثہ تھی ' لیکن مذہب کی توہین اور مقدس چیزوں کی بے آبروئی کرنے کے سوا ان فلسفیوں کا اور کوئی شغل نہ تھا . وؤل تیر †

---

* کلیوچفسکی : " مضامین اور تقریریں " .

† فرانس کا مشہور انشاپرداز (۱۶۹۴ - ۱۷۷۸) ' مذہبی رواداری کا حامی ' تعصب کا دشمن . طنز میں یکتا تھا .

کے اکثر روسی پیرو جنھوں نے اس کے بارے میں محض افواھیں سنی تھیں اسے الحاد کا مبلغ * سمجھتے تھے ' اور روسو کی تصانیف سے انھوں نے صرف اتنا سیکھا تھا کہ عقلمندی کا اصل جوھر علم کے فریب سے بچا رھنا ھے † . یوں آزاد خیالی کے فلسفے نے اس جہالت اور ذھنی جمود کو جو روس میں پہلے سے موجود تھا حق بجانب کر دکھایا اور اسے تقویت پہنچائی ‡ " . نئے خیالات نے روسی سوسائٹی کی کوئی ذھنی یا روحانی حاجت نہیں پوری کی . ان سے لوگوں کو ویسی ھی دلچسپی تھی جیسی غیبت کرنے اور سننے ' یا شہوت انگیز ناولوں کی تصویریں دیکھنے سے ھوتی ھے . " فلسفیانہ تضحیک نے وولٹیر کے روسی پیرو کو ھر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد کردیا ' پولیس والے کے سوا اسے اورکسی کا خوف نہیں رھا ' جسمانی تکلیف کے سوا اس کے دل میں اور کسی قسم کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رھی ... روسی ذھنیت ' جس میں یورپ کے بصیرت افروز اثرات نے یہ کیفیت پیدا کردی تھی حقیقت میں یورپ کی تہذیب نہیں حاصل کر رھی تھی بلکہ ایک مسالہ دار اور ثقیل غذا اختیار کرنے سے جس کی وہ عادی نہیں تھی اپنے آپ کو بیمار کر رھی تھی . اسی دوا نے جو کسی زمانے میں اس کی صحت کی اصلاح کے لئے تجویز کی گئی تھی روسی قوم کے پرانے امراض اور ابھار دئے ' اور اب صرف اس کی بیماریوں کا علاج نہیں کرنا تھا بلکہ خود دوا کا " . §

---

*حالانکہ وولٹیر کا مقولہ ھے کہ " اگر خدا نہ بھی ھوتا تو ھمیں کوئی نہ کوئی بنانا پڑتا".

† روسو نے ۱۷۶۲ میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ علوم و فنون انسان کے اخلاقی تنزل کا سبب ھوتے ھیں . اس کا خیال تھا کہ یورپ کی قوموں کو وہ سادہ اور فطری طرز معاشرت اختیار کرلینا چاھیئے جو قدیم یونان اور روما میں رائج تھا . اس کے ناول " ژولی یا نئی اےلوآز " نے ' جس میں اس نے ایسی زندگی کی نہایت دل ربا تصویر کھینچی ھے ' فرانسیسی ذھنیت میں ایک انقلاب پیدا کردیا . جیسا کہ وولٹیر نے طنزاً کہا ھے " اسے پڑھکر چاروں ھاتھ پیر پر چلنے کو جی چاھتا ھے ."

‡ کلیوچفسکی : " مضامین اور تقریریں " .

§ ایضاً .

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲ - ۱۷۹۶) روسی روشن خیالی کے اس پہلو سے آگاہ تھی . اس کا اپنا فلسفۂحیات بھی اسی تخیل پر مبنی تھا جس کی شعاعیں فرانس سے ہر طرف پھیل رہی تھیں . اپنی ذہنی اور اخلاقی بساط کے مطابق اس نے ذاتی طور پر اصلاح کی کوشش کی ' مگر اس کی زندگی کا طریقہ ایسا تھا کہ اس کی رہنمائی سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا . اس کے عہد کے مدبروں میں بھی اس قدر حس تھی کہ قومی زندگی کے دھبوں کو مٹانے کی فکر کریں اور انھوں نے قوم کو تعلیم کی رغبت دلانے اور درسگاہیں قائم کرنے میں بہت سرگرمیاں دکھائیں . لیکن وہ وہم اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے . انھوں نے درسگاہیں قائم کیں جن میں نہ استاد تھے نہ طالب علم ' اور نہ ان کے لئے درسی کتابیں فراہم کی جاسکتی تھیں . اگر یہ سامان سارا مہیا بھی ہو گیا تو تعلیم یافتہ لوگوں کو پھر وہی ذہنیت جس سے انھیں آزاد کرنا مقصود تھا اختیار کرلینے سے روکنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا . یوں ریاست کی ساری اصلاحی کوششیں ناکام رہیں ' لیکن خود تعلیم یافتہ روسی طبقوں میں دو چار ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنھیں ذہنیت کے عام رجحان میں سبک سری اور بدمذاقی نظر آتی تھی ' اور اس امید میں کہ تضحیک سے گمراہوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ اپنی حماقتوں سے باز آئیں گے انھوں نے طنز اور تضحیک کو اصلاح کا آلہ بنایا . پہلی ترکی جنگ کے زمانے میں (۱۷۶۸ - ۱۷۷۴) اس قسم کے انشاپردازوں نے بہت زور دکھایا . ان میں سب سے زیادہ جوشیلا ایک نوجوان سابق فوجی کپتان فوِنی کوِث تھا ' جس کے تین رسالے ' " احدی " " مصور " اور "تھیالی" اس وقت کی انشاپردازی کے کارنامے مانے جاتے ہیں .

نی کولائی لواذوِچ فوِنی کوِث (۱۷۴۴ - ۱۸۱۶) تبلیغ کے کام کے لئے فطرتاً نہایت موزوں تھا ' اور اس کے رسالوں میں جوش کے ساتھ حقیقت بینی اور حقیقت نگاری کا وہ مادہ پایا جاتا ہے جس سے روسی انشاپردازی اس وقت تک

ناآشنا تھی اور جو بعد کو اس کا مایۂ ناز بن گیا . فووی کوف کے تیروں کا ھدف فرانس کی تقلید کا خبط تھا اور قوم کی اس حماقت کو واضح کرنے اور اس پر لعنت ملامت کرنے میں اس نے کوئی دقیقہ نہیں باقی رکھا . لیکن وہ خرابی جسے فووی کوف دور کرنا چاھتا تھا اخلاقی کمزوری یا خالص بداخلاقی نہیں تھی ' بلکہ ایک طرح کی دل کی بیماری ' اور بیماریوں کا علاج کیا جاتا ھے ' مذاق نہیں اڑایا جاتا. روسیوں نے یورپی تہذیب اس بے ڈھنگے پن سے اختیار کی تھی کہ ان کی ذھنیت کو فروغ دینے کے بجائے اس نے ان کی نگاہ دھندلی کردی ' اور چونکہ وہ اپنی اصلیت سے ناواقف تھے اور اپنے آپ سے بیگانہ ' اس ناواقفیت اور بیگانگی نے انھیں اپنی اصلیت سے بےپروا کردیا ' اور بتدریج یہ بےپروائی نفرت اور تحقیر میں منتقل ھوگئی . فون ویزن کے کیرکٹر اوانوشکا کی طرح روسی اس پر افسوس کرنے لگے کہ وہ روسی تھے ' اور انھیں صرف اس بات سے تسکین حاصل ھوتی تھی کہ "گو ان کے جسم روس میں پیدا ھوئے ان کی روح شاہ فرانس کی تابعدار ھے" * . ایسی ذھنیت کا علاج تضحیک سے نہیں ھوسکتا ' اور خود فووی کوف نے بھی اسے محسوس کیا . " مصور " میں اس نے ایک مضمون شائع کیا جس میں ایک مصنف اور اس کے ناظرین میں گفتگو ھوتی ھے اور ایک ناظر مصنف سے کہتا ھے : " آپ کو یہ معلوم ھونا چاھئے کہ جس وقت آپ میرا مذاق اڑاتے ھیں میں خود بھی آپ کے ساتھ ھنسی میں شریک ھوتا ھوں " . یعنی مصنف کچھ بھی لکھے ' پڑھنے والے پر اس کا اثر نہیں ھوتا : اگر ھوتا تو ھنسنے کے بجائے وہ خفا ھوتا یا اپنی غلطیوں پر نادم اور شرمندہ . کچھ اس ناکامی کے احساس ' کچھ ریاست کی مخالفت نے فووی کوف کو یقین دلادیا کہ اس کا طرز عمل صحیح نہیں ' اور اس نے اپنا طریقہ بدل دیا .

رسالوں اور مضامین کے ذریعے سے اس نے تعلیم یافتہ لوگوں میں نام پیدا کرلیا

---

* فون ویزن اور اس کی تصانیف کا ذکر روسی ڈراما کے تحت میں آئے گا .

تھا . ۱۷۷۹ میں وہ ماسکو آیا اور وہاں کے دارالعلوم کا چھاپہ خانہ دس سال کے لئے ٹھیکے پر لیکر کتابوں کی ایک دُکان کھولی اور کتابوں کی اشاعت شروع کردی. ان ادنیٰ شہوت انگیز اور اخلاق کو برباد کرنے والے ناولوں کے مقابلے میں جو ڈھیروں فرانس اور انگلستان سے منگائے جاتے تھے اس نے انہیں ممالک کے ادب کے بہترین نمونے تعلیم یافتہ روسیوں کے مطالعے کے لئے ترجمہ کرائے ' اور اسی کے ساتھ ہی درسی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ روسی درسگاہوں کے واسطے تیار کردیا · چھاپے خانے کا ٹھیکا لینے کے سات سال کے اندر اس نے تین سو چھیاسٹھ اخلاقی ادبی اور درسی کتابیں شائع کیں . کتب فروشی سے اسے اتنی ہی آمدنی ہوتی تھی جتنی ماسکو کے بڑے بڑے دُکانداروں کو ' " اور ان لوگوں کا جو اس زمانے میں تھے اور خود نووی‌کوف سے واقف تھے یہ بیان ہے کہ اس نے علم کی محبت اور مطالعے کا شوق صرف پھیلایا نہیں بلکہ اسے پیدا کیا : اس کا کاروبار اس قدر وسیع تھا اور کام اس سلیقے سے کیا جاتا تھا کہ اس کی کتابیں صرف یوروپی روس کے دُور افتادہ کانووں ہی میں نہیں بلکہ سائبیریا تک پہنچنے لگیں ' اور لوگوں نے انہیں پڑھنا شروع کردیا ... ٹھیکے کے دس سال میں نووی‌کوف کی اشاعت کتب اور کتب فروشی کی جدوجہد نے روسی سوسائٹی میں نئی معلومات ' نیا مذاق ' نئے احساسات پیدا کردئے ' منتشر خیالات کو ہم آہنگ بنایا ' اور مختلف مذاق کے ناظرین کو ایک مستقل مطالعے سے شوق رکھنے والی جماعت کی شکل دیدی . اس شوق کو پورا کرنے کے لئے مترجموں ' مؤلفوں ' چھاپے خانوں اور کتب فروشوں نے جو سرگرمیاں دکھائیں ' کتابوں ' رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے روسیوں کے ذہن میں جو تحریک ہوئی " ان سب کا نتیجہ ایک چیز ہوئی جو ابھی تک روس میں ناپید تھی - عام رائے " * . افسوس ہے ملکہ کتھیرین دوم

---

* کلیوچفسکی : " مضامین اور تقریریں " .

ملکہ کیتھرین دوم ان خدمات کی قدر نہ کرسکی اور اس خوف سے کہ کہیں نووی‌کوف کے کاروبار کا انجام انقلابی خیالات کا پرچار نہ ہو ' اس نے نووی‌کوف کو ۱۷۹۲ میں قید کرکے اس کا سارا کام برباد کردیا . لیکن نووی‌کوف اس وقت تک اپنا مطلب حاصل کرچکا تھا ' اور روس کی ذہنی اور ادبی خود داری کی بنیاد اس قدر مستحکم ہوگئی تھی کہ بیرونی اثرات کے مہلک ثابت ہونے کا بہت زیادہ خطرہ نہیں رہا تھا .

فون‌ویزن کے ڈراموں اور نووی‌کوف کی شخصیت کے علاوہ الکسانڈر نکولایوچ رادِش‌چف (۱۷۴۹ - ۱۸۰۲) کا ناول " پیٹربرگ اور ماسکو کا سفر " جو ۱۷۹۰ میں لکھا گیا اس کی دلیل ہے کہ روس میں خودی کا احساس پیدا ہورہا تھا اور ایک خاص رنگ بھی پکڑ رہا تھا . رادش‌چف نووی‌کوف کی طرح رئیس خاندان کا تھا ' اور اس نے بھی پیٹربرگ کے کیڈٹ کالج میں تعلیم پائی تھی . یہاں سے فارغ ہوکر وہ جرمنی گیا ' اور وہاں جرمن اور فرانسیسی فلسفیوں کا مطالعہ کیا . اس مطالعے کا نتیجہ اس کا ناول تھا' جس میں اس نے بڑی بےترتیبی سے اپنی معلومات ' احساسات ' اور فلسفیانہ ' سماجی اور معاشی نظریوں کو یکجا کر کے انہیں ناول کی پوشاک پہنادی . اس ناول میں کوئی ادبی یا فنی صفت نہیں ' اس کا تخیل بھی ادنیٰ ' اور اکثر اپنا نہیں پرایا ہے . لیکن رادش‌چف کی برائی کرنے والے بھی اس سے انکار نہیں‌کرتے کہ اس میں ایک درد ' مظلوموں سے ہمدردی اور قوم کی محبت ظاہر ہوتی ہے جس کا اس سے پہلے روسی ادب میں نام و نشان تک نہیں ملتا اور جس کا مقابلہ بعد کے مصنف بھی مشکل سے کرسکیں گے .

اس زمانے کی ذہنی بیداری کا دوسرا پہلو نکولائی میخائلووچ کارامزن کی تصانیف ہیں . کارامزن صوبۂ سمارا کا ایک خوشحال زمیندار تھا جس نے بہت

اچھی تعلیم پائی تھی ۔ ۱۷۸۵ میں وہ اس حلقے میں شامل ہو گیا جسے نووی‌کوف نے ماسکو میں قائم کیا تھا ۔ ان لوگوں کی صحبت نے اس کے دل کو بھی ولولوں اور حوصلوں سے لبریز کردیا ۔ ۱۷۸۹ میں اس نے یورپ کا سفر کیا ' اور وہاں سے اس نے روسی رسالوں میں خطوط بھیجے جن میں یورپ کے علمی اور ادبی مشاہیر کے حالات زندگی اور یورپ کی مشہور درسگاہوں اور دارالعلوم کا مفصل بیان تھا ۔ ان خطوط کا اصل مقصد یورپ کی ذہنی اور علمی طرقی کی دلفریب تصویر دکھا کر روسیوں کو عبرت دلانا تھا ' مگر کارامزن کی شخصیت ابھی تک پختہ نہیں تھی ' اور اس کے خیالات نے کوئی معین شکل نہیں اختیار کی تھی ' اس لئے وہ اکثر مغالطوں میں مبتلا ہوگیا اور یوروپی تخیل کی صحیح ترجمانی نہ کر سکا' لیکن " خطوط " کی اصل خوبی ان کی سادہ سلجھی ہوئی زبان ہے جس سے قدیم سلات کے ثقیل الفاظ بالکل دور کردئے گئے ہیں اور سینکڑوں نئے الفاظ اور محاورے اس صفائی سے کھپا دئے گئے ہیں کہ کسی جدت کا شبہہ نہیں ہوتا ' اور جس میں ایک ایسی ہم آہنگی اور ترنم ہے جو نثر میں نظم کی شان پیدا کردیتا ہے ۔ عمر کے ساتھہ کارامزن کا ذہن پختہ ہوگیا ' اس کے خیالات میں نہ پیچیدگی رہی نہ تلون ' اور وہ بلاغت اور فصاحت جس نے " خطوط " میں اپنی جھلک دکھلائی تھی روسی نثر کی ایک گراں‌بہا دولت بن گئی ۔

یورپ سے واپس آکر کارامزن نے دو تاریخی ناول لکھے ' " غریب لی‌زا " اور " نتالیا ' نواب زادی " ' جو روس میں رومانی اثرات کا پیش خیمہ تھے ۔ ان ناولوں میں کارامزن نے گزشتہ روسی زندگی کا عکس اتارا ہے ' مگر اپنے عقیدے اور خیال کے مطابق ؛ اس کے کیرکٹر دیہاتی زندگی اور روسی مناظر قدرت کے شیدائی ہیں ' دولت اور عیش و آرام کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں ' اور ان کا سب سے عزیز حوصلہ کار خیر کے ذریعے سے دائمی شہرت حاصل کرنا ہے ۔ واقعات

دیکھے جائیں تو یہ تصویریں جھوٹی ہیں ' اور کیرکٹروں کی یہ ذہنیت اور آرزوئیں مصنف کی صریحی ایجادیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں . لیکن اس زمانے میں کسی نے ناولوں کے اس عیب پر غور نہیں کیا ' سب ان کی زبان کی نفاست اور داستان کی دل آویزی پر آفریں کہتے تھے . کارامزن نے یہ ناولیں لکھہ کر روسی قوم پر واقعی بہت بڑا احسان کیا ' کیونکہ ان کی وجہ سے روسی اپنی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے ' اور ان کی نظروں سے وہ پردہ اٹھہ گیا جو ادنیٰ یوروپی ناولوں نے ڈال دیا تھا . " غریب‌لی‌زا " کی ہیروئن ایسی فصیح زبان بولتی ہے جو اس وقت کارامزن کے سوا کوئی لکھہ بھی نہیں سکتا تھا ' مگر وہ ایک غریب کسان کی لڑکی تھی جو کسی رئیس زمیندار پر عاشق ہوگئی تھی ' زمیندار نے اس کے جذبے کا احترام نہیں کیا ' اور اپنی بےعزتی کا داغ مٹانے کے لئے وہ ایک جھیل میں ڈوب کر مرگئی . اس کی داستان کا لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر ہوا ' اور غریب لی‌زا کے طفیل میں وہ روس کے ان بیکس اور مظلوم کسانوں سے ہمدردی کرنے لگے جنھیں وہ پہلے حیوانوں سے بھی بدتر سمجھتے تھے .

ناولیں لکھنے کے بعد کارامزن نے عمر کا بقیہ حصہ روس کی تاریخ تصنیف کرنے کے لئے وقف کردیا ' اور اس کی تاریخ روس کی بارہ جلدیں ہی اس کا کارنامہ ہیں . قومی زندگی کی تدریجی تعمیر میں اس نے ماسکو کے بادشاہوں کو بیجا اہمیت دی ہے ' اور خود قوم کی کوششوں کو بہت نظرانداز کیا ہے ' وہ بادشاہوں اور مدبروں کی تدبیروں میں الجھا رہتا ہے اور ان قومی اداروں کا ذکر بھی نہیں کرتا جو دراصل قدیم ملکی نظام کی جان تھے . بعد کے مورخوں نے اس کی تصنیف میں اسی قسم کی بہت سی غلطیاں اور خامیاں نکالی ہیں جن کی وجہ سے وہ اب مستند نہیں قرار دی جاسکتی ' لیکن جو خدمات اس تصنیف نے انجام دیں وہ بے شمار ہیں . گزشتہ زندگی کی یادگار اس نے ایسی شکل میں

پیش کی ' اور اسے اتنا شاندار اور ہمت‌افزا دکھایا کہ وہ روسی خود داری کا سنگ بنیاد بن گئی ' اس نے روسیوں میں قومی نشوونما اور ریاست کو فروغ دینے کا حوصلہ پیدا کیا ' اور قومیت کے احساس کو اسی قدر تقویت پہنچائی جتنی اس خون نے جو روسی وطن پرستوں نے اپنے ملک کو نےپولی‌ئن کے پنجے سے بچانے کے لئے بہایا تھا .

اس دور کے نثر سے جب ہم نظم کی طرف رخ کرتے ہیں تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے . جرژاون میں اپج ہے ' مگر اس کے خیال میں شوخی اور بلندپروازی نہیں' ژوکوفسکی کا درجہ فن کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر اس میں بدیع‌الخیالی نہیں اور اس کی کوششیں زیادہ تر ترجموں پر صرف ہوئیں . یہ دونوں شاعر محض مخبر ہیں ایک نئے دور کے جو شروع ہونے والا تھا .

گاورلّئی رومانووچ جرژاون (۱۷۴۳ - ۱۸۱۶) صوبۂ کازان کے ایک مفلوک‌الحال رئیس زادے کا لڑکا تھا . اس کا شروع بچپن شہر اورن‌برگ میں گذرا ' اس کے باپ کے انتقال پر اس کی ماں کازان آئی اور وہاں جرژاون ایک مدرسۂ اعلیٰ میں جو اسی زمانے میں کھلا تھا داخل کرا دیا گیا . سولہ برس کی عمر میں ' قبل اس کے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کرسکے جرژاون فوج میں بھرتی کر لیا گیا ' اور وہ دس سال جو اس نے فوجی ملازمت میں گذارے اس کی زندگی کا سب سے تاریک حصہ ہیں . اس کی صحبت نہایت ذلیل تھی ' اور جو کام اس کے سپرد تھا وہ صرف مشکل نہیں بلکہ غیر دلچسپ تھا . سب سے زیادہ تکلیف اسے اپنا علمی اور ادبی شوق پورا نہ کرسکنے کی تھی . لیکن باوجود تمام دشواریوں کے جرژاون نے راتوں کو جاگ کر عروض پر کتابیں پڑھیں ' اور لومونوسوف کی نظموں کا بہت غور سے مطالعہ کیا ' کیونکہ اس زمانے میں وہی استاد مانا جاتا تھا . مطالعے کے علاوہ وہ خود شعر کہنے کی بھی مشق کرتا رہا ' اور ۱۷۷۲ میں جب اسے افسر کا عہدہ ملا اور پیٹربرگ

میں رہنے کی اجازت حاصل ہوگئی ' تو وہ بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کا کلام اس قدر پسند کیا گیا کہ سب اسے صدی کا سب سے اعلیٰ شاعر ماننے لگے .

" فےلیتسا " جرژاوں کی پہلی نظم تھی جس نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا. اس نظم میں اس نے ملکہ کیتھرین دوم کی مدح کی ہے اور اس موقع کو اس کے درباریوں کی قلعی کھولنے کے لئے نہایت مناسب طور پر استعمال کیا ہے . چنانچہ " فےلیتسا " کی تعریف کرنے کے بعد اس کا عاشق (جس سے ایک خاص رئیس مراد ہے جو ملکہ کیتھرین کی نظرالتفات سے بہت بیجا فائدہ اٹھاتا تھا) اپنے بارے میں کہتا ہے :

" فےلتسا ایسی ہے ' میں ایک عیاش ہوں '
لیکن ساری دنیا میری ہی جیسی ہے '
علم و دانش نے اسے چاہے جتنا مشہور کر دیا ہو'
ہر انسان حقیقت میں محض دھوکا ہے .
ہم دنیا میں راہ راست پر چلنا نہیں جانتے '
بدمستی میں اوہام کے پیچھے دوڑتے ہیں .
خوشامد اور شکایت ' غرور اور بدکاری -
ان ویرانوں میں بھلا کسی کو
اتفاق سے بھی سیدھا راستہ مل جاتا ہے ؟
صرف تجھے ' اے ملکہ ' یہ فخر حاصل ہے
کہ تاریکی میں روشنی پیدا کرے '
بدنظمی میں نظام قائم کرے'
اس نظام کو استحکام عطا کرے'
اور انسان کے حیوانی جذبات کو

اس کی مسرت کا سامان بنائے ۔"

اس نظم کا لوگوں پر بہت مختلف اثر ہوا ۔ جنھیں دربار سے کوئی واسطہ نہیں تھا انھوں نے اس کی بہت تعریف کی ' جن درباریوں کو اندیشہ ہوا کہ ان کی پردہ دری کی گئی ہے بہت خفا ہوئے ' اور انھوں نے جرژاون پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک انسان کو خدائی کا مرتبہ دے کر خدا کے حق میں بےادبی کی ہے ۔ مگر ملکہ کیتھرین کو یہ نظم بہت پسند آئی ' جرژاون کا دربار میں رسوخ ہوگیا ' اور وہ ملکہ کے خاص دوستوں میں شمار ہونے لگا ۔

جرژاون کی نظمیں عموماً معاصر شخصیتوں اور کارناموں کے متعلق ہیں ۔ اکثر شاعر جن کا دربار یا امیروں کی صحبتوں میں رسوخ ہوتا ہے مدح‌سرائی کو اپنا پیشہ بنالیتے ہیں ' اور سچ اور جھوٹ میں مطلق تمیز نہیں کرتے ۔ جرژاون میں یہ کمزوری نہیں تھی ۔ ملکہ کیتھرین کے سوا اس نے کسی کی ذات کی بیجا یا مبالغہ آمیز مدح نہیں کی ' اور ملکہ کی تعریف کو بھی اس نے درباریوں کی ہجو کے لئے ایک آڑ بنایا ' جیسا کہ اس کی نظم "فےلیت سا" سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اور ملکہ یا کسی اور شخصیت کی اس نے اگر تعریف بھی کی تو کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اس امید میں کہ اس سے روس میں قومیت کا احساس بڑھے گا اور قوم کے خادموں کے حوصلے بلند ہوں گے ۔ سووژروژ ایک نہایت قابل اور کامیاب روسی جنرل تھا جس نے پولی‌ٹن کے کئی افسروں کو شکست دی ' اور پولستان کے دارالسلطنت وارسا کو فرانسیسیوں کے قبضے سے چھینا ۔ اس کی تعریف میں جرژاون لکھتا ہے :

" رات کے بھونچال کی طرح جوانمرد چلا جاتا ہے !
اس کا سایہ تاریکی پھیلاتا ہے ' اس کی للکار سے آسمان پر غبار چھا جاتا ہے ۔
اس کی نظر بجلی کی طرح سامنے چمک چمک کر اس کا راستہ روشن کرتی ہے '
اس کے پیچھے اونچے شاہ بلوط کے درخت زمین بوس ہوتے ہیں ۔

وہ جہاز میں بیٹھا تو سمندر ابل پڑتا ہے ،
پہاڑوں پر چڑھا تو وہ کانپ جاتے ہیں .
شہر پناہیں اس کے چھونے سے گرپڑتی ہیں ،
قلعوں کو وہ اڑا کر بادلوں میں غائب کر دیتا ہے .
دنیا اس کی عظمت سے لرزتی ہے ،
کمزور اور بے بس مخلوق کا اس سے بہتر کوئی محافظ نہیں . "

سوووروف کی مدح میں جرژاوں نے مبالغہ تو بہت کیا ہے ، لیکن اس کا اصل مقصد اپنے ملک، کا جاہ و جلال دکھانا، روسی دلوں میں اولوالعزمی پیدا کرنا ہے . سوووروف کی تعریف اس وجہ سے کی گئی کہ وہ وارسا کا فاتح تھا، نظم کا عنوان بھی " وارسا کی فتح " ہے . اس کے مقابلے میں جرژاوں کی نظم " بادشاہ " کے چند شعر ملاحظہ ہوں . اس کی نیت پر اس کے بعد کوئی شک نہ باقی رہنا چاہئے .

" ایک بت ، تمام برائیوں سے لپا ہوا ،
عوام کے حقیر تصوروں پر جادو کر دیتا ہے ،
لیکن اگر کوئی صاحب نظر اس کی طرف آنکھ اٹھائے
تو اس کی ساری خوبیاں غائب ہوجاتی ہیں .
یہ نظر کو دھوکا دینے والی صورتیں ہیں ،
مٹی کی صورتیں جن پر سونا پھرا ہے !
اے روح کے فیض سے ناآشنا بادشاہو ،
کیا تم ان صورتوں میں اپنی شکلیں نہیں پہچانتے ہو ؟
گدھا ہمیشہ گدھا رہتا ہے
چاہے اس کی پیٹھ پر ستارے جڑ دئے جائیں ،

جہاں اسے اپنی عقل سے کام لینا چاہئے
وہ صرف اپنے کان ہلاتا ہے . . .
ہاں ، قدرت کا ہاتھہ حقداروں کا حق دینے میں
ہمیشہ کوتاہی کرتا آیا ہے . ''

جرژاون کی شاعری کے متعلق روسی نقادوں میں بہت اختلاف رہا ہے ، بعضے اسے لومونوسوف سے کم ، بعضے اٹھارویں صدی کا سب سے ممتاز شاعر مانتے ہیں . پُشکن کی رائے ہے کہ وہ شاعر ہی نہیں تھا. جرژاوں کا انتہائی شوق اور بلند حوصلہ دیکھتے ہوئے پُشکن کے اس خیال میں کچھہ ناانصافی ضرور محسوس ہوتی ہے ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نازک احساسات جو ہر شاعر میں ہونا چاہئیں، اور خصوصاً اس میں جو قوم کی رہنمائی کرنا چاہتا ہو ، جرژاون کو نہیں عطا ہوئے تھے . اس کی حیثیت اس استاد کی سی ہے جو اپنے شاگردوں میں صحیح مذاق پیدا کرنے کے لئے طبع آزمائی کرتا ہے ، اور ان کی اخلاقی تربیت کی غرض سے بزرگوں کے کارناموں کو ایک دلچسپ داستان کے پیرائے میں پیش کرتا ہے ، لیکن رہبری کے لئے نا موزوں اور اس نظر سے محروم ہے جو دوسروں کی آنکھوں میں بھی روشنی پیدا کر دیتی ہے .

روسی مذاق کی رہنمائی اور نو آموز شاعروں کو ان کے فن میں تربیت دینے کی اہم خدمت وسّی لئی آن‌درے یوچ ژوکوفسکی (۱۷۸۳ - ۱۸۵۲) نے انجام دی . اس کا اپنا کلام بہت کم ہے ، لیکن اس نے ترجمے بہت کئے ، اور یہی حقیقت میں اس کے کارنامے ہیں . ان کے ذریعے سے اس نے روس کے اہل ذوق کو جرمن ، انگریزی اور فرانسیسی شاعری کے بہترین کلام سے آشنا کر دیا ، اور ان کے سامنے نمونے پیش کردئے جو ایک صحیح ادبی معیار کا کام دے سکتے تھے . اس نے یونانی شاعر ہومر کی اوڈیسی ، سنسکرت کی داستان نل‌دمینتی اور فردوسی کے شاہ نامے سے سہراب اور رستم کے قصے کے جو ترجمے کئے وہ اصل زبان سے نہیں تھے بلکہ جرمن شاعر روکرٹ

" جب دانت نہ تھے تب دودہ دیو ' جب دانت دیے کہا ان نہ دے ہے "

تیسرے درویش کی سیر میں (جو فارسی کے نسخے میں دوسرے درویش کی سیر ہے) اصل فارسی سے جا بجا اختلاف پایا جاتا ہے ' لیکن مہر امن نے ہر جگہہ نو طرز مرصع کی تقلید کی ہے - وضاحت کی غرض سے چند مقامات کا حوالہ یہاں دیا جاتا ہے —

آں گنبد چہار صفہ داشت - در پیش یک صفہ پردہ کشیدہ بودند - آں مرد بآں پردہ رفت و بعد از لمحہ آواز گریہ و نالہ بگوشم رسید - آں مرد پیر بنالۂ غزیں می نالید و می گفت —

اے فلک تا بچند خوں بارم رحم آور بدیں دل زارم

مرا بر احوال او تعجب آمد ' بر خاستہ بہ عقب پردہ آمدم و نظر بہ اندرون گماشتم ' دیدم ..... " (فارسی)

" بہ سبب ماندگی و کسل اعضا کہیں داران خواب کے اوپر قافلۂ بیداری کے تاخت لائے اور متاع گراں بہاے ہو شیاری کو لوٹ لے گئے - بعد ایک لمحے کے آواز گریہ و زاری کی بیچ گوش ہوش میرے کے مستمع ہوے - آنکھہ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا پلنگ پر لیٹا ہوں و صاحب خانہ سے مکان خالی ہے ' آگے دالان کے ایک پردہ پڑا ہے ' اس کے تئیں اٹھا کر ملاحظہ کیا کہ ..... "

(نو طرز مرصع)

" ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا - اس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی آنکھیں مل کر جو دیکھتا ہوں تو اس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہے نہ کوی اور ہے - اکیلا میں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے - چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا - ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا - وہاں جا کر اسے اٹھایا - دیکھا تو ..... " (باغ و بہار)

فارسی کتاب میں تیسرا درویش (شاہزادۂ عجم) پیر مرد سے پوچھتا ہے کہ یہ صنم کہاں سے آیا ، اس کا نام و نسب کیا ہے ، وغیرہ وغیرہ تو بوڑھے نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا تو خود پوچھ لے - اس کے بعد وہ اس نازنین کے پاس جا کر سلام کرتا ہے .....

نو طرز مرصع میں یہ سوال و جواب نہیں - غش سے ہوش میں آتے ہی وہ نازنین کو سلام کرتا ہے وغیرہ - یہی باغ و بہار میں ہے -

جس روز مال و اسباب لے کر ملک فرنگ پہنچتا ہے تو شاہی خواجہ سرا آتا ہے اور ملاقات کے بعد کہتا ہے کہ ہماری ملکہ نے مسلمان تاجروں کے آنے کی خبر سنی ہے جو سامان بادشاہوں کے لائق ہو اسے لے کر چلو - وہ مناسب سامان جمع کر کے خواجہ سرا کے ساتھ ہو لیتا ہے (فارسی)

نو طرز مرصع میں وہ اس روز ماندگی اور کسل مزاج کا عذر پیش کر کے دوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کرتا ہے - باغ و بہار میں بھی اسی کا اتباع کیا گیا ہے —

ملکہ دوسرے روز سامان کی قیمت دینے کے لئے بلاتی ہے جب جاتا ہے تو بٹھاتی ہے اور ایک ساعت کے بعد مٹھائی آتی ہے - پھر دستر خوان بچھتا ہے - ملکہ رونے لگتی ہے اور چند نوالے کھانے کے بعد دستر خوان بڑھاتے ہیں - اس وقت خلوت میں اپنا حال سناتی ہے (فارسی)

نو طرز مرصع میں مٹھائی اور دستر خوان وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں اور یہی باغ و بہار میں ہے —

ملکہ کہتی ہے کہ اگر تو میرا کام کرے گا تو جو نفع ملک فرنگ سے ہونے والا ہے وہ میں دیدوں گی - اس نے کہا اس کی ضرورت نہیں میں ہر خدمت کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں - ملکہ نے کہا روپیہ لینا ہو گا ، ہمیں مفت کا خدمتگار

نہیں چاہئے - اس نے کہا جو آپ کی مرضی —

نو طرز مرصع اور باغ و بہار میں یہ گفتگو مطلق نہیں —

اس کے بعد ملکہ کا یہ کہنا کہ دریا اس پار جو شہر ہے وہاں چلا جا اور اپنا مال اسباب بھی لےجا - ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کو خبر ہو جاے تو تیرا مال و جان خطرے میں ہو - اگر تو ادھر رہا اور تیرے پاس کوئی چیز نہ ہوئی تو فوراً اُدھر جا سکتا ہے اور اُس طرف تجھہ پر کوئی ظلم زیادتی نہ ہوگی - پانسو تو مان دیتی ہے اور وہ کاروان سرا میں آتا ہے اور اپنے سب ساتھیوں کو اس شہر کے بادشاہ کے ظلم سے ڈراتا ہے اور ادھر لے جاتا ہے —

یہ نو طرز مرصع میں ہیں نہ باغ و بہار میں

اس درویش کے سیر میں اس قسم کے بہت سے اختلافات ہیں جن کی تفصیل باعث طوالت ہوگی لیکن ہر موقع پر میر امن نے نو طرز مرصع ہی کی تقلید کی ہے —

اس درویش کے بیان میں جب بہزاد خاں ملکہ اور شاہزادے (تیسرے درویش) کو بھگا کر لے جاتا ہے اور بادشاہی فوج تعاقب کر کے پہنچتی ہے تو وہ انہیں پل کے پاس کھڑا کر دیتا ہے - نو طرز مرصع کی عبارت یہ ہے —

" بہزاد خاں رستم تواں نے ملکہ اور شہزادے کو زیر دیوار ایک پل کے کہ بارہ پلی سے کم نہ تھا ' کھڑا کیا "

میر امن نے یہ غضب کیا ہے کہ اس کے ساتھہ جون پور کے پل کا بھی اضافہ کر دیا ' جو شاہزادۂ عجم کے منہ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا —

" بہزاد خاں نے ملکہ کو اور اس فقیر کو ایک در میں پل کے کہ بارہ پلی اور جون پور کے پل کے برابر تھا ' کھڑا کیا "

اسی بیان میں کوکہ ملکہ سے شاہزادے کی سفارش اور اس کا حال زار بیان

کرتے ہوئے جہاں سب کچھہ کہتا ہے وہاں یہ فقرہ بھی ہے " سائیں تیرے کارن چھوڑا شہر بلخ " اسی موقعہ پر یہی فقرہ میر امن نے بھی نو طرز مرصع سے نقل کر دیا ہے - یہ مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ باغ و بہار کا اصل ماخذ نو طرز مرصع ہے نہ کہ فارسی نسخہ —

لیکن نو طرز مرصع اور باغ و بہار کے طرز بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے- نو طرز مرصع کی عبارت نہایت رنگین اور سرتاپا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلا نے لگتا ہے - تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گوؤں کا طرز اختیار کیاہے - آج کل اس کا پڑھنا طبیعت پر بار ہوتا ہے زبان کا ڈھنگ پرانا ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھر پور ہے - باغ و بہار سے اسے کچھہ نسبت نہیں - نمونے کے طور پر چند سطریں نقل کی جاتی ہیں جن میں اس کے طرز بیان کا اندازہ ہو گا —

" بعد ایک لمحے کے وہ ماہ شب چہار دہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کی ہو کر اوپر مسند زربفت نقرئی کے جلوہ آرا ہوی ' واہ جی واہ - جس وقت وہ قمرطلعت داخل باغچہ نمونۂ جنت کی ہوئی' عطر گلاب رخسارۂ زلیخاے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہو گیا اور یوسف عکس بیاض نگینہ ہاے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین خلد آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا —

کنّے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا
لاتی ہے بوئے یار سے بھر بھر کے جھولیاں

نو عروسان شبوگیں اوپر فرش چاندنی کے لباس فقرہ سے بہار افروز بزم دلفریبی و دلربای کے تھیں اور ماہ رویان نسترن آگیں اوپر بساط چمن کے خلعت سیمیں سے رونق افروز خوبروی و خوشنمائی کے تھیں "—

(باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے - میر امن خاص دلی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان ٹھیٹ دلی کی زبان ہے اور ان کا لکھا سند ہے)- چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں —

" جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا ' شاہ عالم پورب کی طرف تھے - کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا شہر بے سر ہو گیا - سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی - ایکبارگی تباہی پڑی - رئیس وہاں کے ' میں کہیں تو کہیں ' ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے ' وہاں نکل گئے - جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھہ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا - اور بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے ' وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے ' کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے - اور جو شخص سب آفتوں سہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے ' عرس ' چہڑیاں ' سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوئی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا ' اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے "

(اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی - اگرچہ زبان نے بہت کچھہ پلٹا کھایا ہے اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے تاہم باغ و بہار اب بھی ویسے ہی دل چسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی - مصنف کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور وہ ہر موقع پر اسی کے مناسب ٹھیٹ الفاظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ ایسی خوبی کے ساتھہ کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشاپردازی کی داد دینی پڑتی ہے - نہ بھدا طول ہے نہ فضول لفاظی ہے - سادہ زبان لکھنا سخت مشکل ہے - سادگی بعض وقت عامیانہ یا بے مزہ ہو جاتی ہے —

سادگی کے ساتھہ فصاحت اور لطف بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے - میر امن اس امتحان میں پورے اُترے ہیں اور یہی وجہ ان کی کتاب کی مقبولیت کی ہے -

ہماری زبان فارسی الفاظ اور ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں میں ایسی رچی ہوئی ہیں کہ ان سے بچنا مشکل ہے اور خواہ مخواہ بچنے کی ضرورت بھی نہیں - خواہ مخواہ دوسروں کے چبائے ہوئے لقموں کو چبانا اور آنکھہ بند کرکے دوسروں کے لکھے ہوئے کو نقل کردینا بھی انشا پردازی نہیں - میر امن نے اس میں بڑا اعتدال برتا ہے وہ بدیسی لفظوں اور چیزوں کی شان و شکوہ سے مرعوب ہوکر دیسی سادہ اور میٹھے لفظوں کو نہیں بھول جاتےاور قدیم فارسی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھہ ساتھہ اپنے بے تکلف اوراطیف استعارے اور تشبیہیں بھی استعمال کرجاتے ہیں جو بڑا لطف دے جاتی ہیں - مثلاً گلکرسٹ صاحب کو دعا دیتے ہیں کہ ہمیشہاقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے" یہاں دجلہ و فرات اور جیحوں وسیحوں کے بدلے گنگا جمنا کے لفظ کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں - ایسے فقرے اس کتاب میں بہت سے ملیں گے —

زبان کی قدرت کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہر حالت اور موقع کے لئے نہایت مناسب لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبان کوتاہی کرتی ہے - مثلاً آتش بازی، کھانے، بھری سواریاں، مختلف خدمات کے ملازم اور مختلف سازوسامان کے لئے اس قدر کثرت سے لفظ لاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے - جب کہیں گفتگو یا مکالمے کا موقع آتا ہے تو حفظ مراتب اور موقع محل کے لحاظ سے اسی قسم کی زبان لکھتے ہیں - موقع موقع سے ہندی لفظ اس حسن و خوبی سے کھپاتے ہیں کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے - کہیں تصنع یا تکلف نظر نہیں آتا، بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہے - اور باتیں بھی ایسی میٹھی اور پیاری کہ آدمی سنتا رہے اور جی نہ بھرے - لفظ کو اُس کے صحیح مفہوم

میں ٹھیک موقع پر استعمال کرنا اصل انشا پردازی ہے اور اس میں میرامن کو بڑا کمال حاصل ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت کی سادگی بے لطف نہیں ہونے پاتی - یہاں اس کی عبارت کے ایک دو نمونے لکھتا ہوں —

شروع ہی میں خدا کی حمد و ثنا ہے ' اگرچہ یہ مضمون بہت پائمال ہے اور اس میں جدت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن دیکھئے کہ وہ اپنی شیریں زبان میں اسے کس طرح لکھتے ہیں —

" سبحان اللہ ! کیا صانع ہے ! کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں پیدا کیں - باوجود دو رنگ کے ایک گورا ایک کالا اور یہی ہاتھ پاؤں سب کو دیے ہیں ' تس پر رنگ برنگ کی شکلیں جدی جدی بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا تیل تول ملتا نہیں - کروڑوں خلقت میں جس کو چاہئے پہچان لیجئے - آسمان اُس کے دریاے وحدت کا ایک بلبلا ہے اور زمین پانی کا بتاشا - لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے ' پر اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا - جس کی یہ قدرت اور سکت ہو ' اس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے - کہے تو کیا کہے ! بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم نہ مارسکے چپکا ہورہے " —

ایک جگہ فضول خرچی کا انجام بتایا ہے - دیکھئے کن الفاظ میں مفلسی کا نقشہ کھینچا ہے - کئی قسمیں نوکروں کی بیان کرگئے ہیں جنھیں اب کوئی جانتا بھی نہیں —

" اس در خرچی کے آگے اگر گنج قاروں کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا - کئی برس کے عرصے میں ایکبارگی یہ حالت ہوی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے ' کافور ہو گئے - بلکہ راہ بات میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے - اور نوکر چاکر خدمتگار بھلیے ' ٹھلیت '

خاص بردار ' ثابت خانی سب چھوڑ کر کنارے لگے. کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے کہ یہ تمہارا کیا حال ہوا ؟ سوائے غم اور افسوس کے کوی رفیق نہ ٹھیرا - اب تمرّی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں - دو تین فاقے کڑا کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا '' —

دیکھئے انتقام کی جھل کیونکر دکھائی ہے " جس طرح اُس نے مجھہ پر ہاتھہ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی دونوں کے پرزے پرزے کروں ' تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو - نہیں تو اس غصے کی آگ میں پھک رہی ہوں - آخر جل بل کر بھو بھل ہو جاؤں گی '' —

ہر موقع اور محل کی زبان اور بات چیت ویسی ہی لکھی ہے جیسی ہونی چاہئے - ملاحظہ ہو

" اے بچے ! جس نے تجھے تیر مارا ' میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُسے میرا سا دکھیا بناوے '' —

یا ایک بڑھیا کی دعا اور گفتگو دیکھئے

" الٰہی تیری نتھہ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے - اور کھاؤ کی پگڑی قائم رہے - میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں - ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی سے پورے دنوں درد زہ میں مرتی ہے اور مجھہ کو اتنی وسعت نہیں کہ ادھی کا تیل چراغ میں جلاؤں ' کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں - اگر مر گئی تو گور کفن کیونکر کروں گی اور جنے تو دائی جنائی کو کیا دوں گی - اور بچا کو ستھوارا اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی - آج دو دن ہوے ہیں کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے - اے صاحبزادی اپنی خیر کچھہ ٹکڑا پارچہ دلا تو اس کو پانی پینے کا ادھار ہو '' —

اگرچہ میر امن قصے روم و شام ' چین و ایران کے لکھتے ہیں لیکن جب موقع آتا ہے تو ہمارے مرثیہ گو شاعروں کی طرح آداب و رسوم اپنے ہی دیس

کے بیان کرتے ہیں - مثلاً وزیر زادی کے کھیل تفریح کا بیان دیکھئے —

" اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا ' وہ لڑکی اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا اور ڈھولک پکھاوج لئے ہوے رتجگے کی تیاری کر رہی تھی اور کڑاہی چڑھا کر حلوے اور رحم تلتی اور بنا رہی تھی کہ ایکبارگی اُس کی ماں روتی پیٹتی سر کھلے پانوں ننگے بیٹی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پر مارے اور کہنے لگی - کاشکے تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا " —

ایسے موقعے اس کتاب میں بیسیوں آے ہیں - میر امن نے ہر جگہ اپنے ہی ہاں کے ساز و سامان ' کھانے ' پوشاک اور رسم و رواج کا ذکر کیا ہے - اس کے پڑھنے سے اس زمانے کی بہت سی ایسی باتیں اور چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو اب معدوم ہو گئیں یا مٹتی جاتی ہیں —

رہا زبان کا معاملہ تو اس کی فصاحت اور خوبی سے کلام نہیں ہو سکتا - اس کے علاوہ جو بات دیکھنے کی ہے یہ ہے کہ اس میں سینکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے - بعض تو ایسے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو جانے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے - ہماری زبان کا دار و مدار ایک مدت تک شاعروں پر رہا اور شاعری کا میدان زیادہ تر غزل کے لئے وقف تھا ' وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک کھپت ہوتی - جس طرح شاعر شاعر سے بند لیتا ہے عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعر ہی کی زبان کو زبان مانتے ہیں - لغت نویسوں نے بھی اکثر انہیں کی پیروی کی اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کر دئیے - بہت سے لفظ یوں ہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا - اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو اڑے وقت پر کام

آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کرسکتے ' گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جاے مثال کے طور پر چند لفظ یہاں لکھے جاتے ہیں —

" جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے " - گھر سینا بہت اچھا محاورہ ہے - بیماری سینا اب بھی بولتے ہیں —

" جتنے آدمی وہاں کے ہزاری بزاری نظر پڑے " یعنے خاص و عام امیر غریب-

" منہ پر روہت آئی "	یعنے رونق
" بت کہاو "	بات چیت
" گھوڑے کو ٹنگیانا "	ایڑ دینا
" تیسرا درویش کوت باندہ بیٹھا "	نشست کی خاص صورت
" جب پرچھا ہوا " بھیڑ چھٹ گئی '	لوگ ادھر اُدھر ہو گئے '

اس قسم کے بیسیوں لفظ ہیں جو غور اور استعمال کے قابل ہیں —

زمانے کے ہاتھوں ہر چیز میں تغیر ہوتا رہتا ہے زبان کو بھی اس سے مفر نہیں - بہت سے لفظ اور محاورے متروک ہو جاتے ہیں ' بہت سے نئے داخل ہو جاتے ہیں - بعض زبانیں تو اس کی دستبرد سے بالکل مٹ گئیں اور صرف کتابوں میں رہ گئی ہیں - لیکن تغیر صرف الفاظ و محاوروں ہی میں نہیں ہوتا بلکہ صرف و نحو میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے - بعض لفظ جو مذکر تھے مونث ہو جاتے ہیں اور مونث مذکر - جملوں کی ترتیب اور ترکیب میں فرق آ جاتا ہے بعض اوقات لفظوں کے معنے بدل جاتے ہیں یا ان کے استعمال میں کمی بیشی ہوجاتی ہے اور اسی طرح کے بہت سے خفیف تغیر پیدا ہوجاتے ہیں - باغ و بہار کو لکھے

سوا سو برس کے قریب ہوتا ہے لیکن اس عرصے میں بھی بہت کچھہ تغیر ہو گیا ہے - چند باتیں جو صرف و نحو کے لحاظ سے نیز محاورے کے اعتبار سے خاص طور پر قابل غور ہیں ' یہاں لکھی جاتی ہیں —

۱ - جمع مونث اسم کے ساتھہ فعل کی جمع ' ان ' سے یا امدادی فعل کے ساتھہ اصل فعل کی بھی جمع - جیسے

" دو کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گذرانیاں " -

" یہ باتیں ہوتیاں تھیں " -

" گھوڑے کی باگیں ڈال دیاں " -

۲ - " نے " کا استعمال یا ترک بعض افعال کے ساتھہ جو اب حال کے محاورے کے خلاف ہے اور دکن میں اب تک رائج ہے

" القصہ رات کو چپکے یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اس پہاڑ پر لے گئے " —

" ذرا سرت آی تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا "

" اس پر وانگی کے سنتے ہی جوان نے اداب بجا لایا "

۳ - " جب تلک " کا استعمال بغیر " نہ " کے جیسے

" پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تلک وہ راضی ہوا " - یہ فارسی کا تتبع معلوم ہوتا ہے —

" وِالّا " " نہ " کے ساتھہ جیسے

" وِالّا نہ جیسا کرے گا ویسا پاے گا " - یہ " ورنہ " کی بجاے ہے اور غالباً اسی سے دھوکا ہوا ہے —

۴ - شک اور غور مونث استعمال ہوے ہیں - غور کو اب بھی بعض پرانے لوگ مونث لکھتے ہیں - سر سید احمد خاں نے بھی غور کو مونث ہی لکھا ہے -

" اب میرے تئیں شک آئی " -

" خم " کو بھی مونث لکھا ہے - " خمیں سونے کی "

۵ - " رفقی " بمعنے عورت اور " یتیم " بمعنے غلام استعمال کیا ہے —

۶ - ایک جگہ " تم کو " کی جگہ " تمھوں کو " لکھا ہے - -

" شاید تمھاری محنت پر توجہ کر کے تمھوں کو بخشدے " —

۷ - " ہوا نرم نرم بہتی تھی " - ہوا بہنا پرانا محاورہ ہے - " نماز کررہا تھا " نماز کردن کا ترجمہ ہے اور پہلے نماز کرنا بھی استعمال ہوتا تھا

۸ - بعض الفاظ کے املے میں بھی فرق پایا جاتا ہے - یعنے جیسے بولتے ہیں ویسے ہی لکھے ہیں —

جمہرات (جمعرات) ' مرصے (مرصع) لیکن ایک جگہ اصل لفظ ہی لکھہ دیا ہے - " کہو تو صحیح " اب اس کی جگہ " سہی " لکھتے ہیں —

اکثر اردو مضاف مضاف الیہ فارسی طرز پر استعمال کے گئے ہیں اور اردو حروف اضافت آخر میں لکھے ہیں جیسے موافق معمول کے - تقریر و خوش گوئی اس کی - ایک جگہ تو اضافت توصیفی لکھہ کر موصوف کی جمع بنائی ہے —

" اور خانہ زاد سورثیوں کی قدر سمجھے گا " —

اگر خانہ زاد کو اضافت کاتب کی غلطی بھی سمجھو جائے تو " سوروثیوں " آج کل کی بول چال کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے —

۱۰ - " سار " لفظ جیسے ' مانند کے لئے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے - " تم سار کا محبوب ' " تجھہ سار " یہی لفظ ہے جو دکن میں " سری " ہوگیا ہے اور شمالی ہند میں اب بھی بعض جگہ ایک آدہ لفظ کے ساتھہ استعمال میں آ جاتا ہے —

ایک اور کتاب نو طرز مرصع کے نام سے محمد عوض زریں نے لکھی ہے جس میں انھیں چار درویشوں کے قصے بیان کئے ہیں چنانچہ وہ خود لکھتا ہے --

" اس خاک پائے درویشاں حق بیں محمد عوض زریں نے قصۂ چار درویش زبان فارسی میں ترتیب دیا اور عبارت شگفتہ سے گلدستۂ مجالس کیا - راجہ صاحب سراپا حلم و تمکین راجہ رام دیو کہ اس عالی منش کے برادر بزرگ خداوند عدل و داد راجہ سیتل پرشاد اور برادر میانہ فیاض زمانہ راجہ بھوانی پرشاد ادام اللہ اقبالہم ہیں ' اس نحیف کی تصنیف مطالعہ فرماتے اور حظ وافر اٹھاتے ' ایک روز فرمایا کہ اگر کلام زبان ہندی میں انتظام پائے مسامع کو بسہولت سرور آئے - میں نے خوشنودی آقا کو بہبودی دنیا و عقبیٰ جان کر سررشتۂ ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبان اردو میں قلم بند کیا " میرامن کی طرح زریں نے بھی اپنی کتاب کا سنہ تاریخ " باغ و بہار " سے نکالا ہے (۱۲۱۷ ھ) - اس میں قصے بہت مختصر کردئے ہیں حالات وہی ہیں ایک آدہ جگہ فارسی نسخے اور نو طرز مرصع سے خفیف سا اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ زریں کی نظر سے تحسین کی نو طرز مرصع گذری تھی یا نہیں - البتہ نام سے شبہ ہوتا ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی دیباچے میں کتاب کے نام کا کہیں ذکر نہیں ممکن ہے کہ مطبع والوں نے یہ نام (نوطرز مرصع) خود رکھ دیا ہو - عجیب بات یہ ہے کہ اس نے بھی تاریخ باغ و بہار ہی سے نکالی ہے - اس سے میرامن کی باغ و بہار اور اس کتاب کی تالیف ایک ہی سنہ کی معلوم ہوتی ہے - اس کی عبارت سادہ ہے ' تحسین کی نو طرز مرصع کی طرح رنگین اور تشبیہ واستعارہ سے مملو نہیں ہے - مگر عبارت اور بیان میں کوئی خاص لطف نہیں - ایک بات اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ زریں نے اس قصے کو فارسی میں بھی لکھا تھا اور اس سے ظاہر ہے کہ اس قصے کو فارسی میں بھی کئی شخصوں نے تالیف کیا ہے --

باغ و بہار میں ایک بات اور قابل غور ہے - میرامن نے اپنی کتاب کے دیباچے
ں کتاب کا اور اپنا حال بیان کرتے ہوے اردو زبان کی حقیقت کا بھی ذکر کیا
- یہ بیان انھیں روایتاً بزرگوں سے پہنچا ہے - میرامن ہندیوں میں پہلے شخص
ں جنھوں نے اردو زبان کے بننے اور اس کے نشو و نما کا حال لکھا ہے اس کا خلاصہ
ہے " ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا - سلطان محمود غزنوی آیا ' پھر غوری
ر لودھی بادشاہ ہوئے - اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبان نے ہندو مسلمان
ں آمیزش پائی - آخر امیر تیمور نے ..... ہندوستان کو لیا - ان کے آنے اور رہنے
ے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا ' اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا " .....
جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے ' تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی
ر فیضرسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے - لیکن
ر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی-اکھٹے ہونے سے آپس میں این دین سودا
لف ' سوال جواب کرتے ' ایک زبان مقرر ہوئی - جب حضرت شاہ جہاں صاحب
ران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا ... ... تب
ادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب سے شاہ
جہان آباد مشہور ہوا . . . اور وہاں کے بازار کو اردوے معلا خطاب دیا —

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور
عالمگیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی - فدان
بان اردو کی منجملے منجملے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے
کر نہیں کھاتی " —

گریرسن نے اس زبان کی اپنی مشہور اور جامع کتاب * میں کوئی علحیدہ
ہیئیت قائم نہیں کی اور اسے مغربی ہندی کی ایک شاخ قرار دے کر چھوڑ دیا ہے-

---

* Linguistic Survey of India

ان کے دوسرے مقلدین نے یہی راہ اختیار کی ہے - اور اس پر فارسی عربی زبان کا اثر جو مختلف حیثیتوں سے ہوا ہے اس کو نظر انداز کردیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے جس نے بالکل نئی اور علیحدہ صورت اختیار کرلی ہے اور اس نظر سے بھی اس کا دیکھنا ضروری ہے - یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے - جس پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں —

———‡×‡———

اُردو زبان کا ایک آئرش شاعر

از

(جناب مقبول حسین صاحب احمد پوری)

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی خاک میں اُنس و محبت کا ایک ایسا بھی عنصر شامل ہے جو ممالک غیر کے باشندوں کو اپنا بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو - قدیم زمانے میں 'فاہیان' ایسے چینی سیاحوں نے ہندوستان کے علوم و فنون حاصل کئے اور ان کے ساتھ ہند کی محبت بھی اپنے وطن جاتے وقت دل میں لے گئے - یہی حال چندر گپت کے دربار میں یونانی سفیروں کا ہوا - خیر یہ تو پرانی باتیں ہیں لیکن اب بھی جب کہ اگلی شان و شوکت اور دولت و ثروت ہندوستان سے روٹھ گئی ہے نہیں معلوم کہاں کہاں کے لوگ یہاں کے علوم و فنون سے مستفید ہونے کے لئے آتے ہیں اور اکثر شعر و شاعری کا ذوق بھی ظاہر کرتے ہیں - یہ ظاہر ہے کہ شعر و سخن کی محفلوں سے تعلق رکھنے والے حضرات خواہ فرانسیسی ہوں خواہ اطالوی ' خواہ ایرانی ہوں خواہ خراسانی خود بھی شعر و شاعری کی طرف رغبت ظاہر کریں گے اور اگر زبان نے یاری کی تو کچھ نہ کچھ کہنے سے بھی دریغ نہ کریں گے —

الغرض جس وقت اہل فرنگ کو ہندوستان پر اقتدار حاصل ہوا دہلی و لکھنؤ میں شعر و شاعری کے بڑے چرچے تھے - حتیٰ کہ خود دہلی کا چراغ سحری

بادشاہ بھی شاعر تھا - خدا کے فضل سے فاتح قوم بھی مشرقی علوم پر فریفتہ تھی - بہت سے انگریزوں نے سنسکرت فارسی ' اُردو اور ہندی وغیرہ باقاعدہ سیکھی - اس وقت مرزا غالب کی قابلیت کا شہرہ فاتح قوم میں زیادہ تھا - اس لئے غالب کے کئی شاگرد انگریز بھی تھے - اور چونکہ وہ مرزا سے فارسی پڑھتے تھے اس لئے فارسی ہی میں اشعار لکھنے کا شوق بھی رکھتے تھے - میر امن دہلوی کے شاگردوں میں ایک فرانسیسی شخص بھی تھا جس نے اُن سے اُردو تعلیم حاصل کی - اگر لوگ شعر کہتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ یہ تو طبیعت داری اور ذوق و شوق کی بات ہے —

قدیم اسکول شاعری کے دور آخر یعنی امیر و داغ کے زمانہ * سے اردو شاعری میں "شوخی" کو بہت کچھہ دخل ہو گیا تھا - تاہم زبان و محاورہ کے لئے یہ شاعری بھی فائدہ مند ثابت ہوئی - یہ شاعری پسند عام تھی اس لئے ہر شخص کو شعر کہنے کا شوق تھا - اسی وجہ سے داغ کے شاگردوں کی کوئی انتہا نہ تھی - حتیٰ کہ ان شاگردوں میں سے ایک صاحب غیر ملک یعنی آئر لینڈ (Ireland) کے رہنے والے بھی تھے - ان کا اسم گرامی مسٹر بی - ڈی - مانٹروز تھا - مسٹر موصوف ' مضطر ' تخلص کرتے تھے اور کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے - خود کہتے تھے کہ میں دس برس تک دلی میں رہا وہاں اردو سیکھی اور ' داغ ' کا شاگرد ہو گیا —

مسٹر 'مانٹروز' کی بابت ہمیں زیادہ علم نہیں - صرف اتنا معلوم ہے کہ موصوف ایک باکمال مصور تھے - اس کی بھی خبر نہیں کہ دہلی میں کب سے کب تک قیام رہا - لیکن وہ مسٹر نوروز جی کے تھیٹر میں آرٹسٹ کا کام کرتے تھے - عموماً پردے بناتے اور شعروشاعری میں دستگاہ ہونے کی وجہ سے اشتہار نگاری کا کام بھی سپرد تھا ان خدمات

* انیسویں صدی کا آخری عشرہ (۱۸۹۰ سے ۱۹۰۰ ع)

کے عیوض میں آسی روپیہ ماہوار مشاہرہ ملتا تھا - جب سنہ ۱۹۸۳ ع میں مسٹر نوروزجی کا تھیٹر مرزا پور آیا تو مسٹر " مانٹروز " بھی ساتھہ آے اس وقت " مرزا پور " میں مولوی فرزند علی وکیل کے یہاں ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے - مسٹر موصوف بھی شریک ہوتے —

" مرزاپور " میں ان کی " مصوری " کا شہرہ عام ہوگیا - " بینی مادھو " نامے ایک مہاجن کو نقاشی سے بڑا شوق تھا - اس نے مسٹر " مانٹروز " کو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھہ لیا - بعد ازاں وہ الہ آباد چلے گئے اور وہاں " آرٹ " کی پریکٹس شروع کردی ایک بڑی دوکان بھی رکھہ لی - اسی سلسلے میں موصوف نے مہاراج " مانڈا " کی ایک تصویر بنائی جس کے عیوض میں مہاراج موصوف نے ان کو ایک ہزار روپیہ انعام اور دو سو خرچ تصویر مرحمت فرمائے - تصویر قدآدم تھی —

" داغ " مرحوم سے مسٹر مانٹروز کو بڑی محبت تھی - داغ کی وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا جس کا ذکر آگے آئے گا - " داغ " مرحوم نے مولوی نعیم الحق " آزاد " شیخو پوری کو ایک خط * لکھا ہے اس میں مسٹر " مانٹروز " کا ذکر بھی کیا ہے - اس خط کی تاریخ ۲۱ اپریل سنہ ۱۸۹۸ ع ہے ملاحظہ ہو :—

" مہربانا - آپ کے خطوں کا جواب پہلے روانہ ہوچکا ہے اپنے مکان میں دریافت کیجئے - میں بخیر ہوں . . . . . مسٹر " مانٹروز " صاحب انگریز متخلص بہ " مضطر " اس نواح میں تھے - اب وہ کہاں ہیں ان کا پتہ لکھئے گا -

دعاگو نواب مرزا خاں " داغ " " عفی عنہ " —

مسٹر " مانٹروز " کی لائف سے متعلق ہماری واقفیت کی بس اتنی ہی کائنات ہے - خدا کرے وہ اب بھی بقید حیات ہوں - اور اپنی زندہ دل طبیعت سے

---

* یہ خط رسالۂ مرقع (جو حضرت وصل بلگرامی کی ادارت میں نکلا کرتا تھا) میں محفوظ ہے

اشعار کی رنگا رنگ تصویریں بنا رہے ہوں - افسوس ہم ان کے کلام سے بھی زیادہ واقف نہیں ہیں کہ ناظرین کو محظوظ کرسکیں - صرف چند اشعار مل گئے ہیں اور نوحۂ " داغ " یعنی " غیاث المضطر " جو مسٹر موصوف نے داغ پر مرثیہ لکھا ہے وہ بھی اس وقت پیش نظر ہے —

" غیاث‌المضطر " میں تو بعض بعض جگہ مسٹر مانٹروز نے کمال ہی کر دیا ہے - مگر چونکہ اس نظم پر کسی کی اصلاح نہیں ہوئی اس وجہ سے فاش غلطیاں بھی ہیں جو ایک غیر زبان والے کے قلم سے ہونے کی وجہ سے قابل در گذر ہیں —

ان کی نثر سے بھی زبان کی خامی ظاہر ہوتی ہے اگرچہ اس وقت ہمارے پاس مسٹر نوروزجی کے تھیٹر کا کوئی اشتہار موجود نہیں ' ہم " غیاث‌المضطر " سے چند جملے یہاں درج کرتے ہیں جو خود کہہ رہے ہیں کہ ہم اہل زبان کے قلم سے نہیں لکھے گئے :—

> " حیف صد حیف کہ یہ دلسوز ' بی - ٹی " مانٹروز " متخلص بہ مضطر بحال ابتر گذارش کرتا ہے کہ حضرت استاد مرحوم سے اور مجھہ سے بحسن اتفاق اتحاد ربط و ضبط اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ لوگوں کو میرے تلمذ ہونے میں بھی گفتگو تھی . . . . . حضرت مرحوم کی عنایتوں کی نہایت نہیں . . . . . اس حادثۂ نا گہانی (وفات داغ) سے دل کو وہ اضطرا ہوا کہ یہ " غیاث‌المضطرب " جس کا جواب ہوا - ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ باتیں . . . . . مقبول خاص و عام ہو تو زہے سعادت . . . .
>
> رحمت باری سے مضطر دور کیا ورنہ میں کیا اور میرا مقدور کیا

غرض عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں موصوف کو کافی دستگاہ تھی - بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سرتبہ صبح کے وقت مسٹر موصوف اپنے استاد کے پاس گئے -

داغ مرحوم وضو کر رہے تھے - فرمایا حضور صاحب اس مصرعہ پر مصرعہ لگائیے - ع

" دیکھیں تو آہ و نالے میں اپنے اثر بھی ہے "

مسٹر " مانٹروز " نے کہا - ع — " اچھی تو بات ہے ابھی وقت سحر بھی ہے "

اس پر " داغ " مرحوم بہت خوش ہوئے —

ایک مرتبہ دہلی میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا - بڑے بڑے اہل کمال موجود تھے اور طرح یہ تھی - ع " سنیں گے واقعہ اب ہم زبان برگ سوسن سے "

مسٹر " مانٹروز " کا شمار اس وقت بڑے شاعروں میں تو کیا متوسط شعرامیں بھی نہ تھا - مگر انگریز ہونے کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے - انھوں نے بھی ایک غزل لکھی اور اشعار پر ضروری اصلاح لیکر مشاعرے میں آئے - جب پڑھنے کی باری آئی تو کچھہ اشعار کی خوبی اور کچھہ اپنے نرالے لہجے کی وجہ سے مشاعرہ میں واہ واہ کا شور برپا کردیا - اس غزل کے صاف چار اشعار مل سکے ہیں جو یہاں لکھے جاتے ہیں —

۱ - صفائی دیکھنا قاتل کی مقتل میں کہ کس فن سے
لگا کر تیغ میرا خون بہایا اپنے دامن سے

۲ - بچے تو کیا بچے کوئی نگاہ چشم پر فن سے
" کہ درپردہ چلاتی ہے ہزاروں تیر چلمن سے " *

۳ - اٹھا جب ہاتھہ قاتل کا وہیں سر کر دیا حاضر
مرے ہم تو بلا سے لی مگر تعظیم دشمن سے

۴ - ستارے جن کو کہتے ہیں اٹھا لایا فلک ان کو
گرے تھے پھول جو میرے چراغ داغ روشن سے

غیاث المضطر یعنی نوحۂ " داغ " کو مسٹر " مانٹروز " نے بالکل انگریزی

* یہ مصرعہ ایہام معلوم ہوتا ہے —

پیرایہ میں لکھا ہے - اس میں کُل ایک سو دو بند ہیں - بعض بعض نہایت پاکیزہ لیکن عروض کی غلطیاں بہت ہیں - کُل مرثیہ بحر مضارع میں ہے مگر بعض اشعار میں بحر بدل گئی ہے - اکثر جگہ الفاظ غلط ہیں - مثلاً بجائے جدت کے " جودت " لکھا ہے اور ہم صغیران کو صغیران وغیرہ —

مرثیہ کی ابتدا میں پہلے تمہیدی پہلو اختیار کیا گیا ہے - ملاحظہ فرمائیے پہلا بند کس قدر دلفریب ہے —

صبر و شکیب وطاقت ضبط فغاں نہیں کہنا پڑا کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں
غمخوار و یار و مونس ہمدم یہاں نہیں کس کو سنائیں حال کوئی مہرباں نہیں
ایک " داغ " تھا سو وہ بھی تہ آسماں نہیں

پہلے پہل خود شاعر مرحوم کی تعریف کرتا ہے اس کے بعد ' گل ' و ' بلبل ' ' شاعری ' اور ' وفا ' کو شخصیت دیکر ان کی زبان سے نوحہ کناں ہوتا ہے - اور یہ انداز بیان انگریزی " ایلجی " (Elegy) کی خصوصیت سے ہے —

ملک سخن میں " داغ " تو ہر دل عزیز تھا مانے حریف اس کو نہ مانے تو اس سے کیا
جو کچھ کہیں گے اس کے لئے ہے وہ سب بجا " مضطر " زبان خلق ہے نقارۂ خدا
باقی اگرچہ ہند میں اس کا نشان نہیں

اس تمہید کے بعد شاعر سامعین کو اصل مضمون کی طرف مخاطب کرتا ہے —

آغاز ہائے نالۂ شور و فغاں سنو بیٹھو جگر کو تھام کے درد نہاں سنو
یہ شور الغیاث تہ آسماں سنو دو تین نالے ہم سے بھی پیرو جواں سنو
تلمیذ داغ دہلوی ہیں نوحہ خواں نہیں

وہ " شور الغیاث " اس طرح بیان کیا جاتا ہے —

دنیا سے ہائے روح " فصیح البیان " گئی یہ کیا گئی فصاحت ہندوستان گئی
بزم جہان سے رونق اہل زبان گئی گویا کہ جسم خلق سے روح روان گئی
جسم سخن میں ہائے وہ اب لطف جان نہیں

جور و فلک کا شکوہ کرنا مشرقی شاعری کی خصوصیات سے ہے - مگر اس کے ساتھ ہی سایہ مرحوم کے عادات و خصائل پر روشنی ڈالنا مغربی انداز ہے مثلاً

دلی میں مرنے والوں کا یہی غمگسار تھا　　اچھا تھا یا برا تھا مگر یادگار تھا
اے چرخ نابکار تجھے جس سے خار تھا　　وہ تو غریب آپ ہی یاروں کا یار تھا
پامال تجھ کو کرنا تھا اے بدگمان نہیں

× × × × × × × ×

طفلی جوانی اس کی تھی پیری شباب تھی　　جو بات "داغ" کی تھی وہی لاجواب تھی
ہم کیا کہیں طبیعت عالی جناب تھی　　صد انتخاب میں سے کہیں انتخاب تھی
کلک زبان میں طاقت شرح و بیان نہیں

اسی طرح آئی شاعر بیان کرتا ہے کہ داغ کس طرح دہلی سے "رام پور" گئے - کس طرح رام پور میں قدر کی گئی - اور کیونکر رامپور سے حیدرآباد آکر دولت اصفیہ کے زیر سایہ دنیاوی ثروت کے عروج پر پہنچ گئے - اعلیٰ ھذاالقیاس - اس کے بعد اپنے انگریزی دستور کے موافق داغ پر نوحہ کرنے والوں کو شاعر پیش کرتا ہے - "ملٹن" (Milton) نے اپنے دوست ایڈورڈ کنگ (Edward king) کے مرثیہ میں پہلے مرحوم کی تعریف کی ہے - اور لکھا ہے کہ کس طرح وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے اور کالج میں دوستوں اور پروفیسروں کے ساتھ کیا کیا اشغال رہتے تھے پھر اس کے بعد ڈرواڈز (Druids) اور موزیز (Muses) یعنی پروفیسروں اور طالب علموں کو نوحہ خوانوں میں پیش کیا ہے اسی طرح مسٹر "مانٹروز" پہلے "داغ" کی تعریف جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا لکھتے ہیں پھر "وفا" اور 'شاعری' کو نوحہ خوان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں - کیونکہ شاعری کو 'داغ' نے عروج دیا تھا - اور خصلت 'وفا' ان کے خمیر میں شامل تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ گو اس قدر بڑے اور معزز عہدے پر مامور تھے مگر ادنیٰ سے ادنیٰ شخص سے نہایت خلوص برتتے اور اگر کوئی خط لکھتا تو کبھی

جواب سے دریغ نہ کرتے تھے --

۱ - نوحۂ وفا بہت دلچسپ ہے - ' وفا ' کہتی ہے کہ " اے داغ تم مجھے کس کے حوالے کر چلے - کوئی میری پاس داری نہیں کرسکتا - تم نے مجھے محفلوں میں مثل بوے گل ظاہر کیا - احباب سے خط و کتابت میں میرا ظہور پیام روح ہوا - اب میری شادمانی کا کونسا ذریعہ ہے --

ہے ہے سر جنازہ ' وفا ' نوحہ خواں ہوئی با صد فگار پاس سوے آسماں ہوئی
سر گرم ہائے نالہ و شور و فغاں ہوئی کہہ کہہ کے ہائے ' داغ ' وہ نالہ کناں ہوئی
ہنگامہ نعش پر تھا ' وفا ' نوحہ خواں نہیں

لوگ وفا کو سمجھاتے ہیں کہ صبر کر لیکن اس کو صبر نہیں آتا - وہ کہتی ہے کہ ' داغ ' میں تمہیں تنہا پیوند زمیں نہ ہونے دونگی - ع

" میں وہ نہیں کہ میں ہوں کہیں اور تم کہیں "

اس کے بعد وفا کہتی ہے --

الفت کا رشتہ وہ ہے کہ توڑا نہ جائے گا داس تمہارا ہاتھہ سے چھوڑا نہ جائے گا
میں ہوں ' وفا ' تمہاری کچھہ عمرروں نہیں

آخر میں وفا اس نتیجہ پر پہنچتی ہے --

دل سے خیال ' داغ ' ہٹایا نہ جائے گا یہ نقش کالحجر ہے مٹایا نہ جائے گا
مدت کا یار غار ہے کچھہ میہماں نہیں

۲ - ' وفا ' کے بعد شاعری آتی ہے جس کا نمبر نوحہ خوانوں میں سب سے بڑھا ہوا ہے - شاعری تابوت ' داغ ' دیکھہ کر بے ہوش ہوجاتی ہے - تابوت سے لپٹ جاتی ہے - لوگ بہت سمجھاتے ہیں مگر اس کی گریہ و زاری کی کوئی انتہا نہیں --

کہتی ہے ہائے ' داغ ' مجھے داغ دے گئے صبرو قرار کیوں میرا لے کر چلے گئے
دل کو بنانا کھیل تھا اے آسماں نہیں

اب کون ہے جو مجھ کو بلا کر بٹھائے گا اب کون ہے جو مجھ کو * بنا کر بٹھائے گا
اوروں کو ہے نصیب یہ طرز بیاں نہیں

' داغ ' کے بعد شاعری بے والی و وارث رہ گئی - اس لئے کہتی ہے —

بے ' داغ ' بزم اہل سخن میں یتیم ہوں میں کس کے پاس بیٹھ کے جانوں ندیم ہوں
غیروں کے پاس رہ کے میں کیونکر مقیم ہوں میں آشنائے ' داغ ' سخنور قدیم ہوں
کس طرح بیٹھ جاؤں وہاں وہ جہاں نہیں

آخر میں شاعری بھی اس نتیجہ پر پہنچ کر اپنا نوحہ ختم کرتی ہے —

تم وہ نہ تھے جن کو عاشق پامال روئے گا تم وہ نہ تھے جن کو آسماں ہر سال روئے گا
روئیں گے وہ بھی سن کے جو صاحب زباں نہیں

اختتام پر مسٹر مانٹروز شہر یار ' دکن ' سے متعلق دعائیہ اشعار لکھتے ہیں اور وفات داغ کی تاریخ پر کلام ختم کرتے ہیں —

میری دعائے خیر پہ اب اختتام ہو جب تک کہ دور چرخ بریں صبح و شام ہو
جب تک کہ آسماں و زمیں کو قیام ہو جب تک کہ آفتاب سر چرخ بام ہو
ہو " بلند گان عالی " سے خالی جہاں نہیں

تاریخ وفات داغ مرحوم —

تاریخ مرگ ' داغ ' سخنور پہ نالہا پوچھا جو شاعری سے وہیں ہم نے برملا
چشم پر آب ہو کے بصد یاس یوں کہا مضطر ' ہمیں تو غیب سے آتی ہے یہ صدا
" لو باغ میں وہ بلبل ہندوستاں نہیں

ہم یہاں نوحۂ داغ کی خامیوں پر کچھ زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے

---

* آہستہ کر کے —

کیونکہ یہ اہل زبان کے قلم سے نہیں ہے - صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ کہیں کہیں نظم کی بحر بدل گئی ہے - کل مرثیہ بحر مضارع میں ہے - ایک اس میں کئی بند ایک قسم سے دوسری قسم کی بحر مضارع میں مبدل ہوگئے ہیں - مثلاً " مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن " جو کل مرثیہ کی بحر ہے اس کے بجائے چھ ساتھ بند " مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن " میں آ پڑے ہیں - مثلاً --

دل سوز اگر سرھی کے بل جائے تو اچھا یہ سوز نہاں دل سے نکل جائے تو اچھا
جوں شمع سر بزم پگھل جائے تو اچھا "جس دل میں نہ ہو داغ*وہ جل جائے تو اچھا"

جزداغ عشق راز نہاں رازداں نہیں

بعض جگہ زبان کی غلطی ہے - مثلاً --

منظور یہ نہیں کہ طبیعت جتاؤ تم مضمون آفریں میں طبع آزماؤ تم

مگر ایسے موقع پر " مضمون آفرینی " بولتے ہیں --

غیاث ' المضطر ' کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس کے آخر میں مسٹر مانٹروز موصوف کے دستخط بھی موجود ہیں - تاریخ بھی لکھی ہے - بالکل اس طرح -

B . D , Montrose
Photog . & artist
Allahabad
1915

مسٹر ' مانٹروز ' کی بابت جو کچھ واقفیت حاصل ہوسکی اس کے شکریہ کے مستحق جناب ' بشیر صاحب' احمد پوری ہیں ' بشیر صاحب ' کا بیان ہے کہ

---

* یہ مصرعہ خاقانی ہند کا ہے —

+ جناب بشیرالدین صاحب بشیر احمد پوری پنشنر سابق کوتوال علی گڑھ و بنارس- آپ سے اور مسٹر مانٹروز سے بڑی دوستی تھی - داغ مرحوم اور امیر مرحوم کی صحبت سے بھی آپ مستفید ہوئے ہیں - اب بھی آپ کبھی کبھی جب ان قدیم جلسوں کا ذکر کرتے ہیں تو سننے والوں کا دل بھر آتا ہے —

مسٹر ، مالٹروز ، نہایت باسروت اور خلیق تھے - جب اپنے احباب سے ملتے تو مصافحہ ہی نہیں بلکہ معانقہ کرتے ، ان کا کوئی ایسا دوست نہ ہوگا جس کا فوٹو انھوں نے نہ لیا ہو - یا تصویر نہ کھنیچی ہو - غرض اپنے احباب کی تصویریں بنانے میں مشاق تھے - اور ہندوستانیوں میں ایسے گھل مل کر رہتے کہ کسی کو ان کے فرنگی ہونے کا دھوکا ہی نہ ہوتا تھا - ان میں زندہ دلی بیحد تھی - ہر وقت لبوں پر موج تبسم رواں رہتی - اس کے علاوہ ان کی بابت ہمیں زیادہ علم نہیں - اگر چہ --

بس نیست این کہ می گذرد در حال ما
آرے ہمیں زجانب ما بودہ است شرط

تنقید حیات حافظ

از

جناب بشیر احمد صاحب ڈار - بی - اے (آنرز)

مدت ہوئی کہ مولانااسلم جے راجپوری نے ' حیات حافظ ' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی - میں نے کئی دفعہ اپنے مضامین میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے - مصنف کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی لیکن چونکہ میرے نقطہ نگاہ سے اس میں چند ایک خامیاں موجود ہیں اس لئے بھی کوشش کرونگا کہ ان اغلاط کی تصحیح کرسکوں - میرے سامنے ' حیات حافظ ' کا تیسرا اڈیشن مطبوعہ عام علیگڈھ ہے

(۱) نام و نسب اور تعلیم

مولانا فرماتے ہیں :

ان کے آبا و اجداد مقام ' سرکان ' کے باشندے تھے ..... ان کے دادا شیراز میں آگئے تھے ..... خواجہ کے والد کا نام مولانا کمال الدین تھا وغیرہ ... " صفحہ ۷ —

اس بیان کا ماخذ اگرچہ خود مولانا نے تصریح نہیں کی' مرزا فرحت شیرازی کی کتاب آثار عجم ہے -لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ جتنی مختلف روایات دستیاب ہوسکیں انہیں دیکھے اور ان میں کسی ایک کو چننے کی وجوہات بھی تو بتائے - مولانا نے

تو یہ تمام بیان یوں درج کر دیا گویا کہ یہ فیصلہ شدہ امر ہے ۔ مولانا نے اس روایت کو شاید اس لئے بے کم و کاست لکھا کیونکہ پہلی روایت مولانا 'شبلی' استعمال میں لا چکے تھے اور چونکہ نئی کتاب کے لئے نیا مواد ہونا ضروری تھا اس لئے انہوں نے بغیر پہلی روایت کی طرف اشارہ کئے اس کو لکھ ڈالا —

مولانا 'شبلی' کا ماخذ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں 'عبدالنبی کا میخانہ ہے جہاں یہ درج ہے :

"آوردہ اند کہ جد عالی تبار ایشاں از کوہائے اصفہان ست بہ جہت بعضے از موانع در ایام سلطنت اتابکیہ (۵۴۳ھ تا ۶۸۶ھ) از انجا بہ شیراز آمدہ توطن نمودہ اند اسم والد ماجد حافظ ' خواجہ بہاءالدین ست" صفحہ ۸۰ —

مولانا فرماتے ہیں :-

"خواجہ کے ایک چچا بھی تھے جن کا نام سعدی تھا (یہ شیخ سعدی گلستان و بوستان کے مصنف نہیں ہیں) وہ ایک صوفی منش شاعر اور بڑے با کمال تھے" صفحہ ۷

یہ غلط فہمی ہم پہلے ہی دور کر چکے ہیں ۔ (دیکھو رسالہ اردو بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ ء) خواجہ کے چچا اگر سعدی تھے تو بموجب حکایت وہ گلستان و بوستان کے مصنف ہی تھے ۔ مولانا نے خطوط وحدانی کی عبارت بڑھا کر تاریخی غلطی کے ارتکاب سے تو اپنے آپ کو بچا لیا ہے (کیونکہ حافظ سنہ ۷۲۵ ھ میں پیدا ہوتے اور شیخ سعدی سنہ ۶۹۰ ھ میں فوت ہوتے ہیں) لیکن انہوں نے ماخذ سے رو گردانی کی ہے جو خود بھی ایک بڑی بھاری غلطی ہے —

اس کے بعد مولانا نے 'خواجہ حافظ' کی تاریخ پیدائش اور عمر کے متعلق جو قیاس دوڑایا ہے اس کی اصلیت بھی پہلے دکھائی جاچکی ہے —

قولہ :

" حفظ قرآن کے بعد خواجہ نے مولانا شمس‌الدین محمد عبداللہ شیرازی کے حلقۂ درس میں تفسیر اور فقہ پڑھی - مولانا شمس‌الدین حافظ کی ذہانت پر اس قدر فریفتہ تھے کہ ان کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے - یہاں تک کہ انھوں نے اپنا لقب شمس‌الدین ان کو عطا کردیا " - صفحہ ۹

مولانا نے اس بیان کو درج تو کر دیا لیکن اس کا ماخذ بیان نہیں کیا - امید ہے کہ وہ اپنا ماخذ ضرور بیان کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے —

(۲) امرا اور سلاطین کا دربار

اس عنوان کے تحت میں مولانا نے وہ وہ فاش غلطیاں کی ہیں کہ الامان- معلوم نہیں کہ یہ لوگ الفاظ کو تو کہاں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن جب تاریخ کا معاملہ آتا ہے تو محض پھسپھسی - دولت شاہ جیسے تذکرہ نویسوں کی کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کو مصالحہ لگا کر اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں — مولانا ارشاد فرماتے ہیں :-

" ان کے ابتدائی زمانے میں سلطان ابوسعید خاں بغداد کا بادشاہ تھا - تمام عراق و فارس ان کے قبضے میں تھا - اس کے زمانہ میں اس کی طرف سے شیخ حسین پسر امیر الامراء چوپان شیراز کا والی تھا - اہل شیراز عام طور سے اس سے ناراض تھے-سنہ ۷۳۶ھ میں جب سلطان ابوسعیدخاں نے وفات پائی اور بوجہ اس کے کہ کوئی بیٹا نہ تھا ، اطراف ممالک میں جس کا جہاں بس چلا اس نے قبضہ کر لیا اور ایک سلطنت کی گیارہ سلطنتیں ہو گیں تو شیخ حسین اپنی جان کے خوف سے شیراز سے بھاگ گیا-شیخ ابواسحاق نے جوسابق

والئی شیراز محمد شاہ اینجو کا بھتیجا تھا موقع پاکر شیراز اور اصفہان پر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی " صفحہ ۱۹

اس بیان میں مولانا نے چند غلطیاں کی ہیں۔ 'خاندان اینجو' کی تاریخ اتنی صاف نہیں جتنی کہ مولانا نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تا حتی الوسع اس کو بیان کرسکوں :—

'خاندان اینجو' —

سلطان 'خدا بندہ' سنہ ۷۰۳ ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت فارس اور اس کے گرد و نواح کی حکومت شیخ الاسلام 'جمال الدین ابراہیم' کے ہاتھوں میں تھی۔ سنہ ۷۰۶ ھ میں وہ فوت ہوگیا تو بادشاہ نے یہی منصب اس کے لڑکے شیخ 'عزالدین عبد العزیز' کے حوالہ کردیا۔ اسی زمانے میں 'شرف الدین شاہ محمود اینجو' فارس کے چند اضلاع کا صوبہ دار تھا (شیخ عبد العزیز کے ماتحت)

جب سنہ ۷۲۵ ھ میں 'عزالدین' قتل ہوگیا تو 'ابو سعید' نے جو 'خدا بندہ' کے بعد تخت نشین ہوا تھا 'فارس' اصفہان' اور 'کرمان' کی حکومت 'امیرتاش' پسر امیر حسین پسر امیر الامرا چوپان کو مل گئی۔ اس نے 'محمود شاہ اینجو' کو فارس' کی صوبہ داری عطا کی —

اس دن سے خاندان اینجو کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ تاریخ گزیدہ' (مصنفہ حمداللہ مستوفی) میں لکھا ہے کہ 'محمود شاہ' عبداللہ انصاری' کی اولاد میں سے تھا۔ 'امیر محمود' کے چار لڑکے تھے :

(۱) جلال الدین مسعود شاہ (۲) غیاث الدین کیخسرو (۳) شمس الدین محمد (۴) جمال الدین ابو اسحٰق —

سنہ ۷۳۵ ھ میں ابو سعید نے فارس کی حکومت امیر 'مسافر ایناق' کے سپرد

کردی - جب 'محمود شاہ' کو معلوم ہوا تو اس نے چند امیروں کو ساتھہ ملاکر امیر 'مسافر' پر حملہ بول دیا - وہ بیچارہ کسی طرح بچ بچاکر 'ابو سعید' کے پاس جا پہنچا - محمود شاہ اور اس کے ہمراہی پکڑے گئے - اور بادشاہ نے سب کو سزائیں دیں - 'محمود شاہ' کو 'اصفہان' کے قلعہ میں قید کردیا - اور 'امیر مسافر' بڑی شان سے شیراز میں داخل ہوا —

جب سنہ ۷۳۶ ھ میں ابو سعید فوت ہوا تو ملک غیاث الدین کیخسرو' شیراز آیا اور امیر مسافر 'ایناق' کو پکڑ کر پہلے تو قید رکھا اور بعد میں اُسے 'آذربایجان' بھیج دیا - 'ابو سعید' کے 'بعد ارپاخاں' تخت پربیٹھا - اس نے تمام ان سرداروں کو جن کو وہ اپنی سلطنت میں خارج سمجھتا تھا' قتل کروانا شروع کیا - ان میں 'محمود شاہ' کی بھی باری آگئی - اور وہ 'تبریز' میں قتل کیا گیا 'امیرمسعود' نے بھاگ کر امیر شیخ حسن پسرامیر چوپان کے پاس 'روم' میں پناہ لی اور شیخ 'ابو اسحق' امیر 'علی شاہ' کے پاس 'دیار بکر' چلا گیا - اسی سال 'ارپا خان' قتل ہوا - اور 'موسیٰ خان' تخت نشین ہوا اور اسی سال ہی سلطان 'محمد خان' پسر امیر 'قتلق خاں' نے شیخ 'حسن ایلخانی' کی مدد سے آذر بایجان' پر قبضہ کرلیا اور شیخ 'حسن' نے مشورہ سے 'مسعود شاہ اینجو' کو وزیر اعظم مقرر کیا - لیکن جب سنہ ۷۳۸ ھ میں سلطان 'محمد' قتل ہوگیا 'مسعود شاہ' شیراز چلا آیا - مگر 'کیخسرو' نے بھائی کو داخل نہ ہونے دیا - دونوں میں لڑائی ہوئی - 'کیخسرو' نے شکست کھائی اور قید ہوا - تھوڑے عرصہ بعد وہ قتل کرڈالا گیا - اور 'مسعود' بادشاہ ہوا - پھر اسے اپنے بھائی 'محمد' کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو اس نے اسے بھی 'شولستان' کے قلعہ 'سفید' میں قید کردیا —

سنہ ۷۳۱ ھ میں امیر شیخ 'حسن کوچک' نے 'سلیمان خاں' کو جو 'ہلاکو خاں' کی اولاد سے تھا' تخت شاہی پر بٹھایا اور اس کے نام سکہ چلانا

شروع کیا - لیکن در حقیقت تمام سلطنت کا مالک خود تھا - سنہ ۷۴۰ ھ میں اس نے اپنے پسر عم ' امیر پیر حسین ' بنیرہ چوپان ' کو فارس کی حکومت عطا کی - جب ' پیر حسین ' شیراز کے قریب پہنچا تو ' شمس الدین محمد ' جو قلعۂ ' سفید ' میں تھا ' بھاگ کر اس کے ساتھ مل گیا ' مسعود شاہ ' نے خود مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی ' پیر حسین ' شہر میں داخل ہوا لیکن اس نے ' محمد ' کو بے گناہ قتل کر ڈالا - جس کی وجہ سے لوگوں نے شورش برپا کردی - ' پیر حسین ' بھاگ گیا اور مسعود دوبارہ شہر میں داخل ہوا —

سنہ ۷۴۱ ھ میں ' پیر حسین ' دوبارہ لشکر جمع کر کے آیا - ' مسعود ' کو پھر شکست ہوئی اور وہ ' سرستان ' بھاگ گیا - ' پیر حسین ' پچاس دن تک شہر کا محاصرہ کئے رہا - آخر کار شہر والوں نے اس سے مصالحت کرلی اور وہ شہر میں داخل ہوا —

سنہ ۷۴۲ ھ میں ' ملک اشرف بن تیمور تاش بن امیر چوپان ' اور ' جمال الدین ابواسحق ' نے بڑی فوج کے ساتھ ' اصفہان ' پر قبضہ کر لیا - پھر دونوں مل کر ' فارس ' کی طرف بڑھے - ' پیر حسین ' نے آگے آ کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور بھاگ کر اپنے پسر عم ' امیر حسین کوچک ' سے مدد مانگی لیکن اس نے اسے زہر دے کر مار ڈالا - ' ملک اشرف ' بغیر کسی تکلیف کے ' عراق کا مالک ہو گیا - اس کے بعد دونوں نے ' شیراز ' کا رخ کیا لیکن ' ابواسحق ' نے ایک چال چلی - ' ملک اشرف ' کو کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں شہر میں جاکر آپ کے قیام کا بندوبست کروں - اجازت حاصل کر کے وہ شہر میں داخل ہوا - امیروں کو ورغلا کر اپنی طرف کر لیا اور ' ملک اشرف ' کے مقابلے پر کھڑا ہو گیا — ' ملک اشرف ' نے غصے میں آکر ' فارس و عراق ' کے کئی شہر جلا دئے اور خود ' آذربایجان ' کی طرف چلا گیا جب اس واقعہ کی خبر ' امیر شیخ حسن بزرگ ' کو پہنچی تو اس

نے ' امیر مسعود ' اور ' یاغی باستی ' کو بھیجا - ' ابواسحق ' نے خوشی سے سلطنت کی باگ بھائی کے ہاتھہ میں دے دی لیکن ' یاغی باستی ' نے ایک دن موقع پا کر مسعود کو قتل کر ڈالا - شہر کا ایک حصہ ' امیر شیخ ' کی طرف ہوگیا اور دوسرا یاغی باستی ' کی طرف - لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں موخرالذکر آذر بایجان کی طرف چلا گیا —

اس طرح ' ابواسحق ' ' شیراز ' اور اس کے توابع کا خود مختار حکمراں ہو گیا *

---

* میں نے یہ سب بیان ' فارس نامۂ ناصری ' ' انسائیکلوپیڈیا اسلام ' جو تمام تر ' شیراز نامہ ' (اس کا مصنف خود ' ابواسحق ' کا ہم عصر تھا) سے ماخوذ ہے ' اور ' روضۃالصفا ' وغیرہ تواریخ سے لیا ہے - لیکن ان کے علاوہ ہمیں ' ابن بطوطہ ' کے سفر نامے میں بھی ' ابواسحق ' کے حالات ملتے ہیں - ' ابن بطوطہ ' ' شیراز ' میں دو بار پہنچا - ایک سنہ ۷۲۸ ھ میں اور دوسری بار سنہ ۷۴۸ ھ میں لکھتا ہے :—

جب ' محمود شاہ ' (کتاب میں غلطی سے ' محمد شاہ ' لکھا ہے) اینجو نے وفات پائی تو اس کی جگہہ پر ' سلطان ابو سعید ' نے ' شیخ حسین ' کو والئی شیراز کر کے بھیجا - یہ ' شیخ حسین ' امیرالامرا ' چوپان ' کا بیٹا تھا ... جب ' شیخ حسین ' کو سلطان ' ابوسعید ' نے والی شیراز کر کے بھیجا ہے تو اس کی مدد کے واسطے افواج کثیرہ ساتھہ کر دئے تھے - ' شیخ حسن ' وہاں پہنچ کر قابض ہوا ... ' شیخ حسین ' نے ایک مدت تک ' شیراز ' میں اقامت کی - بعد اس کے ملک عراق (ابو سعید) کے پاس آنے کا ارادہ کیا تو ' ابواسحق ' اور اس کے دونوں بھائیوں ' رکن‌الدین ' اور ' مسعود بیگ ' اور اس کی والدہ طاش خاتون ' کو گرفتار کر کے ' عراق ' لے چلا - جب وہ ' شیراز ' کے بیچ بازار میں پہنچے - تو ' طاش خاتون ' نے چہرہ کھول کر لوگوں سے فریاد کی کہ اے اہل شیراز ! کیا اس طرح ذلت کے ساتھہ میں شہر سے نکلونگی ؟

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ (۴۳۴) -

اردو جولائی سنہ ۳۰ ع

(سنہ ۷۴۲ ھ یا سنہ ۷۴۳ ھ) یہ ہے ' خاندان اینجو ' کی تاریخ جس کو مولانا نے کتنی غلطیوں کا ارتکاب کر کے بیان کیا ہے - اس تمام بیان کو اگر غور سے پڑھا جاے تو معلوم ہو گا کہ

(۱) ' ابوسعید ' کی زندگی میں ' امیر محمود اینجو ' شیراز کا حاکم تھا اور اس کے بعد ' امیر مسافر ایناق ' حاکم ہوا —

بقیہ صفحہ گذشتہ

حالانکہ میں فلاں کی زوجہ فلاں ہوں ... خاتون کے اس کہنے سے لوگوں نے شور مچایا - سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور ' شیخ حسن ' کے لشکر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالا - بہت سا مال و اسباب بھی لوٹ لیا - اس طرح اس خاتون اور اس کے لڑکوں کو چھڑا لیا - ' امیر شیخ حسن ' اور اس کے ساتھی سب بھاگ کھڑے ہوے اور سلطان ابو سعید کے پاس پہنچے - سلطان نے بڑا بھاری لشکر اس کے ہمراہ کردیا اور حکم دیا کہ تم ' شیراز ' کو پلٹ جاؤ اور جس طرح چاہو ' شیراز ' کے لوگوں پر حکومت کرو - جب سلطان کے حکم کی خبر اہالیان شہر کو ہوئی تو ان کو یقین ہوا کہ ہم ایسے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے - سب کے سب ' قاضی مجدالدین ' کے پاس حاضر ہوے اور ان سے درخواست کی کہ فریقین کے خون بچائیے - غرض ان کی وجہ سے شہر والوں کو امان ملی ... ' امیرحسین ' بڑی دھوم دھام کے ساتھ شہر میں داخل ہوا - جب ' ابوسعید ' نے وفات پائی اور اس کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تو بخوف جان ' شیراز ' سے نکل گیا اور ' ابواسحق ' حاکم بن گیا ... "

دیکھو اردو ترجمہ سفر نامہ ابن بطوطہ جلد اول امرتسر صفحہ ۲۲ - ۲۱

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ

(۲) ' شیخ حسین ' ابوسعید کی زندگی میں شیراز کا حاکم نہیں بنا بلکہ سنہ ۷۴۰ ھ میں یعنی ابوسعید کی وفات سنہ ۷۳۶ ھ کے چار سال بعد " بہ ایمائے ' امیر شیخ حسن کوچک ' وہ ' شیراز ' کا حاکم ہوا —

(۳) یہ ' شیخ حسین ' امیر چوپان کا پوتا تھا —

' مولانا اسلم ' کا بیان ان تینوں باتوں کے خلاف ہے اور اس لئے غلط ۔ فت نو میں جو کچھ ' ابن بطوطہ ' کے سفر نامے سے لے کر درج کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً مولانا نے اس کے بیان کو آسان اور زود رسان سمجھ کر درج کرلیا اور کوئی تکلیف گوارا نہ کی کہ یہ بیان ٹھیک بھی ہے یا نہیں !!

آگے مولانا یوں رقمطراز ہوتے ہیں :

" شاہ اسحق میں اگر چہ تمام خوبیاں تھیں مگر وہ آرام پسند تھا ۔ سنہ ۷۵۴ ھ میں ' امیر مبارزالدین ' مظفر نے اس کو غافل پا کر شیراز پر حملہ کردیا " صفحہ ۲۰

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ

لیکن باوجود ' ابن بطوطہ ' کی ہم عصری کے ہم اس بیان کو قابل یقین نہیں ٹھہرا سکتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ' محمود شاہ اینجو ' ' ابوسعید ' سے پہلے فوت ہوا ۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے ۔ ' روضۃالصفا ' میں ' ارپا خاں ' کے حال میں لکھا ہے :—

" در روز استفتاح ہمیں سال ملک سعید شرف‌الدین " محمود شاہ اینجو را کہ قارون زمان و اشرف و اعظم ملوک جہان بود ' بہ بہانۂ آنکہ پسرے از نسل ' ہلاکو خاں ' در حجرۂ تربیت دارد ' تا برسیدہ بہ قتل آورد "

دیکھو صفحہ ۱۹ ۔ ذکر احوال اولاد چنگیز خاں جلد پنجم ۔ طبع بمبئی—

اور یہ صاف ظاہر ہے کہ ' ارپا خاں ' ' ابوسعید ' کی وفات (سنہ ۷۳۶ ھ) کے بعد تخت پر بیٹھا —

اس کے علاوہ ' ابن بطوطہ ' نے ' ابواسحق ' کے صرف دو بھائیوں کے نام بتائے ہیں ۔ حالانکہ انسائیکلو پیڈیا اسلام میں بہ حوالۂ شیراز نامہ صاف طور سے لکھا ہے کہ امیر محمود کے چار لڑکے تھے ۔ ' رکن‌الدین ' کا نام ' ابن بطوطہ ' نے غلط لکھا ہے ۔ ' ابواسحق ' کا کوئی بھائی اس نام کا نہیں — (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

لیکن بعد میں دوسری صفحہ (۲۱) پر خود لکھتے ہیں :

..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ' شاہ ابواسحق ' اور ' مظفر ' میں ابتداہی سے لڑائیاں ہوتی چلی آتی تھیں اور ' ہمیشہ ابواسحق کو فتح ہوتی تھی ' - کیونکہ اس کے پاس فوج بہت زیادہ تھی - لیکن اس دفعہ اس حملہ میں بازی پلٹ گئی شاہ ابواسحق کو بڑی جرأت ' سے لڑا لیکن ' امیر مظفر ' نے اس کو شکست دی اور میدان چھوڑ کر اصفہان بھاگا —

اب اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں بیانات متضاد ہیں ایک طرف تو کہا گیا ہےکہ ابواسحق غافل تھا اور امیر مظفر نے اسی بے خبری کی حالت میں حملہ کردیا - دوسری طرف کہتے ہیں کہ ان میں ہمیشہ لڑائیاں ہوتی تھیں اور ایسی حالت میں کیسے بے خبری رہ سکتی ہے —

پیشتر اس کے کہ میں ان بیانات کی تردید میں کچھہ لکھوں ' مناسب سمجھتا ہوں کہ امیر مظفر اور اس کے خاندان کے متعلق بھی کچھہ لکھوں تا کہ ناظرین کو سمجھنے میں دقت نہ ہو —

' خاندان آل مظفر '

' اس خاندان کا بانی ' ' مبارزالدین بن مظفر ' ' ابوسعید ' کے عہد میں

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ گذشتہ

ابن بطوطہ کی غلطی کے کئی وجوہات ہیں - اول تو یہ ہے کہ جو اب سفر نامہ موجود ہے وہ صرف اصلی سفر نامے کا خلاصہ ہے جسے ' ابن جزی ' نے جو ' سلطان ابوعنان مرینی ' بادشاہ ' مراکو ' کا سکریٹری تھا ' کہا تھا - اور اب جو سفر نامہ موجود ہے وہ در حقیقت یہی خلاصہ ہے - دوم یہ کہ وہ تمام یاد داشتیں جو ' ابن بطوطہ ' نے لکھی تھیں دریا میں ضائع ہو گئیں - اور زبانی واقعات جو اسے یاد رہے اس نے وہی درج کر دئے - اس بیان کی تائید علامہ ' ابن خلدون ' سے بھی ہوتی ہے - انہوں نے صاف لکھا ہے کہ ابن بطوطہ کے کئی بیانات ناقابل قبول ہیں —

معمولی درجے کا آدمی تھا - لیکن آہستہ آہستہ ایسے کا رہائے نمایاں کئے کہ 'ابوسعید' کا منظور نظر بن گیا - جب 'ابوسعید' فوت ہوا تو اسوقت یہ یزد کا حاکم تھا - اس نے فوراً یزد اور کرمان پر قبضہ کرلیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا - ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ 'ابواسحق' سنہ ۷۴۲ ھ میں مستقل طور سے 'شیراز' پر قابض ہوگیا - تخت پر بیٹھتے ہی اس نے توسیع سلطنت میں کوشش شروع کی - لیکن فوراً ہی اسے 'مبارزالدین' سے پالا پڑا - مبارزالدین دلیر آدمی تھا' سپاہی منش تھا اس لئے ابواسحق کی کچھہ نہ چل سکی - آخر کار سنہ ۷۵۴ھ میں مبارزالدین نے اسے شیراز کے قریب شکست دی اور وہ بھاگ کر 'اصفہان' جاپہنچا - وہاں بھی چار پانچ سال تک وہ مقابلہ پر تلا رہا لیکن آخر کار قید ہوا وہ 'امیر مظفر' نے اسے قتل کروا ڈالا —

لیکن 'امیر مظفر' کا خود بہت برا حشر ہوا - اس کے لڑکے شاہ شجاع نے اسے پکڑ کر اندھا کر دیا (سنہ ۷۶۰ ھ) - کئی سال تک بے چارہ قید میں پڑا رہا اور آخر کار وہیں مرگیا —

خواجہ 'حافظ' نے اس واقعہ کی طرف ایک قطعہ میں اشارہ کیا ہے ...

شاہ غازی خسرو گیتی ستاں آنکہ از شمشیر از خوں می چکید
عاقبت شیراز و تبریز و عراق چوں مسخر کرد وقتش در رسید
آنکہ روشن بد جہاں بینش ازو میل در چشم جہاں بینش کشید

'شاہ شجاع' باپ کو اندھا کرکے 'شاہ شجاع تخت پر بیٹھا اور تمام ملک اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیا - 'کرمان' اپنے بھائی 'سلطان احمد' کو اور 'اصفہان' شاہ محمود کو - (سنہ ۷۶۵ ھ) میں کسی بنا پر اپنے بھائی 'سلطان محمود' سے مخالفت ہوئی - لیکن بہت جلدی فیصلہ ہوگیا - 'شاہ محمود' کے دل میں ابھی تک رنج تھا - اس نے 'سلطان اویس جلایر' کو 'بغداد' میں خط بھیجا کہ اگر چہ

میرا بھائی ' شیراز ' چلا گیا ہے لیکن ' اصفہان ' کی تسخیر کا خبط اس کے دل میں ہے ۔ اگر آپ مدد کریں تو تمام فارس فتح ہوسکتا ہے شاہ شجاع کو بھی اس بات کا پتہ لگ گیا ۔ ادھر ' شاہ یحییٰ ' نے یزد ' پر قبضہ کرلیا ۔ ' شاہ شجاع ' نے فوراً اپنے وزیر خواجہ قوام الدین نیار کو ' یزد ' بھیجا لیکن بعد میں اس کا قصور معاف کردیا ۔ اس کے بعد ' شاہ محمود ' سلطان اویس کی مدد لیکر آگیا اور شہر پر قبضہ کرلیا ۔ شاہ ' شجاع ' نے کرمان میں اپنی حکومت قائم کرلی ۔ پھر استقلال پاکر شاہ محمود ' کو نکال دیا اور دوبارہ شیراز پر قابض ہوگیا ۔ بعد میں ' تبریز ' ' شوستر ' ' بغداد ' اور سلطانیہ پر بھی قبضہ کرلیا ۔ آخرکار ۷۸۶ ھ میں فوت ہوا

' زین العابدین ' شاہ شجاع کے بعد اسکا بیٹا فارس کی حکومت کا مالک ہوا ' مرنے سے پہلے اس نے ' تیمور ' جس نے شاہ شجاع کی زندگی ہی میں نہایاں کامیابیاں حاصل کرنی شروع کردی تھیں ' خط لکھا کہ آپ میری اولاد کی حفاظت کریں ۔ ' شاہ شجاع ' کے مرتے ہی شاہ ' یحییٰ ' نے شیراز پر حملہ کیا ۔ لیکن شکست کھائی ۔ اس کے بعد سنہ ۷۸۹ ھ میں ' تیمور ' نے حملہ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ' تیمور ' نے ایک ایلچی ' زین العابدین ' کے پاس بھیجا تھا اور کہا تھا کہ تمہارے والد مرحوم نے تمہیں میرے حوالے کیا ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم میری اطاعت قبول کر لو ۔ لیکن اس نے کچھ پروا نہ کی اور سیدھا ' شوستر ' بھاگ گیا جہاں اس کا ' چچا زاد بھائی ' منصور ' حکمران تھا ۔ اس نے اسے اندھا کر دیا —

' تیمور ' کسی خاص وجہ سے سمرقند واپس چلا گیا اور شاہ ' یحییٰ ' کو ' شیراز ' کا گورنر بنا گیا لیکن ' تیمور ' کے جاتے ہی شاہ ' منصور ' ' شیراز ' پر چڑھ آیا اور اسے فتح کر لیا ۔ جب سنہ ۷۹۵ ھ میں ' تیمور پھر دوبارہ واپس آیا تو شاہ ' منصور ' نے خرب دل کھول کر مقابلہ کیا ۔ لڑائی کے دوران میں کئی دفعہ وہ خود ' تیمور ' کے پاس جا پہنچا اور ایک دفعہ وار کرنے ہی کو تھا کہ ' تیمور '

کے لڑکے شاہ رخ ' میرزا ' نے اسے قتل کر ڈالا - اس کے قتل کے بعد ' تیمور ' نے اس کی بہادری کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میں نے آج تک کسی کو ' منصور ' کا ہمسر نہ پایا اس لڑائی کے بعد ' تیمور ' نے سب مظفری شاہزادوں کو قتل کر ڈالا اور آل ' مظفر ' کا خاتمہ ہوا —

به عبرت نظر کن به آل مظفر شهانے که گوئے از سلاطین ربودند
که در هفصدو خمس و تسعین هجرت دهم شب ز ماه رجب چون غنودند
چو خرمایه فان از زما فها به رشتند چون ترہ به اندک زمانے درودند

اب میں ان دونوں بیانات " کی طرف راجع ہوتا ہوں " - اصل واقعات یہ ہیں کہ دونوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں اور ہر دفعہ شیخ ' ابواسحق ' کو شکست ہوئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح صلح کر لیتا - مگر جب سنہ ۷۵۴ ھ میں امیر ' مظفر ' نے حملہ کیا تو ' ابواسحق ' نے قاضی ' عضدالدین ' کو صلح کے لئے بھیجا - لیکن امیر ' مظفر ' نے صلح سے انکار کر دیا - بعد میں ابواسحق کو شکست ہوئی —

' حبیب السیر ' میں لکھا ہے :—

" در اوائل سن اربع و خمسین و سبعمائه ' همت بلند نهت ارجمند ' امیر مبارزالدین محمد ' را بران داشت که کهند اندیشه بر کنگرهٔ تسخیر شیراز افد اخت . . . امیر شیخ بعد از تقدیم مشوره عمدة المتاخرین ' قاضی عضدالدین را بد رسم رسالت نزد امیر مظفر فرستاد و التماس مصالح نمود . . . لاکن جناب مبارزی جواب داد که بر عهد و پیمان شیخ ' ابواسحق ' مطلقاً اعتماد نیست زیرا که هشت نوبت با من مصالح نمود و باز راه منازعت پیمود . . . "

جز و دوم از جلد سیوم - سلطنت امیر مظفر

اس بیان سے صاف واضح ہے کہ امیر ' ابواسحق ' امیر ' مظفر '

کے حملہ سے واقف تھا ' بے خبر نہیں تھا یہ بھی واضح ہے کہ دونوں کے درمیان آٹھ دفعہ لڑائی ہوئی اور آٹھوں دفعہ ' ابواسحق ' شکست کھا کر صلح کرنے پر مجبور ہوتا رہا - اس کے علاوہ اس کی جرأت سے لڑنا بھی ثابت نہیں ہوتا چنانچہ لکھا ہے کہ جب اس نے مقابلہ کے لئے فوج کو شہر سے پانچ فرسخ کے فاصلہ پر قائم کیا تو امیر ' مظفر ' کا خوف اسے ہر وقت لگا رہتا تھا - حتیٰ کے جب اس کی آمد کی خبر اس کے کان تک پہنچی تو فوراً میدان چھوڑ کر قلعہ بند ہو بیٹھا !

" . . . . ' امیر شیخ ' از صلح نومید شدہ با لشکرے چوں سیل پر خروش ' پنج فرسنخئے شیراز را محل نزول ساخت لیکن بعد از قرب و صول جناب مبارزی وہم برو غالب گشتہ بہ شیراز در آمدہ "

یہ ہے اس کی جرات اور میدان میں لڑنا ! —

مولانا حاجی قوام‌الدین حسن کا ذکر کرتے ہوے فرماتے ہیں کہ انہوں نے حافظ کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا (دیکھو صفحہ ۲۱) لیکن یہ غلط ہے - میں نے اس سے پیشتر اردو کے جنوری سنہ ۱۹۲۹ ع والے نمبر میں اس خیال کی تردید کر دی ہے —

قولہ :-

" امیر مظفر ایک سپاہی منش اور سخت طبعیت کا آدمی تھا - جب شیراز پر اس کا قبضہ ہوا تو اس نے بہت سختیاں کیں - یہاں تک کہ تمام لوگ اس کے دشمن ہوگئے - اس کے بیٹے شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ عنقریب ملک میں بغاوت ہونے والی ہے تو امراء لشکر کے ساتھ متفق ہو کر ۷۶۰ ھ میں مظفر کو گرفتار کر لیا- آنکھوں میں سلائی پھیر کر قید کر دیا " صفحہ ۲۳

مولانا کے ایسے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بجاے ایک سوانح اور تنقیدی

مضمون لکھنے کے وہ ایک ناول یا کہانی تصنیف فرما رہے ہیں ' جس کا ہیرو شاہ شجاع ہے - یہ پہلا موقع ہے کہ انھوں نے شاہ شجاع کی تعریف کی ہے اور آگے بھی کئی اور مواقع آئیں گے - شاید انہیں شاہ شجاع سے محبت ہو گئی ہے اور وہ اسے کسی حالت میں بھی برے رنگ میں پیش نہیں کر سکتے - اس لئے اس کی برائی کو بھی اچھائی کے رنگ میں پیش کرتے ہیں —

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر مظفر بڑا ترش مزاج آدمی تھا - سخت گیر تھا اور کئی انسانوں کو اس نے بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا لیکن اس ظلم کے ساتھ ہی ساتھ اس کا رعب و داب اس کی ہیبت و طاقت اتنی تھی کہ کوئی اس کے سامنے بول نہیں سکتا تھا - باوجود اس ظلم کے ملک میں کسی قسم کی بغاوت کا اثر نہ تھا - شاہ شجاع نے اپنے باپ کو اندھا کیا اس خوف سے نہیں کہ ملک میں بغاوت ہونے والی ہے بلکہ اس خوف سے کہ کہیں باپ بجائے اس کے کسی اور بیٹے کو بادشاہ نہ بنادے - وہ خود عیاش تھا - اور مظفر بڑا دیندار - اس لئے باپ ہمیشہ شاہ شجاع کو حقارت سے دیکھا کرتا تھا —

اس کی شہادت تاریخ سے یوں ملتی ہے —

(ا) ایک دفعہ امیر مظفر نے شاہ شجاع کو کسی دشمن کے تعاقب میں بھیجا روضۃ الصفا میں ہے :-

" شاہ شجاع و شاہ محمود را از عقب گریختگان فرستاد - ایشاں تا نخچوان رفتہ در انجا سہ شبانہ روز بہ عیش و عشرت مشغول گشتند و چوں مراجعت نمودند ' امیر محمد شاہزادگان را بہ سخنان زشت و دشنامہاے غلیظ مشوش خاطر گردانید و ایں موجب کینہ و عداوت اولاد گشت "

جلد چہارم - آغاز احوال شاہ شجاع صفحہ ۱۴۶

(ب) دوسری جگہ لکھا ہے :-

"چوں جناب مبارزی در اصفہان قرار گرفت، فرزندان را بہ دستور سابق بلکہ زیادہ از ان بہ سخنان و کلمات نا خوش و حرکات خنک می رنجانید و شاہ شجاع و شاہ محمود قبل از وصول بہ صفہان باشاہ سلطان شکایتے از پدر کردہ بود ند و گفتہ بود کہ امیر محمد داعیۂ آں دارد کہ شملہ را بگیرد و فرزند کوچک خویش ابویزید را بر تخت نشاند... پس ایں سہ کس باہم عہد کردہ اتفاق نمودند کہ چوں بہ اصفہان رسند، جناب مبارزی را گرفتہ، مقید سازند"

یہ ہیں وجوہ جو تواریخ میں ہمیں ملتے ہیں - مولانا نے خدا جانے کہاں سے یہ روایت لی کہ بغاوت کے خوف سے انہوں نے اسے قید کرلیا —

قولہ :-

"ابوانوارس شاہ شجاع کے تخت نشین ہوتے ہی تمام لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ خود عالم، عام دوست اور بڑا دیندار تھا- علماء و صلحاء کی اس کے دربار میں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی" صفحہ ۲۴

اس جگہ مولانا نے شاہ شجاع کی پھر تعریف کی ہے - ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ایک دفعہ شاہ محمود نے سلطان اویس والیء بغداد کی مدد سے اپنے بھائی شاہ شجاع سے شیراز فتح کر لیا - لیکن کچھ عرصہ بعد ۷۶۷ھ میں شاہ شجاع نے دوبارہ پھر شیراز فتح کر لیا-اس وقت حبیب السیر میں لکھا ہے :-

"در امر معروف و نہی منکر و تقویت ایمان ارکان شریعت خیرالبشر صلعم مبالغۂ بسیار نمود و در تعمیر مساجد و مدارس وخوانق

مساعی جمیلہ مدنول داشتہ ملازمت مجلس علماء کرام اختیار نمود"

جلد سیوم جز و دوم ذکر سلطنت آل مظفر صفحہ ۲۹

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اسلم نے اسی بیان سے تمام واقعات درج کئے ہیں لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ وہ تمام واقعات پر نظر ڈالے - نہ یہ کہ جو مطلب کا بیان ہو وہ لے لے اور باقی کو چھوڑ دے- ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ شاہ شجاع نے یہ سب کچھ کیا - لیکن یہ کرنے کی وجہ ملکی ضبی اس نے اپنی رعایا کو خوش کرنے کے لئے یہ کام کئے اور مولانا نے غلط فہمی سے اسے الٹا سمجھ لیا - چنانچہ اسی تاریخ میں کسی اور جگہ لکھا ہے کہ جب وہ سلطانیہ اور بغداد وغیرہ ممالک فتح کرکے آتا ہے تو عیش و عشرت میں مشغول رہتا ہے —

"دراں ایام بر شرب مدام چنداں حرص و شرہ پیدا کردہ کہ از دست ساقیان گلندام جزمئے گلفام نمی گرفت و از علواء مستی صبوح از عبوق باز نمی شناخت و ترانۂ مجلس او بہ ذروۂ عیوق رسیدہ ... چوں اغلب اوقات ازجام نشاط و ساغر عشرت جرعۂ کم نمی فرمود، غذا بسیار اندک تناول می نمود ... "

اب اگر ہم اس بیان کو پڑھیں تو اس سے کیا اندازہ لگا سکتے ہیں - مولانا 'اسلم' کی جو مرضی ہو وہ کہیں لیکن ہمارے نزدیک تو جیسا کہ اس بیان سے صاف ظاہر ہے وہ شرابی تھا —

کسی یورپین مورخ نے لکھا ہے کہ "حقیقت میں 'شاہ شجاع' کی عیاشی کی وجہ سے اس کے زمانہ میں شراب خواری اور عشق بازی کا بہت زیادہ چرچا ہوگیا تھا - مولانا 'اسلم' اس فقرہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کاش اس مورخ نے کوئی تاریخ بھی 'فارس' کی اُٹھا کر پڑھی ہوتی تو اسے معلوم ہوجاتا کہ تمام شاہان 'شیراز' میں 'شاہ شجاع' بہت بڑا عالم اور نہایت درجہ کا پابند شرع اور حافظ قرآن تھا-

اس کا زمانہ 'شیراز' کے لئے شریعت اور مذہب کا زمانہ تھا ایسے متشرع بادشاہ کے متعلق اس قسم کا غلط اندازہ کرنا فارسی تاریخ سے جہالت کی دلیل ہے'

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو فقرہ مولانا نے دوسروں کے لئے استعمال کیا ہے وہ خود مولانا پر ہی عائد آتا ہے - بہ مانا کہ وہ عالم تھا' حافظ قرآن تھا لیکن کیا ان دونوں چیزوں سے اس کا پرہیز گار بھی ہونا ضروری ہے - تاریخ صاف لفظوں میں بتلا رہی ہے کہ وہ عیاش اور شراب خوار تھا —

ایک بیان تو ہم پہلے 'حبیب السیر' سے ابھی درج کرچکے ہیں - ایک اور جگہ درج ہے کہ وہ شراب کے نشے میں اتنا مست ہوگیا کہ اسے دین و دنیا کا ہوش نہ رہا اور اسی مستی کی حالت میں اس نے اپنے بیٹے سلطان 'شبلی' کی آنکھیں نکلوانے کا حکم دیا - لیکن جب ہوش آیا تو بہت پچھتایا لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا اب آپ اس مستی کے کیا معنی لیتے ہیں ؟

میں نے اس سے پہلے کسی اور تعلق میں روضۃ الصفا سے ایک بیان نقل کیا تھا (دیکھو صفحہ ۸) اس میں لکھا ہے

"ایشاں تا نخچواں رفتہ در اں جا سہ شبانہ روز بہ عیش و عشرت مشغول گشتند"

'ایشان' کی ضمیر کا اشارہ 'شاہ شجاع' اور 'شاہ محمود' کی طرف ہے - 'مبارزالدین' نے جو اپنی اولاد سے درشتی کی تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خود پرہیزگار تھا اور اس کے برخلاف 'شاہ شجاع' عیش پرست —

اب اگر انسان ان واقعات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ 'شاہ شجاع' پرہیز گار تھا —

مولانا اسلم ان دلیلوں کے علاوہ ایک اور دلیل بھی پیش کرتے ہیں - وہ یہ

ہے کہ خود خواجہ 'حافظ' نے 'شاہ شجاع' کی تعریف کی ہے :

مظہر لطف ازل روشنئی چشم امل جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

اور اس کے ساتھہ لکھتے ہیں :

ایک بات ضرور تھی کہ امیر 'مظفر' نے شراب خانے بند کردئے تھے اور 'شاہ شجاع' کے زمانے میں تجارت کی آزادی کی وجہ سے پھر شراب کی دوکانیں کُھل گئیں - اسی کا بعض جگہ خواجہ نے مذاق اُڑایا ہے :

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش کہ دور شاہ شجاع ست می دلیر بنوش

چونکہ خواجہ 'حافظ' نے 'شاہ شجاع' کی تعریف کی ہے اور اسے جامع علم و عمل کہا ہے تو اس سے نتیجہ نکالنا کہ وہ درحقیقت ایسا ہو تھا بالکل غلط ہے - 'حافظ' قصیدہ خوانی میں ایسا ہی تھا جیسے کہ دوسرے شاعر - اس کا بیان بعد میں آئے گا —

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا شراب خانے کُھلوا دینا حالانکہ اس کے والد نے انھیں بند کیا تھا کوئی عیب کی بات ہے یا نہیں - اس کی موجودہ مثال ریاست بھوپال سے ملتی ہے - موجودہ حکمراں سے پہلے تمام شراب کا کار و بار بند تھا لیکن موجودہ نواب نے شراب بنانے اور بیچنے کی عام اجازت دے دی ہے - اس پر تمام ملک میں عام احتجاج ہوا تھا - خواہ یہ تجارت کی وجہ سے ہو خواہ کسی اور مدعا سے ہر حالت میں یہ کار بد ہے - اور شاہ 'شجاع' کی حالت میں تو یقیناً اس لئے تھا کہ وہ خود شراب خوار تھا - اب دیکھئے 'خواجہ حافظ' اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں غزل کا مطلع یوں ہو :

سحرز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش کہ دور شجاع ست مے دلیر بنوش

اور آخر میں یوں ختم کرتے ہیں :

محل نور تجلی ست رائے انور شاہ چرقرب او طلبی' در صفائے نیت کوش

بجز ثنائے جلالش مساز ورد ضمیر — کہ ہست گوش دلش محرم پیام سروش
رموز مصلحت ملک خسرواں دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ان اشعار کو سمجھانے کے لئے مجھے ' شیخ سعدی ' کی ایک مثال پیش کرنی چاہئیے —

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب ' ہلاکو خاں ' نے سنہ ۶۵۶ ھ میں بغداد کو تباہ کیا تھا تو ' ابوبکر بن سعد زنگی ' (المتوفی سنہ ۶۵۸ ھ) نے جو خاندان ' اتابک ' سے شیراز کا حاکم تھا ' اپنی فوج حماہ آور کی مدد کے لئے بھیجی اور اس طریقے سے اس نے اپنی سلطنت کو بچا لیا - لیکن اس کے ساتھ اس نے ایک دوسری اور زیادہ با وقعت اسلامی سلطنت کو تباہ کرنے میں مدد دی - ' شیخ سعدی ' (المتوفی سنہ ۶۹۱ ھ) نے بغداد کا مرثیہ لکھا تو آخری شعر یہ تھے

خسرو صاحب قران فوت زماں ابوبکر سعد — آنکہ اخلاقش پسندیدہ است و اوصافش گزیں
مصلحت بود اختیار رائے روشن بین او — زیر دستاں را سخن گفتن نشایہ جز چنیں
روز گارت باسعادت باد و سعدی مدح گوئے — رایتت منصور و بختت باز و اقبالت قریں

اب ' حافظ ' کے شعروں کا ان اشعار کی روشنی میں مطالعہ کرو - تم کو معلوم ہوگا کہ ' حافظ ' نے کس طرح عمدہ طریقہ سے شاہ ' شجاع ' کی ہجو کی ہے - ظاہر یہ تعریف ہے اور در پردہ مذمت ! سو مولانا ' اسلم ' کو سمجھنا چاہئیے کہ شراب خانے کھولنا کوئی اچھا کام نہیں اور اس کام پر ' حافظ ' نے بھی ' شاہ شجاع ' کو برا کہا لیکن چونکہ حاکم وقت تھا اس لئے زیادہ زبان کھولنے کی جرات نہیں ہوئی —

قولہ

" سنہ ۷۸۶ ھ میں ' شاہ شجاع ' کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ' زین العابدین ' تخت نشین ہوا ... اس مغرور شہزادے نے باپ کے

مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھہ بد سلوکیاں شروع کیں اور شیراز میں پھر دور مظفری تازہ ہو گیا " صفحہ ۲۶

معلوم نہیں کہ مولانا نے کہاں کہاں سے اپنا مواد جمع کیا - کسی تاریخ میں تو کم از کم ایسے واقعات نہیں ملتے - حبیب السیر میں لکھا ہے :

" ہمدریں سال اشراف و اعیان اصفہان بہ واسطہ بخل و امساک شاہ یحییٰ بہ مقام ہوا داریء سلطان زین العابدین کہ در غایت کرم و سخاوت بود آمدند ... " جز و دوم از جلد سیوم صفحہ ۳۸

اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس نے کس حد تک اپنے امیروں کو تنگ کیا ۔ قولہ :-

" مثل مشہور ہے کہ ظلم کی عمر تھوڑی ہوتی ہے ابھی ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ سنہ ۷۸۷ ھ میں شہنشاہ ' تیمور ' ایک گرجتے برستے بادل کی طرح آن پہنچا ' زین العابدین ' نے مقابلہ کے لئے لشکر فراہم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا - آخر خوف کے مارے صاحب قران کے آنے سے پہلے ہی ' شیراز ' سے بھاگا اور اپنے چچا ' منصور ' کے پاس ' تستر ' میں پہنچا " صفحہ ۲۷

اس بیان میں کچھہ اتنی غلطیاں جمع ہیں کہ ہنسی آتی ہے - تیمور کا پہلا حملہ سنہ ۷۸۹ ھ میں ہوا نہ کہ سنہ ۷۸۷ ھ - اور اس حملہ کی وجہ ' زین العابدین ' کا ظلم نہ تھا بلکہ اس کی وجہ کوئی اور تھی - ' حبیب السیر ' میں لکھا ہے :

" در سنہ ثمان و سبعین و سبعمائہ کہ صاحب قران گیتی ستان امیر تیمور گورکان ہمت عالی بر استخلاص و لایت ' آذر بایجان و عراق گماشت ' ایلچی بہ شیراز فرستاد وبہ سلطان ' زین العابدین '

پیغام داد که پدر مرحوم تو با ما در مقام دولتخواهی و اتحاد بود - بنا برآں در وقت وفات یافتن ' مکتوبے در باب سفارش تو ارسال نمود می باید که بدرگاہ عالم پناہ آئی تا ترا بہ نوعے منظور نظر گردانیم ... سلطان زین‌العابدین بہ سبب عدم مساعدت بخت ہر توجۂ آستانۂ جاہ و جلال طریق اہمال و اہمال سلوک داشت بلکہ ایلچی را اجازت مراجعت نداده ... " صفحہ ۳۹

نیز یہ کہنا کہ ' زین‌العابدین ' نے فوج جمع کرنے کی کوشش کی کہیں ظاہر نہیں ہوتا - جب ' تیمور ' نے اصفہان کے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا تو ' شیراز ' کی طرف رخ کیا - اس وقت لکھا ہے :

صاحب قران عازم شیراز گشت و سلطان زین‌العابدین از واقعۂ اصفہان و توجہ موکب نصرت نشان ' جز یافتہ بہ جانب شستر گریخت "

اس کے علاوہ مولانا نے بجائے شستر کے جس کو شوستر بھی لکھتے ہیں ' تستر لکھا ہے - معلوم نہیں کہ آپ نے یہ نام کہاں سے لیا ہے ؟

قولہ :-

" ... انھوں نے کسی امیر یا وزیر کی شان میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا جو شعراء کا خاصہ خیال کیا جاتا ہے اور جس سے شیخ سعدی جیسے بزرگ تارک‌الدنیا بھی نہیں بچ سکے - ' انھوں نے بہت کیا تو یہ کیا کہ کسی غزل میں ایک دو شعر کسی کی تعریف ' میں بڑھا دئے اور اس کا نام لے دیا اور بس " صفحہ ۱۹

ایک دوسری جگہ مولانا فرماتے ہیں :

" قصیدوں کی کیفیت یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں سے کسی میں کوئی قصیدہ نہیں ہے - کسی میں چار ہیں کسی میں پانچ - ہمارے

سنہ ۹۵۲ ھ کے نسخے میں ایک بھی نہیں ہے سنہ ۱۲۰۸ ھ کے نسخے میں سات ہیں —

مگر عام طور پر قلمی نسخوں میں کوئی قصیدہ نہیں پایا جاتا " صفحہ ۷۰

یعنی ' مولانا اسلم ' کے خیال کے مطابق ' حافظ ' نے کبھی قصیدہ خوانی نہیں کی وہ کسی دوسرے کی تعریف نہیں کرتے تھے بلکہ ہر وقت اپنی خودی میں غرق رہتے تھے - لیکن یہ خیال درحقیقت غلط ہے - ' حافظ ' نے ایسی ہی قصیدہ خوانی کی جیسے کہ دوسرے فارسی شاعروں نے کی - لیکن ایک نقطہ بیان کر دینے کے قابل ہے ' مولانا روم ' اور ' عطار ' رحمہم اللہ تعالے نے اپنی تمام عمر بے پروائی میں گذاری - یہ حالات زمانہ کے اقتضا کی وجہ سے تھی - تمام ملک میں بدامنی تھی - اسلامی سلطنتیں تباہ ہوگئیں اس حالت میں اگر ان شخصوں نے اپنی حاجت روائی کے لئے دست سوال دراز نہ کیا تو صاف ظاہر ہے کہ وہ حالات ہی ایسی تھی - یہی حال ' شیخ سعدی ' کا تھا - لیکن ان کے زمانے میں قدرے امن تھا انھوں نے بھی اپنے زمانے کے بادشاہوں کی تعریفیں لکھیں لیکن مولانا ' اسلم ' کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان تمام قصائد میں ان کو شاذو نادر ہی کوئی ایسا موقع ملے گا جہاں وہ یہ کہہ سکیں کہ یہ مبالغہ ہے - انھوں نے قصیدوں میں بادشاہوں کو سمجھایا اور اس سمجھانے سے وہ کبھی نہیں ڈرے ایسی ہمت عالی پیدا کرنی بڑی مشکل ہوتی ہے - لیکن اس کے برخلاف خواجہ حافظ نے قصیدے لکھے اور ان میں بادشاہوں کی تعریف کی اور ایسی تعریف کی جو عام فارسی شعراء کا رویہ ہے —

ان کے دیوان میں چند قصائد ہیں - ایک ان میں سے ' ابواسحق ' کی تعریف میں ' ایک ' شاہ شجاع ' اور ایک ' شاہ منصور ' کی تعریف میں - اب ' مولانا اسلم ' ان قصائد کو حافظ کی طرف منسوب کرنے سے انکار کرتے ہیں - لیکن ایک آدمی کا انکار جب کہ وہ بغیر دلیل ہو کوئی وقعت نہیں رکھتا - ' ابواسحق ' کی تعریف

خواجہ ' کرمانی ' نے بھی کی ہے اور اگر یہ قصیدہ اس کے ہاں بھی نہ ملے تو پھر اس کو کس کی طرف منسوب کریں ؟ اس طرح ' شاہ شجاع ' کی تعریف میں ' سلمان ساوجی ' اور عماد کرمانی نے قصاید لکھے اور اگر یہ قصیدہ ان کے دواوین میں بھی نہ ملے تو پھر اس کو کیا کریں ؟ ان کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ جعلی ہیں - لیکن جعلی لکھنے والوں کا کوئی مقصد ہونا چاہیے - انہوں نے جو یہ جعلی قصیدے لکھکر ' حافظ ' کی طرف منسوب کئے تو کیا وجہ تھی ؟ حضرات تشیع نے تو کئی قصیدے اس غرض سے تصنیف کرا کر مختلف شعرا کے دواوین میں شامل کئے کہ وہ شیعہ ثابت ہوسکیں لیکن معلوم نہیں کہ ان قصائد کو لکھنے والے کا کیا مدعا تھا ؟ یہ محض ' حافظ اسلم ' کا خیال خام ہے کہ یہ قصائد ' حافظ ' کے نہیں - اسی طرح انہوں نے ' حافظ ' کے ' ساقی نامی ' سے بھی انکار کردیا ہے حالانکہ مولف میخانہ نے جو جہانگیر کے زمانے میں بیٹھا لکھ رہا ہے اس کو - ' حافظ ' کی طرف منسوب کیا ہے - اگر بعض شخصوں نے غلطی سے بعض چیزوں کو ' حافظ ' کے دیوان میں داخل کردیا تو مولانا ' اسلم ' نے اس کے برعکس دوسری غلطی کی کہ ان چیزوں کو جو ' حافظ ' کی ہی تھیں ' دیوان سے خارج کردیا ہے برایں عقل و دانش بباید گریست پیشتر اس کے کہ میں ' حافظ ' کے قصیدوں کی مثالیں پیش کروں ' میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ' شیخ سعدی ' کے قصائد کے نمونے بھی پیش کروں تاکہ مولانا ' اسلم ' کو معلوم ہوجائے کہ ' شیخ سعدی ' اگر وہ تارک الدنیا تھے تو وہ قصائد میں بھی تارک الدنیا ہی رہے - سب سے پہلے میں ان کے ان قصائد کو لیتا ہوں جو انہوں نے ' اذکیانو ' کی مدح میں لکھے ہیں - فرماتے ہیں : —

بس بگرد ید و بگرد د روزگار دل بہ دنیا در نہ بندد ہوشیار

اے دستت می رسد کارے بکن پیش ازاں کز تو نیاید ہیچ کار

نام نیکو گر بماند ز آدمی به کز و ماند سرائے زر نگار
صورت زیبائے ظاہر ہیچ نیست اے برادر سیرت زیبا بیار
چوں خداوندت بزرگی داد و حکم خوردہ از خوردان مسکیں در گزار
نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت بر قرار

اور آخر میں فرماتے ہیں —

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو حق نشاید گفتن اِلا آشکار
ہر کرا خوف و طمع دربار نیست از خطا باکش نباشد و ز ثنار

ایک دوسرے قصیدے میں جو انھوں نے انکیانو کے لئے ہی لکھا ہے فرماتے ہیں-

بہ نقل از اوستادان یاد دارم کہ شاہان عجم کیخسرو و جم
ز سوز سینۂ فریاد خواہاں چناں پرہیز کردندے کہ از سم
حرامش باد ملک و بادشاہی کہ پیشش مدح گویند از قفا دم
سخن شیریں بود پیر کہن را ندانم بشنود نوئیں اعظم
جہاں سالار عادل انکیانو سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی الا گر ہوشیاری بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ سخن ملکے ست سعدی را مسلم

'انکیانو' تو پھر بھی معمولی 'شیراز' کا حاکم تھا - سعدی نے جب 'علاءالدین جوینی' اور صاحب دیوان شمس الدین جیسے شخصوں کی تعریفیں کی ہیں تو بھی ان میں کہیں مبالغہ نہیں ملتا - شیخ سعدی کے اپنے بیان کے مطابق صاحب دیوان 'شمس الدین' نے ہزاروں احسانات ان پر اور ان کے بھائی پر کئے- اور بزرگوں کی طرح ان کی عزت کرتے تھے - شیخ سعدی نے بھی اپنے قصائد میں ان احسانات کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے انھوں نے تقریباً کسی جگھہ

بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا —

شمس‌الدین کی تعریف میں فرماتے ہیں :

دوست‌دارم کہ ہمہ عمر نصیحت‌گویم یا ملامت کنم ونشنود الا مسعود
ہمہ‌گویندوسخن گفتن سعدی دگرست ہمہ دانند سزا میر نہ ہمچوں داؤد
من چگویم‌کہ گر اوصاف حمیدت‌شمرند خلق آفاق بماند طرفے نا معدود
ہمہ آں باد‌کہ در بند رضائے تو روند اہل اسلام و تو در بند رضاے معبود

اسی‌طرح ' علاءالدین جوینی ' کی تعریف میں فرماتے ہیں :

جفا مکن کہ نماند جہاں‌وہرچہ دروست وفا و صحبت یاران مہرباں ماند
امیر مشرق و مغرب علاء دولت و دیں کہ بارگاہ رفیعش بہ آسماں ماند
خدائے خواست کہ اسلام در حمایت او زتیر حادثہ در بارۂ اماں ماند
وگر نہ فتنہ چناں‌کردہ بود دنداں تیز کزیں دیار نہ مرغ و نہ آشیاں ماند
من‌ایں‌غلط‌بہ‌پسندم‌ز رائے روشن خویش کہ دست‌طبع‌توگویم بہ‌بحر و کاں‌ماند

آخری شعر میں ' شیخ ' نے انوری کے شعر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس نے ' سنجر ' کی تعریف میں لکھا ہے —

گر دل و دست بحر و کاں باشد دل و دست خدایگاں باشد
شاہ سنجر کہ کہتریں خدمش در جہاں بادشہ نشاں باشد

ان کے مطالعہ کے بعد اب ذرا ' حافظ ' کے طرز کلام کا بھی ملاحظ کریں - اور اگر آپ انصاف سے کام لیں تو معلوم ہوجائیگا کہ ' سعدی ' اور ' حافظ ' کی قصیدہ خوانی میں دن رات کا فرق ہے - ' سعدی ' کے قصائد میں اگر خوشامد ہے‌تو بالکل خال خال لیکن ' حافظ ' کا لہجہ ایسا نہیں‌ہے جیسا کہ دوسرے عام ایرانی شعراء کا - میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں-ناظرین خود اندازہ کرلیں —

ایک قصیدے میں جو انھوں نے ' قوام الدین محمد ابن علی ' کی تعریف میں لکھا ہے ' فرماتے ہیں :

قوام دولت و دنیا محمد ابن علی — کہ می درخشدش از چہرہ نوریزدانی
اگر نہ گنج عطاے تو دستگیر شود — ہمہ بسیط زمین رو نہد بہ ویرانی
توئی کہ صورت جسم تراہیولیٰ نیست — چو جوہر ملکی در لباس انسانی
سوانح کرمت را چگونہ شرح دہم — تبارک اللہ ازاں کار ساز روحانی

آخر میں کہتے ہیں :

شنیدہ ام کہ زمن یاد می کنی گہ گہ — ولے بہ مجلس خاص خودم نمی خوانی
ہزار سال بقا بخشدت مدائح من — چنیں متاع نفیسے بچوں تو ارزانی
بہ باغ ملک بہ شاخ امل بہ عمر دراز — شگفتہ باد گل دولتت بہ آسانی

سب تعریفوں کو چھوڑ دو - ان آخری اشعار کو ہی لے لو - میرے خیال میں شیخ سعدی نے کبھی کسی کی اتنی خوشامد نہیں کی کہ وہ اسے کہیں کہ تو ہزار سال تک جئے - چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے بھی ہیں —

ہزار سال نگویم کہ عمر تو بادا — کہ آں بروں ز عقل ست ....

اس کے علاوہ انھوں نے ' شاہ شجاع ' جیسے عیاش کی تعریف کی اور قصیدے کے بعد میں لکھتے ہیں :

دادہ فلک عنان ارادت بہ دست تو — یعنی کہ من کیم بمراد خودم رسان
خصمت کجا ست در تہ پاے خودت نگر — یار تو کیست برسرو چشم منش نشان

یوں تو کئی مثالیں میں دیوان سے نکال کر دے سکتا ہوں لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں —

قولہ :-

" الغرض سواے غزل کے جو طبیعت کے اصلی اپج سے ہوتی

قصیدہ وغیرہ جن میں مصنوعی خیالات ہوتے ہیں انھوں نے کبھی نہیں کہا ... ان کی ساری توجہ غزل گوئی ہی کی طرف تھی " صفحہ ۱۶

یہ تو میں نے ابھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے قصیدے لکھے اور ان قصیدوں میں انھوں نے دوسرے فارسی شعراء کا سا رویہ بھی تھوڑا یا بہت ضرور قائم رکھا - اب مولانا ' اسلم ' فرماتے ہیں کہ انھوں نے اور کچھ نہیں لکھا - یہ ان کی غلط فہمی ہے - انھوں نے مثنوی بھی لکھی اور وہ بھی ایسی پر زور کہ نظامی کا دھوکا ہوتا ہے - ملاحظہ ہو ساقی نامہ

سر فتنہ دارد دگر روز گار — من و مستی و فتنۂ چشم یار
فریب جہاں قصۂ روشن ست — بہ بیں تا چہ زاید شب آبستن ست
بیا ساقی آں جام صافی صفت — کہ بر جاں کشاید در معرفت
بدہ تا صفا در دروں آردم — دلے از کدورت بروں آردم
بیا ساقی از باد ہائے کہن — بجامے پیاپے مرا مست کن
چو مستم کنی از مئے بے غشت — بہ مستی بگویم سرود خوشت
بمن دہ کہ طنبور خوش گفت ونے — کہ یک جرعہ مے بہ ز دیہیم کے
بیا ساقی آں آتش تابناک — کہ زر دشت می جوید ش زیر خاک
بمن دہ کہ در پیش رندان مست — چہ آتش پرست و چہ دنیا پرست
بیا ساقی آں جام جم دہ مرا — ملال مکن دم بدم دہ مرا
کہ خوش گفت با تاج و کنج — کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج
دم از سر ایں دیر دیرینہ زن — صلائے بہ شاہان پیشینہ زن
ہماں مرحلہ ست ایں بیاباں دور — کہ گم شد درو لشکر سلم و تور
ہماں منزلست ایں جہان خراب — کہ دیدست ایوان افراسیاب

مغنی نوائے بہ گلہانگ رود بیاد آور آں خسروانی سرود
روان بزرگان خود شاد کن ز پرویز و از بار بد یاد کن
مغنی ز اشعار من یک غزل بہ آہنگ چنگ آوراندر عمل
کہ تا وجد را کار سازی کنیم بہ رقص آیم و خرقہ بازی کنیم
کہ ' حافظ ' چو مستانہ سازد سرود ز چرخش دہد رود زہرہ درود

اُردو کے اَن پڑھ شاعر *

از

[جناب مرزا فدا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

———:o:———

پیک

اس شاعر کا اصلی نام دریافت نہ ہوسکا لیکن تخلص کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ تھا - ابتدا میں حضرت ابو محمد سراج الدین بہادر شاہ متخلص بہ ظفر آخری تاجدار دہلی کے دربار فیض آثار میں چوبداری کی خدمت پر مامور تھا جو بجاے خود بڑے پاے کے شاعر تھے اور فن شعر میں غائر نظر رکھتے تھے —

وہ زمانہ شاعری کے کمال عروج کا تھا - قدر دانان سخن نے اہل کمال پر جود و کرم کے دروازے کھول دئے تھے - دہلی کے علاوہ نظام دکن،نوابان اودھ، رامپور فرخ آباد کی سرکاریں کملا و فضلا کے لئے آغوش کشا تھیں - ہر چند دہلی کا نیر اقبال پستی کی طرف جھک چکا تھا اور حکومت کا رقبہ قلعۂ معلی کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا تھا ' لیکن شاہ ظفر کے دربار میں شعرائے نامور کی کمی نہ تھی - سیکڑوں شاعروں کے علاوہ ذوق سا رفیع الخیال اور غالب سا فلسفی اور با

---

* دیکھو سلسلے کے لئے رسالہ اردو جلد ۹ حصہ ۳۵ بابت جولائی سنہ ۱۹۲۹ع —

کمال شاعر اپنے کلام بلاغت نظام سے مشاعروں کو محشر ستان معنی بنائے تھا - حکیم مومن خاں مومن الگ انعکاس لفظی کی بساط بچھائے داد شیریں مقالی دے رہے تھے - شہزادوں اور رئیسوں کے ذوق و شوق کا عجب عالم تھا - کوئی تذکرہ نویس ایسا نہ ملے گا جس نے تذکرہ لکھنے پر قلم اٹھایا ہو اور ان رنگین محفلوں کی نظر فریب تصویریں کھینچنے سے اغماض کیا ہو —

وہی پر ذوق زمانہ پیک کو نصیب ہوا - قلعۂ معلی میں منعقد ہونے والے مشاعروں کی دلچسپیاں دیکھیں اور بہاریں لوٹیں، شعرائے نغز گفتار کی دل پذیر سخن سرائیوں سے بہرہ اندوز ہوا - رفتہ رفتہ طبیعت پر شاعری کا رنگ چڑھنا شروع ہوا - علم وفضل کی جانب سے تو خیر صلا تھی، لیکن شاہی وسل نے آئین تہذیب سکھاکر مہذب و شائستہ کردیا تھا - ادب و آداب کے اصول و قواعد یاد تھے - اچھے اشعار سنتے سنتے طبعی جوہر اُبھر آئے - خدا کے گھر سے طبع موزوں لایا تھا - اول اول تو اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے خائف رہا، طبیعت بحر نظم کی روانی دکھاتی مگر وہ جبراً اس سمت سے توجہ ہٹاتا - آخر آخر سیلاب ذوق کا روکنا دشوار ہوگیا جس طرح کسی کے روکے سیل نہیں رکتی وہ بھی وجدان و تاثرات قلبیہ پر قابو نہ رکھ سکا اور شد بد نظم کرنے لگا —

یہ قاعدہ ہے کہ قابل پر وقتاً فوقتاً جو جذبات و کیفیات طاری ہوتے ہیں ان کا کیف و اثر کلام موزوں کی صورت میں نمودار ہونے لگتا ہے - چونکہ پیک بھی اکثر دہلی کے بے نصیبوں کی طرح شاہی کا ورق الٹنے ہی حوادثات و مصائب میں مبتلا ہوگیا اور نہ معلوم کتنی مدت تک زمانہ کے شدائد برداشت کرتا رہا آخر کار ضروریات زندگی سے ناچار ہوکر قصہ گوئی و نامہ بری کا پیشہ اختیار کیا اور اسی ذریعہ سے معاش حاصل کرنے لگا یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام سے اس ادنیٰ زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے —

'پیک' کے نام کی طرح اُس کی شاعری کے حالات بھی عام معلومات سے بے نیاز ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اُس نے کس اُستاد فن کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور اپنے بعد کلام کا کس قدر ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا؟ تذکروں کی چھان بین کرنے سے صرف تین شعر دستیاب ہوئے جس سے اس طبیعت دار امی محض شاعر کی مشاقی کا اندازہ کرنا مشکل ہے مگر مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر حاصل شدہ کلام درج کیا جاتا ہے —

اب تو غم کھاتا ہوں میں اے ہم نشیں دیکھنا! پھر غم مجھے کھا جائے گا
'پیک' اُس کوُ میں نہ لے جا آرزو دن دیہاڑے قافلہ لٹ جائے گا

شوق سے جب کہ میں آتا ہوں ترے کوچہ میں مجھ سے لیتی ہے صبا تیزیٔ رفتار کو دام

تاب

میر حیدر نام 'تاب' تخلص میر محبوب علی پانی پتی کے خلف الرشید اور علم سے بے بہرہ تھے۔ ابتدائے عمر سے موسیقی کا شوق تھا۔ مبداء فیاض نے انھیں دلکش اور خوش گلوئی عطا کی تھی۔ جب گانے بیٹھتے تو کیف آور سماں باندھ دیتے۔ بچپن کا عہد گذر کے شباب کا عالم شروع ہوا تو حسن اتفاق نے موسیقی کے ایک ماہر کامل 'دھرم داس' نامی سادھو سے دو چار کردیا۔ دھرم داس اپنے وقت میں فن موسیقی کا بے مثل ماہر تھا اور میر حیدر 'تاب' پر خاص طریقے سے مہربان ہوگیا تھا۔ نہ معلوم 'تاب' کی آواز کا سریلا پن یا خوش نوائی و طبیعت داری پسند آئی' بہر حال اُس نے فن تعلیم کرنے میں مطلق بخل نہ کیا اور موسیقی کے تمام

عیب و صواب ذہن نشین کرادئے - ایک تو آواز میں قدرتی درد ' سریلا پن اور دل کشی موجود تھی اُس پر فن کی تکمیل نے اور چار چاند لگا دئے - نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں ' تاب ' کی موسیقی دانی شہرت پذیر ہوگئی —

' تاب ' کا مولد تو پانی پت تھا لیکن قیام دہلی میں رہتا - ابتدا میں جو فن شوقیہ حاصل کیا جاتا ہے آخر میں وہ ذریعہ معاش بن جاتا ہے - ' تاب ' نے بھی قوالی پیشہ اختیار کیا - امیروں کی سرور افزا محفلیں اُن کے اظہار کمال کا اکھاڑا بن گئیں —

دہلی کے مستقل قیام نے شاعری کی طرف بھی متوجہ کردیا - گاہ گاہ فکر سخن ہونے لگی - شاگردی کا حال معلوم نہ ہوسکا - شاید دہلی کے کسی اُستاد سے اصلاح لیتے ہوں گے - سنہ ۱۸۵۶ ع کے غدر سے کچھ بارہ برس قبل تک دہلی میں زندہ سلامت موجود تھے - تذکرہ نویسوں نے ان کے صرف دو شعر نقل کئے ہیں جو ضیافت طبع کے واسطے لکھے جاتے ہیں —

میں تو عاقل تھا زمانے کا ' پہ اُلفت کے طفیل
کوئی سودائی کہے ہے ' کوئی دیوانہ مجھے

کثرت دل ہر شکن میں دیکھ ' غیرت سے ہوا
آفت جان ہو گیا ' زلفوں کا سلجھانا مجھے

تحیر

غلام مصطفیٰ نام تحیر تخلص - مولانا شاہ رفیع الدین کے فرزند جگرہند اور دہلی کے باشندے ' ذہین و ذکی آدمی تھے - ان کے خاندان دودمان کی بزرگی اور

شہرت محتاج بیان نہیں - سارا خاندان بہ اعتبار علم و فضل کمال فاموری رکھتا ہے - خود جناب 'تصیر' مولانا شاہ عبد العزیز محدث صاحب تحفۂ اثناء عشریہ کے برادر زادے ہیں - افسوس کہ آپ خاندانی میراث یعنے دولت علم و فضل سے محروم رہ گئے لیکن شاعری میں طبیعت خوب لڑی - فکر رسا کی استمداد و استعانت سے زمین سخن میں پر بہار و نکہت بیز باغ لگا ے - حکیم ثناء اللہ خاں 'فراق' کی شاگردی نے کلام میں گرمی پیدا کردی —

جناب 'تصیر' اوصاف حمیدہ و اخلاص پسندیدہ رکھتے تھے - سب سے جھک کر ملنا اور اعزاز و اکرام سے پیش آنا گویا طبیعت ثانیہ بن گئی تھی —

ان کا کلام بالکل صاف اور مغلق الفاظ سے کلیتاً پاک ہے - اکثر مضامین نے کہیں بار نہیں پایا - حسن و عشق کی باتیں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں :

عید کے دن مجھے کہنے یہ ہراک یار لگا ہو مبارک، تری چھاتی سے وہ جلدار لگا

جدا مجھ سے جب وہ دل آرام ہوگا اجل کا اُسی وقت پیغام ہوگا

فکر اطفال کو ہے سنگ اُٹھانے کی آمد آمد ہوئی شاید ترے دیوانے کی

تصدق

ان کا نام شیخ تصدق حسین اور 'تصدق' تخلص تھا - لکھنؤ میں پیدا ہوے اور یہیں بچپن کا عہد بسر کرکے جوانی کے ولولہ خیز و پرفضا میدان میں داخل ہوے - یہیں شباب کوشیب سے تبدیل کیا اور بالآخر یہیں کو زمین کا پیوند ہوگئے -

ان کی پیدائش غالباً شاہی زمانے کی تھی کیونکہ عمر طبیعی کو پہنچ کر وفات پائی اور سنہ ۱۹۰۵ ع کے قبل زندہ سلامت لکھنؤ میں موجود اور مطبع منشی نول کشور میں کام کرتے تھے - علم سے بالکل بہرہ نہ تھا لیکن - قلب و دماغ غضب کا پایا تھا - جس زمانے میں ان کی نشوونما ہوئی - وہ قدیم روسا و امرا کا عہد تھا - اگلے تمدن اور پرانے اخلاق و عادات کا دور ' دورا تھا - امیروں کے کاشانۂ عیش و نشاط میں اور اسباب امارت کے علاوہ ایک داستان گو کا ہونا بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا جو اچھے دار باتوں کا مزیدار طلسم بناکر اُن کے قلوب کو محظوظ و مسرور کرسکے - سیکڑوں غریب خاندانوں کی ' اِسی بہانے سے روٹیاں چلتی تھیں - اکثر فصیح البیاں اشخاص جنھیں کوئی اور پیشہ نہ جڑتا وہ فن داستان گوئی اختیار کرکے - نام و نمود حاصل کرتے - شیخ صاحب کو بھی من جانب اللہ خوش بیانی اور شیریں مقالی عطا ہوئی تھی - علم کی طرف سے تو جواب صاف تھا - رہا ہنر تو وہ بھی بجز داستان گوئی کے حاصل نہ ہوا - چونکہ شرفائے وقت اِس پیشہ میں عیب نہ سمجھتے تھے لہذا شیخ صاحب نے بھی مناسبت فطری سے یہی پیشہ ذریعہ معاش بنایا اور اپنی اور اپنے اہل وعیال کی بسر اوقات کرنے لگے مگر جب زمانے نے کروٹ لی ' اہل لکھنو پر تباہی و بربادی آئی ' شاہی کا ورق اُلٹا اور انگریزی حکومت کا باب شروع ہوا تو رفتہ رفتہ رئیسوں کے مزاج میں بھی انقلابی کیفیت رونما ہوئی - طلسمی کتابوں اور داستانوں کے بدلے نئے نئے ناول اور قصے پڑھے ' اور سنے جانے لگے اور اُن غریبوں پر تازہ مصیبت نازل ہوئی جو داستانیں بیان کرکے اپنا پیٹ پالتے اور اہل وعیال کا آذوقہ بہم پہنچاتے تھے —

شاہی میں تو ایسے لوگوں کی کمی نہ ہوگی لیکن کساد بازاری کی گرماگرمی ہوتے ہی سب کے سب متفرق اور منتشر ہونا شروع ہوئے - جس کا جدھر منہ اُٹھا عالم بے سروسامانی میں بیباک کھڑا ہوا - بعضوں کو دیسی ریاستوں میں پناہ

ملی بہتوں نے داستان گوئی ترک کر کے اور اور پیشے اختیار کر لئے اور لکھنؤ بھر میں صرف تین شخص رہ گئے جو وضع داری کو نبھا رہے جاتے تھے - منجملہ اُن کے ایک ہمارے شیخ صاحب ہیں - زمانے کی سفا کیوں نے انہیں بھی نہ چھوڑا اور فکر معیشت نے تنگ کرنا شروع کیا - لیکن لکھنؤ کی جدائی گوارہ نہ ہوئی - بار بار پردیس کا عزم کر کے ارادہ فسخ کردیتے - اُنہیں دنوں میں نواب بہاول پور کو داستان سننے کا شوق پیدا ہوا - اہل صحبت کی زبان سے شیخ صاحب کی تعریفیں سن سن کے غائبانہ طور پر بے حد مشتاق ہوئے - کسی سلسلے میں لکھنؤ تشریف لانے کا اتفاق ہوا - شیخ صاحب کو داستان سننے کے لئے یہ موقع نہایت مناسب تھا - لکھنؤ آ کر ایسے فصیح اللسان و سحر بیان داستان گو کو نہ سننا مُنتہائے محرومی تھی - اشتیاق تو پہلے ہی سے تھا - لکھنؤ پہنچتے ہی خدام کو حکم ہوا کہ کسی نامی داستان گو کو حاضر کیا جاے - یہاں شیخ صاحب کے سوا اور کون تھا ؟ لوگوں نے ان سے کہنا شروع کیا - اول اول تو استغنا کے سبب سہل انگاری رہی - پھر کچھ لوگوں نے اصرار کر کے نواب کی حضوری میں حاضر کیا انھوں نے مناسب عزت و توقیر کی اور داستان سننے کا شوق ظاہر فرمایا - شیخ صاحب نے امیر حمزہ کی داستان کا ایک ٹکڑا فصیح و دل نشیں الفاظ سے عرض کیا سلاست بیان اور طبیعت داری پورا رنگ دے گئی - پہلے تو نواب صرف مشتاق ہی تھے اور اب داستان سن لینے کے بعد شیخ صاحب کو چھوڑنا دشوار ہو گیا - ملازمت کی سلسلہ جنبانی شروع ہوئی - شیخ صاحب کو وطن کا فراق اور احباب کی جدائی گوارا نہ تھی اور نواب کا اصرار کہ بہاول پور چلو غرض

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلی و فرقت لیلیٰ

ایک والئی ملک کا کہنا بھی ٹالا نہیں جا سکتا - چار و نا چار ملازمت اختیار کی

کلیجے پر پتھر رکھ کر وطن و اہل وطن سے مفارقت گوارا کی اور نواب کی ہمرکابی میں بہاول پور تشریف لے گئے - جس طرح بن پڑا چندے قیام کیا لیکن وہاں اکھنؤ کی سی چہل پہل اور مزیداریاں کہاں - زبان مختلف ' معاشرت جداگانہ' طبیعتوں میں اختلاف یہاں تو سو شام گھر سے نکل کر اکبری ' روزانے میں آ بیٹھنا اور شام اودہ کے نظر فریب مناظر سے لطف اندوز ہونا ' افیون خانے کی خوش گپیاں احباب کی نمکین گفتگوئیں ' وہاں ان میں سے کچھ بھی نہ تھا - چھ سات مہینے تو جوں توں بسر کئے اُس کے بعد بیماری کا عذر پیش کر کے رخصت حاصل کی اور وطن واپس آ گئے - جب تک رخصت کے دن باقی رہے ریاست کی طرف سے خاموشی رہی - رخصت کی معیاد ختم ہوتے ہی بہاول پور آنے کا تقاضہ شروع ہوا - شیخ صاحب کا یہ حال کہ قطب کی طرح جم کر رہ گئے - شہر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے - مختصر یہ کہ نواب صاحب نے کوئی ممکن کوشش اُٹھا نہ رکھی مگر شیخ صاحب نے اکھنؤ نہ چھوڑا اور کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بیٹھ رہے - ہر چند بہاول پور تو نہ گئے لیکن فکر معیشت نے پھر عود کیا ایسے نازک وقت میں ان کے واسطے مطبع منشی نول کشور خدا کی رحمت سے کم نہ تھا جس نے کرم کا دامن پھیلا کر ایسے باکمال شخص کو اپنی حمایت میں لے لیا اور داستانوں کے دفتر کے دفتر لکھوا کر ملک میں شایع کر دئے جس سے دو فائدے ہوے ایک یہ کہ اُن کی بے روزگاری کی شکایت رفع ہو گئی اور دوسرا نفع یہ ہوا کہ مستقل یادگاریں قائم ہو گئیں جو متعدد بار کتابی صورت میں طبع ہو ہو کر اہل ملک کے سامنے پیش ہو چکی ہیں اور پیش ہوتی رہتی ہیں —

شیخ صاحب کے دیکھنے والوں (مطبع منشی نول کشور کے قدیم ملازمین) کا بیان ہے کہ مرحوم کو دستخط کرنا بھی نہ آتا تھا - جب کسی داستان کے اجزا داخل کر کے معاوضہ حاصل کرنا چاہتے تو حسب قاعدہ رجسٹر پر ٹکٹ لگا کر دستخط کرنے کی ضرورت پیش آتی اُس وقت شیخ صاحب دستخط کے بدلے انگوٹھے کا نشان

بنا دیتے اور کوئی دوسرا شخص تصدیق کر دیتا —

شیخ صاحب بلند بالا، لا غراندام، سیاہ فام و چیچک رو آدمی تھے سر پر پٹے وضع و لباس میں قدامت کے پابند، البتہ چوکوشیہ ٹوپی کے عوض دو پلی پہنتے تھے - افیون کے نہایت شائق تھے - جب داستان تصنیف کرنے بیٹھتے تو افیون کی ڈبیا، ایک چھوٹی سی کٹوری، لوٹے میں پانی اور بھرا ہوا مدار یہ حقہ سامنے موجود ہوتا جسکی گہلتی جاتی اور عالم سرور میں داستان کا غیر متناہی سلسلہ جاری رہتا - طبعیت دریا کی طغیانیوں کی طرح ابلتی رہتی - ایک یا دو کاتب، کتابت کی خدمت انجام دینے میں مصروف رہتے - داستان بیان کرنے کا اسلوب بھی نہایت دل کش، موثر اور خاطر نشین ہوتا مطبع کے بعض دفتری اور کلرک اشتیاق میں گرد جمع ہو جاتے اور داستان سننے میں اتنا محو ہوتے کہ کبھی کبھی فرائض منصبی سے بھی بے پروا ہو جاتے - گاہ گاہ اثنائے داستان کوئی میں پھنک آ جاتی اور داستان کا سلسلہ قطع ہو جاتا - سامعین اپنے اشتیاق کو دیر تک دبا نہ سکتے اور 'ہاں' کہہ کر شیخ صاحب کو چونکا دیتے - حافظہ اتنا قوی کہ کبھی سہو واقع نہ ہوتا - جہاں سے داستان چھوٹی تھی وہیں سے پھر شروع ہو جاتی - بیان کی دل چسپی اور تاثیر کا یہ عالم کہ سامعین کو مسرور و مغموم کرنا بالکل اختیاری بات تھی - جب چاہتے دو چٹکلوں میں ہنسا دیتے اور جب مزاج میں آتا چند جملوں میں غمگین ملول بنا دیتے - حکیم حافظ خواجہ محمدشمس الدین احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کی عمر بارہ پندرہ برس کی تھی - علمائے فرنگی محل سے عربی کا درس لیتے تھے ان دنوں شیخ صاحب حافظ خواجہ محمد قطب الدین مالک مطبع نامی کے یہاں آمد و رکھتے اور حکیم صاحب کو بھی ان کی خوش گفتاریوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا کرتا تھا - ایک مرتبہ لاہور سے کوئی رئیس تشریف لائے اور حافظ صاحب کے مہمان ہوئے - حافظ صاحب نہایت باوضع،

خلیق و متواضع واقع ہوے ہیں انھوں نے لوازمات مہمانداری میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی - مہمان کی آسائش و آرام کا کل سامان فراہم کردیا - لکھنو کی مشہور و تاریخی عمارتیں دکھائیں تفرج گاہوں کی سیر کرائی اور پررونق بازاروں میں پھرایا - رئیس لاہور کو جہاں لکھنو کے عجائب و غرائب دیکھنے کا شوق تھا وہاں اہل کمال کی داستان گوئی کے بھی بے حد شائق تھے - کئی مرتبہ حافظ صاحب کو باتوں باتوں میں سنا چکے تھے - چنانچہ ایک روز حافظ صاحب انھیں ساتھ لے کر منشی نول کشور کے مطبع میں گئے - ان دنوں شیخ صاحب داستان تصنیف کرنے کی خدمت پر مطبع میں مامور تھے - جب شیخ صاحب کو اطلاع ہوئی تو رئیس لاہور سے نہایت اخلاق سے ملے - رسم تعارف ادا ہونے کے بعد ادھر سے داستان کہنے کی فرمائش ہوئی - شیخ صاحب نے ازراہ انکسار پریشانئی طبع کا عذر کیا لیکن پذیرا نہ ہوا - جب اصرار بڑھا تو امتثال امر کے طور پر معمولی طریقہ سے ایک ترجیحی داستان شروع کی قصہ یہ تھا کہ " امیر حمزہ بغرض شکار جانب صحرا تشریف لے گئے ہیں - پڑاؤں میں ان کی نہایت محبوب ملکہ ' مہر انگیز " دختر نوشیرواں موجود ہیں " جن کے حاصل کرنے میں امیر کو ہفت خواں فتح کرنا پڑا تھا - بڑے بڑے پہلوانوں سے معرکے گرم ہوے اور منتہاے کوشش کے بعد ملکہ ہاتھ آئیں بخت عرصہ سے فکر میں تھا کہ کوئی موقع ملے تو ملکہ کو ہلاک کر کے امیر کو روحانی رنج و قلق میں مبتلا کرے - چنانچہ موقع پاتے ہی قنات چاک کر کے ملکہ کے خیمے میں داخل ہوا اور ملکہ کو فراق امیر میں خود رفتہ و حواس باختہ پاکر آتش کینہ بھڑک اٹھی فوراً خنجر آبدار کھینچا اور پوری قوت سے ملکہ کے کلیجے میں بھوک دیا - زخم کاری لگنے سے ملکہ خون میں لت پت ہوکر زمین پر تڑپنے لگیں اور بخت خیمے سے نکل کر فرار ہوا لشکر میں اس واقعہ خونی کی اطلاع ہوئی ہر سپاہی غضبناک اور سراسیمہ ہوگیا

قاتل کی تلاش جاری ہوی - ایک ہرکارے نے جھپٹ کر امیر کو مطلع کیا - امیر نہایت پریشانی کی حالت میں لشکر گاہ کی طرف واپس ہوے - راستے میں بختک مل گیا اسے ملکہ کے قصاص میں قتل کیا اور لشکر میں داخل ہوے - خیمے میں جاکر ملکہ کی جو حالت دیکھی اُس سے کلیجہ شق ہوگیا - اُس وقت تک ملکہ میں کچھہ کچھہ جان باقی تھی - بالیں پر امیر کو پاکر آنکھیں کھول دیں"—

اس پر غم کے منظر کو کچھہ ایسے الم پاش اسلوب سے بیان کیا کہ بے اختیار سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے - یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں کے سامنے مذکورہ واقعات گذر رہے ہیں - داستان تو ختم ہوگئی مگر دلوں پر جو دیرپا اثر ہوا تھا عرصہ تک محو نہ ہوسکا —

شیخ صاحب جس واقعہ کو بیان کرتے تھے ہو بہو اُس کی تصویر بن جاتے تھے - اگر غم کی داستان کہہ رہے ہیں تو صورت محزوں ' آنکھیں نمناک ' آواز گلو گیر و دردناک ہوجاتی - لب لہجہ سے سننے والوں کو متاثر کردیتے - اُن کی یہ صفت اُن کے ہم عصروں میں اس حد تک نہ تھی ' اِسی وجہ سے اُنھیں اور داستان گویوں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا - ان کی تصنیف سے دفتر کے دفتر شایع ہوچکے ہیں - جو ہر جگہ دستیاب ہوسکتے ہیں منجملہ اُن دفتروں کے چند یہ ہیں —

(۱) نو شیروان نامہ کامل -

(۲) دفتر آفتاب شجاعت کامل -

(۳) طلسم زعفران زار کامل —

اسی طرح نہ معلوم کتنے دفتر ہیں جو اِس عالی دماغ اور ذہین و طباع شخص کی طبیعت داری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں - یہ سوال کہ جس میدان میں اچھے پڑھے لکھے حضرات قلم اُٹھاتے خائف ہوتے ہیں وہاں ایک عام سے بے بہرہ شخص کیسے بے تکلفی سے سمندِ خیال کی تکاپو میں مصروف ہے ' سخت حیرت و استعجاب

میں مبتلا کر دیتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کے دماغ میں یہ خیالات کہاں سے سما گئے تھے؟

شیخ صاحب کی تصنیف کی ہوئی داستانوں کی تصحیح کا کام مولوی محمد اسمٰعیل صاحب 'اثر' کے متعلق تھا۔ اِس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کے کلام منظومہ کی اصلاح بھی مولوی صاحب موصوف کے ذمہ ہوگی۔ بہر نوع شیخ صاحب کا کاہ کاہ فکر سخن بھی فرماتے تھے۔ کلام صاف صاف ہوتا اور اس پر لکھنؤ کا رنگ غالب نظر آتا۔ گل و بلبل رخ و کاکل کے فرسودہ مضامین اور معاملہ بندی زیادہ پائی جاتی ہے، جو عہد گذشتہ کی شاعری کا جز و اعظم سمجھی جاتی ہے۔ شیخ صاحب سنہ ۱۹۰۲ ع سے پہلے حیات تھے اور پریس میں کام کرتے تھے۔ غالباً اُن کی آخری تصنیف دفتر آفتاب شجاعت ہے جس کا پہلا ضخیم حصہ سنہ ۱۹۰۲ ع میں چھپ کر شایع ہوا اور دوسرا اور تیسرا حصہ سنہ ۴ - ۱۹۰۳ ع میں طبع ہوکر پبلک کی ضیافت طبع کا باعث ہوا۔ کلام کا نمونہ جو اُن کی تصنیفات سے حاصل ہوا یہ ہے:

ہردم یہ شور قمری و سرو و چمن کے ہیں — جنگل میں آج پھول کسی بے وطن کے ہیں
کچھ بات ایسی کیجئے اے بادشاہ حسن — مشتاق اہل بزم نہایت سخن کے ہیں
پوچھے اگر تو کہہ دیں خدا کے بھی سامنے — سازے ہوے ہم اک بت پیماں‌شکن کے ہیں
بلبل کی یہ دعا ہے کہ یارب تو خیر کر — بگڑے ہوے کچھ آج یہ نقشے چمن کے ہیں
جیسے ہیں گل عذار حسینان لکھنؤ — معشوق ہیں خطا کے نہ ایسے ختن کے ہیں
بلبل کی طرح ہوش میں آتی نہیں بہار — مبہوت ایسے عشق میں اُس گلبدن کے ہیں
فصل خزاں کبھی ہے جہاں میں کبھی بہار — نیرنگ سب یہ گردش چرخ کہن کے ہیں
زخموں کے مسکرانے سے ثابت ہوئی یہ بات — کشتہ کئے ہوے کسی گل پیرہن کے ہیں
فرط قلق سے راتوں کو اُوجاڑے جس سے نیند — افسانے وہ کچھ ایسے غریب‌الوطن کے ہیں

صیاد ! ہم سے کہنہ اسیروں کو چھوڑ دے - دشنام اک زمانے سے سیر چمن کے ہیں
مرنے کے بعد دولت و حشمت سے کام کیا - محتاج بادشاہ و گدا اک کفن کے ہیں

اصلاحہ ہو گا ہم کو تصدق فشار قبر
کس واسطے کہ ہم تو معجب پنجتن کے ہیں

"ساقی نامہ"

پلا ساقیا بادۂ خوش گوار — کہ آئی ہے فی الحال فصل بہار
شگفتہ ہیں گل باغ میں بے شمار — چمن میں مسرت کناں ہے ہزار
مرے دل کو ہر غنچہ مرغوب ہے — گھٹا چھائی گلشن میں بھی خوب ہے
جو پڑتی ہیں کچھہ ابر سے بوندیاں — ہر اک گل ہے گلشن میں خندہ کناں
ہوا سرد جاں بخش ایسی ہے بس — کہ بے شک ہے مثل مسیحا نفس
گلوں کی ہے گلشن میں طرفہ بہار — بعینہ ہیں ہم صورت چشم یار
شگفتہ ہیں اس طرح مابین باغ — ذرا بھی نہیں دل میں لالے کے داغ
ہے مرغوب دل قامت سرو باغ — ہے مثل قد یار عالی دماغ
عیاں ہے درختوں میں بس یوں انار — کہ ہیں خوش نما مثل ..... یار
گلستاں میں سبزے کا ہے ایسا رنگ — کہ ہے مخمل سبز بھی جس سے دنگ
گلوں سے چمن کے یہ بس ہے عیاں — کہ ہے قدرت باغبان جہاں
جو اس فصل میں دل ہے شاداں کہاں — مجھے روز و شب بس یہی ہے خیال
لکھوں داستا نہائے صاحب قراں — کہ شائق نہایت ہیں پیر و جواں
دکھاؤں وہ اپنی طبیعت کا رنگ — کہ خود میرے دشمن بھی ہو جائیں دنگ
جو ہیں دوست میرے وہ ہوں شادماں — جو منصف طبیعت ہیں، ہوں مدح خواں

تصدق نہ دے طول اب زینہار
کہ نا خوش ہوں احباب عالی تبار

تصویر

شیخ حسن جان نام تصویر تخلص، لکھنؤ کے رہنے والے تھے - ان کے والد شیخ مدد علی روسا کی سرکاروں میں داروغگی کی خدمات انجام دیتے اور سفید پوش شریفوں کی طرح عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے - محلہ نادان محل میں ذاتی مکان تھا - وہیں شیخ حسن جان کی ولادت ہوئی - یہ کم سن ہی تھے کہ خاندان پر افلاس و ادبار کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں - خوش حالی و فراغت کا دور رخصت ہوا - عسرت و فلاکت کی نوبت پہنچی جس سے تصویر اکھہ پڑھ نہ سکے - محض اُمی رہ گئے - کشف دوزی کا کام سیکھہ لیا تھا وہی ذریعہ معاش قرار پایا - شاعری کی جانب میلان طبیعت تھا - شعر کہتے اور اچھا کہتے اس فن میں حضرت خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت مدظلہ لکھنؤی کے شاگرد تھے جو ادبی دنیا میں شہرت و نام وری رکھتے ہیں اور ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کے تلامذہ کی کافی تعداد موجود ہے - حضرت عشرت کی اصلاح نے ان کے کلام کو جملہ نغزشوں سے پاک کر کے دلاویز و دلچسپ بنا دیا - مشاعروں کی شرکت کا زیادہ شوق نہ تھا مگر گاہ گاہ احباب کے اصرار اور تقاضے سے شریک ہوجاتے تھے - آدمی باریش اور ہنس مکھہ واقع ہوے تھے - اگلی وضع کے پیر و، گندمی رنگ، چیچک رو اور داغ ابھرے ہوے - سر پر پٹے رکھتے تھے، لاغر اندام و کشیدہ قامت - چالیس بیالیس سال کی عمر میں مدقوق ہو کر دس بارہ برس ہوے وفات پائی - کلام بہم رسیدہ کا نمونہ حاضر ہے —

ہم تو راضی ہیں وہ بیداد پہ بیداد کریں
کہیں افلاک نہ اس ظلم سے فریاد کریں
رحم اب بلبل ناشاد پہ صیاد کریں
فصل گل میں تو اُسے قید سے آزاد کریں

ایک انداز پہ مجبور نہ سمجھو اُن کو
وہ جو چاہیں تو اداؤں میں بھی ایجاد کریں
مرنے والے کی وفاؤں کا سنائیں قصہ
آئے بیٹھیے، ذکر دل فاشاد کریں
کیا زمانے میں یہی ہوتا ہے کیوں اے تصویر
بھول جائیں وہ ہمیں اور اُنہیں ہم یاد کریں
گلہ فلک کا شکایت نہ کچھ زمانے کی
نصیب ہی کو ہے کاوش مرے مٹانے کی
ہر اک قدم پہ قیامت نثار ہوتی ہے
عجیب شان ہے دامن اُٹھا کے آنے کی
مزہ ہو، روٹھ کے تم بے منائے من جاؤ
میں سوچتا رہوں تدبیر ہی منانے کی
وہ بھیجتے ہیں رقیبوں کے ہاتھ نامۂ شوق
نئی ادا یہ نکالی ہے دل دکھانے کی
تمام عمر نصیبوں کو روئیے 'تصویر'
یہی سزا ہے، حسینوں سے دل لگانے کی

تصویر

غلام احمد عرف میاں بہن نام تصویر تخلص تھا۔ دہلی کے شریف زادے بڑے خلیق، متواضع اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ آشنا و نہ آشنا سے یکساں

برتاؤ کرتے - خندہ رو ' خندہ جبیں ' نیک طبیعت و شگفتہ مزاج ' بھاری بدن منڈی ہوئی ڈاڑھی ' چھوٹی چھوٹی مونچھیں گہرا سانولا رنگ ' جسم میں سوسی کا کرتا اور اسی کا تنگ مہری کا پائجامہ کندھے پر لٹھے کا رومال ' سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی - بے چارے زمانے کی نامساعدت اور فلک سفلہ پرور کے شاکی تھے - معلومات نہ تھی حتیٰ کہ اپنا نام بھی لکھنا نہ آتا تھا - بعض شرفا کی طرح زمانۂ نامیموں نے اِن کو بھی امتحان کی سخت گیر کسوٹی پر چڑھایا - غریب پر افلاس و تنگ دستی کی بلا نازل ہوئی - حمیت ذاتی نے کسی کا دست نگر بننا گوارا نہ کیا - فن نیچہ بندی حاصل کرکے کسب معاش کرنے لگے - جب اپنی ردی حالت کا احساس پیدا ہوتا تو آہ جگر دوز کھینچ کر کہہ اُٹھتے —

کیا حال دل سناؤں یارا نہیں بیاں کا
مارا ہوا ہوں میں بھی اک جور آسماں کا

طبیعت خدا داد کی استعانت اور فکر سلیم کی استمداد سے شاعر بن گئے تھے - فن سخن میں پہلے میاں تنویر کے شاگرد ہوئے مگر جلد تر کسی شاعر کی اصلاح پر جھگڑا ہوگیا اور انہوں نے ذوق دہلوی کو کلام دکھانا شروع کیا اور آخر دم تک اُنہیں کی شاگردی کا دم بھرا کئے - دہلی کی بول چال اور روز مرہ اِن کے کلام میں نمکینی اور چاشنی پیدا کر دیتا ہے - اکثر عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں جو شعرائے دہلی کا خاص رنگ ہے اور تغزل کی جان ہے - اور اُس سے تصویر کے کلام میں دل فریبی و دلکشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے - صرف یہی نہیں کہ محض عاشقانہ چونچلے ہوں - بلکہ غزلیات کا بیشتر حصہ سوز و گداز سے بھرا ہے - تصوف کی بھی کمی نہیں - جب عشق حقیقی کا شوق چرّایا تو فکر رسانے بلند پروازی اختیار کی - پاکیزہ جذبات اور نادر تخیلات نے دامن سخن کو گوہر مضامین سے مالا مال کر رکھا ہے - بندش صاف ہوتی ہے - پھر بھی عامی حالت

بادرست هونے سے شعروں میں تعقید اور الجھنیں پیدا هوگئی هیں جس سے طبعیت بے مزہ سی هوجاتی هے - اور ناگواری کے اثرات ذوق سخن کی راہ میں روڑے اٹکا دیتے هیں - مگر یہ عیوب بہت هی کم پائے جاتے هیں - جہاں اس قبیل کی خامیاں پائی جاتی هیں وہ اُن کی اُمیت پر نگاہ کرتے هوے محاسن معلوم هونے لگتی هیں اور بے اختیار داد دینے کو دل چاهتا هے - کیوں کہ جس تاریک فضا میں رہ کر انھوں نے فن لطیفہ سے دل چسپی حاصل کی وہ ایسا عالم هے جہاں خامیوں کی اُمید زیادہ اور محاسن کی توقع مفقود هونا چاهئے - پھر بھی اُن کے کلام میں جا بجا محاسن شعری کے جواهر ریزے ضوٴفشاں نظر آتے هیں - اس موقع پر ایک شعر یاد آگیا ملاحظہ هو —

فدا نا آشنائی پر تو هیں لاکھوں دل و جان سے
اگر وہ بت کسی کا آشنا هوتا تو کیا هوتا

اس شعر کی خوبیوں کو اس طرح جانچنا مناسب هوگا کہ پہلے 'تصویر' کی استعداد علمی کا تصور کیا جائے ' پھر شعر پڑھ کر غور کیا جائے کہ ایک نا آشنائے علم و فضل نے حسیات قلبی کو کتنی صفائی اور آسانی کے ساتھہ بیان کردیا هے - جسے ظاهر کرتے وقت قائل کو بڑے بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی هے - لیکن ' تصویر ' نے اپنی سیدھی سادی منجھی هوئی زبان میں فوٹو کھینچ دیا هے اور لطف یہ کہ رنگ تغزل کا داس بھی چھوٹنے نہ پایا -

سنا جاتا هے ان کی تصنیفات کا بہت کچھ ذخیرہ تھا - ترتیب دیا جاتا تو ضخیم دیوان بن جاتا مگر عدم توجہی کی بدولت ضایع هوگیا - سنہ ۵۷ ع کے غدر کے بعد سنہ ۱۲۷۱ ھ میں نا مساعدت زمانہ اور بے روزگاری سے اُکتا کر مہاراجہ هوواں سنگھ والئی الور کی سرکار میں حاضر هوئے - جہاں ان کے کلام کی اچھی قدر کی گئی اور ریاست کی طرف سے ایک روپیہ یومیہ مشاهرہ اور دوپٹے برائے زراعت

مقرر ہوئے - وہ زمانہ ریاست میں بہ لحاظ قدردانی بہت بہتر تھا حضرات ظہیر مجروح ، تشنہ وغیرہ بھی اسی سرکار کے نمک خوار تھے - شعر و سخن کا چرچا اُزوروں پر تھا - ' تصویر ' نے ان صاحب کمال کے سامنے خوب خوب داد کلام دی اور آخر تک اسی سرکار کے وظیفہ خوار رہے - اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

صبر اُس پر ہے ، ہماری حسرت دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا
دل پہ بیٹھا تھا جو پھر دیکھا جگر کے پار تھا
دیکھنا کیا تو ہے تیر نگاہ یار کا
کہتے ہو ، فرصت ہوی ہم کو تو آئیں گے ضرور
میری جاں ! یہ بھی کوئی انداز ہے اقرار کا
بوسۂ لب میں جو ہے قند مکرر کا مزہ
غور سے دیکھا تو سارا لطف ہے تکرار کا
اُس کی اک ٹھوکر پہ سوہنگامۂ محشر نثار
پوچھ مت تصویر ، عالم یار کی رفتار کا
کہاں میں ، اور کہاں تیرا دام عیاری
یہ اتفاق ہے صیاد اب دوانے کا
جو لب پہ آہ و فغاں ہو تو کچھہ اثر بھی ہو
وگر نہ لطف نہیں شور و غل مچانے کا
ہزار طرح سے تڑپے بوقت ذبح ، مگر
نہ پایا ذبح ترے پاؤں پہ لوٹ جانے کا
جو دل میں ہونگا تو دینے کی طرح سے ظالم
میں دل سی شے کو نہیں خاک میں ملانے کا

بچا بچا کے جو رکھا ' تو دل کو کیا رکھا
مزہ ہے جان پہ اُلفت میں کھیل جانے کا
خدا دکھائے نہ دشمن کو انتظار کی رات
قضا سے ہم کو تو شکوہ ہے بھول جانے کا
وہ نیچی نیچی نگاہیں ' وہ بھولی بھولی شکل
جو سر پہ دیکھو ' تو ہے خون اک زمانے کا
تمہاری شکل سے نفرت ہے یا حیا ' تصویر ؟
کھلا نہ بھید ہمیں ان کے منہ چھپانے کا
کس ناز سے وہ کہتے ہیں اکثر شب وعدہ
ہم آئے کہاں اور ارادہ تھا کدھر کا
اے دیدۂ خوں بار ! ذرا اور بھی ہمت
کچھ رنگ تو بدلا ہے مرے خون جگر کا

وہ تو اسد بھی میری پامال کر گئے تھے
پر نقش پانے ان کے کچھ کچھ نشاں بنایا
تصویر ! عاشقوں کا کیا پوچھتا ہے مسکن
روز ازل سے ہم کو بے خانماں بنایا

تمنا تھی کہ وہ ضد سے پلائے بادہ گلگوں
فقط دعوی کیا تھا اس لئے پرہیز گاری کا
وہ غش اچھا تھا ' میرا سر تو تھا اس گل کے زانو پر
ہوا میرے ہی اوپر وار میری ہوشیاری کا

دیکھہ کر قاتل کو آتے جان تن میں آگئی قتل ہونے کی خوشی میں خون اپنا بڑھ گیا

تو نے جس جا پہ قدم رکھہ کے اٹھایا ظالم
رہ گیا نقش قدم چشم تمنا ہو کر

وہ بھی ہوں گے کہ جو آرام سے ہیں الفت میں
چین ہم نے تو نہ پایا ترے شیدا ہو کر

خواب گہہ سے اٹھتے ہی آیا جو یاں وہ مست ناز
دل میں کیا کیا شک گئے زلف پریشاں دیکھہ کر

سر اُٹھاؤ، ہوچکی بس سرکشی اب تو من جاؤ، خدا کو مان کر

سوئیں گے جا کے چین سے زیر زمیں بھی ہم آرام پائیں گے دل مضطر کہیں بھی ہم

اے اسمان! تو بھی ستم میں کمی نہ کر یاں بھی یہی ہے جی میں کہ اب تو نہیں کہ ہم

یہ جنازہ ترے، تصویر، دل افگار کا ہے ساتھہ جانا تو تجھے چاہئے دو چار قدم

وہ کون سی جفا ہے کہ جو تو نے کی نہیں
وہ کون سا ستم ہے جو ہم نے سہا نہیں

جلوے کو تیرے دیکھ کے، کچھ غش سا آگیا
اس کا پتا ملا تو پھر اپنا پتا نہیں
کس کا رفیق، کیسی وفا، اے دل حزیں
دل لے کے پھر کسی کا بھی وہ آشنا نہیں

حریص لذت آزار میں ہی ہوں سچ ہے خدا نہ خواستہ تم تو ستم شعار نہیں

کعبہ تو کعبہ، دیر میں سجدے کروں ہزار پر آشنا ہو وہ بت نا آشنا کہیں
خدا ہی جانے بتوں کی نظر میں سحر ہے کیا قیامت ہوتی ہے برپا جدھر کو دیکھتے ہیں

بگڑ جاتا ہے ازبس تند خو وہ باتوں باتوں میں ہم اس کے دل کو رکھتے ہیں دم تقریر باتوں میں

راہ طلب میں اس کی یہ کہتا ہے دل میرا
اے کاش! ہوتے بدلے ہر اک عضو تن کے پاؤں
قطع و برید دامن صحرا کا قصد ہے
کرتے ہیں کام ہاتھ کا مجھ بے وطن کے پاؤں
عصمت کے معنے یہ ہیں جلی سر سے پاتلک
لیکن نہ رکھا شمع نے باہر لگن کے پاؤں

سوزش دل سناے کیوں، داغ جگر دکھاے کیوں
دعوی عشق ہو جسے، موت سے دم چراے کیوں

عاشق زار میں نہیں، تم پہ نثار میں نہیں
مجکو یہ انعفال ہے ؛ میں نے ستم اٹھائے کیوں
جو ہر عشق ہے یہی ٹکڑے ہو جیب و آستیں
جس کو جنوں سے ننگ ہو دشت کی خاک اڑائے کیوں

مل چکی ہم ظالم کے ماروں کی داد گر وہ آئے حشر کے میدان میں
کرتے ہو باتیں در و دیوار سے آج ہو، تصویر، کس کے دھیان میں

کہو کب تھیں تم میں یہ شوخیاں، کہو کب تھیں تم میں یہ گرمیاں
کبھی آئینے سے بھی تھی حیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی آکے مجھ سے چمٹ گئے، کبھی پاس سے میرے ہٹ گئے
وہ وفور رات کے نشہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

قیس نے جنگل کیا آہوں سے روشن رات کو، وادئی ایمن بنایا نجد کا بن رات کو

بے وفاؤں سے بھی وفا، تصویر، یہ نہ خوش آئی تیری خو مجکو

جیتے پھرے، تو آئیں گے کعبہ بھی زاہدو اب تو چلے ہیں دیر کو اک برہمن کے ساتھ

عاشق زمانہ ہوتا ہے، لیکن نہ اس طرح، اے دل، کبھی تو جانب سود و ضرر تو دیکھ
کرتی ہیں ذبح ہم کو تری کم نگاہیاں گر دیکھتا ہے یار، تو بھر کر نظر تو دیکھ

دشمن ہی کو پہنچے جو مرے پاس سے اُٹھے اس سے تو نہیں کوئی قسم اور زیادہ

تم وہ ہو سنگ‌دل، کہ تمہیں نے خبر نہ لی جب تک ہمارے سر پہ قیامت گذر نہ لی
عاشق کے قتل کرنے میں ایسا ہے اضطراب ظالم ذرا بھی تو نے چھری تیز کر نہ لی

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں کیا لگی پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی
دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی
میں نے کہا، عدو پہ تو عاشق ہی ہوگیا ہنس کر کہا، کہ آپ ہی کی بد دعا لگی
بس بس خرام ناز، کہ محشر ہوا بپا پہلے تمہاری چال سے خلق خدا لگی

ہر رات ہم کو رہتی ہیں اختر شماریاں ہر روز اپنے حق میں تو روز شمار ہے

عداوت تو نہیں خلق خدا سے اُس ستم گر کو
تڑپنے میں ذرا بسمل کے، اُس کا دل بہلتا ہے
الٰہی! عشق بھی آلہ ہے کیا انساں بنانے کا
کوئی عاشق ہو یا مجنوں، یہاں سانچہ میں ڈھلتا ہے
تم آئے تو عنایت ہے، نہ آتے تو شکایت کیا
محبت میں کسی کا، کب کسی پر زور چلتا ہے
مقرر غیر کے زانوں میں کی اُس شوخ نے چٹکی
ہمارے دل کو، کوئی آج چٹکی سے مسلتا ہے
جلانا تھا جسے اُس کو جلایا ایک ٹھوکر میں
خرام ناز کے پردے میں ظالم چال چلتا ہے

نہ آئے ' گرچہ نہیں جاں جا کے آنے کی قضا بھی پھر نہیں اک بار آکے آنے کی
یہاں تلک میں بلا پارسا کہ اُس بت نے عدو سے شرط بھی مے پلا کے آنے کی
کئے ہی ڈالتی ہے قتل ' ذبح سے پہلے ادا ' وہ ناز سے خنجر اُٹھا کے آنے کی
یہ قصد ہے کہ کروں بندوبست وہ شب وصل رہے نہ راہ کہیں سے حیا کے آنے کی
گلہ نہ کر سکے تا کشتۂ جفا کوئی یہ طرز خوب ہے سرمہ لگا کے آنے کی

وفا کی ہم نے تم سے ' اور تم نے غیر سے اب تک طریق عشق سے باہر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

اگر اک لے لیا بوسہ خطا اس کو نہیں کہتے محبت کہتے ہیں ' ترک حیا اس کو نہیں کہتے

تمنا جو نہ رکھتا ہو ' جھکائے وہ نظر کس سے
اُسے شادی و غم کس کا ' اُسے سود و ضرر کس سے
ہمیں تو شام عیش و صبح غم یکساں نظر آئی
خدا جانے ترا وعدہ تھا شب کس سے سحر کس سے

ہمیں تو آزمائش اے بت بے پیر اتنی تھی کہ تو جلاد اتنا تھا ' تری شمشیر اتنی تھی

کیا بری چیز ہے محبت بھی بات کرنے میں آنکھ بھر آئی
میرے ہر کام میں ہے ناکامی آہ بھی لب پہ بے اثر آئی

مجھکو وہاں بلائیے ' یا آپ آئیے اپنی تو ہے وصال تمنا ' کہیں سہی

ھجر کی شب تو سحر ھو یا رب وہ نہ آیا تو قیامت ھی سہی
جان بے کار تو اپنی نہ گئی اے ستم گر! تری شہرت ھی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچئے صاحب آپ پر میری طبیعت ھی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو آپ کی خیر! عنایت ھی سہی

کفن کی سفیدی سے ثابت ھوا شب ھجر اپنی سحر ھو گئی

حال دل بھی کہوں گا چارہ گرو ھوی فرصت جو دیدۂ تر

تصویر! تو اتنا غم فرقت سے نہ گھبرا
یہ رنج بھی دنیا میں ھیں ناداں کوی دن کے

تنہا

اکا نام تنہا تخلص قصاب تھا - دھلی میں اس کی دوکان گوشت کی عمدگی میں مشہور تھی - اکثر شادی بیاہ کے موقعوں پر جو پخت و پز کا انصرام کیا جاتا تو اکا کی دوکان سے گوشت کی خریداری ھوتی - بکری زیادہ ھونے کی وجہ سے اس کی مالی حالت بہت بہتر تھی - اس میں اپنی قوم والوں کی طرح اکھڑ پن بالکل نہ تھا - مزاج میں آشتی اور صلح جوی کی صفت موجود تھی - امیروں شریفوں کی دیوڑھیوں پر حاضر ھوتے ھوتے آئیں ادب و آداب سے خوب واقف ھو گیا تھا - گفتگو کرتے وقت اپنی اصلیت اور مخاطب کی عزت کو ملحوظ رکھتا - طبقہ قدما کے شعرا کا زمانہ پایا تھا - غزل گوئی کی گرمی نے شوق سخن پیدا کر دیا

دوکان پر جو کوئی گوشت خریدنے آتا اس کی منت خوشامد کر کے دو چار اشعار سن لیتا اچھا شعر فوراً حافظہ کی بیاض میں درج ہو جاتا - اس کا مذاق طبیعت اچھا تھا فکر سے کہتا اور جو کچھ کہتا اچھا کہتا —

ادنیٰ پیشہ اختیار کرنے والے علی العموم تعلیم سے بے نیاز ہوتے ہیں - اُن کا تمام تر رجحان آبائی پیشہ کی طرف رہتا ہے - اکا بھی اکتساب علوم کے معاملے میں اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا ' مگر طبیعت اچھی پائی تھی - ہم تک اُس کے چند اشعار پہنچے ہیں - جس کے مطالعہ سے ' تنہا ' کی نزاکت تخیل ' تلاش مضمون ' ذوق معنویت ' شوخیٔ طبیعت وغیرہ کا کچھ کچھ حال معلوم کیا جاسکتا ہے - اُس کے اشعار پڑھ کے یہ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے طبقے میں جہاں زیادہ تر درشتی اور بے تمیزی کی توقع قرین قیاس ہے وہاں تنہا کی سی شائستہ اور پاکیزہ طبیعت کی ہستی بھی گدڑی کے لعل کی طرح تابندہ و ضو فشاں ہے - اس کی شوخیٔ طبیعت اور نزاکت خیال کی ایک مثال ملاحظہ ہو —

اب نامہ بر بنائیں کے ناصح کو جی میں ہے
معقول آدمی تو ہو کوئی جواب کو

چونکہ ناصحان مشفق کی جا و بے جا نصیحتوں سے عشاق واقف ہیں اُن کی ہر وقت کی بک بک اور اپنے مطلب کی پوپکی تکرار کا مزا چکھے ہوئے ہیں اسی لئے ' تنہا ' نے جناب ناصح کو ٹالنے کی غرض سے اس خدمت کے لئے منتخب کیا ہے کہ خود اُن کی تلخ نوائیوں سے نجات حاصل کرے نیز جناب ناصح اپنی الٹی سیدھی باتوں سے معشوق پریچہرہ و گل اندام کو قائل و معقول کرسکیں - اس کے علاوہ ایک لطیف معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ناصح ہمیشہ عشاق کو عشق محبوب سے روکتا رہتا ہے لہذا اپنی آنکھوں سے تو بہ شکن و زاہد فریب حسن و جمال دیکھنے کے بعد عشاق کو محبت نہ کرنے سے مجبور و معذور سمجھ سکے - اس

ذکی الطبیعت شاعر کے چند اشعار یہ ہیں —

تاب گہر تو پہنچے نہ دندان کی آب کو
اور لب کریں خجل ترے برگ گلاب کو
دے دے کے وصل یار کا مژدہ بتاؤ تو
بہلائیں کب تلک دل خانہ خراب کو
اب نامہ بر بنائیں گے ناصح کو جی میں ہے
معقول آدمی تو ہو کوئی جواب کو
کیا آئی اے اجل جو نہ آئی شب فراق
آنکھیں ترس رہی ہیں مری کب سے خواب کو
تنہا اُسی گلی میں جو مر جاؤ خوب ہے
آخر تو چھوڑنا ہے جہان خراب کو

اساتذہ کی اصلاحیں

از

(حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم)

اصلاح مرزا نوشہ غالب مرحوم

منشی حسیب الدین ' سوزاں ' سہارن پوری —

سوزاں — میں اس چمن میں صورت مرغ پریدہ ہوں
وحشت یہ ہے کہ سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں

اصلاح — اس دامگہ میں طائر از کف پریدہ ہوں
وحشت یہ ہے کہ سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں

پہلے مصرع کی ترمیم سے مطلع میں کس قدر ترقی پیدا ہوگئی " دامگہ " اور " از کف پریدہ " یہ دونوں ترشے ہوئے ٹکڑے خود بتاتے ہیں کہ ہم غالب کی قلم معجز رقم سے نکلے ہیں —

سوزاں — راحت کبھی تو مجھ کو بھی اے آسمان دوں
کیا رنج ہی کے واسطے میں آفریدہ ہوں

اصلاح —　　راحت کبھی تو مجھ کو بھی اے افرید گار
کیارنج ھی کے واسطے میں افریدہ ھوں

پہلے مصرع میں بجائے " آسمان دوں " کے آفریدگار بناکر شعر میں جان ڈال دی چونکہ مصرعہ ثانی میں "آفریدہ" ھے اس لئے اسی کی مناسبت سے مصرعہ اولیٰ میں " آفریدگار " بنا کر مضمون مصرعہ ثانی کو قوی کردیا —

استانی حضرت امیر مینائی رح نے بھی یہ قافیہ خوب فرمایا ھے—

امیر - پیدا کئے کی شرم الٰہی ضرور ھے　　تو آفرید گار ھے میں آفریدہ ھوں

سوزاں :-　　جو دل میں ھے وہ کہہ نہیں سکتا کسی طرح
چپ ھوں اگرچہ لذت حلوا چشیدہ ھوں

اصلاح :-　　جو دل میں ھے کہا نہیں جاتا زباں سے
میں مثل گنگ لذت حلوا چشیدہ ھوں

دونوں مصرعوں میں تصرف اس حسن سے کیا گیا کہ شعر میں روانی و سلاست کے علاوہ لطف زبان پیدا ھو گیا - کہا نہیں جاتا زباں سے " اس ٹکڑے کی کیا بات ھے اور دوسرے مصرع میں " مثل گنگ " کی کیا تعریف ھو بیساختہ یہی مصرع پڑھنے کو جی چاھتا ھے —

سوزاں :-　　معاذاللہ ھے کتنا لیئم اے آسماں تو بھی
تجھے انداز بخشش کا نہ آیا ھے نہ آے گا

اصلاح :-　　معاذاللہ ھے کتنا غلط بخش اے فلک تو بھی
تجھے انداز بخشش کا نہ آیا ھے نہ آے گا

" لیئم اے آسماں تو بھی " کے بجاے " غلط بخش اے فلک تو بھی " بناکر شعر میں کتنی معنوی خوبیاں پیدا کردیں - آسماں کو اس موقع پر لیئم کہنا نامناسب تھا کیونکہ لیئم تو اُسے کہتے ھیں جو کسی کو نہ دے اب بجاے اس

کے غلط بخش کے معنی خیز ٹکڑے کو غور سے ملاحظہ فرمائیے یعنی فلک دیتا تو ہے مگر ایسا غلط بخش ہے کہ جو مستحق ہیں وہ اس کی بخشش سے محروم ہیں - اسی مضمون کو حضرت جلیل مد ظلہ نے بھی کس خوبی سے نظم فرمایا ہے —

جلیل :- فلک نا اہل ہے دیتا ہے شہرت بےکمالوں کو
کسی دن اُنگلیاں اٹھتے نہ دیکھیں ماہ کامل پر

انگلیاں اٹھنے کا اشارہ ہلال کی طرف ہے —

سوزاں :- جس طرح رخ اہل جہاں سوے خدا ہے
اس طرح سے ہے روے خدا سوے محمد

اصلاح :- جس طرح رخ اہل خدا سوے خدا ہے
اس طرح سے ہے روے خدا سوے محمد

بجاے " اہل جہاں " کے " اہل خدا " بنایا اہل جہاں میں تو ساری دنیا آگئی اہل خدا سے صرف وہی برگزیدہ اصحاب جو مقربان بارگاہ کبریا ہیں ان سے مراد لی گئی ہے صرف ایک لفظ کی ترمیم سے شعر نور کے سانچے میں ڈھل گیا - سبحان اللہ —

سوزاں :- کیا مجھے نفع ان آنکھوں سے کہ واہیں لیکن
نظر آتی نہیں اُس نور نظر کی صورت

اصلاح :- کیا مجھے نفع ان آنکھوں سے کہ باینہمہ قرب
نظر آتی نہیں اُس نور نظر کی صورت

" واہیں لیکن " کے بجاے " باینہمہ قرب " بنانے سے جو حسن شعر میں پیدا ہو گیا وہ ظاہر ہے یعنی یہ کہ باینہمہ اتنی قربت کے اُس نور نظر کی صورت نظر نہیں آتی اللہ اللہ کیا فارک خیالی ہے —

سوزاں :-　　القصہ تجربہ نہ تھا بازار عشق کا
سودائے سود میں تھے خیال زیاں نہ تھا

اصلاح :-　　القصہ مثل تاجر دانا ازمودہ کار
سودائے سود میں تھے خیال زیاں نہ تھا

(ایک قطعہ کا درمیانی شعر ہے) اس اصلاح سے شعر میں صفائی پیدا ہو گئی —

سوزاں :-　　سوز غم دل میں آتشیں چہرہ
کشتہ ہوں وضع شمع محفل کا

اصلاح :-　　دل پر سوز روئے جاں افروز
کشتہ ہوں وضع شمع محفل کا

مصرعۂ ثانی اسی مصرع کا محتاج تھا "روئے جاں افروز" اس ٹکڑے کی بلاغت کا کیا کہنا —

سوزاں :-　　کاہ خوشیدۂ صحرا ہوں میں اے آتش خو
اس قدر تیز نہ ہو مجھ پہ کہ جل جاوں گا

اصلاح :-　　دیکھنا تودۂ ہاروت ہوں اے آتش خو
اس قدر تیز نہ ہو مجھ پہ کہ جل جاوں گا

کاہ "خوشیدہ" صحرا میں وہ بات کہاں جو تودۂ ہاروت میں ہے اب مصرعہ ثانی کا ثبوت قوی ہو گیا —

سوزاں :-　　ہوتا ہے جس سے راز نہاں جہاں
وہ لفظ ہوں میں قدرت حق کی کتاب کا

اصلاح :-　　معنی سے جس کے راز دو عالم ہو منکشف
وہ لفظ ہوں میں قدرت حق کی کتاب کا

اس اصلاح سے زمین شعر کا پایہ آسمان پر پہنچ گیا - مصرعۂ ثانی میں "وہ لفظ ہوں" یہ ٹکڑا تھا جس کے لئے معنی کی نہایت ضرورت تھی - لہذا اُستاد کامل نے پہلے مصرع میں معنی کا لفظ بنایا اور اُس پر طرۂ "راز نہاں جہاں" کو "راز دو عالم" بنا دیا - کیا اُستادانہ اصلاح دی —

سوزاں :-　　جب وہ ساقی ہو پھر بھلا کیونکر
دعوی اتقا کرے کوئی

اصلاح :-　　اس کو ساقی بناتے ہیں لیجے
دعوی اتقا کرے کوئی

پہلے مصرع کی ترمیم سے شعر کے معنی کیا سے کیا ہو گئے انداز بیان میں وہ شگفتگی پیدا ہو گئی جس کی مثال مل سکتی ہے تو غالب ہی کے کلام میں مل سکتی ہے کتنا پیارا مصرع لگا دیا —

سوزاں :-　　خجل نہ کفر ہو اسلام سے میرے کیونکر
صنم پرست ہوں ایسا کہ برہمن کیا ہے

اصلاح :-　　خدا پرست مجھے لوگ کہتے ہیں اور میں
صنم پرست ہوں ایسا کہ برہمن کیا ہے

مصرعۂ ثانی میں "صنم پرست" تھا اس لئے پہلے مصرع میں استاد نے خدا پرست بنایا اب دونوں مصرعوں میں دونوں ٹکڑے برابر کے ہو گئے اور شعر میں فصاحت پیدا ہو گئی اصلاح کے یہی معنی ہیں کہ بہم دونوں مصرعے دست و گریباں ہو جائیں —

سوزاں :-　　اے عشق تیرے صدقے یہ تاثیر ہے تری
مُڑ مُڑ کے یوں وہ میری طرف دیکھتا چلے

اصلاح :-　　قربان تیرے اے اثر جذب اشتیاق
مُڑ مُڑ کے یوں وہ میری طرف دیکھتا چلے

عشق کی تاثیر کے مقابلے میں اثر جذب اشتیاق کا کرشمہ دیکھئے وہ اصلاح دی کہ تعریف کو الفاظ نہیں ملتے —

سوزاں :-　　حج سے بہتر طوات ہے دل کا
طوف کعبہ کیا کرے کوئی

اصلاح :-　　حج اکبر زیارت دل ہے
طوف کعبہ کیا کرے کوئی

اے سبحان اللہ اتنا بلند مصرع لگا دیا کہ شعر فلک ہفتم پر پہنچ گیا۔ پہلے مصرع میں طوات اور دوسرے مصرع میں طوف کانوں کو ناگوار سا تھا مگر استاد نے بجائے " حج سے " کے " حج اکبر " بنا یا اور بجائے طوات کے زیارت بناکر شعر کو بلند سے بلند تر کردیا —

سوزاں :-　　وہ بے فائدہ در پئے شست وشو ہیں
یہ دھبا نہیں عاشقوں کا لہو ہے

اصلاح :-　　وہ بے فائدہ در پئے شست و شو ہیں
یہ آخر وفا پیشگاں کا لہو ہے

" وفا پیشگاں " یہ ترکیب خاص ' غالب ' ہی مرحوم کا حصہ ہے۔ اس اصلاح سے شعر میں جو دھبا تھا وہ مٹ گیا —

سوزاں :-　　نہ دل میں بلکہ اُسے ہر جگہ سمجھتا ہوں
بھلا بتاؤ تو قید رگ گلو کیا ہے

اصلاح :-　　نہ دل میں بلکہ اُسے ہر جگہ سمجھتا ہوں
خدا کے واسطے قید رگ گلو کیا ہے

" بھلا بتاؤ تو " مصرعۂ ثانی میں یہ ٹکڑہ برائے بیت تھا بجاے اس کے " خدا کے واسطے " بنانا ایسے ہی کہنہ مشق اُستاد کا کام تھا - اگر یہ اصلاح غور سے دیکھی جاے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ (خدا کے واسطے) یہ ٹکڑا خاص یہیں کے لئے وضع کیا گیا - میں تو اس اصلاح کے لکھتے وقت کئی بار جھوم جھوم پڑا - واقعی ایسی ہی نادرالوجود اصلاح سبق آموز ہوا کرتی ہے - جب اس مصرع کو پڑھتا ہوں —

مصرع :-　　خدا کے واسطے قید رگ کلو کیا ہے

دل تڑپ جاتا ہے اور طبیعت بے چین ہو جاتی ہے - یقین تو ہے کہ ارباب نظر بھی اس اصلاح کو پڑہ کر میری طرح وجد میں آجائیں گے —

(عطیہ حضرت زاہد سہارن پوری)

لطیفہ

سید محمد شاہ صاحب وکیل نے جو سخن فہمی اورسخن سنجی میں ممتاز تھے سہارن پور محلہ میر یاد گار میں اپنے مکان کے سامنے ایک مسجد اور کنواں سنہ ۱۲۵۸ ھ میں بنوا کر استاد ذوق سے تاریخ کہلا کر منگائی جو اب تک محراب مسجد مذکور پر جلی حرفوں میں تحریر ہے —

سید باصفا محمد شاہ　　کرد تعمیر طرفہ مسجد و چاہ

ذوق سال عمار تش بقلم　　زد رقم ساخت کعبہ و زمزم

سنہ ۱۲۵۸ ھ

مولوی سیدامیرحسن صاحب ' حسن ' وکیل سہارنپوری شاگرد ملک الشعرا ' ذکی مرحوم نے سن کر فرمایا کہ اردو زبان کا ماہر و شاعر خود ہی گالی کھائے کہتا ہے ' ذوق ' سالے - حالانکہ کہہ سکتا تھا ع - ذوق تاریخ و سال ہر دو بہم —

کسرۂ لام کے اشباع سے جو خرابی پیدا ہوی وہ نہ ہوتی —

دلی کی ایک صحبت میں جس میں حکیم عبدالمجید خاں صاحب ' مولوی

ذکاءاللہ صاحب اور مولانا 'حالی' اور میر مہدی حسن 'مجروح' اور مولوی محمد حسین 'آزاد' اور سید زاہد حسین زاہد سہارنپوری موجود تھے - حضرت زاہد نے اس روایت کو نقل کیا اور سب تو مسکرائے اور اعتراض و مصرعۂ ثالث مابعد کو پسند کیا - لیکن مولانا 'آزاد' سن کر پی گئے - پھر جب دیوان 'ذوق' ترتیب دے کر شائع کیا تو اس تمام واقعہ کو اڑا گئے اور مولوی سید امیر حسن کا مصرعۂ ثالث اختیار کیا — عطیہ حضرت زاہد

(عطیہ حضرت زاہد)

چند اصلاحیں اساتذہ قدیم کی ہمارے مخدوم و محترم سید زاہد حسین صاحب زاہد رئیس سہارنپوری تلمیذ حضرت امیر مینائی رح نے ہماری استدعا پر ہمیں مرحمت فرمائیں —

انہیں میں میر 'انیس' مرحوم کی بھی دو اصلاحیں ہیں اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو اصلاحیں ہمارے محترم دوست نے بھیجی ہیں ان میں اکثر اصلاحیں 'ناسخ' کے کلام پر 'آتش' کی اور 'آتش' کے کلام پر 'ناسخ' کی ہیں اور 'اسیر' کے کلام پر 'آتش' کی-خیر یہاں تک تو مضائقہ نہیں کہ 'آتش' 'مصحفی' کے ارشد تلامذہ میں سے تھے بعد مصحفی کے ممکن ہے کہ اپنا کچھ کلام 'اسیر' نے 'آتش' کو دکھایا ہو' مگر 'آتش' و 'ناسخ' کے معاملے میں جہاں تک خیال کیا جاتا ہے قرین قیاس یہی ہے کہ اپنے مقام پر بیٹھ کر یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے کلام پر اصلاحیں دیا کرتے ہونگے' جو نہ زیادہ مشہور ہوئیں نہ تذکروں میں درج کی گئیں - خاص خاص بزرگ اس راز سے واقف تھے' انہیں بزرگوں سے سن کر حضرت زاہد کے تحویل حافظہ میں محفوظ تھیں - شائقین ادب کو حضرت زاہد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ایسی نادر و نایاب اصلاحیں مرحمت فرمائیں کہ جس سے ہمارے ارباب اب

تک بالکل ناواقف تھے ۔ ہم حضرت زاھد کی مرسلہ اصلاحیں اسی سرخی کی تحر میں شکریہ کے ساتھہ درج کرتے ہیں —

شیخ ناسخ — دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

اصلاح خواجہ آتش — ڈال سایہ تو اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ناتواں کے لئے آنچل کے سایہ سے سبک تر کفن اور کیا ہوسکتا ہے ۔ سمجھہ میں نہیں آتا کہ خواجہ صاحب کی اس نازک خیالی کی کن الفاظ میں داد دی جائے ۔ منشی مظفر علی اسیر —

وہ زار ہوں کہ ہوا چشم مور میں مدفوں
کمال تنگ ملا گوشۂ مزار مجھے

اصلاح آتش — وہ زار ہوں کہ ہوا چشم مور میں مدفوں
بہت فراخ ملا گوشۂ مزار مجھے

سبحان اللہ " کمال " تنگ کو " بہت فراخ " بنایا چونکہ پہلے مصرع میں " زار " کا لفظ ہے اب جا کے " زار " کا مفہوم ادا ہوا ۔ مطلب یہ ہے کہ میں وہ زار ہوں کہ چیونٹی کی آنکھہ بھی میرے لئے بہت فراخ ہے —

خواجۂ آتش — یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے
زمین جس کی چہارم آسماں ہے

اصلاح شیخ ناسخ — یہ اُس رشک مسیحا کا مکاں ہے
مسیحا جس کے در کا پاسباں ہے

اس اصلاح پر میں اپنی ناچیز رائے لکھنا عبث جانتا ہوں ۔ مگر اتنا ادبی زبان سے ضرور کہوں گا کہ آتش کا مطلع بے عیب ہے ۔ اور ناسخ کے مطلع میں دونوں

مصرعوں میں " مسیحا " کی تکرار کانوں کو نا گوار ہے اور ایک واجب التعظیم پیمبر کو پاسبانی کا عہدہ عطا کیا گیا ہے جو سراسر سوء ادبی ہے - جس زمانے میں میں بھوپال میں تھا حضرت ' شوق ' قدوائی بھی بھوپال ہی میں تشریف فرما تھے " آرزو کرتے ' جستجو کرتے " - اس طرح میں غزل کہہ رہے تھے - میں روز اُنہ حاضری دیا کرتا تھا اور جب کوئی غزل کہتا تھا - حضرت شوق کو دکھا لیا کرتا تھا - اس دن جب میں حاضر ہوا تو حضرت شوق نے اپنا نیا مطلع سنایا —

چبا کے پان جو عیسیٰ سے گفتگو کرتے　　ضرور ایک پیمبر کا تم لہو کرتے

میں سنکر صورت تصویر خاموش رہا - مجھے خاموش دیکھ کر خود ہی فرمایا کہ اس مطلع میں تم کو سوء ادبی کا خیال ہوا ہوگا - میں نے کہا جی ہاں - یہ سن کر اپنے مطلع کو قلم زد کردیا - اگر یہ مطلع نعت میں ہوتا تو چنداں ہرج نہ تھا - مگر آتش مرحوم کا یہ مطلع تو نواب معتمد الدولہ کے نئے مکان سے وابستہ ہے- آتش نے یہ مطلع فی البدیہہ کہا تھا - اس پر یہ اصلاح کہاں تک قابل تسلیم ہو سکتی ہے —

رند —　　اگر تُی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میلا ہو کر

جب یہ شعر ' رند ' نے مشاعرے میں پڑھا تو شیخ ناسخ نے فرمایا کہ نواب صاحب پھر ارشاد ہو کیا خوب فرمایا ہے - اگر تُی - کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا " نواب رند نے فرمایا کہ شیخ صاحب سو دفعہ پڑھو ائے گا تو یہی پڑھوں گا " اگر تُی کا ہے گماں الخ - کیونکہ زبان یہی ہے اور بول چال میں اسی طرح ہے —

میرمونس - ذکر انصار حسین — یاور تھے درد و غم میں سپر تھے لڑائی میں
عمر ان کی سب گزر گئی تیغ آزمائی میں

اصلاح میر انیس —　　یاور تھے دردِ غم میں سپر تھے لڑائی میں
ساری جوانی کٹ گئی تیغ آزمائی میں

" عمر ان کی سب گذر گئی " اس ٹکڑے کو کاٹ کر " ساری جوانی کٹ گئی " بنایا تیغ آزمائی کی مناسبت سے " جوانی " اور پھر کٹ گئی کیا خوب اصلاح دی سبحان اللہ —

میر مونس —　　جلوہ نما تھے بیچ میں اُس فوج کے حسین
چاروں طرف تھا جلوۂ خورشید مشرقین

اصلاح میر انیس — دل کی طرح تھے قلب میں اُس فوج کے حسین
چاروں طرف تھا جلوۂ خورشید مشرقین

" دل کی طرح تھے قلب میں " اس معنی خیز ٹکڑے کی کیا تعریف ہو - اس اصلاح سے شعر میں جو ترقی ہوئی وہ تعریف سے مستغنی ہے —

سید بہادر حسین ارم لکھنوی —

تیر چلوں میں کماں دار لئے بیٹھے ہیں
اور محمد کے نواسے کی خطا کچھ بھی نہیں

اصلاح میر انیس —　　تیر چلوں میں کماں دار لئے بیٹھے ہیں
اور جگر گوشۂ زہرا کی خطا کچھ بھی نہیں

" اور محمد کے نواسے " کے بجائے " اور جگر گوشۂ زہرا " بنایا - پہلے مصرع کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں جو الفاظ بنائے گئے وہ قابل داد ہیں معلوم یہ ہوتا ہے کہ میر انیس کی اصلاح ہے —

حضرت زاہد تحریر فرماتے ہیں کہ رضوان علی خاں رضوان ، مرادآبادی نے بڑی تعلی و تبختر کے ساتھ غزل نعتیہ شائع کی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ اساتذ

حال اس کے مثل لکھنے پر قادر نہیں اور عاجز ہیں —

اس پر استانی حضرت امیر مرحوم نے بعض تلامذہ کے اسرار بلیغ سے خلاف عادت فطری اکثر مصرعے بدلے تھے جو اب حافظے میں محفوظ نہیں - البتہ اخوی حضرت ریاض کو ضرور یاد ہوں گے - اس وقت صرف ایک شعر مستحضر ہے —

رضواں — وہ بلبل خوش لہجہ ہوں نالے مرے سن کر
ہیں جھومنے لگتے شجر کوئے محمد

اصلاح — وہ بلبل خوش لہجہ ہوں نالے مرے سن کر
جھوما کئے برسوں شجر کوئے محمد

" ہیں جھومنے لگتے " اول تو اس ٹکڑے میں تعقید کا عیب تھا ' اس اصلاح سے یہ عیب بھی رفع ہوا اور شعر میں سلاست وروانی پیدا ہوگئی —

رنگیں — سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

اصلاح شاہ حاتم — سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

" ہم نے شب " کے بجائے " رات ہم " بنا کر شعر میں سلاست و صفائی پیدا کردی - اس زمانے میں یہ ترکیبیں جائز تھیں اور " کبھو " بھی مستعمل تھا - جو زمانۂ حال میں متروک ہے —

(منقول از آبحیات)

میر مونس مرحوم نے ایک مرثیہ میں یہ روایت نظم کی ہے کہ جب سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام نے سفر کا تہیہ فرمایا اور کل اقربا اور انصار ہمراہ رکاب ہوئے مگر حضرت صغرا کو بیماری کی وجہ سے ہمراہ لیجانا مناسب نہ سمجھا مگر وہ ساتھ چلنے کے لئے اصرار فرمارہی ہیں ' اور حضرت انھیں سمجھارہے ہیں اس موقع پر یہ مصرع تحریر فرمایا

ع　کہیں بیمار سفر میں نہیں جاتے بیوی

اس مصرع پر میر انیس نے یوں اصلاح دی —

ایسے بیمار سفر میں نہیں جاتے بیوی

" کہیں " اور " ایسے میں جو نازک فرق ہوگیا وہ ظاہر ہے " ایسے " سے بیمار کی نازک حالت کا پتا چلتا ہے —

(از حضرت عزیز لکھنوی)

تبصرے

ادب

گنجینۂ تحقیق ۴۹۹
تذکرۂ ریختی ۵۰۲
تجلیات سخن ۵۰۲
ملیس نظمیں ۵۰۳
من کی بانسری ۵۰۴
عالم حسینات ۵۰۴
نقش و نگار ۵۰۵
دیوان مرزا کامران ۵۰۶
میٹرکولیشن گرامر اینڈ کمپوزیشن ۵۰۶
مضامین فرحت ' حصہ دوم ۵۰۷
پردہ ۵۰۸
اردو انقلابی قاعدہ ۵۰۹
ترجمہ انٹرمیڈیٹ پرشین کورس ۵۱۰
دیوان اثر ۵۱۰
درسیۂ عثمانیہ ۵۱۱
نصاب مرغوب موسوم بہ جدید الاسلوب ۵۱۲

تاریخ و سیر

عرب و ہند کے تعلقات ۵۱۳
ملیبار ۵۱۹
سلطان شہید ۵۲۲
چمنستان مظفر ۵۲۳

حفظان صحت

رہنمائے صحت ۵۲۴
ماں اور بچہ ۵۲۵

اُردو کے جدید رسالے

ادب ۵۲۶
نیرنگ ۵۲۷
معلومات ۵۲۷
پیام اسلام ۵۲۷
بصیرت ۵۲۷
حصار اسلام ۵۲۸
عزیز ۵۲۸
ہونہار ۵۲۹

متفرق نوٹ

تلاش حق ۱۲۹

تبصرے

ادب

گنجینۂ تحقیق

(از جناب پروفیسر سید محمد احمد صاحب ' بیخود ' موہانی
ایم - اے ' پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ)

یہ کتاب فی الحقیقت گنجینۂ تحقیق ہے اور بے خود صاحب کی علمی کاوش اور ادبی تحقیق کا نتیجہ ہے —

اس میں پانچ انتقادی مضامین ہیں - پہلا " آئینۂ تحقیق " (جلوۂ غالب) یعنی دیوان غالب (اردو) کی شرحوں پر ایک سرسری نظر - دوسرا " سرمۂ تحقیق " (حمایت غالب) بجواب نقدانقد بیخودی - تیسرا " سرمایۂ تحقیق " (حمایت غالب) چوتھا " مایۂ تحقیق " یعنی شرح قصائد خاقانی نوشتہ شادان لکھنوی پر ایک نظر اور اُس کا شرح پروفیسر ناصری و شرح شادان بلگرامی اور شرح جناب بحشی سے تقابل اور قابل اختلاف مواقع پر ناقدانہ اظہار خیال - پانچواں " آئینۂ تحقیق " یعنی حکیم ناطق صاحب لکھنوی کے تبصرۂ اصلاح سخن (شوق سندیلوی) پر ناقدانہ نظر - یہ پانچوں مضمون ۳۴۵ صفحوں پر ہیں —

اردو میں مرزا غالب ہی کا کلام ایسا ہے کہ جس پر متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور آئندہ لکھی جائیں گی ' یہ مرزا کے کلام کا اعجاز ہے ۔ اس وقت تو شرحیں شایع ہو چکی ہیں جن پر اس کتاب کے پہلے مضمون میں سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد مرزا صاحب کی ایک غزل کا حل اور شوکت تھرتھی ' طباطبائی اور حسرت موہانی سے اتفاق و اختلاف بیان کیا گیا ہے ۔ ان سب میں زیادہ مفصل اور ضخیم اور مشہور شرح مولانا طباطبائی کی ہے ۔ شرح تو جیسی ہے سو ہے مگر اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل شارح اپنے آپ کو غالب سے کچھ کم نہیں سمجھتے ۔ بعض اشعار پر ایسے ایسے عجیب اعتراض کئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور اکثر مقامات پر بقول بیخود صاحب " اس شرح میں ازانجمع اور پندار کے باہمی ہجوم جھوم کے اتھے ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کے برسے ہیں " ۔ اور کیا سچی بات کہی ہے " اگر کچھ شکایت فاضل شارح سے ہو سکتی ہے تو اتنی کہ زیادہ نہ سہی غالب کو اپنا ہی سا فکتہ شناس و محقق سمجھا ہوتا " ۔ حضرت بیخود نے اس شرح کی خوب قلعی کھولی ہے اور داد تحقیق دی ہے ۔ —

یہ مضمون جب شایع ہوا تو اودھ پنچ میں " نقد النقد بیخود " کے عنوان سے ایک مضمون اس کی تردید میں لکھا گیا اس مضمون میں نہ تو مرزا غالب کی غزل کے حل پر خامہ فرسائی کی گئی اور نہ قابل مضمون نگار حضرت بیخود) کی کسی رائے پر تنقید کی گئی بلکہ ایک اردو دانی پر اعتراض تھے ۔ اس دوسرے مضمون میں ان اعتراضوں کا جواب ہے ۔ ہر لفظ اور محاورے کی تحقیق کی گئی ہے اور مستند اساتذہ کے کلام سے سندیں پیش کی گئی ہیں ۔ اس سے بیخود صاحب کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مضمون مولانا طباطبائی صاحب کی طبع بلند کا نتیجہ تھا ۔ اس میں بھی بیخود صاحب نے طباطبائی صاحب کے بعض اعتراضات کا جو انہوں نے کلام غالب پر فرمائے ہیں بڑی خوبی سے جواب دیا ہے ۔ پڑھنے کے قابل ہے ۔ —

" نگار " میں جو اپنی جدت خیالیوں کے لئے مشہور ہے ایک صاحب نے " آر گس " کی آنکھیں

ایک مضمون " غالب بے نقاب " کے عنوان سے شائع کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ غالب کے اکثر اشعار یا تو سرقہ ہیں یا توارد - مولانا بیخود نے اس کا بہت مدلل اور محققانہ جواب دیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھہ غالب کے اشعار کا ان اشعار سے مقابلہ کر کے دکھایا ہے جن سے سرقہ کرنے کا الزام دیا گیا ہے - شعر کی خوبی کو پوری طرح سمجھنا اور پھر ان خوبیوں کو اس طرح بیان کرنا کہ پڑھنے والے کی زبان سے بے اختیار تحسین و آفرین نکلے ' ہر ایک سخن شناس کا کام نہیں - یہ حضرت بیخود ہی کا حصہ ہے - اس مضمون نے حضرت آرگس کی ساری لن ترانیاں خاک میں ملادی ہیں - اس کے جواب بعض اور صاحبوں نے بھی لکھے تھے لیکن وہ تشنہ اور نا کافی تھے - بیخود صاحب کے جوابات بہت قابل تعریف ہیں - مضمون کے شروع میں سرقات شعریہ پر محققانہ بحث کی ہے —

چوتھے مضمون میں قصائد خاقانی کی شرحوں پر ناقدانہ اظہار خیال کیا ہے اور اگرچہ فاضل مولف نے شادماں صاحب کی شرح کو دوسری شرحوں سے بہتر بتایا ہے لیکن جہاں جہاں ان سے چوک ہوی یا کمی رہ گئی ہے تو اس کو بھی ظاہر کردیا ہے —

پانچواں مضمون جو سب سے طویل ہے اور کوئی سواسو صفحے پر ختم ہوا ہے وہ ناطق صاحب کے تبصرۂ " اصلاح سخن " کے متعلق ہے - شروع میں فاضل مولف نے ناطق صاحب کی عبارت کی سولہ سطروں پر (۲۷) اعتراض کئے ہیں جس کی ضرورت نہ تھی - اس کے بعد ناطق صاحب نے اصلاح سخن پر جو تبصرہ کیا ہے اور جن جن شعروں شوق صاحب کے اشعار پر اصلاحیں دی ہیں ان کے عیب و صواب مدلل طور پر ظاہر کئے ہیں - " اصلاح سخن " پر مختصر سا تبصرہ اس رسالے میں ہو چکا ہے اس کے متعلق کچھہ کہنے کی ضرورت نہیں - شوق صاحب سند یلوی نے اپنی سولہ غزلیں مختلف اساتذہ کے پاس بھیج کر شاگردانہ اصلاح کی التجا کی اور پھر ان سب اصلاحوں کو حضرات شعرا کے نیچ کے خطوط کے ساتھہ شایع کردیا جس پر اخباروں اور رسالوں میں خوب خوب چہ می گوئیاں ہوئیں - یہ پانچواں مضمون انہیں اصلاحوں اور خاص کر ناطق صاحب کے تبصرے کے متعلق ہے - وہ قصہ پرانا ہوگیا ہے لیکن جو شوق زبان رکھتے ہیں ان کے لئے یہ مضمون بہت دلچسپ ہوگا - —

یہ کتاب ادبی تنقید کے اعتبار سے بہت قابل قدر ہے - اس میں زبان و ادب کے متعلق بہت سے کارآمد نکات آگئے ہیں جو طالبان سخن و ادب کے لئے متاع بے بہا ہیں —

مولانا بیخود دیوان غالب اردو کی مفصل شرح ہو اکھ رہے ہیں بلکہ اکثر

چکے ہیں۔ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ شرح بےمثل ہوگی

تذکرۂ ریختی

(مرتبہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب منشی فاضل ایم آر اے
ایس مکتبۂ ابرا حیدیہ - حیدرآباد دکن چھوٹی تقطیع صفحات ۹۲)

یہ ریختی گو شعرا کا تذکرہ ہے - شروع میں قابل مولف نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں ریختی کی ایجاد و ابتدا سے بحث کی گئی ہے - جہاں تک دریافت ہوسکا ہے سب سے پہلا شاعر جس کا کلام ریختی کے طرز میں ملتا ہے ' ہاشم بیجاپوری ہے بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور دو چار شعر بھی نقل کئے ہیں - مولف نے بڑی محنت سے ایسے تمام شعرا کے کلام کا انتخاب یا جو اشعار دستیاب ہوسکے ہیں اس چھوٹے سے مجموعے میں جمع کردئے ہیں - قابل مولف نے ریختی کی بہت حمایت کی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ اس صنف کلام کو قائم رکھا جائے اس حمایت سے ریختی کا خار زار گلزار نہیں بن سکتا ' خواہ اس کے کہنے والے کیسے ہی پاکباز اور متقی کیوں نہوں - البتہ ایک بات ضرور ہے کہ جو الفاظ اور محاورے زبانوں پر تھے وہ تحریر میں آگئے اور زبان کے دلدادہ کو ان شعرا کا احسان ماننا پڑتا ہے - کتاب کے آخر میں ایک مختصر فرہنگ بھی ہے—

تجلیات سخن

(یعنی مجموعۂ کلام مولوی نظام الدین حسین نظامی صاحب بدایونی -
مرتبہ مولوی عبد احمد صاحب فرشوری - چھوٹی تقطیع صفحات ۱۳۶)

یہ چھوٹا سا مجموعہ نظامی صاحب کے کلام کا ہے جس کے لئے ہم مولوی عبد احمد صاحب کے ممنون ہیں - شروع میں ایک دیباچہ قمر الدین احمد صاحب بدایونی

بی اے، بی ٹی کا اور ایک مقدمہ مولوی محمد قمرالحسن صاحب قمر بدایونی کا ہے - جن میں نظامی صاحب کے کلام کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں - مولانا قمر صاحب نے اس فسن میں بدایوں کے شعرا کا ایک جدول کئی صفحہ پر دیا ہے جس میں شاعر کا تخلص، نام و سکونت، سنہ وفات اور آخری خانے میں نمونے کے طور پر دو ایک شعر ہیں - اور مقدمے کے آخر میں ملا عبدالقادر بدایونی مشہور مورخ کے حالات اور ان کے کلام میں سے سلام رخصتی درج ہے - یہ حصہ تاریخی اور ادبی لحاظ سے بہت اچھا ہے —

نظامی صاحب کا کلام جو اس مجموعے میں ہے زیادہ تر نعتیہ، قومی، مدحیہ (لکن، بھوپال رام پور سے متعلق) اور بعض دوسرے مواقع کی نظمیں ہیں - کلام میں روانی اور جوش پایا جاتا ہے اور مولانا حالی مرحوم کے فیض اثر کی جھلک نظر آتی ہے - امید ہے کہ نظامی صاحب کے احباب اسے شوق سے پڑھیں گے —

سلیس نظمیں

(از جناب منشی محمد یوسف صاحب ناظم انصاری - ملنے کا پتہ: مولوی فتح محمد صاحب صدر مدرس مدرسہ انجمن اسلام، سنہڈھرست روڈ بمبئی)

یہ دو جز کا رسالہ بچوں کے لئے نعمت ہے - اس میں صرف بچوں کے لئے آسان زبان میں چھوٹی بڑی نظمیں ہیں - بچوں کے لئے نظم لکھنا بڑا دشوار کام ہے اور اردو میں اس کی بڑی کمی ہے - اس کمی کو مولوی اسمٰعیل مرحوم نے پورا کیا اور ایسی اچھی اور پر لطف نظمیں لکھیں کہ ان کا جواب نہیں - ان کے بعد اگر کسی کو ایسی نظمیں لکھنے کا سلیقہ ہے تو وہ حضرت ناظم ہیں - ہمیں یہ نظمیں پڑھ کر فی الحقیقت خوشی ہوئی - زبان صاف اور سلیس اور با محاورہ ہے - اور نظمیں دلچسپ ہیں - ہمیں امید ہے کہ ناظم صاحب اس سلسلے کو ضرور قائم رکھیں گے اور یہ ان کا بڑا کام ہوگا —

من کی بانسری

مجموعۂ کلام محمد امیرصاحب بی اے بی ٹی -
مطبوعہ مطبع عہد آفریں ' حیدر آباد دکن)

یہ ایک نوجوان پر جوش شاعر کا کلام ہے اور اس میں اس زمانے کا رنگ صاف نظر آتا ہے - جس طرح ملک کے دوسرے حالات بدل رہے ہیں ' اردو شاعری میں بھی ایک نئی شان پیدا ہو رہی ہے - اس مجموعہ میں بھی مشرق و مغرب دونوں سے گل چینی کی گئی ہے - کہیں ٹیگور کی ترجمانی کی ہے تو کہیں براؤننگ کی ' کسی جگہ ورڈ سورتھ کی خوشہ چینی کی ہے تو کسی جگہ ونشی دھر کی - بعض نظموں میں ان کے استاد مولانا وحیدالدین مرحوم کا رنگ جھلکتا ہے تو بعض میں اقبال کے خیالات اور طرز کا تتبع پایا جاتا ہے - ہمیں ڈاکٹر سید عبداللطیف (جنھوں نے ان نظموں پر پیش نامہ لکھا ہے) اتفاق ہے کہ "مولوی محمد امیر کی فطرت میں شاعری ہے اور وہ شاعر ہیں" —

عالم حسینی

(مولوی نورالحسن صاحب شمیم متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

یہ بھی جامعۂ عثمانیہ کے ایک نوجوان شاعر کا کلام ہے - اس میں حقیقی طور پر قدیم و جدید دونوں رنگ نظر آتے ہیں لیکن خیال کا ڈھنگ بتا رہا ہے کہ ہوا کدھر کی ہے - شروع میں غزلیں ہیں ' اس کے بعد کچھ نظمیں - کلام میں سادگی ہے ' طرز بیان میں الجھن نہیں اور نئی بحروں کی تلاش میں خواہ مخواہ درد سری نہیں کی ہے - ان کے کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونہار ہیں ' شعر کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اور شاعری کا سچا ذوق رکھتے ہیں —

نقش و نگار

(جلیل احمد قدوائی بی اے کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مطبوعہ - مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ - قیمت ایک روپیہ چھوٹی تقطیع - صفحات ۵۶)

ابھی دونوجوان شاعروں کا ذکر ہوچکا ہے جلیل احمد قدوائی صاحب کا شمار بھی انھیں میں ہے - لیکن یہ زیادہ مشاق ہیں' ان کے تخیل کی جولانی زیادہ وسیع اور ان کے کلام میں زیادہ لطافت پائی جاتی ہے - عبدالشکور صاحب نے اس مجموعے پر ایک مقدمہ لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ بڑی خوبی کے ساتھ ان کے کلام کے محاسن کو بتایا ہے - بعض بعض شعر اس میں استادانہ انداز کے نظر آتے ہیں' کہیں کہیں ان کی نظم معمول سے دور پہنچتی ہے اور اکثر جذبات کی گرمی بڑی خوبی سے ادا کرجاتے ہیں-شروع کے چند ورق پر تو مختلف موضع پر نظمیں ہیں اور باقی غزلیں ہیں - جب سے مولانا حالی مرحوم نے غزل میں اصلاح کی اور نئی شان سے غزلیں لکھنی شروع کیں اس وقت سے غزلوں کا رنگ بہت کچھ بدل گیا ہے - جلیل صاحب کی غزلوں میں بھی خاص بات پائی جاتی ہے - چند اشعار اہل ذوق کے لطف کی خاطر یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

نور نگیٔ انتظار کب تک — یہ گریۂ زار زار کب تک
تسکین ہے وجہ راحت دل — تسکین کا اعتبار کب تک
اشکوں پہ ہے اختیار مانا — پر اشکوں پہ اختیار کب تک
کیوں پھینک نہ دوں جلوں میں یہ بھی — پیراہن تارتار کب تک

مدت کے بعد آن کے بیٹھی جو عندلیب — فرط خوشی سے جھوم گئی شاخسار گل

خود بخود پانو میں نکلے چھالے — کیا بیاباں میں بہار آئی ہے

دعائے وصل کے بعد اب یہ خوف ہے مجھ کو — کہ جذب دل کہیں کردے نہ کامیاب مجھے

ہم دنیا کو اپنی زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
یہ وہ عقدہ ہے جس کو صرف اہل دل سمجھتے ہیں
ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگانی نے — کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل سمجھتے ہیں

دیوان مرزا کامران

(مع مقدمہ مرتبہ جناب محمد محفوظ الحق ایم اے لکچرار
پریسیڈنسی کالج ' کلکتہ - قیمت دو روپے)

یہ نادر دیوان مرزا کامران ابن بابر بادشاہ کا ہے - دنیا میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو پٹنے کے مشہور کتب خانۂ خدا بخش خاں میں محفوظ ہے - پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے اسے بڑی خوبی سے مرتب کیا ہے - دیوان تو صرف ۳۴ صفحے کا پڑھے مگر فاضل مرتب نے تحقیق سے اس پر ۵۸ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جس میں کامران کے سوانح زندگی ' اس کی علمی قابلیت اور شاعری پر تبصرہ کیا ہے - اردو مقدمے کا خلاصہ انگریزی زبان میں بھی لکھ کر کتاب میں شامل کر دیا ہے - اس کے علاوہ کتاب میں بلاک کی چار تصویریں ہیں جن میں بابر ' ہمایوں ' جہانگیر اور شاہجہاں کی تصویروں کے عکس ہیں نیز مشہور ایرانی خطاط خواجہ محمود شہابی (کاتب دیوان کامران) کا بھی عکس دیا ہے ان سے کتاب کی رونق بڑھ گئی ہے - کتاب کی لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے —

دیباچے میں فاضل مرتب نے مرزا کی بے مروتیوں اور بد عہدیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن باوجود توجیہہ و تاویل کے وہ اس میں آشکارا ہیں کہ ان کا چھپانا دشوار ہے - تاہم یہ دیباچہ تاریخی لحاظ سے بہت قابل قدر ہے اور پروفیسر محفوظ الحق صاحب کی یہ محنت ہر طرح لائق داد و تحسین ہے -

---

میٹریکولیشن پرشین گرامر اینڈ کمپوزیشن

(مولفۂ عبدالغفور صاحب ' ایم اے ایم او ایل بی ٹی
منشی فاضل ' گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج دھرم سالہ و بھائی
بشنداس صاحب ایم اے - صفحات ۱۴۶ ' چھوٹی تقطیع -
مطبوعہ رائے کلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور قیمت ایک روپیہ)

فارسی صرف و نحو کی یہ کتاب انگریزی خواں طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے اور اسی لئے کہیں کہیں اس کا تطابق انگریزی نحو سے بھی دیا گیا ہے - مولفین نے آسان بنانے کی بہت کوشش کی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے قدیم اصطلاحات اور طریقے کو قائم رکھا ہے ' لیکن کہیں کہیں انہوں نے نئی اصطلاحات بھی بنائی ہیں - مثلاً حروف متداخلہ' اس سے ان

کا مطلب حروف ندا ' تاسف ' تحسین ' تعجب وغیرہ ہے - اس کے لئے " نجائیہ " کا لفظ زیادہ بہتر تھا جو استعمال میں آچکا ہے - اسی طرح (Prefixes اور Suffixes) کے لئے علامات اولیہ اور علامت آخریہ تراشے گئے ہیں حالانکہ ان کے لئے اب سابقہ اور لاحقہ عام طور پر استعمال ہونے گئے ہیں - اگرچہ ہمیں مولفین سے کہیں کہیں اختلاف ہے تاہم یہ کتاب انگریزی خوان طلبہ کے لئے نہایت مفید اور کار آمد ہے اور مولفین نے اسے بڑی محنت اور سلیقہ سے تیار کیا ہے —

مضامین فرحت ، حصہ دوم

(از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب - بی اے ' اسسٹنٹ ہوم سکرٹری حیدرآباد - صفحات ۱۹۱ قیمت دو روپے)

یہ مضامین فرحت کا دوسرا حصہ ہے - ابھی کہا ہے ' خدا نے چاہا تو ایسے ایسے کئی حصے شایع ہوں گے - مرزا صاحب میدان میں ابھی ابھی آئے ہیں اور آتے ہی انہیں قبولیت حاصل ہوگئی ہے - ان کی زبان اور بیان دونوں دلکش ہیں - یوں خود بھی اُنہیں ادب کا ذوق ہے اور پھر رسالے والے بھلا ایسی چہکتی بلبل کیوں چھوڑنے لگے ان کا اصرار برابر جاری رہا (خواہ مرزا صاحب کتنے ہی بگڑیں اور ناک بھوں چڑھائیں) تو ایسے بہت سے مضامین ان کے صدقے میں ہمیں مل جائیں گے - اس حصے میں سب کے سب مضامین اردو رسالوں میں شایع ہوچکے ہیں - آخری دو مضمون یعنی , حکیم آغا جان عیش دہلوی' اور 'ایک وضع کی تعمیل' تو اسی رسالے میں چھپ چکے ہیں- باقی دوسرے رسالوں میں - پہلا مضمون " بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر " بے مثل ہے اور ایک یادگار چیز ہے - " پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر " آپ بیتی ہے اور پر لطف ہے -"فرماں بردار بیٹا" تاریخی مضمون ہے اور آغا جان والا ادبی - ادبی اور تاریخی مضامین میں وہ لطف نہیں جو بیانیہ مضامین میں ہے - ہمیں یقین ہے کہ یہ حصہ بھی پہلے حصے کی طرح مقبول ہوگا —

پردہ

(مصنفۂ محمد فضل الرحمن صاحب ' لکچرار سٹی کالج '
حیدرآباد-قیمت ایک روپیہ (مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن)

اس ڈرامے میں تین ایکٹ ھیں-اشخاص ڈراما میں خان بہادر اکرام حسین خان ھیں جو شہر کے ایک رئیس دقیانوسی خیال کے آدمی ھیں- دوشیزہ خان بہادر کی نافتخدا لڑکی ھے ' اظہار ' خان بہادر کا لڑکا ھے ' صادق ' خان بہادر کا بھتیجا ھے جسکی نسبت دوشیزہ کے ساتھہ ھو چکی ھے - ڈاکٹر میتھو ایک ھندوستانی عیسائی ھیں اور خان بہادر کے خاندانی طبیب ھیں - قادر ایک پرانا خادم ھے اور گل بہار خادمہ ھے —

صادق پرنئی تہذیب کے خیالات کا اثر ھے-وہ پردے کی رسم کا سخت مخالف ھے اور اس کی دلی تمنا ھے کہ وہ اپنی منسوبہ دوشیزہ کو پردے سے باھر پوری آزادی دے مگر اپنے خسر کے ڈر کے مارے اپنے خیالات پر عمل پورا نہیں ھوسکتا اتفاق سے دوشیزہ بیمار ھوتی ھے - ڈاکٹر کا خیال ھے کہ تازہ ھوا کی اسے ضرورت ھے - چنانچہ اب صادق عہد کرتا ھے کہ وہ اپنے خیالات پر عمل کر کے اپنی منسوبہ کی جان بچائے - پہلے پہل دوشیزہ کو صادق کی رائے ماننے میں پس و پیش ھوتا ھے کیونکہ وہ پردے سے باھر نکلنے کو اپنے خاندان کی رسوائی خیال کرتی ھے مگر پھر اس کی سمجھہ میں بات آجاتی ھے- وہ صادق اور اپنے بھائی اظہار کے ساتھہ باھر تفریح کو جاتی ھے- خان بہادر کو جو اس کا علم ھوا تو طیش سے آگ بگولا ھوگئے اور بھتیجی داماد دونوں کو گھر سے نکال باھر کیا چنانچہ وہ دونوں اپنے پرانے دوست اور خاندان کے خیر خواہ ڈاکٹر میتھو کے گھر میں پناہ گزیں ھوے —

تیسرے ایکٹ دوسرے سین میں ایکدم سے اس ڈراما کے پڑھنے والے پر یہ حقیقت منکشف ھوتی ھے کہ اظہار اور گل بہار (خادمہ) میں کچھہ ہا ھمی لگاو ھوگیا ھے- اس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ گل بہار قادر سے قطع تعلق کر کے یہاں اظہار کے ساتھہ ھو لیتی ھے- انھیں بھی خان بہادر گھر سے نکال دیتے ھیں- اور یہ دونوں بھی ڈاکٹر میتھو کے یہاں جاکر پناہ گزیں ھوتے ھیں —

اگرچہ اس ڈرامے میں مصنف صاحب نے ھماری سوسائٹی کی ایک بڑی خرابی

کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی آبادی کا ایک اچھا خاصہ حصہ گھروں کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر خود اپنی اور اپنی اولاد کی نشو و نما کو تباہ کر ڈالتا ہے ' فن ڈرامہ نویسی کے اعتبار سے یہ ڈراما ناقص ہے - اول تو جتنے کیرکٹر ہیں وہ سب بے جان سے معلوم ہوتے ہیں - ان کی شخصیتیں معمولی اور امتیاز سے عاری ہیں - جو مواقع (Situations) پیدا کئے گئے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے ڈرامے کے کیرکٹر —

سوشل ڈراما بڑی کارآمد چیز ہے - لیکن اس کے ساتھہ ڈراما نویس پر بڑی ذمہ داریاں بھی عاید ہوتی ہیں - کیرکٹروں کی شخصیت متعین کرنے اور نیز مواقع آفرینی میں کمال احتیاط اور خوش مذاقی درکار ہے — (ی)

اُردو انقلابی قاعدہ

(مرتبہ منشی اکبر علی صاحب بی اے ' بی ٹی ' سابق اپجو ڈیشنل سکریٹری ریاست منگرول - نمبر ۴۲ لیک اسکوائر ' نئی دہلی - قیمت دیڑھ آنہ)

اس زمانے میں اُردو کے متعدد قاعدے شایع ہوے ہیں - ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم میں آسانی ہو اور پرانے طریقے سے جو اُن کے دماغ پر بار پڑتا ہے وہ رفع ہو - اسی نہت سے یہ قاعدہ لکھا گیا ہے - لیکن افسوس ہے کہ قابل مولف کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی - جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہے اُس سے اور اُلجھن بڑھ گئی ہے - پہلے سبق کے بعد ہی مرکب الفاظ شروع کردئے ہیں - یہ درست نہیں ہے - پھر اعراب کی عجیب حالت ہے - ہر آخر حرف پر جزم لگایا گیا ہے - اس کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ اُردو میں آخر حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے - اسلئے میں بھی یکسانی کا خیال نہیں رکھا گیا - ایک جگہ غوطہ الف سے لکھا گیا ہے اور دوسری جگہ ہ سے - یہی حال بعض دوسرے الفاظ کا ہے - اعراب کے قائم کرنے اور لگانے میں بہت بے ترتیبی پائی جاتی ہے - بعض ایسے حروف کے جوڑ بتائے گئے ہیں جو کبھی مل کر نہیں آتے جیسے ط اور گ کا جوڑ یا چ اور ذ وغیرہ - لکھائی چھپائی کاغذ ' تصویریں نہایت ادنیٰ درجے کی ہیں —

ترجمہ انٹرمیڈیٹ پرشین کورس

(از مولوی فضل الدین، فیاض، ہر یانوی بی اے، ایچ پی، پروفیسر فارسی امبالہ کالج - قیمت دو روپے چار آنے)

یہ پنجاب انٹر میڈیٹ کے فارسی نصاب کے حصہ نظم کا انگریزی ترجمہ ہے - اس نصاب میں فردوسی، قصائد سلمان ساوجی، سعادت نامہ، تحفۃ العجم فخری، قصائد سعدی، ہفت بند کاشی، حسین دانش کی تضمین، نظم انوری وغیرہ کا انتخاب ہے - مولوی فضل الدین صاحب نے شروع میں ہر شاعر کے حالات دئے ہیں اور پھر نظموں کا با محاورہ انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - جہاں کہیں ضرورت ہوئی مشکل الفاظ اور محاورات کی تشریح بھی کردی ہے - پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے کار آمد چیز ہے —

دیوان اثر

(مطبوعۂ انجمن ترقی اُردو - مجلد ضخامت دو روپے غیر مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ)

سید محمد نام اثر تخلص، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے ان کا کلام فصاحت اور سلاست کا اعلیٰ نمونہ ہے - واردات قلبی کو ایسی صفائی، حسن و خوبی اور درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے - ان کی لاجواب مثنوی " خواب و خیال " اس سے قبل انجمن ترقی اُردو شایع کر چکی ہے - دیوان اور مثنوی دونوں نایاب تھے - اب دیوان بڑی جستجو اور تلاش سے کمال صحت کے ساتھ طبع کیا گیا ہے - اثر کا کلام اردو ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے - اس میں نہ بعید از کار تشبیہات و استعارات ہیں نہ تخیل کی بلند پروازی ہے، چھوٹی چھوٹی بحریں اور سادہ سادہ لفظ ہیں لیکن زبان اور بیان کے حسن نے جادو کا کام کیا ہے - زبان و ادب کے شائقین کے لئے یہ کلام، جو اب تک نایاب تھا، ایک بڑی نعمت ہے -

---

درسیۂ عثمانیہ

(یعنی اردو کا قاعدہ اور ابتدائی سات کتابیں ' مرتبۂ انجمن ترقی اردو)

یہ سلسلہ انجمن ترقی اردو نے سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کی تجویز و منظوری کے مطابق ریاست حیدر آباد دکن کے مدارس کے لئے مرتب کیا ہے - اس سلسلے میں قاعدہ بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ بچے کم سے کم وقت میں نہایت سہولت کے ساتھ صحیح طور پر اردو لکھ پڑھ سکیں - انجمن نے اس سے قبل کوئی پندرہ سال ہوتے ہیں جب کہ اپنا قاعدہ مرتب کر کے شایع کیا تھا - اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد جتنے قاعدے لکھے گئے سب نے کم و بیش اس کا تتبع کیا - اب وہی قاعدہ ترمیم و اضافے کے ساتھ اس سلسلے میں شایع کیا گیا ہے - اس میں خصوصیت کے ساتھ یہ باتیں قابل غور ہیں —

۱ - سب حروف ایک بار نہیں دئے گئے جن کا پہچاننا اور یاد کرنا بچے کے لئے عذاب ہو جاتا ہے - بلکہ سب سے پہلے صرف تین حرف ایسے دئے گئے ہیں جو سب سے زیادہ آسان اور سادہ ہیں - انہیں تین حروف سے لفظ اور جملے بنائے گئے ہیں - یہ حرف ایسے ہیں - جن میں جوڑ نہیں بلکہ الگ الگ رہتے ہیں (ا ' ر ' د ') —

۲ - اس کے بعد تدریجی طور پر دو دو تین تین نئے حروف کا ایک ایک سبق ہے تاکہ بچے پر بار نہ ہو —

۳ - قاعدہ کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں کہیں جوڑ نہیں تمام الفاظ اور جملے مفرد حروف سے بنائے گئے ہیں دوسرے حصے میں ترجوڑ شروع ہوتا ہے -

۴ - بچے کو حروف کے نام نہیں بتائے جاتے بلکہ ان کی آوازیں بتائی جاتی ہیں اور بچہ انہیں آوازوں کو ملا کر خود بخود لفظ بناتا ہے - ہجے کرنے کا دستور بالکل اٹھا دیا ہے —

۵ - بچے کو رٹنے اور یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ شروع ہی سے وہ اپنی سمجھ سے لفظ بنانے اور پڑھنے لگتا ہے —

۶ - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اعراب کا قاعدہ ایسا منضبط کیا گیا ہے کہ غلطی کا احتمال نہیں رہتا اور بچہ ابتدا ہی سے صحیح پڑھنے اور لکھنے پر قادر ہوجاتا ہے - اردو تحریر میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ لفظ کی صحت کا یقینی

نہیں ہوتا جس طرح جو چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن اس قاعدے اور ریڈروں میں اس کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے ' غلط پڑھنے کا امکان ہی باقی نہیں رہا - اگر یہ رسم خط اردو تحریر میں جاری ہو گئی تو اردو پر جو بہت بڑا اعتراض ہے وہ خود بخود رفع ہو جاے گا —

قاعدہ ہندوستان کے نامور خوشنویس اعتماد رقم منشی علی محمد خاں صاحب سے لکھوایا گیا ہے اور اس کے بلاک بنوا کر طبع کرایا گیا ہے - بچوں کے لئے بجاے خود خوشنویسی کا بہترین نمونہ ہے —

پہلی چار ریڈریں بھی مشہور خوشنویسوں سے لکھوائی گئیں اور بلاک بنوا کر چھپوائی گئی ہیں - ریڈروں کی زبان بہت صاف ستھری اور فصیح ہے - مضامین دلچسپ اور کار آمد ہیں - اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ زبان کی فصاحت اور بیان کی دلچسپی کے ساتھ بچوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہو - اس لئے تاریخ ' جغرافیہ ' ہئیت ' زراعت ' مناظر قدرت ' اخلاق وغیرہ پر بہت اچھے اچھے سبق خاص خاص لوگوں سے لکھواے گئے ہیں - نظمیں کچھ تو پرانی ہیں اور کچھ نئی لکھوائی گئی ہیں جو بہت ہی پر لطف اور سبق آموز ہیں - آخری ریڈروں میں کچھ کچھ حصہ نامور انشا پردازوں کے نظم و نثر کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے ' لیکن وہ انتخاب طلبہ کے ذوق کے مناسب اور ان مصنفوں کا بہترین کلام ہے - تصویریں رنگین اور سادہ خاص طور پر تیار کرائی گئی ہیں - طلبۂ مدارس کے لئے اردو میں اس سے بہتر اب تک کوئی درسی سلسلہ نہیں لکھا گیا اور ہمیں امید ہے کہ ریاست حیدرآباد دکن کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی ان کا رواج نہایت مفید ہوگا —

نصاب مرغوب موسوم بہ جدید الاسلوب

(مؤلفۂ مولوی قمر علی صاحب ایم - اے ایل ایل بی ' ایڈوکیٹ' بریلی)

(قیمت المعلم حصۂ اول دو روپے چار آنے ' حصہ دوم دو روپے چار آنے

نصاب مرغوب حصہ اول و دوم قیمت فی دو روپے چار آنے -

مصباح الابصار قیمت چار آنے)

ہمارے پاس یہ نصاب عربی رائے زنی کے لئے آیا ہے ' فاضل مصنف نے اس میں انگریزی درسی کتابوں کے اصول پر زبان اور قواعد کو ساتھہ ساتھہ بیان کیا ہے تاکہ عربی زبان کے طالب کو دونوں مقابلۃً بہت کم مدت میں اچھی طرح حاصل ہوجائیں - اصل اسباق ابتدا میں چھوٹے چھوٹے عربی کے متداول جملوں پر مشتمل ہیں جو صرف و نحو کے کسی قاعدہ کے تحت بطور مثال کے لکھے گئے ہیں ' ان جملوں کے انتخاب میں فاضل مصنف نے نہایت قابلیت صرف کی ہے - اور اکثر بیشتر وہ جملے یا کلام پاک کی آیتیں ہیں یا عربی کے دوسرے عام متداول جملے اور امثال ' یہ طرز بیان نہایت مرغوب اور جلد ذہن نشین ہونے والا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی شخص توجہ اور محنت سے اس کتاب کو سمجھہ کر پڑھے اور ذہن نشین کرے تو تقریباً تمام کلام پاک کو وہ اچھی طرح زبان عربی کے اصول پر سمجھنے کے قابل ہوجائے گا - اور اس طرح پھر اسے زبان عربی پر بہت جلد قدرت حاصل ہوجائے گی - اس کتاب نے عربی صرف و نحو کو ادب عربی کے ساتھہ بیان کر کے عربی کے طالب پر بہت بڑا احسان کیا ہے اب اسے گرداننی یاد کرنے کی ضرورت نہیں

جتنی مدت میں درس قدیم کے طالب العلم کو شاید صرف و نحو بھی مکمل نہ آتی اس سے کم مدت میں اس نصاب کے پڑھنے سے نہ صرف و نحو بلکہ ادب عربی بھی بہت کچھہ آجائے گا - اور ایسی استعداد پیدا ہوجائیگی کہ پھر زبان کے سمجھنے میں استاد کی ضرورت باقی نہ رہے گی —

جو لوگ عربی سیکھنا چاہتے ہیں ان سے ہم اس کتاب کی پر زور شفارش کرتے ہیں - اس کے دو حصے ہیں - اس کے ساتھہ دوسری کتاب المعلم ہے اس میں ان تمام جملوں اور الفاظ کی تشریح ہے جو نصاب مرغوب میں فاضل مؤلف نے لکھے ہیں گویا یہ نصاب کی مکمل شرح ہے تاکہ طالب العلم کو سرے سے کسی استاد کی ضرورت ہی نہ رہے وہ اپنے آپ محنت کر کے عربی کا اچھا خاصہ ادیب بن سکے اس کے بھی دو حصے ہیں-اس مکمل سلسلہ کی قیمت عہ آٹھہ آنے ہے —

فاضل مولف نے نصاب مرغوب پر چالیس صفحہ کا ایک نہایت دلچسپ مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں اپنی کتاب کی ضرورت اور خوبی بیان کی ہے - اسے مصباح الابصار کے نام سے علیحدہ بھی چھپوا دیا ہے -

اس کی قیمت چار آنے ہے —

ہم چاہتے تھے کہ جس قدر مفید اور آسان وعمدہ طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے ویسی ہی اس کی کتابت اور طباعت بھی دیدہ زیب ہوتی تاکہ طالب العلم کے لئے مزید سہولت ہوتی اور یہ مروجہ انگریزی درسی کتابوں کے ہر حیثیت سے ہمپایہ ہو سکتی، مقدمہ کی زبان میں قدامت کے آثار نمایاں ہیں مگر اس سے نفس کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا —

تاریخ و سیر

عرب و ہند کے تعلقات

(مولاناسید محمد سلیمان صاحب ندوی-متوسط تقطیع صفحات ۴۰۲
قیمت ۴ روپیہ - ہندوستانی اکادیمی - الہ آباد)

یہ کتاب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی ان تقریروں پر مشتمل ہے جو موصوف نے مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی اکادمی (یو پی) کے زیر اہتمام کی تھیں - اس کتاب میں پانچ باب ہیں - پہلے باب میں ہندوستان اور عرب کے ابتدائی تعلقات کے متعلق عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں سے چھان بین کر کے نہایت مفید اور کار آمد معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں چنانچہ ابن خرداذبہ نے اپنی مشہور کتاب المسالک و الممالک میں اور سلیمان تاجر، ابودلف مسعربن مہلہل ینبوعی بزرگ بن شہریار ناخدا، مسعودی، اصطخری، ابن حوقل، بشاری مقدسی، البیرونی اور ابن بطوطہ نے جو ہندوستان کے حالات لکھے ہیں ان کے اقتباسات موقع محل کے مطابق درج کئے گئے ہیں - دوسرے باب میں ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات کا ذکر ہے - اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یونانی تجارت کے زوال کے بعد

متمدن دنیا کے تجارتی راستوں پر عربوں کا قبضہ ہوا اور مشرقی ممالک اور یورپ کا سارا بیوپار انھیں کے ہاتھوں ہوتا تھا - اسی بحری تجارت کی بدولت عباسیوں کے زمانہ میں اسلامی تمدن نے رونق پائی - تیسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح عباسیوں کے عہد میں 'برا مکہ' کی سرپرستی میں ہندی علوم و فنون کی 'بغداد' میں رسائی ہوئی اور سنسکرت سے کلیلہ' طب' ہیئت' منطق اور ادب و اخلاق کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا - اسی سلسلے میں مولانا نے 'سنھو' اور 'برتھولڈ' کی تائید کی ہے کہ 'برا مکہ' کا دراصل مجوسیوں کوئی نسلی تعلق نہ تھا جیسا کہ اکثر مورخوں نے لکھا ہے بلکہ ان کے اجداد 'بدھ' مت کے ماننے والے تھے - اسی وجہ سے انہیں ہندوستان کے علوم و فنون سے خاص ہمدردی تھی - چوتھے باب میں ہندوستان اور عرب کے مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس باب میں دراصل ان دو ملکوں کے باہمی مذہبی اثر و تعلق کو دکھانے کے بجائے ہندوستانی مذاہب و رسوم کے متعلق عرب مصنفین کی رائے پیش کی گئی ہے - اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان کے عرب اور ترک و افغان و مغل فاتحوں کے مذہبوں میں' باوجود ظاہری مشابہت کے' فرق تھا - آخری باب میں ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے پہلے کی عربی نوآبادیوں اور تجارتی منڈیوں کا حال دیا ہے - ان نو آبادیوں کے چھ بڑے بڑے مرکز تھے - سرندیپ' مالدیپ' ملیبار' گجرات' اور سندھ - ان کے (کارومنڈل) دہ' پٹن' اور بدھ پٹن میں بھی ان کے تجارتی مرکز موجود تھے —

یہ کتاب ہندوستان کی آبادی ابتدائی اسلامی تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے - اس سے پہلے اب تک کسی نے اس عہد کی تاریخ کو اس قدر جامع اور مرتب طور پر نہیں پیش کیا ہے - جس زمانے کے حالات پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے' یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک' وہ ہماری تاریخ کا ایسا باب ہے جو اس وقت تک تاریکی میں ہے - اب تک لے دیکر ہماوی والذیمت کا سارا دار و مدار الہق صاحب کی تاریخ پر تھا جنھوں نے اپنی کتاب میں عربی اور فارسی ماخذوں سے نہایت ہی کار آمد اور مفید اقتباسات جمع کردئے ہیں - مگر تاریخی تحقیق کو اس وقت تک مکمل نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس کے نتائج خود ماخذوں کی چھان بین کے بعد قایم نہ کئے جائیں —

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس موضوع کی تحقیق میں نہ صرف یہ کہ مولانا نے سب ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا ہے بلکہ اپنے نتیجے قایم کرتے وقت اُس بصیرت سے بھی کام لیا ہے جس کے بغیر تاریخی تحقیق ادھوری رہتی ہے یا یوں کہیے کہ اس کی حیثیت واقعات و سنین کے ایک بے معنی طومار سے زیادہ نہیں ہوتی - اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'قطب الدین ایبک کی مرکزی حکومت (دہلی) کے قیام سے کئی صدیاں پیشتر مسلمانوں نے مغربی اور جنوبی ہند میں اپنی نو آبادیاں جو اکثر تجارتی منڈیاں تھیں' قایم کرلی تھیں —

مگر اس کتاب میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ہمیں اختلاف ہے اور جو ہماری رائے میں تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں - مثلاً پہلے باب میں مولف نے نہایت نیک نیتی سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عربوں کو ہندوستان کے ساتھ ہمیشہ ایک قسم کا روحانی تعلق رہا ہے - اس کے ثبوت میں صفحہ ۳ پر اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "مجھے ہندوستان کی طرف سے رحمانی خوشبو آتی ہے" ہمارے خیال میں اصول درایت اور تاریخی تنقیح کی بنا پر اس روایت کو کوئی مورخ بھی صحیح تسلیم نہ کرے گا - اصل یہ ہے کہ عرب اور ہندو تاریخ میں دو ایسی قومیں ہیں جن کے ذہنی اور روحانی نقطہاے نظر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں - شاید ہی دو ایسی قومیں ہوں جن کی زندگی کے اصول اتنے مختلف ہوں جتنے کہ ان دونوں کے ہیں - پھر صفحہ ۳ پر ایک روایت نقل کی گئی ہے جس کے بیان کے مطابق جنت سے چار دریا نکلے ہیں نیل، فرات، جیحوں اور سیحوں - مولانا کے نزدیک اس چوتھے دریا سے گنگا مراد ہے - صفحہ ۴ پر امام حسین علیہ السلام کی والدہ کو بجاے ایرانی ہونے کے سندھی بتایا گیا ہے - آگے چل کر صفحہ ۱۱ پر سوامی 'دیانند' کے حوالے سے اس دعوے کو بلا غور و تامل تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مہا بھارت کے زمانے میں ہندوستان میں عربی داں لوگ موجود تھے - چنانچہ جب کوروؤں نے لاکھہ کے گھر میں پانڈوؤں کو جلا کر پھونکنے کا قصد کیا تو ودرجی نے عربی زبان میں 'یدھشٹر' کو اس کی خبر کردی - 'یدھشٹر' نے بھی عربی زبان میں انھیں اس کا جواب دیا - یہ سب حکایتیں بالکل نا معتبر ہیں جنھیں اس کتاب میں نہ ہونا چاہئے تھا - یا یہ

کہنا کہ عرب ہندوستان کو " اپنا موروثی پدری وطن " اس لئے سمجھتے ہیں کہ بعض روایتوں کے مطابق حضرت آدم جنت سے ہندوستان کی دکنی سر زمین پر پھینکے گئے تھے ' مورخانہ تعدیل کا خون کرنا ہے —

سندہ کی اسلامی تاریخ میں سومرہ اور سامہ خاندانوں کے متعلق ہماری معلومات اب تک بالکل ناقص ہیں - بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ سومرہ خاندان کی حکومت غزنویوں کے عہد سے لیکر محمد تغلق کے زمانہ تک رہی اور پھر اس کے بعد سامہ خاندان برسر اقتدار ہوا - اس خاندان کی حکومت اکبر اعظم کے عہد تک رہی جب کہ یہ سب علاقہ سلطنت مغلیہ میں ملحق کر لیا گیا - مورخین کو اس میں برابر اختلاف رہا ہے کہ آیا یہ دونوں خانوادے عربی نژاد تھے یا ھندی - عبدالعلوم شرر صاحب اپنی تاریخ سندہ میں اس خیال کے حامی معلوم ہوتے ہیں کہ یہ عربی الاصل تھے - اس کے برخلاف بعض انگریز مورخوں نے انہیں ھندی کہا ہے بلکہ الفنسٹن نے تو بلا تحقیق انہیں راجپوت قرار دے دیا ہے مگر تاریخی قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری خاندان کے زوال کے بعد سندہ کے دیسی قبیلوں نے سر اٹھایا اور سومرہ انہیں قبیلوں میں سے ایک تھا یا یہ کہ سومرہ کسی ھندی اسلامی قبیلے کے سردار کا نام تھا جس نے محمود غزنوی کے عہد میں یا اس سے کچھ قبل ملتان کے آس پاس کے علاقہ میں اقتدار حاصل کرلیا تھا - ان خاندانوں کے متعلق الہیت نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد کے ضمیمے میں جو مواد اکٹھا کر دیا ہے اس کے سوا اب تک ہمارے مورخوں نے کوئی نئی بات نہیں بتائی - اصل میں تاریخی اعتبار سے اس پورے زمانے کی ترتیب و تدوین ابھی باقی ہے - ہمارا خیال تھا کہ " عرب و ہند کے تعلقات " سے یہ کمی پوری ہوجائے گی لیکن جیسا کہ مولف کو خود اس کا احساس ہے وہ مواد کے نہ ہونے کے باعث یا اور کسی وجہ سے یہ کام کماحقہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے —

مولف نے سومرہ اور سامہ حکمرانوں کے جو نام تحفۃ الکرام اور میرمعصوم کی تاریخ سندہ کے حوالے سے گنوائے ہیں ان میں ایسے نام بھی ہیں جو آدھے ھندی اور آدھے اسلامی کہے جاسکتے ہیں جیسے محمدتور ' عمر سومرہ ' جام نندا ' جام نندا نظام الدین ' جام تماجی ' جام جونا وغیرہ - یہ نام ورخ کی بہت کچھ رہنمائی کرسکتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ھندی اسلامی تمدنوں اور زندگی کے تصورات کا اختلاط نہایت خوبی سے اس زمانے میں عمل میں آرہا تھا - اس طرح تحقیق کا ایک بڑا میدان

کھل جاتا ہے - ہر مورخ کے لئے از بس ضروری ہے کہ کسی قوم کی سلطنت کی تاریخ کے ساتھہ ساتھہ اس کے تمدن اور خیال کی تاریخ بھی دنیا کو بتائے کیونکہ اقوام کے تمدن و اعتقاد میں جو وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کی اہمیت زندگی کے لئے فوجی نقل و حرکت یا تعیین سنین سے کہیں زیادہ ہے چنانچہ اگر علاقۂ سندہ کی مذہبی اور معاشرتی تاریخ پر ہم نظر ڈالیں تو اس چیستان کا حل ہمیں مل جائے گا جو ان ہندی اسلامی مخلوط ناموں سے پیدا ہوتی ہے --

آج اس زمانے میں بھی سندہ کے ہندو اور مسلمان کا شتکار زندہ پیر کا بڑا ادب کرتے ہیں، منتیں مانتے ہیں اور ان کی معجمت میں گیت گاتے ہیں - یہ زندہ پیر کون تھے ؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سندہ میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندو کاشتکار دریائے سندہ (انڈس) کے دیوتا کی پوجا کرتے تھے - ظاہر ہے کہ اس دریا سے انہیں اتنا خلوص و اعتقاد اس لئے تھا کہ ان کی روزی اسی کی فیاضی پر منحصر جب یہی لوگ مسلمان ہوئے تو بھی ان کی زندگی میں اور گرد و پیش میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا - انہوں نے اسلام کے احکام بھی تسلیم کئے اور اپنے قدیم بھگوان داتا دریائے سندہ کے ساتھہ بھی خلوص و نیازمندی کا لگاؤ باقی رہنے دیا - چنانچہ اسی پرانے دیوتا کو آج کل مسلمان زندہ پیر یا خواجہ خضر کہتے ہیں اور ہندو اندرو لال کے نام سے یاد کرتے ہیں - 'بکر' کے قریب ایک درگاہ ہے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا سالانہ میلہ لگتا ہے - مسلمان اسے زندہ پیر کی درگاہ کہتے ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اندرو لال کی خاک یہاں دفن ہے - سندہ کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک ایسا فرقہ پایا جاتا ہے جو اندرولال کو اوتار مانتا ہے - یہ لوگ موحد ہیں - یہ فرقہ دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا * - چنانچہ وثوق کے ساتھہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فرقے کے پیدا ہونے میں اسلام کی تحریک ضرور موثر ہوی ہوگی - ہمارے اس نتیجہ کی خاص کر اس سے اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں اسماعیلیوں اور قرامطہ کے مبلغین سندہ میں موجود تھے اور کبھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس گُر سے بخوبی واقف تھے کہ کسی عقیدے کے پھیلانے

---

* ملاحظہ ہو (Indain Antiquary) ۱۹۱۸

کسی عقیدے کے پھیلانے کا بہترین اور سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ جس قوم میں اس عقیدے کی نشر و اشاعت کی جارہی ہے اس کے قدیم رسوم و عقاید میں سے بعض کو چن کر ان کے ساتھ اس عقیدے کا امتزاج کر دیا جائے - چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور اس لئے انھیں بڑی کامیابی ہوئی - آج بھی خوجے حضرت علی کو وشنو کا اوتار مانتے ہیں - بعد کے زمانے میں بہت سے صوفیا نے بھی اس اصول پر عمل کیا - ان کے نزدیک ایسا کرنے میں نہ صرف مصلحت تھی بلکہ انہیں اس طریقے میں سچائی بھی نظر آئی —

ہم نے ان مسائل کی طرف اس لئے توجہ دلائی ہے کہ وہ ہمارے نزدیک تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں - ورنہ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے مولانا کی یہ کتاب یقینی طور پر ہمارے تاریخی ادب میں ایک نہایت مفید اضافہ ہے - اس میں صحت کا بھی التزام رکھا گیا ہے - صرف صفحہ ۵ پر ایک غلطی رہ گئی ہے - کہا گیا ہے کہ " شمالی ہندوستان میں درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں اور افغانوں کا زمانہ چودھویں صدی ہجری کا آغاز ہے " حالانکہ محمود غزنوی کا پہلا حملہ ۳۹۰ ہجری بمطابق سنہ ۱۰۰۰ ع میں ہوا ہے —

اس کتاب کی زبان نہایت سلیس اور صاف ہے مولف نے لفظوں کے استعمال میں متانت ' اعتدال اور صحت کو ملحوظ رکھا ہے اور ہمارے اکثر مورخوں کی عادت کے خلاف خطیبانہ مبالغوں سے احتراز کیا ہے - ایک علمی مضمون کے لئے اس سے عمدہ اسلوب بیان نہیں ہو سکتا —

(ی)

ملیبار

(از حکیم شمس اللہ صاحب قادری - صدر دفتر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ دس آنے میں مل سکتی ہے)

قابل مولف نے اس رسالے میں ملیبار کے جغرافی حالات' اس کی قدیم تاریخ' اقوام عالم کے ساتھ تعلقات ' مسلمانوں کا توطن ' خاندان علی راجہ ' قرون وسطیٰ کے سیاح اور ان کے سفر نامے اور ساحل ملیبار پر پرتگیزوں کے اقتدار کے متعلق نہایت مفید معلومات کو ایک جگہ جمع کردیا ہے - جیسا کہ اس رسالے کے آخر میں " کتابیات " کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے مولف موصوف نے عربی ' فارسی اور انگریزی کتابوں

کے وسیع مطالعہ کے بعد اسے مرتب کیا ہے - اور واقعات کی چھان بین میں اپنی ذاتی تحقیق سے بھی کام لیا ہے —

بعض بیانات کی نسبت ہمیں کچھ شبہات ہیں جنھیں یہاں بتا دینا ضروری ہے - مولف موصوف نے W. R. Philips کے حوالے سے لکھا ہے کہ مقدس تھوما ملیبار آئے تھے اور میلاپور میں اس جہان سے رخصت ہوے - مگر تاریخ میں صرف نسطوری عیسائیوں کے مبلغین کے متعلق ذکر ملتا ہے کہ وہ عراق، یمن اور حضرموت کے عیسائی تاجروں کے ساتھ آئے تھے - انھوں نے جنوبی ہند میں اپنے کلیسا بھی تعمیر کئے - بعض مورخوں نے اس واقعہ کو بہت اہمیت دی ہے - ان کا خیال ہے کہ ان مبلغین کی تعلیمات کا ہندی عقاید و خیال پر مستقل اثر پڑا - مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کرشن اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے حالات میں جو مشابہت ہے یا عیسائیوں کے Logos اور ہندوؤں کے نظریۂ "واک" میں جو مماثلت ہے وہ سب مسیحی اثر کی بدولت ہے - تعجب یہ ہے کہ سرجارج گریرسن جیسے محقق نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے - کیا ہم اسے ان کی مذہبیت اور اپنے مذہب کی بڑائی کے خیال پر محمول کریں ؟ مگر یورپ کے دوسرے مستشرقین نے جن میں موسیو بارتھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس نظریہ کو بالکل غلط ٹھہرایا ہے اور اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ نسطوریوں کا اثر بہت محدود تھا اور مقدس تھوما کا ہندوستان جانا محض ایک بے بنیاد افسانہ ہے جو مورخانہ تنقید تنقیح کی تاب نہیں لا سکتا —

پھر مولف موصوف نے صفحہ ۲۴ پر شنکر اچاری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "ویدوں کا مشہور مفسر اور وشنو مذہب کا ہادی" تھا - حالانکہ شنکر اچاری نے ویدوں کی نہیں، بلکہ برھمسترا" کی تفسیر لکھی ہے جس میں اس نے اپنشدوں کے فلسفۂ وحدت الوجود کے مطابق انسان اور کائنات کی تعبیریں کی ہیں - وہ در اصل فلسفۂ ویدانت کا مدون اور مرتب ہے - غالباً مولف موصوف کو وید اور ویدانت میں غلط فہمی ہوگئی - فلسفہ ویدانت کا وید سے کوئی تعلق نہیں - یہ چھ ہندو فلسفوں میں سے ایک ہے جس میں برھما کے سوا جو، تنہا حقیقت ہے، اور سب کائنات مایا ہے - اس کے متبعین کو طنزاً مایا وادن" (مایا یا دھوکہ کے مبلغ) کہا جاتا تھا - یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ "وہ وشنو مذہب کا ہادی" تھا - وہ

شیو جی کا پوجاری تھا - چنانچہ اس کا لقب شنکراچاری خود اس کی بڑی شہادت ہے - شنکر ' شیوجی ہی کا ایک نام ہے وشنو مذہب تو اس کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے - اس مذہب کے ہادی رامانج نے شنکر اچاری کے جواب میں " برہم سترا " کی دوسری تفسیر لکھی تھی جس میں اس کے دلائل کو رد کیا تھا اور شخصی خدا کے وجود ' کائنات ' اخلاق اور زندگی کی ذمہ داری کو " مایا " نہیں بلکہ حقیقت سے تعبیر کیا تھا —

صفحہ ۱۱ پر عجمی جہاز ران بزرگ بن شہریار کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے چوتھی صدی میں سنہ ۴۰۴ ھ (۱۰۱۳ ع) سے پہلے ایک کتاب اپنے بحری سفروں کے حالات میں لکھی " پھر وقائع مہمہ کی فہرست میں لکھا ہے کہ اس کی کتاب عجائب الہند ۴۰۴ھ سے پہلے لکھی گئی - حالانکہ بزرگ بن شہریار نے سنہ ۳۰۰ ھ میں اپنی سیاحت شروع کی - غالباً یہاں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ چوتھی ہجری کو ۴۰۰ ھ سمجھا گیا ہے - حالانکہ چوتھی ہجری سنہ ۳۰۰ ھ سے شروع ہوتی ہے —

ملک اشرف ابوالنصرقا تصور بادشاہ مصر نے ۱۵۰۷ میں اور سلیمان والیٔ روم نے سنہ ۱۵۳۸ ع میں پرتگیزوں کے اثر کو توڑنے کے لئے ساحل گجرات پر جو جنگی بیڑے بھیجے ان کے متعلق بہت سرسری طور پر دو صفحوں پر اکتفا کیا گیا ہے حالانکہ پرتگیزوں کی یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی جنگی مہموں کی کامیابی تاریخی اعتبار سے بہت وقیع ہیں - یہ دراصل مشرق کی شکست اور مغرب کی فتح کا اعلان تھا - اس کے بعد سے آہستہ آہستہ متمدن دنیا کی ساری تجارت اور لین دین مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر اہل یورپ کے قبضے میں پہنچ گیا - یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محمود غزنوی نے وسط ایشیا میں نہایت مستحکم حکومت قائم کرلی تھی سندھ پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا - اگر بادشاہ مصر ، والیٔ روم ' اور سلطان محمود غزنوی کو اتنی توفیق ہوتی کہ متفقہ طور پر پرتگیزوں کا مقابلہ کرتے تو ممکن تھا کہ آج تاریخ عالم کی رفتار وہ نہ ہوتی جو اب ہے —

اس کتاب کی زبان سادی اور سلیس ہے (ی)

سلطان شہید

محمود خاں صاحب محمود بنگلوری نے اس مختصر رسالے میں سلطان ٹیپو کی زندگی، اس کے جنگی کارنامے اور نیز انتظامات ملکی کے متعلق سرسری حالات بیان کئے ہیں - اس میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ سلطان ایک مسلمان متعصب وطن بادشاہ ہوا ہے جس نے برابر یہ کوشش کی کہ مرہٹوں اور نظام کو انگریزوں کے جال میں نہ پھنسنے دے مگر کامیاب نہ ہوا - مولف نے سلطان کی علم دوستی اور وسیع الخیالی کا بھی ذکر کیا ہے - اور اس ضمن میں سلطان کے اس خط کا ترجمہ نقل کیا ہے جو اس نے سنہ ۱۷۹۳ ع میں جگت گرو شنکر اچاریہ شری سچدا نند بھارتی کو لکھا تھا - اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مذہب والوں کا خیال رکھتا تھا - چنانچہ ہندوں کے مذہبی رہنماؤں کو خلعت و تحایف سے سرفراز کرتا رہتا تھا - آج بھی سرنگر میں وہ فرمان موجود ہے جس میں اس نے اس مٹھ کے لئے جاگیر عطا کی ہے —

اصل میں ان تمام حالات کو چند صفحوں میں نہایت سرسری طور پر بیان کیا جاسکتا ہے - ہم مولف صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ان سب فرامین کو علحدہ شائع کریں جو میسور کے سرکاری عجوزیم یا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال یا ہندوستان میں اور کہیں موجود ہیں - فرانسیسی زبان میں مو سیو مارٹینو Martineau نے ہمارے ملک کی اس عہد کی تاریخ کے متعلق نہایت کارآمد سلسلہ شائع کیا ہے، اس میں فرانسیسیوں کے ہندوستان سے تعلقات کے متعلق جتنا مواد انہیں اس عہد کے فرانسیسی گورمنٹ کی سندوں اور دستاویزوں کی بدولت مل سکا جمع کردیا ہے - سلطان ٹیپو کے فرانسیسیوں کے ساتھ برابر آخر دم تک نہایت گہرے تعلقات رہے - چنانچہ اس نے نپولین کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت بھی دی تھی - مگر زمانے نے ان منصوبوں کو پورا نہ ہونے دیا - بہر حال اس سلسلے میں بھی بہت کچھ مواد مل سکتا ہے —

اس رسالے میں مولف صاحب کے جوش خطابت کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے - جیسے صفحہ ۳۸ پر :-" آہ ! وہ سلطان جو ہندوستان میں ترکی اسلام کا آخری خدنگ تھا ' وہ سلطان جو پشت و پناہ دین تھا ' وہ سلطان جس کا وجود اسلامیان ہند کے لئے قدرت کی طرف سے آخری مہلت تھی " - وغیرہ —

تاریخ نے مدتیں ہوئی خطابت کی زبان میں بولنا چھوڑ دیا ہے - اب جو کچھ اسے کہنا ہوتا ہے اپنی سیدھی سادی بولی میں ٹھیک ٹھیک کہہ دیتی ہے — (ی)

چمنستان مظفر

(مولفۂ مولوی مظفر حسین خاں صاحب سلیمانی)

یہ کتاب مولوی مظفر حسین خان صاحب سلیمانی نے ہندوستان کے ایک فاضل اور اپنے ہم وطن پروفیسر سید اولاد علی مرحوم کے حالات میں لکھی ہے —

سید صاحب موصوف سلطنت اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے بھائی صاحب عالم مرزا محمد جواد علی بہادر عرف جرنیل صاحب کے استاد ' مشہور اور مختار کار تھے —

انتزاع سلطنت کے بعد جب بادشاہ کی والدہ ' ولی عہد بہادر اور جرنیل صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اپنے حقوق کی پیروی کے لئے انگلستان گئے تو سید صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے - بادشاہ کی والدہ اور بھائی کا وہیں انتقال ہوگیا اور جب یہ لٹا قافلہ اپنے وطن کو واپس آگیا تو سید صاحب وہیں رہ گئے - پہلے ان کا تقرر کیمبرج یونیورسٹی میں ہوا اور اس کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی اور اردو کے پروفیسر ہوگئے - بوجہ علم و فضل ان کی وہاں بہت عزت و وقعت تھی اور ۳۷ سال تک پروفیسری کی خدمت انجام دی - انگریزی میں بھی انہوں نے اعلیٰ قابلیت حاصل کر لی تھی - وہیں شادی کی اور اس سے ایک بیٹا بھی ہوا جو ڈاکٹر

تھا - آخر سنہ ۱۸۹۸ء میں انتقال کر گئے - بیچ میں وہ سال تہرہ سال کے لئے اپنے وطن بھی آئے اور شاہ آباد اور لکھنو میں ان کے لکچر ہوئے جو بڑے شوق اور دلچسپی سے سنے گئے —

مولوی مظفر حسین صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے بڑی تحقیق اور جانکاہی سے ہندوستان کے ایک ایسے فاضل کے حالات جمع کئے ہیں جسے ہم بھول گئے تھے - ان حالات کے ضمن میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر آگیا ہے جو بادشاہ کی والدہ وغیرہ نے اپنی سلطنت کی واپسی کے لئے انگلستان میں کیں - اس کتاب کے پڑھنے سے اس زمانے کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور خاص کر اس بات کے معلوم ہونے سے خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے ایک شخص نے محض اپنے علم و فضل سے انگلستان جیسے ملک میں ہر دلعزیزی اور عزت حاصل کی - تمام کتاب بہت دلچسپ اور مطالعہ کے قابل ہے —

حفظان صحت

رہنمائے صحت

(مہاتما گاندھی کی کتاب کا ترجمہ از محمد اعظم خاں صاحب نصیر وکلا، عثمان پورہ، حیدرآباد دکن قیمت ۱۲ آنے)

یہ کتاب مہاتما گاندھی کی ایک مختصر سی کتاب کا ترجمہ ہے جو اصل میں گجراتی میں تھی، گجراتی سے انگریزی میں ترجمہ ہوی اور اس انگریزی کا یہ اردو ترجمہ ہے —

صحت کسے عزیز نہیں، لیکن انسان حظ نفس کی خاطر ایسی بے اعتدالیاں کرتا ہے کہ اپنی صحت کھو بیٹھتا ہے - اس کتاب کے شروع

میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ صحت دواؤں کے استعمال یا طبیب کے علاج سے نصیب نہیں ہوتی بلکہ اصول صحت کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ سخت مغالطہ ہے "کہ کسی مرض کا علاج بغیر دوا کے نہیں ہو سکتا۔ اس خیال نے نوع انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے اُسے اس قدر نقصان ہوا ہو"۔ اور کیا خوب کہا ہے کہ "جہاں ایک دفعہ کسی گھر میں دوا کی شیشی داخل ہوئی پھر وہ کبھی نکلنے کا نام نہیں لیتی بلکہ اپنے ساتھ اور شیشیوں کو بھی کھینچ لاتی ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی صاف ہوا، صاف پانی کا استعمال کرے، سادہ غذا کھائے، نشہ کی چیزوں سے پرہیز کرے، بے اعتدالیوں سے باز رہے، ضروری ورزش کرے تو نہ وہ بیمار ہوگا، نہ اس کی طبیعت کسل مند ہوگی۔ زیادہ دنوں تک زندہ رہے گا، اور جب تک زندہ رہے گا، توانا اور خوش رہے گا۔ جسم اور دماغ دونوں اچھی حالت میں رہیں گے اور اپنا کام زیادہ تن دہی اور اطمینان سے انجام دے گا۔ اس کتاب میں اسی کے گُر بتائے ہیں جو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور ذرا سے غور کے بعد قبول کرے گا۔ یہ کتاب ہر شخص کو پڑھنی چاہئے کیونکہ ہر شخص صحت کا آرزو مند ہے اور اکثر بیماریاں ہماری ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ترجمہ بہت اچھا اور صاف ہے —

ماں اور بچہ

(مصنفہ ڈاکٹر بود ھراج چوپڑہ صاحب ایم بی سی، ایچ بی۔ مینیجر رام رتن، لاہور۔ صفحات ۴۱۴ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے)

ہندوستان میں بچوں کی اموات کی جس قدر کثرت ہے دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ اس کی وجہ جہالت ہے۔ ڈاکٹر بود ھراج صاحب سالہا سال سے بچوں کے امراض کے علاج کر رہے ہیں اور اس فن میں خاص مہارت حاصل ہوگئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب جو انہوں نے ایک مدت مدید کے تجربے کے بعد لکھی ہے، ہمارے ملک کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔

پہلے یہ کتاب انہوں نے انگریزی میں لکھی تھی جو کثرت سے شایع اور مشہور ہوئی - اب انہوں نے اردو میں اس کا سلیس اور آسان ترجمہ اپنے اہل وطن کے لئے شایع کیا ہے - اس کتاب میں بچوں کی اموات کے اسباب، حاملہ عورت اور بچے کے پیدا ہوتے وقت کی احتیاطوں، دودہ پلانے کی ہدایات، دایہ، دودہ چھڑانے، مصنوعی دودہ پلانے، بچے کی جسمانی، دماغی، روحانی ترقی، بچے کی عام بیماریوں، بچے کی دماغی کمزوری کے اسباب اور علاج کے متعلق نہایت تفصیل سے بحث کی ہے - اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو جو بال بچوں والا ہے اور خاص کر ماؤں کو بیحد فائدہ پہنچے گا - یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر گھر میں رکھی جاے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کیا جاے —

اُردو کے جدید رسالے

ادب

(اڈیٹر سید اعظم حسین صاحب - لکھنؤ - سالانہ قیمت چار روپے)

یہ ماہانہ رسالہ تقریباً ایک سال سے لکھنؤ سے شایع ہو رہا ہے - خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ سے ایسا اچھا رسالہ نکل رہا ہے - اگرچہ اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر یہ ادبی رسالہ ہے اور ادبی لحاظ سے اچھے اچھے مضمون ہوتے ہیں - نظم و نثر دونوں میں زبان کی خوبی کا لحاظ رکھا جاتا ہے - تنقید و تبصرہ اکثر بے لاگ اور ادیبانہ ہوتا ہے - زبان و ادب کے شایقین کے لئے بہت اچھا رسالہ ہے - اس کا عید نمبر بڑے سلیقے سے مرتب ہوا تھا —

نیرنگ

(اڈیٹر : محمد عزیزالدین صاحب - دھلی - سالانہ چندہ سارے تین روپے)

یہ رسالہ دھلی سے شایع ہوتا ہے اور اس کا مقصد اردو علم و ادب کی ترویج و اشاعت ہے - دھلی کے رسالے کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے - اس کا ایک دھلی نمبر اس سال کے شروع میں شایع ہوا تھا جس میں بہت اچھے اچھے مضمون ناظمین اور تصویریں تھیں - یہ وہی نیرنگ ہے جو پہلے رام پور سے شایع ہوتا تھا اور اب دلی میں منتقل ہو گیا ہے - اس سے قبل بھی اس میں بہت اچھے علمی اور ادبی مضامین شایع ہو چکے ہیں —

معلومات

(اڈیٹر احمدالدین احمد صاحب سارھوری
ایم اے - الہ آباد - سالانہ چندہ دو روپے)

یہ چھوٹی سی تقطیع پر الہآباد سے اسی سال شایع ہوی ہے - اس کا مقصد آسان زبان میں علمی معلومات بہم پہنچانا ہے - یہ بہت ہی مبارک مقصد ہے اور ہماری تمنا ہے کہ یہ رسالہ جاری رہے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو - ایسے رسالوں کی ہمارے ملک کو بہت ضرورت ہے - اگرچہ اس کا حجم بہت کم اور تقطیع چھوٹی ہے مگر اس پر یہ مثل صادق آتی ہے " بقامت کہتر و بقیمت بہتر " - ہمیں امید ہے کہ اس کی قدر کی جائے گی اور خاص کر مدارس میں اسے رواج دیا جائیگا —

پیام اسلام

(زیر سرپرستی انجمن اشاعت اسلام جالندھر - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ مذھبی اور تبلیغی رسالہ ہے اور اپنے مقصد کو خوبی سے انجام دے رہا ہے لکھنے والے بھی اچھے ہیں اور مضامین بھی مذھبی اعتبار سے خوب ہوتے ہیں —

بصیرت

(مدیر مولوی عبدالحق صاحب و دیارتھی ' نائب مدیر)

مولوی محمد عصمت اللہ صاحب-لاہور - سالانہ چندہ چار روپے)

یہ نیا رسالہ ہے جو رسالوں اور اخباروں کے جنم بھوم لاہور سے شایع ہوا ہے - اگرچہ اس میں علمی اور ادبی مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر اسے شغف مذہب سے ہے - مگر تعصب سے اس کا دامن آلودہ نہیں وہ آپس کے اتحاد کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کسی مذہب پر دلخراش حملہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی خوبیوں کا قائل اور ان کا بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتا - یہ روش قابل تعریف ہے —

حصار اسلام

(اڈیٹر میاں سلطان احمد وحودی
ایم آر اے ایس لندن - بتالہ - سالانہ چندہ دو روپے)

اگرچہ یہ مذہبی پرچہ ہے لیکن اس میں ادبی اور دلچسپ مضامین بھی ہوتے ہیں - سامیات سے بھی بحث ہوتی ہے - ایک ناول کا ترجمہ بھی چھپتا ہے ایک آدہ تصویر بھی ضرور شائع ہوتی ہے - اکثر مضامین تبلیغی رنگ کے ہوتے ہیں جن صاحبوں کو اس قسم کی چیزوں سے دل چسپی ہے ان کے لئے خوب ہے —

عزیز

(اڈیٹر بشیر احمد صاحب - سالانہ چندہ تین روپے
عزیز آفس ' پاتکامہلشن ' بینڈی بازار بمبئی)

خوشی کی بات ہے کہ بمبئی شہر سے اردو کا ایسا اچھا رسالہ نکلتا ہے - اس

میں لڑکے لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے بڑی بعض خاص مضمون ہوتے ہیں ' یہ اس میں بڑی خوبی ہے - زبان صاف اور سادہ ہے - نظمیں بھی اچھی ہوتی ہیں - انعامی مضامین بھی لکھوائے جاتے ہیں - مضمون دلچسپ ہوتے ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ہے —

ھونہار

(مونیجۂ اکرم صاحب بی اے سالانہ چندہ
پانچ روپے - قومی کتب خانہ ' ریلوے روڈ لاہور)

یہ ہفتہ وار رسالہ بچوں کی خاطر نکلتا ہے - ہماری زبان میں بچوں کے پڑھنے کے لئے کتابیں ' اخباروں اور رسالوں کی بہت کمی ہے اس لئے جو صاحب لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اس قسم کی کوشش کرتے ہیں وہ بڑا اچھا کام کرتے ہیں یہ رسالہ بہت خوشخط اور اچھا چھپا ہے ' زبان بھی اس کی سادہ ہوتی ہے - مضامین بھی بچوں کے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں - لیکن بعض اوقات ایسے مضامین بھی شایع ہو جاتے ہیں جن سے ہمارے ملک کے بچوں کو زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اسے شوق سے پڑھ سکتے ہیں - جہاں تک ممکن ہو ایسی چیزیں لکھنی چاہئیں جنھیں بچہ شوق اور دلچسپی سے پڑھے اور اس کے علم میں بھی اضافہ ہو - اگرچہ اس کی زبان اچھی اور سلیس ہے تاہم اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی لفظ خلاف محاورہ اور غلط استعمال نہو کیونکہ بچپن کی غلطی بڑی مشکل سے نکلتی ہے - مثلاً " فرشتہ ... دوسرے شخص کے پاس پہنچا جو اندھا ہوا کرتا تھا " - یہ غلط ہے مطلب یہ ہے " جو کبھی اندھا تھا " اسی طرح " فاقہ مست ہوا کرتا تھا " - یعنی جو پہلے تھا - بچوں کے مضامین کے لئے پیرائہ بیان بھی دلچسپ ہونا چاہئے - ہمارے رائے میں یہ رسالہ بچوں کے لئے بہت خوب ہے —

تلاش حق

یہ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے - یہ ترجمہ دائنر

سید عابد حسین صاحب ایم اے ' پی ایچ ڈی نے بہت سنجیدی اور سلیس زبان میں کیا ہے ۔ اس پر مفصل تبصرہ ہم کسی آیندہ اشاعت میں شایع کریں گے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ دنیا کی ان کتابوں میں سے ہے جس کا مطالعہ ہر پڑھے لکھے شخص پر لازم ہے —

جلد اول	قیمت	ایک روپیہ سکہ انگریزی
جلد دوم	قیمت	ایک روپیہ سکہ انگریزی

انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد دکن سے مل سکتی ہے

اردو

جلد ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ ع حصہ ۴۰

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	بنیادیات فصاحت	جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی مدظلہ '	۵۳۱
۲	بکرا شاعر مرثیہ گو	جناب طالب الہ آبادی	۵۶۳
۳	روسی ادب (تیسرا باب)	جناب محمد مجیب صاحب بی اے آفرزاکسن	۶۷۸
۴	سسی پنوں	جناب قاضی فضل حق صاحب ایم اے پی ای - ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور	۷۱۶
۵	تنقید پر اعتراض	جناب محمد احتشام الدین صاحب ایم اے دہلوی	۷۳۳
۶	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۷۶۰

مبادیات فصاحت

از

جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی مدظلہ

یہ لکچر جناب کیفی صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں اہل علم کی ایک اچھی اور ستھری صحبت میں دیا اور بہت پسند کیا گیا ۔ حضرت کیفی کی تحقیق اور نظر تنقید قابل داد ہے بیان کا لطف اس کے علاوہ ہے ۔ حضرت کیفی مختلف حیثیتوں سے ہیں اور ان کا کلام (نظم ہو یا نثر) غور سے پڑھنے کے لائق ہے — (ایڈیٹر)

ہر زمانہ میں بعض افراد اس خیال کے ہوتے ہیں کہ قاعدے اور قانون فضول ہیں ۔ ان کے لئے میں مشق اور عادت سب کچھ سکھا دیتی ہے ۔ بدقسمتی کا یہ جذبہ دماغی ، ہر فن کی ابتدا میں ہر ایک دیکھا جاتا ہے کہ جو اول ادب کے حق میں تقریباً بت شکن ہیں یا پرانے بت توڑ کر اپنے نئے بت بناتے ہیں اور خلقت سے ان کی پرستش کا مطالبہ کرتے ہیں —

اس میں کلام نہیں کہ ہر عروض اچھا شاعر اور ہر صرف اچھا ناثر نہیں ہوتا ۔ لیکن اس سے عروض اور صرف سے واقفیت کی ضرورت زایل نہیں ہو جاتی ۔ متمدن جماعت کی مصروفیت کے ہر شعبے میں ضابطے اور قانون کی ضرورت مسلم ہے ۔ ہاں تو اہ فن اکثر آخری لفظ یا اتمام حجت پر مشتوی نہیں ہوا کرتے ۔ غرض و غایت علامہ "سکاکی" کی نہ تھی وہی تھی جو آج کسی کی ہو سکتی ہے ۔ لایعنی عمل میں خواہ

اختلاف ہو لیکن اس سے قاعدے کی ہستی ساقط و باطل نہیں ہو سکتی - ذوق سلیم - معصوم ذہن - تیز تخیل اور سچے کان ضابطۂ قدیم میں اصلاح و ترمیم ضرور کرینگے مگر قاعدے سے قطعاً منکر نہیں ہو سکتے - الفاظ کی بے جوڑ بندش - معلولیت سے تہیدستی - التزام تالیف کا عدم احساس حسن ترتیب کلمات کا فقدان - جدت اور تازگی کی کمی - تخئیل کی پستی اور فرومایگی وغیرہ جو انشا کے نقایص ہیں مشق سے بہت کچھ رفع تو ہو جاتے ہیں لیکن اس سہولت اور وثوق سے نہیں کہ جب قاعدے سے بھی استمداد ہو - اور یہ وہ عیوب ہیں جو مخاطب کے ذہن کو متکلم یا منشی کے ذہن کے قریب نہیں پہنچنے دیتے - قدمانے جو معایب کلام گنائے ہیں مثلاً تنافر کلمات - ضعف تالیف تعقید لفظی و معنوی - حشو و زیادت - شتر گربہ - ذم کا پہلو - توالے اضافت وغیر ہم - یہ سب ان مدات میں ایک طرح سے موجود ہیں جن کا ذکر ابھی آیا ہے - ان کو خواہ مزید علیہ سمجھئے - یہ سب وہ عیوب ہیں جو مخل فصاحت ہیں تاثر کلام کی منافی ہیں - ان سے بچنا ہدایت کے بغیر ناممکن ہوتا ہے - ہدایت کا ماخذ استاد کی اصلاح ہو یا فن کی کتابوں کا مطالعہ - بات ایک ہی ہے—

متقدمین نے جو قاعدے علم معانی کے تحت فصاحت سے متعلق وضع کئے ان کا مطمح نظر زیادہ تر کلام کی لفظی حیثیت معلوم ہوتی ہے نہ کہ اس کی معنوی اہمیت - قاعدہ وہی مفید اور واثق ہوتا ہے جو سائنٹیفک یا علمی اصول کی میزان میں پورا اترے - اس کی توضیح کے لئے میں ایک نہایت معمولی بات پیش کرتا ہوں - وہ ہے اسم ذات اور اسم صفت کی ترتیب - یعنی صفت و موصوف کی تقدیم و تاخیر کی طرف

آپ کو متوجہ کرتا ہوں - سوال یہ ہے کہ کلام میں صفت سے پہلے موصوف لایا جائے یا اس کا الٹ ؟ فرانسیسی اور فارسی زبانوں میں موصوف پہلے لایا جاتا ہے اور صفت اس کے بعد - انگریزی اور اردو میں عمل اس کے برعکس ہے - مثال کے لئے "اسپ مشکی" کو لیجئے - یہ تو ہوئی فارسی کی ترتیب - اردو میں کہیں گے "مشکی گھوڑا" سطحی نظر کے نزدیک ان دونوں فقروں میں کوئی فرق نہیں پایا جائے گا لیکن سائنس کی نظر میں فرق موجود ہے - اور بڑا فرق ہے - علم نفسیات کی کی رو سے اس دو لفظی فقرے کا تجزیہ اس طرح ہوگا - جب "اسپ مشکی" یا "گھوڑا مشکی" سامعہ نے اخذ کیا تو سامع کا ذہن گھوڑے - محض گھوڑے کی طرف معاً راجع ہو گیا - اور چونکہ گھوڑے کی کوئی خصوصیت اس کے علم میں نہیں آئی ہے اس لئے کسی گھوڑے کی شکل ذہن پر اثر آفریں ہوجاتی ہے اغلباً سامع کا ذہن کُمیت یا سبزہ گھوڑے کی طرف جائے گا کیونکہ ان رنگوں کے گھوڑے عموماً پائے جاتے ہیں اور روز مرہ دیکھنے میں آتے ہیں - نتیجہ یہ ہوا کہ جب لفظ "مشکی" ایزاد کیا گیا تو تخیل کی رفتار میں مزاحمت ڈالی گئی - یاتو کمیت گھوڑا کا نقش لوح تخیل سے مٹا کر اس کی جگہ مشکی گھوڑے کا نقش کھینچا گیا - یا اگر کمیت گھوڑے کا نقش ابھی مرتسم نہیں ہوا تھا تو اس ارتسام کا میلان روک دیا گیا - ان دونوں میں سے کوئی صورت ظہور پذیر ہو ان میں سے ہر ایک مزاحمت کی ملتجی ہے - اس کے برعکس اگر صفت کو پہلے اور موصوف کو بعد میں لائیں یعنی "مشکی گھوڑے" کہیں - تو مغالطے اور مزاحمت کا امکان نہیں رہتا - "مشکی" ایک مجرد صفت کا حامل ہے اور کسی خاص تمثل کا خالق نہیں - وہ

ذھن کو اس خاص معروض کے تصور کے لئے تیار کردیتا ھے جو مشکو رنگ کا ھے - اور توجہ لگی رھتی ھے جب تک کہ وہ معروض معلوم نہیں ھو جاتا - ان دو الفاظ کی اس ترتیب سے یعنی صفت کو موصوف سے قبل لانے سے ذھن کے فعل کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ھوئی - نہ مغالطے کا امکان پیدا ھوا ' لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ترتیب زیادہ موثر یعنی فصیح ھے - اسی طرح " جوان " اور "مرد" کی ترتیب پر نظر ڈالئے اگر " مرد جوان " کہا جائے تو پہلے " مرد " کی صورت ذھن میں بیٹھے گی اور ذھن بھٹکے گا اس تلاش میں کہ مرد کس قسم کا ھے ؟ جوان ھے بوڑھا ھے یا ادھیڑ ھے - یا مغالطے کا شکار ھوگا جب تک کہ " جوان " کا لفظ نہ سنے - لیکن " جوان مرد " کہنے سے یہ دقتیں رفع ھو جاتی ھیں - اور ذھن کسی قسم کے اختلال اور تذبذب میں مبتلا نہیں ھوتا + اس کو میں کہتا ھوں قاعدے کا سائنٹیفک اصول پر مبنی ھونا ' شاعر نے زندگی اور موت کی حقیقت اپنی طرز میں اس طرح بیان کی

زندگی کیا ھے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ھے انہیں اجزا کا پریشاں ھونا

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ فصاحت کیا ھے ؟ اجزائے کلام میں حسن ترتیب ھے - اور انہیں اجزا کا پریشان ھونا فقدان فصاحت ھے -

کہنا یہ مقصود تھا کہ تہذیب کے اور اداروں کی مانند زبان بھی ضابطے اور قواعد کی محتاج ھے - اسلاف نہ تو اس حقیقت سے بیخبر تھے اور نہ بے پروا عوارض اور ضرورت کے مطابق انھوں نے فن انشا و تکلم کے قاعدے مدون کئے اب عہد حاضر میں اگر زبان کا ڈھانچہ اور زمانے کی

ضرورتیں کچھ اور ہیں - زاویۂ نگاہ اور مطمح نظر بدل گیا ہے - زیادہ وسیع ہو گیا ہے - کلام اور انشا کی غرض و غایت بھی تغیر پذیر ہے - عندیہ بھی منشی کا وہ نہیں ہو پہلے تھا - تو کیا پرانا ضابطہ تقویم پارین ہوگیا ؟ یہ ایک قسم کی خوش فہمی ہے - اور کیا کہوں - ریاضی اور ہیات کے عالم سے پوچھئے وہ کس طرح تقویم پارینہ کو حرز جان بنا کر رکھتا ہے - تازہ مشاہدات اور تحقیقات سے اس پر حاشئے چڑھاتا ہے اور اس کی مدد سے نئی تقویم مرتب کرتا ہے - اسی طرح زبان کے ان قواعد اور ضابطوں کو سامنے رکھ کر آپ نئے قاعدے انشا اور تکلم کے وضع کرسکتے ہیں اور زبان کے ضابطے کو معقولیت اور سائنس کا جامہ پہنا کر اس سے ہر کام لے سکتے ہیں - جاڑوں میں گرمی کے کپڑے پھینک نہیں دئے جاتے - ان میں سے کچھ تو گرم کپڑوں کے نیچے شعار کی طور پر استعمال ہوتے ہیں اور کچھ نہوئے کے لئے درزی کو دئے جاتے ہیں کہ وہ اس تہذیبی شیروانی کے مطابق اس گرم کپڑے کی شیروانی تیار کردے - عام انسانی زندگی کا یہ اصول تہذیب تمدن کے تمام شعبوں پر عاید ہے - جو لوگ اس نظر سے کام کرتے ہیں وہ مصلح نہیں بلکہ تباہ کار اور ہنگامہ پرداز ہیں —

سوال کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی لازم ہے جہاں دنیائے اردو میں ایسے اصحاب پیدا ہوگئے ہیں جو کسی قاعدے یا ضابطے کے پابند ہی نہیں - وھبیت کا جن ان کے سر پر ایسا سوار ہے کہ ان کی گردن کسی اصول اور ہدایت کے سامنے خم ہونے میں ہو نہیں آتی - ایسے اصحاب بھی عنقا کا حکم نہیں رکھتے ہو قدیم کو بھلے اور دستہ العمل میں سرمو تبدیلی اور ترمیم کو کفر و ارتداد کا مرادف سمجھتے ہیں - ان کا ادبی

جبر و استبداد سیاسی جبر و استبداد سے کم نہیں - یہ ادبی سخت جان اور سخت گیر بھی زبان کے حق میں ایک طرح کا مزمن مرض ہیں - ان میں اور ان میں فرق وہی ہے جو تپ دق اور طاعون میں ہے - دونوں ادب کی جان کے لاگو ہیں —

ان جملہ امور واقعی کو مد نظر رکھ کر اردو کی ترقی اور زبان کی توسیع متقاضی ہے کہ قدیم ضابطہ کا جایزہ لیا جائے - زمانے کے تغیر اور ضروریات حالیہ کا لحاظ رکھا جائے مستقبل کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے - منقول اور سند کے مقابلے میں معقول اور سائنس کو جگہ دی جائے - اور ایسا ضابطہ مرتب کیا جائے جو مقبول خاص و عام ہونے کی وجاہت رکھتا ہو * ان امور کو پیش نظر رکھ کر میں نے آج کے لئے یہ موضوع انتخاب کیا - یعنی " مبادیات فصاحت " اور میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد اس کے لئے نہایت موزوں مقام ہے - وہ مقامی جذبات سے مبرا ہے - دوسرے صوبوں کی ہنگامہ خیزی اور زبان کے خلاف بیجا روی سے معصوم ہے —

جو کچھ عرض کیا گیا اور جو اب گزارش ہوگا وہ ان صاحبوں کی طرف خطاب ہے جن کے دل میں اردو کی ترقی اور توسیع کی چٹک ہے - جو اصلاح اور ترمیم ضروری کو ایک فعل حسنہ یقین کرتے ہیں - جن حضرات کو ان امور سے دلچسپی نہیں اور جو اپنی بےبضاعتی کو آزادگی اور بیقاعدگی کا خلعت فاخرہ پہنانا چاہتے ہیں ان کی طرف میرا روئے سخن نہیں - یہ شعر ان کے حسب حال ہے —

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زبان میں اثر کہاں

نظریۂ فصاحت قدیم - اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص افصح الفصحا

اور ابلغ البلغا ہے - یعنی اس کا کلام فصاحت کی جان اور بلاغت کی روح و رواں ہے - عام لوگ کہنے کو تو کہہ دیتے ہیں لیکن فصاحت اور بلاغت کا اصلی مفہوم ان کے ذہن سے اتنا ہی دور ہوتا ہے جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی - وہ سہل - سلیس اور بامحاورہ کو فصاحت کی تعریف سمجھتے ہیں اور دبیز - بلند آہنگ و مغلق اور مشکل کلام کو بلیغ جانتے ہیں - لیکن خواص کے ذہن میں صرف حقیقیت و مجاز - تشبیہہ و استعارہ - تعریض و کنایہ اور ایجاز و اطناب وغیرہ صنایع بدایع بلاغت کا ماحول ہوتے ہیں - وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بلاغت کے لئے فصاحت پہلی شرط ہے —

ایک فلسفی کا قول ہے کہ دنیا میں سجاوٹ کو افادت پر غلط ترجیح دی جاتی ہے - شعور کا یہ نقص ادب پر بھی اسی طرح حاوی ہے جس طرح تہذیب تمدن کے دوسرے اداروں پر - کلام میں صحت اور تاثر کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے - بناؤ چناؤ اور خود نمائی پر اکثر و بیشتر نظر رہتی ہے - مذاق کی سلامتی اور زبان کی صلاحیت کے تحفظ کو مد نظر رکھہ کر قدیم زمانے میں ادیبوں نے قاعدے مقرر کئے اور فلسفۂ انشا مدون کیا - اردو میں یہ قاعدے فارسی سے آئے - اور فارسی میں عربی سے - لیکن اصل ماخذ اہل عرب کے دل و دماغ کا مولود نہ تھا بلکہ اہل عجم کا - یہ ایک نہایت دلچسپ منظر ہے کہ ان بزرگوں نے جو عربی نژاد نہ تھے اہل عرب کی زبان میں اور عربی سے متعلق محاسن و معائب سخن پر قواعد وضع کئے اور کتابیں لکھیں —

فارسی میں سب سے پہلے سراج المحققین علامۂ سراج الدین علی خاں زورنے علم معانی و بیان پر دو مختصر کتابیں تالیف کیں - ان کے نام ہیں

" عطیۂ کبریٰ " اور " موہبت عظمیٰ " - اس کے بعد میر تقی کا اردو کا تذکرہ " نکات الشعرا " نکلا جس میں شاعروں کے کلام پر جابجا تنقیدی حاشیوں میں فصاحت کے بعض نکات واضح کئے گئے - میر مہرور خان آرزو کے عزیز اور ادبی تلمیذ تھے - نکات الشعرا کی تنقیدوں سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اب تک ادب اور شعر کے متعلق عربی اور فارسی میں جو ہدایتیں جاری ہوچکی تھیں وہ سب یا ان میں سے اکثر اردو پر عاید ہیں - اسی زمانے میں مرزا قتیل کی کتابیں مثل " چار شربت " اور " نہرالفصاحت " وغیرہ نکلیں - دو کتابوں کا نام لینا اس تشکیک کی نفی کرتا ہے کہ اب تک قدما اور متوسطین نے ادب اور بیان پر جو کچھ لکھا وہ ان پر حاوی ہے یا نہیں ؟ وہ ہیں سیدانشا کی " دریائے لطافت " اور مولانا صہبائی کا ترجمہ "حدایق البلاغت" - حدایق البلاغت کا ترجمہ اردو زبان میں ہے اور مثالیہ اشعار بھی اردو کے ہیں - " دریائے لطافت " اگرچہ اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی میں لکھی گئی لیکن اس کتاب کو اردو کے فن انشا کی اولین کتاب تسلیم کرنا چاہئے - زباندانی کے بنیادی اصول اور قاعدے سیدانشا نے قرار دئے ان کی تشریح کی اور تمثیل سے اپنے عندیہ کو واضح کیا - لیکن کہنا پڑتا ہے کہ فصاحت کا جہاں تک تعلق ہے سید انشا کیا آج تک کوئی بھی اس مقام سے اِدھر اُدھر نہیں ہوا جہاں " سکاکی " اور " قزوینی " مقیم ہیں وہی " الفصاحت یوصف بہاالمفرد و الکلام والمتکلم " کے ترجمے ہر کہیں دیکھنے میں آتے ہیں—

اس ضمن میں صرف دو امور کی طرف توجہ دلا کر اصل مطلب پر آؤں گا - اول یہ کہ عربی کی جن کتابوں میں فصاحت کا تذکرہ آیا ہے وہ اگرچہ عجمیوں نے تصنیف کیں لیکن ان کا مطمح نظر عجم نہیں بلکہ عرب تھا اور چونکہ

اہل عرب قدیم الایام سے فن خطابت میں طاق تھے اس لئے لابد تھا کہ منشی پر خطیب کو ترجیح ہوتی - فصاحت میں تثلیث کا مسئلہ یعنی فصاحت سہ گانہ کا وجود اس کی توثیق کرتا ہے - " فصاحت متکلم " سو زبان سے اس کی شہادت دیتا ہے کہ علم معانی و بیان پر جو کتابیں مشہور ہیں ان میں مقدمہ کی ذیل میں فصاحت کے متعلق جو کچھہ درج ہے وہ زیادہ تر خطابت پر عاید ہوتا ہے نہ کہ انشا پر - اگرچہ وہ جو کچھہ بھی ہے انشا کے بارے میں اس سے بہت کچھہ استفادہ ہو سکتا ہے - لیکن اس سے فصاحت کی جامع و مانع تعریف مستنبط نہیں ہوسکتی - اور وہ تعریف تعریف کہے جانے کی مستحق نہیں جس میں یہ دونوں صفتیں موجود نہ ہوں - منطق کی رو سے تعریف جامع و مانع ہونی چاہئے - یہاں صرف یہ پچھلی صفت ہی پائی جاتی ہے یعنی وہ کلام فصیح ہے جو ایسا اور ایسا نہو - جس میں تنافر نہ ہو - ضعف تالیف نہ ہو - تعقید نہ ہو وغیرہ وغیرہ —

دوسرا امر ہے " فصاحت کلمہ " - اس میں تنافر حروف و غرابت وغیرہ کی ممانعت کا ذکر آیا ہے - اور مثال میں " مستشرزات * " پر اعتراض کیا گیا ہے - میرا گمان ہے کہ وہ فاضل مولف اس کلمے کی اتنی چھان نہ کرتے اگر خطیب اور خطابت ان کے ذہن پر مسلط نہ ہوتے- میں یہ نہیں کہونگا کہ اگر یہ لغت صرف عربی کے مطابق صحیح ہے اور اجلال کی طرح متروک بھی نہیں قرار دیا گیا ' اسلوب بیان کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے بھی صحیح محل پر استعمال ہوا ہے ' تو پھر

---

* امری القیس کا شعر ہے فدایرہ مستشرزات الی العلے - تضل العقاص فی مثنی و مرسل —

اس میں کیا فیہ نکل آئی ؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس لفظ کی جگہ امرؤالقیس " مستزفعات " لکھہ دیتا تو بہتر تھا ' تو اسے زیادہ سے زیادہ ترقی کہا جائے گا نہ کہ اصلاح - لیکن ان فاضل مولفوں نے " مستشرزات " کے بدلے کوئی اور لفظ تجویز فرمانے کی زحمت نہیں اٹھائی - چونکہ یہ شعر فصاحت کلمہ کے تذکرے میں اس لفظ کی وجہ سے بہت بدنام ہے اس لئے میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ بزرگ اگرچہ زبان عربی کے بڑے عالم تھے لیکن صاحب قاموس کی طرح اہل زبان نہ تھے - اس وجہ سے " مستشرزات " پر یہ اعتراض کر گئے - ممکن ہے میں غلطی پر ہوں - جہاں تک میں سمجھا ہوں اعتراض حرف شین کی وجہ سے ہوا یعنی " ش " جو مہموسہ رخوہ ہے درمیان " ت " کے جو مہموسہ شدید ہے اور " ز " کے جو مجہورہ معجمہ ہے آگیا ہے اس سے ثقل تلفظ کا گمان ہوا - لیکن مجھے اس استدلال پر اعتراض ہے کیونکہ " رائے مہملہ " بھی تو مجہورہ ہے مثل " ز " کے - کہا گیا ہے کہ حروف قریب المخارج کے اجتماع سے بھی ایسا ثقل پیدا ہوتا ہے جو مخل فصاحت ہے - اسی بنا پر اس آیت میں " الم اعہد * " میں کہا گیا کہ ایسا ثقل ہے جو تنافر کے قریب اور فصاحت کلمہ کے مخل ہے - مگر اصل میں ایسا نہیں ہے - اس کی تفصیل کے لئے " الاتقان " کا مطالعہ ضروری ہے - اگر ایک لمحے کے لئے مذہبی تقدس کی نظر ہٹا کر محض ادبی نگاہ قران مجید پر ڈالی جائے تو ثابت ہوگا کہ اس کا لفظ لفظ فصاحت کی روح و رواں ہے - ایسی تعریفوں سے جن کا نقص ظاہر کر چکا ہوں ماثور ہو کر ایک

---

* سورۂ یسین -

صاحب نے اعتراض کر دیا کہ " نوح یوحیط * " میں تنافر حروف ہے - یہ اور ایسے معترض حروف کے مخارج کی حقیقت سے جاہل مطلق ہیں - الف اور عین ' ھائے ہوز اور حائے حطی کی صحیح اور حقیقی آواز ادا کرنے سے ان کے آلات نطق عاری ہیں - جب اس بارے میں اہل زبان کو بھی مغالطہ ہو جاتا ہے پھر غیر اہل زبان کا تو ذکر ہی کیا ہے —

دیکھا جاتا ہے کہ آجکل طبایع زیادہ ذکی الحس ہیں - علل سے بحث نہیں - یہ واقعہ بدیہی ہے کہ عہد حاضر میں ہر امر میں خواہ وہ معشرت یا ملیات سے متعلق ہو یا دینیات و ادبیات سے ' لوگوں کے ذہن زیادہ حساس ہوگئے ہیں - اس ثبوت سے یہ صرف یہ عرض کرونگا کہ اہل زبان ہی اپنی زبان کے کلام یعنی عبارت اور الفاظ کو صحیح انداز اور لب لہجے سے ادا کر سکتے ہیں - غیر اہل زبان اس زبان کا خواہ کتنا ہی عالم اور مصنف کیوں نہ ہو اس کے آلات نطق لب و لہجے کی صحت اور طرز ادا کی قدرتی شستگی پر حاوی نہیں ہوسکتے-

آیا فصاحت کا تعلق جیسا کہ متقدمین نے زور دیا ہے کلمہ کی ذات سے ہے ؟ یہ مبحث ابھی تشنہ ہے - آگے ذکر آیا ہے کہ فارسی میں سب سے اول خان آرزو نے اہل ہند کو علم معانی اور اس کے رموز سے آشنا کیا - ممکن ہے اہل فارس نے اس موضوع پر اپنی زبان میں کچھہ لکھا ہو لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچا - خان موصوف " عطیہ کبریٰ " کے دیباچے میں فرماتے ہیں :—

و ہر گاہ کہ نظر بر کتب قدیمہ و جدید می افتاں کتابے

---

* سورۂ ہود —

در علم بیان کہ یک جزو فصاحت ست در فارسی
بہ نظر در نمی‌آید - - - پس این رسالہ اول کتابے
است کہ از آسمان فکر بلند بہ زمین شعر فارسی
نازل شدہ" —

پھر انھوں نے دوسرا رسالہ " موھبت عظمیٰ " لکھا - جس کو علم معانی سے متعلق کہا جاتا ھے - ان کے مندرجات و طواط کے حدایق السحر اور دوسری عربی کتابوں سے ماخوذ ھیں - جیسا کہ عربی کتابوں میں التزام تھا اس کی تقلید خان آرزو نے کی - یعنی فصاحت کا ذکر ضمناً اور مجمل طور پر دیباچہ میں کردیا لیکن پھر بھی وہ " تلخیص " سے کچھ زیادہ ھی ھے - چونکہ " سکاکی " کو زبان سے نکل گیا تھا کہ کلام بلیغ کے لئے فصیح ھونا لازمی ھے اس لئے انھیں اور ان کی متعاقبین کو چند لفظ فصاحت کی نذر کرنے پڑے - تثلیث فصاحت کا نظریہ بس اتنا ھے :- فصاحت کلمہ - فصاحت کلام - فصاحت متکلم - ان اجزائے تثلیث کی تعریفوں میں سب کا اتفاق ھے —

۱ - فصاحت کلمہ - خلوص اوست از تنافر حروف و غرابت و مخالفت قیاس لغوی -

پہلی خرابی یہ واقع ھوئی کہ محض فصاحت کی تعریف کی حد کسی کا ذھن راجع نہ ھوا - فصاحت کلمہ ' فصاحت کلام اور فصاحت متکلم یہ قیدوں اضافی ترکیبیں ھیں - کلمہ کی تعریف صرف میں اور کلام کی تعریف نحو میں آجاتی ھے - اس لئے ضروری نہ تھا کہ ان کی تعریفیں وضع یا نقل کی جاتیں - کیونکہ صرف و نحو کا علم ان کتابوں کے مطالعے سے پیشتر ھونا لابد ھے - لیکن یہ کسی کے خیال میں نہ آیا کہ اتنا تو فرمادیتے

کہ فصاحت اسے کہتے ہیں - ان مرکبات میں فصاحت ہی اہم اور جزو اعظم ہے اور اسی کی اصطلاحی حیثیت بتانے سے احتراز کیا گیا - لغت کی کتابوں نے اس لفظ کے معنی بتائے ہیں :- "کشادہ سخن گفتن و تیز زبانی و خوش گوئی" - مگر ایک لفظ جب اصطلاحی حیثیت حاصل کر لیتا ہے تو اپنے لغوی معنی سے کم و بیش دور ہو جاتا ہے - یہ ایک بدیہی امر ہے —

خیر ، اب فصاحت کلمہ کو لیجئے - اس کی تعریف جو کچھ بھی کی گئی ہے ، وہ محض مانع ہے - یعنی تنافر حروف ، غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کا نہ ہونا - اس کلمہ کو فصیح کہا گیا جس میں یہ تین عیب نہ ہوں - پھر فصاحت کلمہ کی ان تینوں شرایط کی تعریف یوں کی گئی —

(ا) تنافر ان حروف کے اجتماع کو کہتے ہیں جن کا تلفظ طبع سلیم پر دشوار ہو - اسے ایک ذوقی امر بتایا گیا ہے —

(ب) غرابت کی نسبت کہا گیا کہ وہ کلمہ جو غیر مانوس الاستعمال ہو یعنی جسے اہل زبان استعمال نہ کرتے ہوں —

(ج) مخالفت قیاس لغوی کی نسبت فرمایا گیا کہ ایک کلمے کا قاعدے ، قانون اور محاورے کے خلاف لانا - اس کی کئی قسمیں ہیں —

(ا) شعر کا وزن یا قافیہ درست کرنے کو کلمے میں تغیر کرنا جیسا اس شعر میں کیا ہے :-

آب انگور و آب نیلوفل - شد مرا از عبیر و مشک بدل - نیلوفر کی " ر " کو " ل " سے بدل دیا تاکہ قافیہ درست رہے —

شاعر اس شعر کو اس طرح کہہ دیتا تو بہتر تھا :-

آب انگور و آب نیلوفر - بدلم شد ز مشک و از عنبر - تو مطلب پورا ہو جاتا اورمخالفت کا نقص بھی نکل جاتا —

(۲) کلمے کا بے موقع استعمال - جیسے " توتنا " کی جگہ " پھوتنا " کہنا

اس فقرے میں :- اس کی باتیں سن کر میرا دل ٹوٹ گیا - یہاں ٹوٹ گیا کی جگہ پھوٹ گیا کہا جائے تو مخالفت کا نقص عاید ہوتا ہے - اسی طرح اس جملے میں :- " ساجھے کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹا کرتی ہے " " پھوٹنا " کے بدلے " ٹوٹنا " کہنا ویسا ہی ہے جیسا پہلی مثال میں پھوٹنا تھا —

(۳) الف اشباع جو بعض کلموں کے آخر میں ضرورت شعری کی وجہ سے بڑھا دیا جائے - جیسے نظامی نے اس مصرع میں " کاخ " کو " کاخا " باندھا ہے (ع) بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد - زیادہ تفصیل غیر ضروری ہے —

میں یہ عرض کروں گا کہ کاخ کو کاخا کہنا غلط ' دل ٹوٹ گیا کو دل پھوٹ گیا کہنا غلط ہے - اسی طرح تغیر یا تقلیب وغیرہ سے کلمے کی ہیئت بدل دینا غلط اور ممنوع ہے - جو شخص 'رحیم بخش' کو 'حریم‌بسک' اور 'قادر' کو 'کادَر' کہتا ہے وہ غلط اور مہمل الفاظ بول رہا ہے —

اب یہ دیکھنا ہے کہ فصاحت کلمہ کی جو تعریف قرار دی گئی معقولیت کے کس درجے میں رکھی جاسکتی ہے ؟ اس بارے میں یہ جتانا ہے کہ کوئی کلمہ جو علم صرف کے قواعد سے مطابقت رکھتا ہے اپنی لغوی حیثیت میں فصیح یا غیر فصیح نہیں ٹھیرایا جاسکتا - ہاں اس کا مناسب یا غیر مناسب استعمال یا صرف ہی وہ عمل ہے جو اسے یعنی اس کے استعمال کو فصیح یا غیر فصیح بنا سکتا ہے - اور یہ صرف یا استعمال کلام سے تعلق رکھتا ہے - کیونکہ جب ایک جملے یا فقرے میں کسی کلمے کا استعمال ہوا تو بداہۃً کلام کی ہستی پیدا ہوگئی - لہذا فصاحت یا غیر فصاحت کا اطلاق کلام پر ہوا نہ کہ کلمے پر - اگر آپ وضو کے مسئلے کو فقہ کی کسی کتاب میں مطالعہ کررہے ہوں یا اس سے متعلق تحریر کریں تو جوربین کا کلمہ ضرور استعمال ہوگا اور وہاں وہ

کلمہ ہرگز غیر فصیح نہ ہوگا - لیکن اگر آپ غزل میں یہ لفظ استعمال کریں جیسے پیرھن ' آنچل ' نقاب ' دامن اور گریبان کا ذکر ہوتا ہے تو یقیناً یہ صرف اس کلمے یعنی جوربین کا بے محل ہوگا اس لئے غیر فصیح - یہی حال ان کلمات اور مرکبات کا ہے جو غالب اور ناسخ کے پہلے کے کلام میں پائے جاتے ہیں یعنی ان کی غزلوں میں - اگر ان میں سے اکثر قصیدے یا نثر میں صرف کئے جاتے تو مضایقہ نہ تھا —

جو لفظ متروک ہو چکے ہیں وہ گویا زبان سے خارج کردئے گئے - لغات میں جو وہ پائے جاتے ہیں تو اس غرض سے کہ متقدمین کا کلام سمجھنے میں مدد ملے - اب میں فصاحت کلمہ کے نظریہ کا تجزیہ پیش کرتا ہوں - پہلی خامی اس نظریہ میں یہ نظر آتی ہے کہ جہاں تک فارسی یا اردو کا تعلق ہے متقدمین یا متاخرین نے کلمے میں تنافر حروف کی مثال پیش نہیں کی جس سے ان کے نظریہ کی وضاحت ہوتی - لیکن صاحب غیاث‌اللغات نے اس بارے میں طبع آزمائی کی ہے - فرمایا ہے جیسے شمع علم ' صدق قول' میں ثقل تلفظ ہے - اول تو مجھے اس کو کلمہ تسلیم کرنے میں کلام ہے - یہ دونوں مرکب وہ نوعیت نہیں رکھتے جو خوش گفتار یا سخن شناس کی ہے - بلکہ شمع علم اور صدق قول ایک کلام کے دو ٹکڑے ہیں جو اس میں سے قطع برید کر کے الگ دکھائے گئے ہیں - شمع اور صدق ' علم اور قول' کو ضرور کلمہ کہا جائے گا - ان مرکبات کی مستقل حیثیت نہیں بفرض محال اگر صاحب غیاث‌اللغات کا یہ ادعا مان بھی لیں تو ان کے مذہب کے مطابق مثل ' قصص اور اساس وغیرہ سینکڑوں عربی اور فارسی الفاظ کلام سے خارج کردینے پڑیں گے ؛ اور خود ان کی کتاب کا نام یعنی غیاث‌اللغات انھیں کے قول کے مطابق فصاحت کلمہ کے متبائن ٹھیرے گا' کیونکہ اس میں دو لام پے در پے آگئے جیسے صدق قول میں

دو قاف اور شمع علم میں دو عین تھے - اور شش کا ھندسہ تو اعداد شمار سے خارج ھی کردینے کے قابل ھے —

اگر مومن کے اس شعر میں تنافر ھے تو وہ کلام سے متعلق ھے - کلمہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں - وہ شعر یہ ھے

پانو تربت پہ میری دیکھہ سنبھل کر رکھنا
چور ھے شیشۂ دل سنگ ستم سے پس کے

اعتراض ھے کہ چار میں ایک جگہ لا کے اکٹھے کردئے - یہ اعتراض شاعر کے شعور تالیف کے خلاف ھو سکتا ھے - ورنہ ان کلمات میں سے ' سنگ ' ستم سے ' پس کے ' کسی میں بھی اپنی مجرد حیثیت میں یعنی باعتبار مجرد کلمے کے نام کو ثقل تلفظ یا تنافر نہیں - یہی کلمے جب مثا سب محل پر صرف کئے جائیں تو اعتراض وارد نہیں کیا جاتا - یہی حال فارسی کے ان مصرعوں کا ھے :—

زمیں شش شد و آسماں گشت ھشت
(اور) از یک کشش شہ شش صد شیربلرزد

ان مصرعوں میں ' شش ' سے لےکر ' شیر ' تک کسی کلمہ پر تنافر حروف یا اثقال کا جرم عاید نہیں ھو سکتا - نقص جو ھے وہ کلام کا ھے - یہی کیفیت غرابت کی ھے - جوربین کا ذکر آگے آچکا ھے - اس ضمن میں یہ بتانا ھے کہ کوئی کلمہ اگر غیر مانوس الاستعمال ھے یعنی اسے اھل زبان یا زباندان استعمال نہیں کرتے تو وہ یا اس زبان میں داخل ھی نہیں ' یا ایک مدت کے استعمال کے بعد متروک ھو گیا - متروکات کی طرف ابھی اشارہ ھوا ھے - لغات میں ھر علم و فن کی اصطلاحیں ' ھر زمانے کے محاورے اور ھر عہد کے مستعملات لکھے ھوتے ھیں - اگر آپ ان الفاظ وغیرہ کو چھانٹ چھانٹ کر نکالیں اور کلام میں لائیں ' محل ' مناسبت ' موضوع اور بیجا صرف ' نیز صنف شعر کا لحاظ

نہ رکھیں تو بےشک کلام کی کراں باری غرابت کے الزام کی مستوجب ہوگی - مثلاً آج کل کے فصحا اور نیز متا خرین نے فعل حال کی شکل کو جیسے " جائے ہے - کرے ہے " کلام سے خارج کردیا ہے - اب اگر کوئی قدامت پرست فعل حال کے یہ صیغے استعمال کرے تو بے شبہ اس کا یہ فعل اہل زبان کے استعمال سے متجاوز ہوگا اور اس کا کلام غیر صحیح سمجھا جائے گا —

مرزا غالب نے اپنے اردو دیوان کی تیسری اشاعت کے خاتمے پر لفظ 'کسو' کی نسبت لکھا تھا :—

" میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں - البتہ
فصیح نہیں - قافئے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو
عیب نہیں - ورنہ فصیح بلکہ افصح ' کسی ' ہے " —

اسی طرح بہت سے کلموں کے محل استعمال پر نظر تعمق ڈالی جائے تو یہ تعمیم درست ہوگی کہ کلمہ بجائے خود فصیح یا غیر فصیح نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کا محل استعمال یا صرف ایسا ہوسکتا ہے - اس ضمن میں یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ بعض متروک الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال عام صورتوں میں جائز نہیں لیکن مرزا کے ' کسو ' کی طرح (اگرچہ اب ' کسو ' قطعاً متروک ہے) خاص محل پر جائز اور جاری ہے - جیسے ' نت ' - کہ اس کا استعمال ' نیا ' کے ساتھ تو درست ہے - اور صورتوں میں نہیں - اس سے واضح ہوگیا کہ فصاحت کا تعلق کلام سے ہے کلمہ سے نہیں ہے ہاں صحت کلمہ کے لئے لازمی ہے —

مخالفت قیاس لغوی کو کلمہ پر عاید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اس کا مطلب ہے کلمہ کا قاعدے ' قانون اور محاورے کے خلاف لانا - اب دیکھنا یہ ہے کہ جو کلمہ قاعدے اور قانون کے خلاف ہوگا وہ صحت سے محروم ہوگا -

فصاحت یا غیر فصاحت کا اس میں دخل ہی کیا ہے —

اگر فصاحت کلمہ کے اس نظریہ کو جس کی تشریح ہوچکی ہے مسلم اور موکد مانا جائے تو آپ ہی فرمائیں ایران اور ہندوستان کے ان نامی استادوں کے حق میں کیا فتویٰ دیا جائیگا جو فرماگئے ہیں :—

لنگنت گر ترا کند فریہ

سیر خوردن ترا ز لنگیں بہ

.....

نہ در ان دیدہ قطرۂ پانی

حکیم سنائی نے 'لنگیں' کا کلمہ فاقہ کے معنی میں استعمال کیا ہے — جیسا کہ ہندی میں ہوتا ہے — 'قطرۂ پانی' پر بھی نظر رہے —

" عرفی " فرماتے ہیں :-

درچاشت کہ از شبنم گل گرد فشان است

آن باد کہ در ہند در آید جکر آید

اس شعر میں جھکڑ (آندھی) کو ایرانی لہجے میں 'جکر' کہا گیا ہے— اور ارشاد ہوا ہے :-

گیت خوانت زہرہ قوال و مکی رانت زحل

آبدارت ابر نیسان و خواصت آفتاب

اس شعر میں 'گیت' اور 'مکی' یعنی مکھی کا راگ حسن سماعت چاہتا ہے —

" سالک " کا شعر ہے :-

سیر گشتم ز کھوری ایام ہوس خوان سیم و زر نہ کنم

ہندی فارسی کی اس کھچڑی کی قبولیت کو ملاحظہ فرمائیے اور کسرۂ

اضافت کا بھی خیال رکھئے —

از سخن تاثیر ما از لفظ ہائے انتخاب
بستہ ہائے خوش قماش پرزانک اوردہ است

" انک " وہ نشان ہے جو ہندوستان میں کپڑا بنانے والے یا بزاز تھانوں وغیرہ پر بنتے یا چھاپ دیتے ہیں - یہ سنسکرت کا لغت ہے - اس کے معنی ہیں نشان، پتا - سنسکرت میں خدا کے ناموں میں "نرانکار" بھی آیا ہے - اس کے معنی ہیں پہچان کی نشانی نہ رکھنے والا - آج کل قماش کے ' انک ' کو ' مارکا ' کہتے ہیں —

امیر خسرو کے ہاں آیا ہے :—

ہمہ راز نوک مژگاں زدہ بر جگر کٹارہ

مرزا صاحب نے اضافت سے اس ہندی لفظ کٹارہ کو اور بھی اپنا لیا - فرمایا ہے :-

دلیر میروی از پے سیاہ را چشماں
دلیر میروی از نگہت بر جگر نیا مدہ است

مرزا غالب نے فرمایا :-

سر پر چڑھنا تجھے زیبا ہے پرائے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا

بعض اہل عملہ انگریزی لفظ ' نمبر ' کو ' لمبر ' بھی کہتے اور لکھتے ہیں جیسے رجسٹروں کے اول خانہ کا عنوان لمبر شمار - اور مرزا صاحب کے فارسی دیوان میں ہے :—

آرے نہ ' چک ' بود نہ تمسک زہر کہ ہست
نے دستخط نہ مُہر نہ نام و نشان اوست

مضمون شعر ' نوٹ ' بوقلمونی زمانا

یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

اس کے باوجود کہ مرزا قتیل معہ اپنی معانی و بیان کی کتابوں کے اتنے برس لکھنو میں رہے شیخ ناسخ نے فرمایا :—

ترے رخسار تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے

' فریم ' آئینہ کی بنتی ہے ہالہ ماہ کامل کا

" فریم " اور ' ہے ہالہ ' قابل ملاحظہ ہے —

ذوق کا ارشاد ہے :-

' پکارے ' سب کہ ' قواعد ' ہے فوج کی شاید

کہ " فیراُڑا " رہے ہر صف میں ہیں قطار قطار

" لال کتاب " اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے

میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے

آپ گھبرائیں نہیں ' میں اور مثالیں مخالفت یا غرابت کی پیش نہیں کروں گا - خلاصہ یہ کہ وہ سکا کی ہوں یا رشیدالدین و طواط ' خان آرزو ہوں یا مرزا قتیل اُن کا اجتہاد نہ استدلال کی میزان میں پورا اترتا ہے نہ اساتذۂ ایران و ہندوستان کے عمل کی رو سے قابل تسلیم ٹھیرتا ہے—

اس فصاحت کلمہ کے فتوے نے ایک بدعت شنیعہ ہمارے ادب میں لاکر داخل کردی ' خاص کر نظم میں - شعرا کا مطمح نظر صاف کلمۂ مفرد رہ گیا اور کلام و تخیل پس پشت ڈال دئے گئے - جہاں الفاظ پر غیر ضروری زور اور تاکید کا درہ لگایا گیا وہاں یہی نتیجہ ظہور میں آیا - اس لفظی فصاحت کے منتر نے عہد تیموری میں جو گت انگریزی لٹریچر کی بنائی تھی وہی حالت متاخرین کے زمانے میں اردو شاعری خاص کر لکھنو کے ایک خاص طبقے کی بن

گئی تھی - یعنی متکلم کی تمام و کمال توجہ کلام سے ہٹ کر کلمہ پر مرکوز ہوگئی - اس زمانے میں انگلستان میں تو ایک شخص ایسا وسیع النظر پیدا ہو گیا جس نے کلمہ کے ساتھ کلام کا بھی لحاظ رکھا یعنی جان ملٹن - لیکن ہندوستان میں کلمہ اور مفرد کا جادو ایسا چلا کہ آج تک کلام اس کی بھول بھلیاں میں چکر غوطہ ہے —

الفاظ کا تقابل اور مناسبت کا جنوں بھی اسی ذیل میں آتا ہے جو منشی اور متکلم کے ہاتھ سے تخیل اعلیٰ کا سلسلہ چھڑا دیتا ہے اور کلام صرف الفاظ کا گورکھ دھندا رہ جاتا ہے - یہ ساری خرابی دلی والوں نے جن میں خان آرزو اور مرزا قتیل کا بڑا حصہ ہے لکھنو کی نوتوڑ سر زمین میں جاکر پھیلائی اور پھر یہ ادبی بدعت کشش باز گشت کے قانون کے تحت خود دھلی پر بھی عاید ہوگئی - آج کل کے اکثر لوگوں کو اپنے زعم میں کلام کی آراستگی کا یہ سہل نسخہ ہاتھ آگیا ہے - جیسا کہ سیاسیات کا اصول ہے کہ ایک موقع جو خود بخود پیدا ہو گیا ہے کیوں نہ اس سے فایدہ اٹھا لیا جائے - یہی اصول آج کل ادبیات پر حاوی ہے - ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ہے - گیتا کی فلسفہ عمل پر اس ہدایت کے ساتھ اتمام حجت کیا ہے کہ جو فعل تمہارا فرض ہے اسے انجام دئے جاؤ اور اوس کے ثمرے کے پیچھے میں نہ پڑو - اسی سے طرح لوگ اچھے اچھے کلمات - شاندار ترکیبیں - بلند آہنگ لغات استعمال کرتے ہیں - بھئی اس سے مطلب کیا نکلا ؟ اس کلام کا ماحصل کیا ہے ؟ یہ سب اگر نہیں ہے تو شاعر کے بطن میں - یعنی ذی رعب کلمات استعمال کئے جاؤ کلام کی خوبی سے غرض نہیں - جب ہی تو مولانا صہبائی نے تائید کی :-

"مدار حسن قبول بر فصاحت کلام است *"

---

* قول فیصل - مولفہ مولانا امام بخش صہبائی دہلی —

کلموں کے تقابل و تناسب غیرہ کے بارے میں موصوف کا شاکیا نہ لہجہ بھی قابل غور ہے - فرمایا ہے :-

" پائے بند مناسبات شدن و آ نگاہ بر ایں قدر کہ گامے بے مراعات آں بر ندارند و اقمۂ بے ملاحظۂ آن در دہن نہ گزراند پائے سعی را لنگ مائدہ سخن را تنگ گردانیدن است " *

یہاں ایک جملۂ معترضہ ذہن میں آیا جس کا ذکر اگر چہ فصاحت کلمہ کی ذیل میں تو نہیں آتا لیکن فلسفۂ کلمہ سے اس کا بہت تعلق ہے - اس لئے اس کا مجمل تذکرہ کئے دیتا ہوں - بعض کا خیال بلکہ یقین ہے کہ فارسی یا عربی الفاظ کا استعمال کلام میں زور پیدا کر دیتا ہے - خدا معلوم وہ لوگ زور سے کیا مراد لیتے ہیں - ایک ریل کا انجن لمبی ترین کو کھینچ کر بھاگے جاتا ہے اور جلدی سے منزل پر پہنچا دیتا ہے - یہ ہوئی - ایک بات - آپ کسی کام کو گھر سے نکلتے ہیں - راستہ میں آپ کو ایک گھوڑا نظر آتا ہے جس کا رنگ نہایت ہی دل فریب ہے بدن ایسا سڈول کہ سانچے میں ڈھلا ہوا سور کی سی ٹھمک چال ہے - رگ وریشہ میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں - اٹکھیلیاں کرتا جارہا ہے - آپ ٹھہر جاتے ہیں اور اس گھوڑے کو دیکھتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ دکھائی دیتا - اب غور طلب امر یہ ہے کہ آیا اس انجن میں زور تھا یا اس گھوڑے میں - آپ ذہن مبارک کو غلطے میں نہ ڈالیں - میں جلدی سے کہے دیتا ہوں کہ انجن میں بھی زور ہے اور گھوڑے میں بھی - مگر میں ایک زور کو جناتی کہونگا اور دوسرے کو ملکوتی - کیونکہ

---

* قول فیصل - مولفہ مولانا امام بخش صہبائی دہلی

انجن کا زور اضطراب آگیں ہے اور گھوڑے کا زور سکون آفرین - اگر آپ اس گفتگو کو اقایدس کی ایک شکل کے دعوے کی حیثیت دیں تو ثبوت میں چند شعر اساتذۂ کرام کے سنئے جن میں مشکل سے دو تین فارسی یا عربی الفاظ واقع ہوئے ہیں - بلکہ انھیں فارسی یا عربی نہیں اردو ہی کہنا چاہئے ناخواندہ شخص بھی انھیں سمجھتا اور بولتا ہے —

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

" مومن " کے اس شعر میں صرف ایک فارسی لفظ " گویا " آیا ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو ٹھکانے جائیں گے

" ذوق " کے اس مطلع میں ایک لفظ بھی فارسی یا عربی کا نہیں آیا—

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

" ناسخ " کے اس شعر میں بھی فارسی عربی کا کوئی لفظ دخل نہ پا سکا —

دیکھ کر ان کو جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غالب کے اس شعر میں رونق - حال بیمار یہ تین لفظ آئے انھیں جو چاہئے سمجھ لیجئے —

سامعین کرام کے مذاق اور ذہنیت کی تحقیر ہوگی اگر میں ان اشعار کی خوبیاں اور زور دکھانے بیٹھوں - بس اتنا کہوں گا کہ یہ وہ شعر ہیں جن پر سیکڑوں دیوان نثار ہیں - ادب میں زور اس موسل کو نہیں کہتے جو اوکھلی میں دھان کوٹتا ہے - بلکہ زور نام ہے اس تاثر کا جس

کا تعلق نفسیات سے ہے —

حیطۂ ادب میں یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ لفظ کے ٹکڑے جسے انگریزی میں سلیبل کہتے ہیں اور ایکسنٹ جسے ایک لفظ کے کسی جز کی صورت کا تور کہئے ۔ اس کو معنوی حیثیت سے قطع نظر سامع کے ذہن کو تسخیر اور متاثر کرنے میں حد درجہ دخل رکھتے ہیں ۔ انگریزی لفظ گرینڈ کے مقابلے میں میگنفیسنٹ اور اسی طرح ہمارے شاندار کے مقابلہ میں عظیم الشان میں جو مابہ الامتیاز ہے اس کی تفسیر کی ضرورت نہیں فلسفۂ انشا کا یہ ایک گُنہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں —

ہاں ۔ گفتگو تھی فصاحت کلمہ سے متعلق ۔ میرا مذہب یہ ہے کہ جو کلمہ صحیح لغوی یا اصطلاحی یا مجازی معنی میں مستعمل ہو ۔ اہل زبان کے محاورے کے مطابق ہو اور مناسب محل پر صرف ہوا ہو موضوع کے اعتبار سے بھی درست اور بجا ہو ۔ ایسے کلمے کلام میں استعمال کرنا اس کی خوبی اور تاثیر کو بڑھا دیتا ہے ۔ اس سے زیادہ کہنا عبث ہے ۔ جس کلمے میں غرابت یا مخالفت کا نقص ہو اسے متروک سمجھنا چاہئے ۔ نہت اور انجھواں ۔ نین اور نیان ۔ کبھی مستعمل تھے ۔ ان سے کلام چمک اٹھتا تھا مگر آج غریب ہیں ۔ اسی طرح مخالفت قیاس لغوی کو قیاس کرلیجئے ۔ تنافر حروف کا ذکر مستشرزات کی ذیل میں آچکا ہے —

اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ آج تک فصاحت کے اول رکن کے باب میں جو کچھ فرمایا گیا وہ زیادہ تر سو شکافی اور فصاحت کلام متعلق ہے ۔ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کہ کوئی خرش فہم موقع

محل اور موضوع کو اونچے سے طاق پر رکھہ کر لغت کی کتابوں سے لفظ لے لے کر کلام میں بھر دے —

اب میں آپ کو فصاحت کی دوسری حد پر لیجانا چاہتا ہوں - میرا مطلب ہے فصاحت متکلم - آپ کہہ چکا ہوں کہ اس کا تعلق زیادہ تر خطابت سے ہے ضمناً مکالمہ بھی اسی حد میں آجاتا ہے - اگر کوئی شخص زنجیر کو زنزیر یا جنجیر عام کو سام یا قلم کو کلم کہے تو صاحب مذاق سننے والے ضرور ہنسیں گے - اس لئے ضروری ہے کہ بولنے میں ہر لفظ صحیح تلفظ میں ادا ہو اور ہر حرف سے اس کی صحیح آواز پیدا ہو - بعض مقامی خصایص ایسے ہیں جو صحیح علم کے باوجود مکالمہ کو صحیح نہیں ہونے دیتے - اس کی وجہ آلات نطق کی بناوٹ کی خصوصیت اور عادت ہے جس کا مداوا صحبت اور مزاولت کے سوا کچھہ اور نہیں - ایک مغربی مفکر نے اس کی وضاحت ہو جائے گی - سیدانشا نے دریائے لطافت میں جو گفتگو اور لہجہ میر غفر غینی کا لکھا ہے اس سے اس امر پر تیز روشنی پڑتی ہے - میر غفر غینی کے آلات نطق کچھہ ایسے واقع ہوئے تھے کہ 'ل' اور 'ر' وغیرہ کی آواز صحیح ادا نہ کرسکتے تھے بلکہ ان حروف کی جگہ 'غ' اور 'ت' وغیرہ کی آواز ناگزیر تھی - سحرالبیان کے اس شعر کو:-

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

وہ یوں کہتے تھے :-

چغی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کغے کو کغے سے بجاتی ہوئی

اس لہجے ہی وجہ سے ان کا نام ہی غفرغینی پڑ گیا - ایسی ہی کیفیت قوموں کی ہے - مختلف ملکوں یا ایک ملک کے مختلف حصوں کے رہنے والوں کا لہجہ خصوصی طور پر خاص حروف کی آواز نکالنے میں مختلف ہوتا ہے - صحت تکلم اہل زبان کے لہجے سے وابستگی رکھتی ہے اور یہ امتیاز ہر ملک اور ہر زبان میں موجود ہے - قریش کے لہجے اور سبعہ احرف کا محض حوالہ دنیا امید ہے اس بارے میں کافی سمجھا جائے گا -

ابھی کلمے کے جز یعنی سلیبل اور تونر یعنی ایکسنٹ کا ذکر آچکا ہے - اور زبانوں میں تونر کے فرق اور ردوبدل سے کلمے کے معنی بدل جاتے ہیں - کبھی اسم سے فعل اور فعل سے اسم بن جاتا ہے - اگرچہ کتابت وہی جوں کی توں رہتی ہے - مثلاً انگریزی میں کنٹریکٹ اور کونٹریکٹ - مکالمہ میں ایک اور چیز بھی ہے جو کلام کے معنی اور متکلم کے عندیہ پر بڑا اثر رکھتی ہے - یعنی لہجے سے الفاظ پر زور دینا جسے انگریزی میں امفیسس کہتے ہیں - اس کا تعلق کلام سے ہے کلمے سے نہیں اس کی تشریح ایک جملے سے بخوبی ہوجائے گی - جس میں یہی کلمات کا صوتی زور مختلف معنی پیدا کردیتا ہے - وہ جملہ ہے —

" میں کل دہلی جاؤں گا "

۱ - " میں کل دہلی جاؤں گا ؟ " (آپ نے یہ کس سے سنا - میں نے تو ایسا ارادہ نہیں کیا)

۲ - " میں ' کل ' دہلی جاؤں گا ! " (یہ کون کہتا ہے کہ کل جاؤں گا - ابھی جانے کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی)

۳ - " ' میں ' کل دہلی جاؤں گا ! " (اور لوگ کل جائیں گے - میرا ابھی طے نہیں پایا)

۴ - میں کل دہلی جاؤں گا - (اور کوئی جائے یا نہ جائے - میں ضرور جاؤں گا)

۵ - میں کل دہلی جاؤں گا - (اج یا پرسوں نہیں - کل جاؤں گا)

۶ - میں کل دہلی جاؤں گا - (بمبئی یا بنگلور نہیں - دہلی جاؤں گا)

آپ نے دیکھا کہ لہجے اور صوت کے اتار چڑھاؤ نے ان چار لفظوں میں کیا کیا معنی پیدا کئے - جملہ استفہامیہ ندائیہ سے خبریہ اور انشائیہ ہو گیا - اسی نہج پر اور آدھی درجن صورتیں اس جملے کی نکل سکتی ہیں - فصاحت متکلم کی حقیقت بس یہی اور اتنی ہے - اس سے زیادہ فن خطابت سے تعلق رکھتا ہے —

اب فصاحت کلام کے بارے میں عرض کرنا ہے - اس کی تعریف کی گئی ہے :—

" خلوص اُنست از ضعف تالیف و تنافر کلمات و تعقید " -

فصاحت کلام کی یہ تعریف کتب قدیمہ سے ماخوذ ہے - ایک صاحب نے ان تین عیوب مخل فصاحت میں ایزادی کی اور تکرار کلمہ واحد - توالی اضافت ، ابتذال ، تغیر ، اثقال اور تناقص کی ایزادی فرمائی * - ایک اور صاحب نے اس فہرست کو اتنی طوالت دی کہ فصاحت کی تعریف میں بیس عیوب گن کر دس عیوب قافیہ بھی شامل کردئے † —

وہ تین عیبوں سے خلوص درکار ہو یا تیس عیبوں سے معائب کلام کی ان فہرستوں کو فصاحت کلام کی تعریف قرار دینا معقولیت سے خارج

---

* بحرالفصاحت - صفحہ ۳۴۴ —

† معیار البلاغت - خاتمہ —

ہے - اور پھر توجیہہ و استدلال کا سلسلہ تک نہیں پڑنے پاتا اس لٹریچر کے ملاحظہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان عیوب کی کیفیت و کمیت کے بارے میں اختلاف رائے بھی ہے - بوستان کا مطلع ہے :—

بنام جہاندار جاں آفریں
حکیم سخن بر زباں آفریں

ایک بزرگ دوسرے مصرع میں ضعف تالیف کا نقص نکالتے ہیں کہ دو کلموں میں جو فاعلیت کے معنے رکھتے ہیں فصل جائز نہیں اور پھر "خون دل آشام" کی طرح وجہ فصل محض اضافت ہی نہیں بلکہ یہاں حرف جار ہے - دوسرے بزرگ اس مصرع میں ضعف تالیف مانتے ہی نہیں-

ضعف تالیف تنافر کلمات ' تعقید وغیرہم کی ماہیت بتانا اور مثالیں پیش کرنا فضول معلوم ہوتا ہے - وہ سب کچھ کتب متداولہ میں آچکا ہے جو آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں - یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیوں متقدمین نے فصاحت کلام کی تعریف میں صرف تین عیوب سے خلوص کی تاکید کی اور کیوں متوسطین اور متاخرین نے اس تعداد کو دس گنا کردیا - اگر یہ کہا جائے کہ قدیم زمانے میں کلام پر اور عیوب عائد ہو نہیں ہوسکتے تھے ' لوگ زیادہ فصیح لکھتے تھے ' جوں جوں کلام فصاحت کے معیار سے گرتا گیا عیوب کی فہرست بڑھتی گئی - یہ دلیل اس وقت پذیرا ہوسکتی تھی جب ایک عہد کے کلام کا موازنہ دوسرے عہد کے کلام سے کیا جاتا جیسے زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا موازنہ بعثت کے بعد کے زمانے کی شاعری سے کیا جاتا ہے - فصاحت علم معانی کا جزو اعظم ہے - زیادہ تر اس وجہ سے کہ کلام بلیغ کے لئے پہلے فصیح ہونا لابد ہے - علم معانی و بیان وغیرہ کی تعریفیں وہی برقرار رہیں لیکن فصاحت کی تعریف .

کہئے فصاحت کلام کی تعریف میں کیوں تبدیلیاں ہوتی رہیں؟ اس کے دو وجوہ ذہن میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ متقدمین کی وضع کی ہوئی تعریف جو کچھ کہ تھی جامع و مانع نہ تھی اور دوسرے یہ کہ فصاحت کے باب میں تقریباً سب کا ذہن غیر مستقل تھا۔ ان کے مزاج کو چون و چرا کی برداشت نہ تھی۔ اسی وجہ سے ان کے ملفوظات میں تخریج تعہئے کا دخل دیکھا جاتا ہے۔ سبھوں نے زور طبع بلاغت پر صرف کیا۔ فصاحت کا ذکر چلتے چلتے کسی نے مقدمہ میں کر دیا کسی نے خاتمہ پر۔ جبھی تو آج ہر کوئی اچھے سے اچھے شاعر کے کلام کو منہ کھول کر کہہ گذرتا ہے 'فصیح نہیں'۔ یہ لفظ فصیح نہیں۔ بھئی وجہ' علت؟ کیوں فصیح نہیں؟ جواب ملتا ہے: سنا نہیں' کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

اردو میں جو برچھے کردی اور طرایف املا کی پھیلی ہوئی ہے اس کی علت غائی ادیبوں کا اختلال طبع اور اضطراب ذہن ہے۔ اسلاف ہر حال میں مستحق تشکر ہیں کہ وہ ایک داغ بیل تو ڈال گئے۔ متعاقبین کا فرض تھا کہ اگر اس میں کہیں کجی اور لرزش کے آثار تھے تو اسے خط مستقیم کی شکل دیتے تاکہ تمام الجھاؤ اور گلجھٹیاں نکل جاتیں۔ مگر کی اور وطواط۔ خان آرزو یا شمس الدین فقیہ کا کہنا کوئی آیت و حدیث تو تھا ہی نہیں کہ اس پر کہیں انگلی رکھنا کفر تھا یا گناہ کبیرہ۔ بات یہ ہے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے مشاطگی کو افادت پر ترجیح دی گئی۔ اس سے کلام میں بہت سے نقص عارض ہو گئے۔ اس کی تشریح میں غالب اور ناسخ کا ایک ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔ میں اس کی نسبت اپنی رائے محفوظ رکھوں گا کہ جو اعتراض ان اشعار پر وارد کئے گئے ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ میرا عندیہ ان اشعار کے پیش کرنے

میں بس یہ ہے کہ خواص کو بھی ان کی صحت و فصاحت میں شبہ ہے۔ اور شبہ کرنے والوں کی ادبی حیثیت سب پر روشن ہے کہ مسلم ہے۔ غالب کا شعر مطلع دیوان ہے :—

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ناسخ کا مشہور اور روشن مطلع ہے :—

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اول شعر کو غلط بتایا گیا اور دوسرے کو مہمل۔ اعتراض کی نوعیت سے قرض نہ رکھہ کر ضرور آپ کی بھی یہ رائے ہوگی کہ کلام کی مشاطگی کی بہتات نے فاضل معترضوں کو ایراد و تعریض کا موقع دیا۔ آپ دیکھتے ہیں ان دونوں شعروں میں مشاطگی کس کمال کی ہے کہ 'چیزے فزوں کند' کی گنجائش ہی نہیں—

جیسا کہ گزارش ہوا ہے سجاوٹ کا شوق جب غلبہ پا جاتا ہے تو انسان کا نفس ناطقہ افادت کی طرف سے بطی الحس ہوجاتا ہے۔ اور شعور یا کہئے اس کی تمام ذہنیت سجاوٹ اور بناوٹ کی حلقہ بگوش ہوجاتی ہے—

آپ کو انتظار ہوگا کہ فصاحت کی تعریف آخر میں نے اپنے ذہن میں کیا قرار دی ہے۔ سنئے' گوش حق نیوش سے سنئے' اور نظر اصلاح سے دیکھئے :—

فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے
ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین پہنچا دیتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ ذہنی قربت کن طریقوں سے مترتب ہوسکتی ہے۔ اس کے کئی مدارج ہیں۔ پہلا درجہ افہام و تفہیم ہے۔ کلام ایسا ہوکہ منشی اپنا مافی الضمیر قاری کو سمجھا سکے اور قاری بغیر دقت اور زحمت کے اُسے سمجھ سکے۔ دوسرا درجہ ہے لطف اندوزی یا تلذذ۔ یعنی سننے اور پڑھنے والے کو اس کلام سے لذت اور راحت حاصل ہو۔ اور سبحان اللہ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلے۔ کہئے روح وجد میں آجائے۔ تیسرا اور آخری درجہ ہے تاثر۔ اس کے معنی ہیں مخاطب آپ کے کلام سے متاثر ہوکر آپ کا ہمخیال ہوجائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ دونوں میں کامل ذہنی قربت اور یگانگت پیدا ہو جائے۔ ان تینوں کیفیتوں کو فصاحت کہئے یا ارتقائے انشا، یہی کلام کی معراج ہے —

فصاحت کے اس تدریجی ارتقا کے مدارج میں درمیانی درجہ وضاحت چاہتا ہے۔ ہر زبان اور ادب کے ثقات اس لطف کو مستحسن نہیں سمجھتے جس میں تہیج یا ایک قسم کا بربریت خروش پایا جائے۔ حسین ساگر سے جب آپ کے بنسی نے ایک بڑی اور کم خار مچھلی نکال کر کنارے پر ڈالی اس وقت آپ کو لطف آیا ہو گا اور آپ خوش ہوے ہونگے۔ اور جب آپ نے اسی حسین ساگر میں سے ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی جان بچائی تو اس وقت بھی آپ کو خوشی ہوئی اور راحت ملی۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ ان دونوں کیفیتوں کی ذہنی نوعیت میں کیا مابہ‌الامتیاز ہے۔ وہ نفسیاتی ہیجان جس میں بربریت کا جوش و خروش ہو دل گزیں نہیں ہوا کرتا اس لئے دیر پا نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد میں روحانیت نہیں بلکہ مادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ شاعر کہہ گیا ہے۔ اور کس حسرت سے کہہ گیا ہے —

حقیقت تم پہ کھل جائے ابھی اس درد الفت کی
گھڑی بھر تم جو میرے دل کو اپنے دل میں رہنے دو

شاعر نے اپنی دھن میں دل میں دل ڈالنے کی تمنا ظاہر کی - میں اسے دوسرے پیرایہ میں ذہنی قربت سے تعبیر کرتا ہوں - دونوں باتیں اصل میں ہیں ایک ہی —

جب ایسے شخص سے آپ کا واسطہ پڑے جو وجیہ ہو ' خوش گفتار ہو ' ستودہ اخلاق اور پاک سیرت رکھتا ہو تو اس کے لئے ضرور آپ کے دل میں انس کا احساس پیدا ہوگا - اسی طرح جب ایسا کلام پڑھنے یا سننے میں آے جس میں الفاظ صحیح اور ترنم ریز ہوں ' جس کے فقروں کی بندش چست اور سلجھی ہوئی ہو ' جس میں اول سے آخر تک شباب تخیل کی اٹھان ہو ' جس کا موضوع دلکش اور مطلب دل آویز ہو ' مگر جس جواہر کے لئے آپ کو ہمالہ الٹ دینے کی ضرورت نہ پڑے - ایسا کلام قاری اور سامع کے ذہن کو ' اس کے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچے گا پر کھینچےگا اور انھیں کم سے کم وقت اور توجہ اس کلام کو اپنے ذہن میں جذب کرنے کے لئے صرف کرنی پڑے گی —

اسے میں کہتا ہوں ایک ذہن کا دوسرے ذہن کے قریب تریں ہونا - جن ہستیوں نے انسانوں کی ذہنیت پلٹ دی ' معما گوئی اور بدیع گفتاری ان سے نامحرم نہیں ' کلام مجید کی فصاحت بالاتفاق ضرب المثل ہے - مستشرقین اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ رگ وید میں جو رچائیں اوشا یعنی طلوع سحر کی شان میں ہیں ان سے بڑھکر فصیح کلام اور زبانوں کی نظم میں نہیں ملتا - اسی ضمن میں آتا ہے وہ تاثر اور جذب ذہنیت جو مارٹن لوتھر کے کلام سے یورپ کی ذہنیت پر مترتب ہوا —

پہلے درجت ہوا یا بیچ ؟ یا اولیت خیال کا حصہ ہے یا نطق کا ؟ ایسے سوالوں کی اندھیر بن میں پڑنا سعی لاطایل ہے - وہ کچھہ بھی ہو یہ امر تو بدیہی حقیقت ہے کہ تخیل بغیر الفاظ کے ناممکن ہے - اسی استدلال کی بنا پر اسلوب کا تاثر تخیل پر مسلم ہے - اچھی بات ' اچھے خیال کے لئے زبان اور اسلوب بھی اچھا چاہئے - بلکہ ان کا اثر بری بات کو بھی دلپذیر بنا دیتا ہے ' متنبی نے ایک شاعر کا سن کر کہا ہے -

واسمع من الفاظہ اللغت التی　　یلذبہا سمعی و لو ضمنت شتمی

اس کی زبان سے میرے کان لذت پاتے ہیں اگرچہ ان میں گالیاں بھری ہوں اور وہ مجھی پر پڑ رہی ہوں —

عرض کیا گیا ہے :-

" فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب تریں کردیتا ہے "—

قربت ذہن نہایت جامع کلمہ واقع ہوا ہے - اس مبحث پر نہ صرف علم لسان بلکہ نفسیات کے تحت بہت کچھہ کہا جاسکتا ہے - اگر میں یہ رام کہانی سنانے بیٹھوں تو لکچر ہو جائے اور مضمون پھر بھی تشنہ رہے - اس لئے بہتر ہے کہ قربت ذہن کی نظیر یا تشریح میں استاد کا شعر سنا کر آپ سے رخصت ہوں فرمایا ہے :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بگڑا شاعر مرثیہ گو

از

(جناب طالب آبادی)

دنیا

دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے - جتنے منہ اتنی ہی باتیں - کبھی کسی دل جلے یا کسی منچلے نے مسکرا کر کہدیا ہوگا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" - بس دنیا لے اڑی، یہ فقرہ بھی کہاوت ہوگیا - دس بیس نہیں سو پچاس نہیں ہزاروں آج تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں - سانپ نکل گیا ہے، لکیر پیٹ رہے ہیں - وہ لوگ جنھوں نے خود مرثیے نہیں پڑھے، نہیں سنے اور نہیں کہے اُن سے کوئی گلہ نہیں - ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کے دل تو ہیں مگر جوہر سے خالی ہیں؛ آنکھیں ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے؛ سنتے تو ہیں مگر سمجھتے کچھ نہیں - اللہ کے فضل سے ہر زمانے میں ایسے لوگ کثرت سے گذرے ہیں - میری نگاہ میں اس قسم کے لوگ صرف دلچسپ ہی نہیں دنیا کے لئے ضروری بھی ہیں - خیر ایسوں کا سننا یا نہ سننا پڑھنا یا نہ پڑھنا سب برابر ہے —

مگر غضب تو یہ ہے کہ جن طبیعتوں میں صلاحیت ہے، جو اچھے برے کی پہچان رکھتے ہیں اور جو کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتے ہیں وہ بھی دوسروں کی عینک سے دیکھیں، خود کوئی رائے نہ قائم کریں،

تحقیق سے کام نہ لیں، اپنے کان نہ ٹٹولیں اور کوئی کہدے کہ "کوا کان لے گیا" تو بس انچر پنچر ڈھیلے ہو جائیں، بے تحاشہ غل مچاتے ہوے کوے کے پیچھے ہو لیں —

دارالاقامہ

دلچسپی کے درجے ہوتے ہیں۔ میرے تجربہ میں دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپ جگہ وہ ہے جس کو پڑھے لکھے لوگ بورڈنگ ہاوس یا ہوسٹل (دارالاقامہ) کے لقب سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس میں ہانت بھانت کے مسافر بستے ہیں، خصوصاً وہ دارالاقامہ جو صرف جامعہ کے اونچے درجوں کے طلباء کے لئے مخصوص ہوتا ہے وہاں کی دلچسپیوں کا کیا پوچھنا ہے —

کبھی لندن کے دارالعوام کا لطف ہوتا ہے، کبھی پیرس کے ہوٹلوں کا مزا آتا ہے، کبھو وائنا کے رصد خانے اس کے سامنے مات ہوتے ہیں کبھی یورپ کے بڑے بڑے دارالعلوم پانی بھرتے ہیں —

مختلف آب و ہوا میں پلے ہوے لوگ ایک احاطے کے اندر کچھ دنوں کے لئے شاہانہ طور پر نظر بند کردئے جاتے ہیں۔ خیر؛ صورت، شکل، جسم اور قد تو عام طور پر مختلف ہوتے ہی ہیں مگر تمام دنیا کے مختلف الخیال، مختلف الوضع اور مختلف المزاج آدمی ایک جگہ دیکھنے ہوں تو کسی نامی جامعہ کے دارالاقامہ میں صرف ایک ہفتہ قیام کرلیجئے۔

گفتگو سے زیادہ بحثیں ہوتی ہیں۔ دنیا کا کوئی ادبی، علمی، فنی، معاشرتی، سیاسی یا اقتصادی مبحث ایسا نہ ہوگا جس پر طلبا تک کر گفتگو نہ کریں۔ کسی انتخاب میں صرف حوالے کے طور پر کسی علم، فن، یا رسالے کا محض نام دیکھ لیا تو کافی ہے۔ اس شد و مد سے باتیں کریں گے گویا تمام نکات پر حاوی ہیں۔ پھر مزہ یہ کہ ہر ایک اپنی اپنی الاپے گا

دوسرے کی نہ سنے گا۔ وہ شور ہوتا ہے کہ کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی اور جس کی نہ سنئے وہ خفا بھی ہو جاتا ہے —

ایک محفل

اسی طرح کی ایک محفل سجی ہوئی تھی۔ ہوائی جہاز پر بحثیں ہو رہی تھیں — مجھے سائنس میں نہ کوئی دخل ہے نہ دلچسپی میں ایک کونے میں چپکا بیٹھا ہوا انیسر کا ایک مراسلہ دیکھ رہا تھا۔ بحث طیارہ سے اتر کر ارسطو کے اقوال پر پہنچی وہاں سے لاطینی زبان کے شاعروں میں گئی، پھر اور بہت سے شعبہ جات علم و صنعت و فن میں گھومتی گھامتی اردو شاعری تک آگئی۔ "ہماری شاعری" پر تنقیدیں ہونے لگیں، بیچارے غالب کو چھوڑ کر ولی دکھنی اور میر سے لیکر آج تک چار سو برس کے اندر جتنے ذکر کے قابل شاعر اردو کے ہوئے ہیں سب کی خبر لے لی گئی۔ اگر یہ نہ ہوتا کہ لوگ واقعت گذاری اور مشغلے کی باتوں کو اہمیت دیدیں گے تو آج کل کے ان چند باکمال ہستیوں کے نام بھی لکھ دیتا جن کو آو بھگت جامعہ والے مشرقی طلبہ میں الاٹمنٹ ہوا کرتی رہتی ہے —

غرض "بکواس ہے" "بیکار ہے" "خلاف فطرت ہے" "قافیہ پیمائی ہے" "مبالغہ ہے" "لغویات ہے" یہ اور اسی قسم کے تمغے بڑی دریا دلی سے بانٹے گئے —

میری شامت کہ دو آدمیوں میں "ڈھول ڈھپا" ہوتے دیکھ کر میں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا "پیش دستی" تو نہیں کی پیش قدمی ضرور کی۔ میرا متوجہ ہونا ہی تھا کہ وہ دونوں بلائیتی جونک بن کر میرے پیچھے پڑگئے۔ اچھا آپ کی رائے کیا ہے؟ آزاد رائے دیجئے گا؟ پوچھنے کو تو پوچھا مگر مشکل سے دس سکنڈ انتظار کر کے انہیں میں سے ذرا جو طرار

تھے انھوں نے خود اپنی رائے بتانی شروع کر دی۔ میں نے بھی دل میں سوچا چلو سستے چھوٹے، بڑی توجہ سے ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا، مگر شور کہئے، اکھڑی ہوئی باتیں کہئے یا میری سمجھ کہئے، بس کہیں کہیں کسی شاعر کا نام سمجھ میں آجاتا تھا اور کچھ نہیں۔ یا یہ کہ 'میر' بڑا دماغ تھا، 'ناسخ' پاگل تھا، 'انیس' کو کچھ نہیں آتا تھا، 'اکبر' ہذیانات بکتے تھے اور ..... کہتے کیا ہیں خواہ مخواہ کی بکواس ہے۔

تنقید کا یہ جوار بھاٹا ذرا تھما ہی تھا کہ ایک صاحب نے کہیں انیس کا نام اردو شعرا میں لے دیا۔ بس اب آئے تو جاتے کہاں ہو، آدھی محفل پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ گئی۔ جو جو جی چاہا بے نقطہ سنائی۔ وہ تو کہئے ایک صاحب بول اٹھے اجی انیس کا ذکر ہو گیا "بگڑا شاعر مرثیہ گو" وہ شاعر ہی کب تھے۔ بھائی میں تو اس فقرہ پر ضبط نہ ہوا۔ میں نے کہدیا جس نے سب سے پہلے یہ بات کہی وہ یا تو غیر شاعر تھا یا متشاعر اور آج جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ یا تو نا شاعر ہیں یا پیر نا بالغ۔

غرض مرثیے کے مختلف شعبوں پر، فوائد اور مضرات پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، آخر میں یہ طے ہوا کہ میں ایک مضمون لکھوں جس میں اپنے دعوے کی دلیلیں پیش کروں۔ مثالوں کے انتخاب میں اس کا خیال رکھوں کہ صرف چوٹی کے مرثیے نہ ہوں ورنہ وہ سنسر کی زد میں آجائیں گے اور مستثنیات میں سمجھے جائیں گے۔ بلکہ جہاں سے جو مرثیہ ہاتھ آجائے اسی میں سے لکھ دوں۔

میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ آج اسے پورا کر رہا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ بھارت میں ایسا کوئی طبقہ ضرور موجود ہے جس کے نمائندے ہمارے وہ دوست تھے جنھوں نے ہم سے مضمون کا وعدہ لیا تھا۔ اور یہ طبقہ

آج تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوتا ہے۔ شاید ان کے اس تعصب بھرے خیال کو میں کچھ دور کرسکوں —

عرض ہے

مگر مضمون لکھنے سے پہلے میں ان حضرات سے جنھیں "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کا مرض ہے نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

(۱) بلا وجہ جو خیال انھوں نے اپنے دل میں قائم کرلیا ہے اسے تھوڑی دیر کے لئے بھلا دیں پورا مضمون ختم کرلینے کے بعد وہ مختار ہوں گے جو چاہیں وہ فیصلہ کریں۔ مگر یہ نہیں کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر' صرف اس لئے کہ ان کے برسوں کے اٹل اور انمول خیالات کے خلاف آئینے میں کچھ اور نظر آرہا ہے وہ مجھے کوس کر گالیاں دے کر مضمون کو نامکمل طور پر نہ پڑھیں۔ اسواسطے کہ آئینے بہت کم خراب ہوتے ہیں مگر جس کی جیسی صورت ہوتی ہے ویسی ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو حسین سمجھتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ حقیقت بھی وہی ہو۔ اس میں میرا کوئی ذاتی نفع نہیں۔ میرے لئے تو سب برابر ہے —

صاف باطن کے لئے یکساں ہے قرب زشت و خوب
سب کو دیتا ہے جگہ دل میں برابر آئینہ (مرثیہ ایک مرثیہ گو)

آپ جو چاہیں سمجھیں' آپ کی غلط فہمی سے نہ حقیقت پر پردہ پڑے گا نہ میرا کوئی نقصان ہوگا' یہ ضرور ہے کہ جب تک ترازو میں پاسنگ درست نہ ہوگا کوئی چیز ٹھیک نہ تلے گی۔ بے تعصب ہونے کے لئے اور بے تعصب رہ کر تحقیق کرنے کے لئے قریب قریب مغرب و مشرق کے ہر فلسفی نے لکھا ہے' صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں' تعصب کو بد ترین معصیت' اخلاق سوز حرکت اور خدا جانے کیا کیا لکھا ہے۔ ہزاروں مضر اثرات اور لاکھوں برے نتیجے دکھائے ہیں۔ یہ سب سچ ہے

مگر بھائی تعصب، جانبہ داری، ہٹ، ضد، یا جو کچھ کہئے سچ پوچھئے تو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر یہ موضوع میرے مضمون سے جدا نہ ہوتا تو جی کھول کر لکھتا۔ بہرطور میرے نزدیک لازمی ہے کہ تحقیق کرنے والا بالکل بے لوث ہو کر تحقیق کرے —

بے لوث ہونے اور تحقیق کے دوران میں بے لوث رہنے کے لئے میرے نزدیک صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ اپنی رائے اور اپنے خیال کو جو انسان اپنی جگہہ پختہ کر چکا ہے اسے یونہی رہنے دے۔ صرف اتنی سی بات پر تیار ہو جائے کہ ذرا سن تو لیں جو ہمارا مخالف ہے وہ کہتا کیا ہے۔ شاید وہی سیدھی راہ پر ہو، ہمیں گمراہ ہوں —

یہ ذرا سا شک اور اپنے پختہ خیالات یہی دونوں تنقید کی سچی ترازو بن جائیں گے اور ماہیت و اصلیت کے پلے آخر میں بالکل برابر نظر آئیں گے، اگر آپ کی غلطی ہے تو حقیقت کے موتی مل جائیں اگر آپ کی غلطی نہیں ہے تو آپ معرفت کے اس بلند درجے پر پہنچ جائیں گے جہاں سے دنیا کی اور کوئی قوت آپ کو ہٹا نہیں سکتی —

(۲) یقین کیجئے، میں نے جن مرثیوں سے انتخابات لئے ہیں وہ ان شاعروں کی کائنات یا شاہکار یا چوٹی کے مرثیے نہیں ہیں۔ سب سے پہلے مجھے جو مرثیے مل گئے انہیں سے مطلب کی چیزیں چھانٹ لی گئی ہیں۔ میں نے محض "مشتے نمونہ از خروارے" پر عمل کیا ہے۔ اردو میں صرف مرثیوں کی تعداد میرے خیال میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ میں نے صرف بیس مرثیے لئے ہیں جن میں ہر درجہ کے مرثیہ گو ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات کے شعبہ جات پر مضمون کے اس حصہ میں بحث نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان کا تعلق زیادہ تر واقعات رنج و غم،

مثلاً رخصت و شہادت وغیرہ سے ہے اور ان کے متعلق اکثر لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ مذہبی روایات و عقائد کی بنا پر ان میں جو کچھ ادب ہے وہ خصوصاً شیعوں کے لئے اور عام طور پر مسلمانوں کے واسطے مخصوص ہے' یہ بات بھی ایک دوسری غلط فہمی ہے - اس کے متعلق اسی مضمون کی دوسری کڑی میں بحث کروں گا - مگر فی الحال میں نے فضائل و مناقب اور مصائب و مذہبی روایات سب کو نظر انداز کردیا ہے اور صرف وہ باتیں دکھائیں ہیں جو عام دلچسپی اور عالمگیر ادبی حیثیت سے مالا مال ہیں —

(۲) میں نے صرف مرثیوں پر اکتفا کی ہے' رباعی' سلام' مخمس' سلام' نوحہ جات یا اور اسی نوع کی دوسری نظمیں نہیں لیں حالانکہ ان میں بھی ادب اور شاعری کے عمدہ نمونے بہت بھرے ہوئے ہیں - ضرورت پڑی تو - یا زندہ صحبت باقی

(۳) میں نے جہاں جہاں سے مثالیں اس مضمون میں دی ہیں ان مرثیوں کے مطالعے اور مرثیہ گویوں کے نام لکھ دیتا ہوں' شاید کسی صاحب کو شوق پیدا ہو اور وہ اصل مرثیہ یا مکمل مرثیہ دیکھنا چاہیں تو زحمت نہ ہو - ان میں سے جو مرثیہ نہ مل سکے وہ مطالعہ کے لئے میں نذر کرسکتا ہوں - اس لئے کہ سب چھپے ہوئے نہیں ہے - جی تو یہی چاہتا تھا کہ جن مرثیوں سے مثالیں لی گئی ہیں ان کے ناظمین کے مختصر حالات بھی لکھ دیتا مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کا معتقد کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں اس پر کوئی غلط اثر ڈال رہا ہوں - بعض مصرعوں کی جگہ محض لکیریں کھنچی ہوئی ہیں' ان لکیروں کی غرض یہ ہے کہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اصل میں اس مصرعے کی کیا جگہ ہے - جو مصرعے چھوڑے گئے ہیں اس کے اسباب یہ ہیں —

(الف) بعض نہایت سست ہیں، بعض صرف بھرتی کے لئے ہیں اور

(ب) بعض مذہبی معتقدات یا روایات کی جھلک لئے ہوئے ہیں۔

ایک ہی مضمون میں مرثیے کے تمام پہلوؤں پر بسط کے ساتھ نظر کرنا کم سے کم میری ہمت سے زیادہ بلند تھا لہذا میں نے کئی کڑیاں کو دی ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	مطالع	مرثیہ گو	کس کی شان میں
(۱)	اے شیر طبع آہوے مضمون شکار کر	مونس	جناب عباس
(۲)	ہاں اے سنان غم جگر و دل کے پار ہو	نفیس	علی اکبر
(۳)	اے طبع رسا صیقل شمشیر زبان ہو	مونس	علی اکبر
(۴)	پنہان ہوے کوکب جو سرا پردۂ شب میں	مونس	امام حسین
(۵)	اے قلم دامن کاغذ پہ گہر ریز ہو پھر	وحید	جناب عباس
(۶)	جام جہاں نما سخن آبدار ہے	وحید	امام حسین
(۷)	یعقوب مصطفوی سے جو یوسف جدا ہوا	نفیس	امام حسین
(۸)	ہاں اے فلک سنبھال سپر آفتاب کی	انس	امام حسین
(۹)	میری زبان کو شرف مدح پنجتن سے ملا	نفیس	امام حسین
(۱۰)	دوزخ سے جب آزاد کیا حر کو خدا نے	انیس	عون و محمد
(۱۱)	نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری	انیس	امام حسین
(۱۲)	معجز بیان ہوں فیض رسا لتماب سے	نفیس	عون و محمد
(۱۳)	معصفر خوں شہیدان ہے مرا دامن دل	رشید	امام حسین

(۱۴) عباس نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی رشید جناب عباس

(۱۵) وہ گل ہوں کہ جس پاس خزاں آ نہیں سکتی سلیس جناب عباس

(۱۶) سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے تعشق حر

(۱۷) ہمیشہ گلشن عالم کا ایک حال نہیں کوثر واپسی اہلبیت

(۱۸) کیا خلق حسن تھا حسن سبز قبا میں دبیر امام حسن

(۱۹) اے قلم معرکۂ جنگ کی تصویر کھینچ نیسان جناب عباس

(۲۰) میری تقریر کو تاثیر عطا کر یا رب ساجد علی اکبر

مرثیہ اردو کی شاعری کو فارسی کی شاعری سے اور فارسی کی شاعری کو عربی کی شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہے ' اردو کے مرثیے بھی نظم ہی کی ایک شاخ ہیں وہ مخصوص سہی لہذا جتنا اردو شاعری کی ہر شاخ ' غزل ' قصیدہ ' نظم وغیرہ کو عربی اور فارسی کے اجزاء مناسب و مقابل سے تعلق ہے اتنا ہی مرثیے کو بھی ہے —

جس طرح ہندوستان کی عورتیں خواہ کسی مذہب یا ملت ' کسی حصۂ ملک یا کسی خیال و وضع کی ہوں اپنے خاندان کے بیٹی ' بیٹے ' ماں باپ ' شوہر ' بہن بھائی یا اور اعزا کے مرنے کے بعد اس کی یاد میں بین کرتی ہیں اسی طرح عرب میں بھی چلن تھا - یہ چلن زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا ' اسلام سے پہلے بھی لوگ اپنے بچھڑوں اور پیاروں کی یاد میں بین کرتے تھے - مرد کم عورتیں زیادہ ' اسی لئے عرب میں مرثیہ کو عورتیں مرثیہ گو مردوں سے زیادہ ہوئی ہیں - مرثیے بچھڑے ہوے کی اچھی صفات کا ذکر ہوتا ہے اور اس کی مصیبتیں یاد کر کر کے رونے رلانے کا سامان کیا جاتا ہے - اسی طرح کے بین آج بھی کئے جاتے ہیں - زمانۂ جاہلیت میں جس قبیلے میں کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا وہ

بڑا ممتاز سمجھا جاتا تھا اور شاعر بلتا نہیں تھا، بلکہ فطرت سے صلاحیت نظم لے کر پیدا ہوتا تھا لہذا اس کے کلام میں جوش، فصاحت، اور بلاغت کی انتہا نہ ہوتی تھی۔ تمام خاندان والے اپنے شاعر کی بڑی عزت کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے وہی تو خاندان کا نام اجالا کرنے والے اور باقی رکھنے والے ہوا کرتے تھے۔ سب لوگ جمع ہو کر جہاں اور طرح کے کلام اپنے خاندانی شاعر سے سنتے تھے وہاں خاندانی مردوں کے مرثیے بھی سنتے تھے۔ وہی طریقہ کم و بیش آج بھی رائج ہے۔ مجلس میں بھی ذاکر مرثیہ پڑھتا ہے سب سنتے ہیں۔ یوں بھی سوگوار کے بین لوگ جمع ہوکر سنا کرتے ہیں۔

عربی میں سب سے پہلے کس نے مرثیہ کہا؟ یا کتنے اچھے مرثیہ گو گذرے؟ یا فارسی میں کون کون سے مرثیے کہے گئے؟ یہ سب سوالات میرے موضوع سے الگ ہیں۔ بہر طور بتانا یہ ہے کہ اردو مرثیے فارسی مرثیے اور عربی مرثیے سب میں تین چیزیں مشترک ہیں —

(الف) — میت کے فضائل و مناقب —

(ب) اس کی مصیبتوں کا ذکر —

(ج) کسی پیرایۂ نظم کا اختیار کرنا اس لئے کہ نثر سے کہیں زیادہ نظم کا اثر طبع انسانی پر ہوتا ہے اور نسبتاً دیر پا بھی ہوتا ہے —

جہاں تک عربی فارسی اور اردو مرثئے کی تاریخ کا سوال ہے نہ مجھ میں اتنی قابلیت ہے کہ میں لکھ سکوں نہ اتنا وقت ہے اور نہ میرے مضمون کے لئے ضرورت ہے۔ لوگوں نے لکھا ہے۔ بعض حضرات لکھ رہے ہیں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہا ہے کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اردو میں مرثیہ

کب سے شروع ہوا، مورخ سے پوچھئے۔ مگر ابتدا اسی وقت سے ہوی جب سے اردو شاعری کی ۱۵ غ

بیل پڑی ' دکھنی اور پر اکرت میں بھی مرثیے ہیں - دکن میں جو "اردو" یا بھاشا یا ہندوستانی زبان میں شعر کہنے والے گزرے ہیں انہوں نے بھی مرثیے کہے ہیں- لیکن مرثیے کو معراج کب حاصل ہوئی ؟ اس کا جواب بہت آسان ہے ' جس نے چند مرثیوں کی ورق گردانی بھی کی ہے وہ بلا تکلف کہہ دے گا کہ انیس اور دبیر کے زمانہ میں مرثیہ کا ہلال بدر کامل بنا - تختہ تصویر پر کچھہ سیاہ سفید دھبے پہلے سے بھی تھے مگر انیس و دبیر نے نت نئی جدتوں سے چار چاند لگادئیے - پہلے کے مرثیے عموماً چو مصرعی قطعہ کی شکل میں ہوتے تھے اور سادگی و اثر سے بھرے رہتے تھے - ان میں صرف مصائب کا ذکر ہوا کرتا تھا اور ان کا صرف ایک مقصد ہوتا تھا وہ یہ کہ کربلا کے واقعات بیان کر کے درد پذیر دلوں کو نشتر لگائیں اور سننے والے بے اختیار رودیں —

ادبیات کی سیر کرنے والے جانتے ہیں کہ ہر زبان کی ابتدائی شاعری میں سادگی و اثر یہی دو چیزیں غالب عناصر ہوتی ہیں - انیس و دبیر نے مرثیے کو جس حالت میں پایا اس میں بہت زیادہ اضافہ کیا اور برابر ترقیاں دیتے گئے - انیس کے پہلے ہی مرثیہ چار مصرعوں (مربع) کی حد سے گزر کر ' خلیق ' کے ہاتھہ میں یا اِن سے بھی پہلے مسدس تک پہونچ چکا تھا ' اس میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی اور آج بھی مرثیہ مسدس (چھہ مصرعوں کے بند) ہی میں کہا جاتا ہے - فضائل کا ذکر بڑھایا ' بہت سے نئے منازل چہرہ ' گریز ' صبح ' صف آرائی ' دعا ' گفتگو ' طعن و طنز ' پہلوان کی لڑائی ' ساقی نامہ ' رجز ' گھوڑے کی تعریف' علم کی تعریف' تلوار کی تعریف ' سراپا وغیرہ داخل کیا - نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ اضافے بالکل ضروری تھے جیسے دنیا کے ہر ادب میں کومیڈی (بزمیہ)

اور ٹریجڈی (المیہ) کا ساتھہ ہے ویسا ہی مرثیے میں بھی ہوگیا ' وسعتیں بھی پیدا ہوگئیں - انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ خوشی کے بعد غم اور غم کے بعد خوشی کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے اسی لئے اردو مرثیوں میں بھی یہ شان پیدا ہوگئی کہ سامعین کو جب چاہا ہنسا لیا جب چاہا رولا لیا —

کربلا کا واقعہ دنیاے اسلام کے لئے عالم کاسب سے زبردست واقعہ تھا لہذا اس کے بعد سے یہ شاخ یعنی مرثیہ محض واقعات کربلا کے لئے مخصوص ہوگئی - اور اب تو یہ حالت ہے کہ جہاں کسی پڑھے لکھے سے " مرثیہ " کا لفظ کہئے وہاں اسکے سامنے صرف " کربلا " سے متعلق واقعات کی تصویریں نگاہ میں پھر جاتی ہیں - یہ سچ ہے کہ آپ جس کے لئے چاہیں مرثیہ کہیں مگر آج تیرہ سو برس سے نہیں تو اردو کی ابتدائی شاعری سے اور اس وقت تک اردو کے مرثیوں میں صرف کربلا کے سانحۂ عظیم کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے —

اردو مرثیے کی خصوصیات

(۱) انگریزی میں بھی اس طرح کا ایک شعبۂ نظم ہے جسے(Elegy) کہتے ہیں اسے دیکھئے ' فارسی اور عربی کے مراثی اور ہندی کے مرثیوں سے مقابلہ کیجئے تو نوعیت ' پیرایۂ بیان ' معنوی اور ظاہری تمام خوبیوں میں اردو کے مرثیے بڑھے چڑھے ہوئے ملیں گے - واقعات اور اعتقادات سے قطع نظر زندگی کے جتنے پہلوؤں کا مرثیوں میں ذکر ہوتا ہے وہ بجائے خود نہایت مفید اور اعلیٰ ہیں —

(۲) زبان کی چستی ' محاورات کی برجستگی دل میں گھر کرتی جاتی ہے —

(۳) چار چار سو بند کے مرثیے موجود ہیں - مگر اجزا میں ایسی مناسبت اور اتنا اچھوتا سلسلہ ہے کہ تمام باتیں ایک ہی زنجیر کی مختلف

کڑیاں معلوم ہوتی ہیں —

(۴) اخلاق اور عادات پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے، ادب، خلوص، وفا، ایثار، انکسار، شجاعت، صبر، قناعت، تحمل، اور بردباری کے سبق ملتے ہیں - دغا، فریب، خونخواری، ظلم، نامردی، اور حیا سوز حرکات سے نفرت ہوتی ہے —

(۵) فکر و جودت پر جلا ہوتی ہے، تلازمات اور مصطلحات سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، حسیات و جذبات کی تہذیب ہوتی رہتی ہے —

اردو مرثیے کا ڈھانچہ خارجی

(۱) چند مخصوص بحریں ہیں مگر آپ جس بحر میں چاہیں مرثیہ کہیں کوئی قید نہیں ہے - ظاہری قیود جو اب تک مرثیہ گویوں نے برتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جیسے مثنوی میں ایک ہی بحر شروع سے آخر تک ہوتی ہے، ویسی ہی ایک مرثیہ ایک ہی بحر میں کہا جاتا ہے - یہ نہیں کہ دو یا کئی بحروں میں ایک ہی مرثیہ ہو ورنہ فردیت کا خون ہو جائے اور اثر و لطف کی جگہ سننے والے کے مزاج میں برہمی پیدا ہو جائے —

(۲) ہر چھ مصرعہ کا ایک بند ہوتا ہے - بند کے آخر کے دو مصرعے مل کر ٹیپ کہلاتے ہیں - چاروں مصرعوں کے قافئے اور ردیف ایک ہوتی ہے بیت کے قوافی و ردیف مصرعوں سے جدا ہوتی ہے - بیت اکثر اپنے اوپر کے سب مصرعوں سے یا کسی ایک مصرعے سے متعلق ہوتی ہے یعنی جو کچھ پہلے بیان کیا جاتا ہے وہی مضمون یا اس سے متعلق مضمون زیادہ وضاحت اور زور کے ساتھ بیت میں نظم ہوتا ہے - اسی لئے بیت مصرعوں سے جدا کوئی چیز نہیں ہوتی اور پھر بیت کے بعد جو بند ہوتا ہے اس کے مضمون سے بھی بیت کا لگاؤ رہتا ہے - اس طور پر بیت بیچ کی کڑی ہوتی

ہے جو اپنے سے پہلے مصرعوں کو اپنے سے بعد والے مصرعوں سے ملاتی ہے یا یوں سمجھئے کہ دو جملوں میں حرف عطف جو کام دیتا ہے وہی دو بندوں میں بیت کا کام ہوتا ہے - اسی لئے عموماً مرثیہ گو ہر بند کا چوتھا مصرعہ اور بیت طبیعت پر بہت زور دے کر کہتے ہیں - بندوں کی کوئی تعداد نہیں ہے - پانچ بند سے لے کر پانسو بند تک کے مرثیے کہے گئے ہیں اور جس کا جی چاہے اس سے بھی کم یا اس سے بھی زیادہ کہے - پہلا بند مطلع کہلاتا ہے آخر کا بند جس میں مرثیہ گو کا تخلص ہوتا ہے مقطع کہلاتا ہے - مگر اکثر مرثیوں میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی کہے جاتے ہیں- اکثر لڑائی یا آمد یا ساقی نامہ کے سلسلے میں مطلعے کہے جاتے ہیں ' مطلع میں اور دوسرے بندوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا - عام طور پر مطلع کے چاروں مصرعوں میں قافیہ و ردیف دونوں موجود ہوتے ہیں —

داخلی | (۱) مرثیہ کا مسلسل ہونا لازمی ہے - آپ جتنی وسعت چاہئے پیدا کیجئے - جتنے بند چاہئے نظم کیجئے مگر پورے مرثیہ کو منشتر اور غیر مترتب واقعات کا دفتر نہ بنائیے - اس خوبی سے تسلسل قائم رکھئے کہ پڑھنے والے کو یہ بھی پتہ نہ چلے کہ کب کہاں سے کہاں پہنچ گیا - اسی لئے قصیدے میں صرف تشبیب کے بعد گریز ہوتی ہے ' مرثیہ میں اکثر جگہہ گریز کرنی پڑتی ہے اور تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے ورنہ Unity اور Continuity ربط اور تسلسل کا خون ہو جائے گا —

(۲) فضائل و مناقب اور مختلف مدارج و منازل کی ترتیب میں فطری مناسبت ہونی چاہئے - الفاظ کا انتخاب اور موسیقی کو قائم رکھنا ضروری ہے- جس طرح کی بات کہنی ہو الفاظ بھی اسی کے مناسب ہوں ' طرز

سخن بھی موزوں ہو، ورنہ مرثیہ نہ رہے گا، نامناسب مصرعوں کا ایک پلندہ بن کر رہ جائے گا —

مرثیہ گو کی دقتیں اور اس کا کمال

قاعدہ ہے کہ جو کام جتنا مشکل اور باریک ہوتا ہے اس کا کرنے والا بھی اتنا ہی ماہر اور باکمال ہونا چاہئے - مرثیے کی چند دقتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اسی سے آپ کو سچے مرثیہ گو کے کمال کا اندازہ ہو جائے گا —

(۱) سب سے بڑی دقت تو یہ ہے کہ اِتنے گنے واقعات اور انھیں کا نظم کرنا ضروری، اچھے سے اچھے اور انوکھے سے انوکھے حادثہ کو ایک مرتبہ کسی کے سامنے بیان کر دیجئے پھر دوبارہ اس میں کوئی لطف یا اثر باقی نہ رہے گا - مرثیوں کے پڑھنے اور سننے کا رواج زیادہ تر شیعوں میں ہے اور ہر شیعہ کے تمام گھرانے والے بچپن ہی سے واقعات کربلا سے اچھی طرح واقف رہتے ہیں - پھر جب تک پیرایۂ بیان میں کوئی انوکھا حسن، کوئی اچھوتی نوک پلک، نہ پیدا کی جائے بھلا سننے والے پر خوشی یا غم کا جذبہ طاری ہو تو کیسے - کبھی ترتیب میں جدت کی جاتی ہے کبھی منازل کے طول و اختصار سے نیا لطف پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی انداز نظم بالکل بدل دیا جاتا ہے - جدت اور مضمون آفرینی کے بغیر کوئی ناظم کامیاب مرثیہ گو نہیں ہو سکتا - پھر یہی ایک قید نہیں؛ تسلسل کی ضرورت ایک طرف، مناسبت ایک طرف اور حفظ مراتب ایک طرف، ان قیود کے ساتھ کوئی کہہ لے اور اچھا کہہ لے تب پتہ چلے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوتا ہے یا "بگڑا مرثیہ گو شاعر" —

(۲) جس طرح ڈرامہ جب تک اسٹیج پر نہ دکھایا جائے پورا لطف نہیں

دے سکتا اسی طرح جب تک مرثیہ گو اچھا ذاکر ٹھکانے سے پڑھ کر نہ سنائے پورا لطف نہیں آسکتا۔ دونوں میں بعض مقاصد مشترک ہیں۔ ڈرامہ میں بھی ایک ہیرو ہوتا ہے مرثیہ میں بھی کوئی خاص ہستی مخصوص ہوتی ہے۔ ڈرامہ میں ہیرو کے صفات بیان کرکے اس سے ہمدردی پیدا کرائی جاتی ہے، یہاں بھی وہی ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں دوسری ہستیوں میں سے بعض مقابلتاً رکھی جاتی ہیں، یہاں بھی دشمنوں سے وہی کام لیا جاتا ہے۔ مگر ڈرامہ میں کبھی کبھی ہیرو کی غلطیاں دکھا کر انہیں کو سبب زوال بتایا جاتا ہے، مرثیہ میں اعتقاداً ایسی کوئی بات نہیں بتائی جاتی، اسٹیج کے ساز و سامان، ڈرامے کے اثر اندازی کو مکمل کردیتے ہیں، مختلف قسم کے لباس اور پردے ڈرامہ پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔ یہاں صرف ذاکر کی آواز کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے اور ہاتھ یا چہرے کی بعض حرکتیں ہوتی ہیں (Acting اور Facing) ہوتی ہے مگر اس آزادی سے نہیں ہوسکتی جتنی اسٹیج پر ہوسکتی۔ رنگ، سین، پردے، باجے ان تمام چیزوں کی کمی مرثیہ گو کو پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اب بتائیے ڈرامہ نویس سے مرثیہ گو کا کام مشکل ہے یا نہیں وہاں دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں سے بھی بہت مدد ملتی ہے، یہاں مرثیہ سننے والوں کو محض سماعت کی دولت ملتی ہے مگر مرثیہ گو کا کمال یہ ہے کہ لفظوں میں ایسا سحر بھر دیتا ہے کہ سننے والے پر بالکل وہی کیفیات طاری ہوجاتی ہیں جو مقصود ہوتی ہیں۔

(۳) مرثیہ گو کو مصور سے کہیں زیادہ صاحب نظر ہونا چاہئے۔ کاغذ اور روشنائی، موقلم اور قرطاس کی جگہ مرثیہ گو کے پاس ضرور رہتی

ھیں مگر مختلف رنگوں کی جگہہ صرف الفاظ رھتے ھیں - اور کامیاب مرثیہ گو کو قدم قدم پر تصویریں کھینچنی پڑتی ھیں- پھر جب تک کوئی جدت نہ ھو اس کا اثر خاطر خواہ نہیں ھو سکتا - مصور کو بھی نظر ناظر سے بہت کچھہ مدد ملتی ھے مگر مرثیہ گو کے لئے صرف سامع کی سماعت ھوتی ھے اور کچھہ نہیں —

(۴) ایجاز اور اشارات کا اتنا صحیح مصرف ھونا چاھئے کہ سننے اور آپ کے سامنے آپ سے آپ تمام مقصود ذھنی تصویریں پھر جائیں —

(۵) ٹریجیڈی اور کومیڈی ایسے پہلو ھے پہلو ھیں کہ سننے والے کی طبیعت بھی اچاٹ نہ ھو اور جو مقصد اصلی ھے یعنی فضائل سن کر محظوظ ھونا اور مصائب سن کر رو دینا وہ بھی حاصل ھو جاے —

(۶) مختلف مذاق، خیال اور قابلیت و عمر کے لوگ مجلس میں جمع ھوتے ھیں - مرثیہ گو کو ان سب باتوں کا خیال بھی رکھنا ضروری ھوتا ھے - یہی وجہ ھے کہ اردو میں ان واقعات کے نظم کرنے والے تو سینکڑوں ھوے ھیں اور اب بھی ھیں مگر ادبی نقطۂ نگاہ سے کامیاب مرثیہ گو صرف دس ھی پانچ ھوے ھیں —

مرثیوں کے روشن پہلو میں نے مضمون کی اس کڑی میں مرثیے کے ان تمام پہلوؤں کو چھوڑ دیا ھے جو مصائب سے متعلق ھیں یا جن کا تعلق کسی خاص روایت یا واقعہ سے ھے کیونکہ ان میں کتنی ھی خوبیاں کیوں نہ ھوں عالمگیر دلچسپی ذرا مشکل سے پیدا ھو سکتی ھے —

مرثیے کی تحلیل (۱) چہرہ - جیسے قصیدے میں تشبیب یا تمہید ھوتی ھے مرثیہ دعا، یا تعلی، یا انکساری یا بہار یا اور کسی موضوع کا حامل ھوتا ھے - اور اس کے بعد اصل واقعات کی طرف

گریز ہوتی ہے —

(۲) ساقی نامہ جہاں طلب اعانت ہوتی ہے —

(۳) صبح صبح کا سماں — نماز

(۴) دوپہر صحرائے عرب کی گرمی

(۵) سواری آمد کی شان —— علم کی تعریف — نہر کی تعریف

(۶) تلوار کی تعریف

(۷) گھوڑے کی تعریف

(۸) جنگ کی حالت

(۹) بھاگڑ

(۱۰) طعن و طنز کی باتیں

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے روشن پہلو نظم کئے جاتے ہیں۔ یہ پہلو صرف وہ ہیں جو عام طور پر مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس ترتیب سے میں نے تحلیل کی ہے بالکل وہی ترتیب ہر مرثیے میں قائم رہے۔ کمی اور زیادتی کے ساتھ ساتھ رد و بدل بھی ہوا کرتی ہے۔ اگر میں اس سلسلہ کی اور کڑیاں بھی لکھ سکا تو رفتہ رفتہ تمام روشن پہلو اور تمام نفسیاتی اور حامل غم پہلوؤں پر روشنی پڑ جائے گی —

چہرہ چہرہ کے لئے بندوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے۔ مگر جس کے حال کا مرثیہ ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے موضوع بھی تلاش کیا جاتا ہے، مقصود مضمون کی طرف الفاظ اور معانی میں خفیف سے اشارات حسن چہرہ کو دوبالا کردیتے ہیں۔ کبھی عجز و انکسار کا اعترات کیا جاتا ہے، کبھی اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے، کبھی ناظم خود اپنی قوت شعر کو مخاطب

کرتا ہے ۔ تھوڑی سی مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں —

سونس

اے شیر طبع آ اوے مضمون شکار کر اے تیغ نطق اپنی برش آشکار کر
اے اوج فکر نظم کو عالی وقار کر اے ناوک قلم دل اعدا فگار کر

کھچتی ہے شکل صف صاف کار زار کی
تیزی ہر ایک بیت میں ہو ذوالفقار کی

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مصرعے آپس میں کس قدر مربوط ہیں اور معانی میں کتنا تسلسل ہے جو تلازمہ پہلے مصرعہ میں اٹھایا گیا ہے وہی برابر قائم رکھا گیا ہے ۔ زبان کو تو لوگ شمشیر سے برابر مشابہت دیتے ہیں ' سونس ' نے نطق کی شمشیر بنائی ہے ۔ کیوں اسواسطے کہ زبان بغیر نطق کے ویسے ہی ہے جیسے تلوار بغیر پانی کے ہوتی ہے ۔ بیت دو مصرعی شعر کو کہتے ہیں' ذوالفقار دو دھاری تلوار کو کہتے ہیں ۔ دیکھئے کس لطف سے ذوالفقار کی چمک دمک اور گھات بانڑہ سب دکھا دیا ہے —

دکھلا وہ گل کہ بابل فردوس مست ہو اوج سخن سے مہر ثریا بوس پست ہو
مضموں کے بلبلوں کا نہا بندوست ہو حرفوں کی تازہ رنگ سے ہرجا نشست ہو

لفظوں سے یوں رہیں در معنی لڑے ہوئے
خاتم پہ جس طرح ہوں نگینے جڑے ہوئے

یہ دوسرا رنگ ہے ۔ گل و انگشتری سے فائدہ حاصل کیا گیا ہے ۔ ورنہ محض کار زار کی یکسان تصویر کشی حساس طبیعتوں پر بار ہوجاتی —

لکھے ورق پہ معرکۂ رزم گر قلم دووے سلاں نوڑہ سے کوئی الف نہ کم

ایک ایک مد میں ہو برش خنجر دودم فون کشیدہ صاف دکھائے کہاں کا خم

ایک ایک دائرہ سپر لاجواب ہو
ہر لام الف میں تیغ دو پیکر کی آب ہو

جس مرثیے کا یہ چہرہ ہے وہ جناب عباس کی شان میں ہے ۔ ممدوح کی خاص صفت شجاعت ہے ۔ اس کے بیان و قبول کے لئے مرثیہ گو ناظرین اور سامعین کو کس حسن سے تیار کرتا ہے اور مخاطبین کے جذبات میں وہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس کی ضرورت ہے —

... ...

... ...

... ...

پہلے مصرعے میں مونس نے ایک نہایت اہم نفسیاتی راز بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر اکثر فلسفیوں نے رسالے کے رسالے سپرد قلم کردئے ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے، کہ خیالات جتنے نازک اور پاکیزہ ہوتے ہیں الفاظ بھی اتنے ہی اچھے اور صاف زبان سے نکلتے ہیں۔ اسی لئے الفاظ، طبیعت کا عکس یا نقرے دماغ کا آئینہ کہے جاتے ہیں۔ اسی خیال کو سعدی نے کہا ہے —

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

وہی بات مونس نے ایک مصرعے میں ادا کردی ہے اور اس حسن و لطف سے کہ معانی میں چار چاند لگ گئے ہیں —

اقلیم ثریا سے قلم باج ستاں ہے کاغذ ورق مہ کی طرح نور فشاں ہے
نقطوں پہ دردرخشندہ ستاروں کا گماں ہے

... ...

... ...

وحید

... ...

الفاظ ہیں کہ جھڑتے ہیں گویا دہن سے پھول گلچیں کہاں ہے آکے چنے انجمن سے پھول
پژمردہ کوئی گل ہے نہ کانٹے کا نام ہے
گر غور کیجئے تو یہ رنگ کلام ہے

کیا بات ہے سخن کی ثنا کیا کروں بیاں یہ فیض ہے اسی کا جو ممتاز ہے زباں
ہوتا ہے اس سے نام جہاں میں کہاں کہاں ہے جنس بے بہا جو کریں غور قدرداں

عسرت میں بھی غنی ہے بشر گر بہم ہے یہ
صدقے جواہر اس پہ ہو ایسی رقم ہے یہ

... ...

یہ جس زمانے کے شعر ہیں تب نہ اس طرح کے کاغذ تھے نہ ایسی روشنائی استعمال ہوتی تھی سنہرے اوراق پر سیاہی سے لکھا جاتا تھا مشک بید کا قلم ہوتا تھا، سیاہی میں چمک پیدا کرنے کے لئے شنجرف حل کی جاتی تھی —

اور جب ممدوح کی تصویر کھنچ جائے تو

... ...

... ...

قدرت ہو نمایاں قلم صنعت حق کی
ہو چار طرف جلوہ گری ایک ورق کی

وحید

اے قلم دامن کاغذ پہ گہر ریز ہو پھر اے سخن منتظم نظم دلاویز ہو پھر

... ...

... ...

... ...

ایک طرف رن میں نظر آئیں ہزاروں رو باہ ایک طرف ایک بہادر ہو بصد شوکت و جاہ
وار کرتا ہوا زوروں پہ چڑھا جاتا ہو
وہ ہٹے جاتے ہوں جرار بڑھا جاتا ہو

جرار سے امام حسین کے بہادر بھائی حضرت عباس مراد ہیں۔ دیکھئے قلت و کثرت کی تصویریں کتنی جاذب نگاہ ہیں الفاظ اور انداز بیان کتنا پر اثر ہے۔

جو بہادر ہیں وہ باہم یہ کریں تقریریں آنکھ سے دیکھتے ہیں چلتی ہوئی شمشیریں

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ادراک و تصور پر مکمل چہرہ کا اتنا پاکیزہ اثر پہونچتا ہے کہ میدان تخیل و تصور میں حقیقتاً تلواریں چلتی ہوں

نظر آتی ہیں، سننے والا بالکل محو ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ جنگ سامنے ہی ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بس وہ ہوتا ہے اور مرثیہ گو کے الفاظ کے اثر سے جو عالم پیدا ہو جاتا ہے وہ عالم رہتا ہے۔ یکسوئی تاثیر کی بدولت وہ اپنی ذات اور اپنے گرد وپیش کے اور اثرات سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتا ہے ۔ اور جس حد کی بے خبری ہو اسی حد تک مرثیہ گو کے کمال کا پتہ چلتا ہے —

کردیا محو یہ اسی نظم کی ہیں تاثیریں جنگ عباس کی ہر بزم میں ہیں تصویریں

دل میں کیفیت جرات جو سما جاتی ہے

کان میں تیغ کی جھنکار سی آ جاتی ہے

بیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ محض حسن خیال ہی نہیں ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے ۔ جس طرح ایک بد مست شرابی ، دوران نشہ میں عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے یا جس طرح سونے والے کو حالت خواب میں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن کا کوئی وجود عالم مادی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح سماعت کے بہت زیادہ ذکی الحس ہو جانے کے بعد مریض کے کان میں عجیب و غریب آوازیں آتی ہیں ۔ انتہائے شوق ، شدت انتظار، یا کمال محویت کے عالم میں بھی یہ کیفیات انسان پر طاری ہوسکتی ہیں اور طاری ہوتی ہیں ۔ اگرچہ ہر شخص پر اختلاف حس وادراک کی بدولت یکسان اثر نہیں ہوتا —

وحید کا ممدوح اتنا بلند مرتبہ اور اس قدر شجاع ہے کہ صرف اس کی جنگ کے حالات بیان کرتے وقت الفاظ اور فقرات میں ایک ہل چل مچ جاتی ہے ۔ تو پھر آپ ہی بتائیے خود ذات ممدوح جس وقت میدان رزم میں خنجر بکف رہی ہوگی اس وقت دشمن کی فوج کا کیا عالم ہوا ہوگا —

جو رقم ہو چکا ہے اس میں تلاطم ہے عیاں در سے الفاظ ہیں سکتے میں کہ چھپ جائیں کہاں

دب کے نقطے کے تلے حرف کسی جا ہیں نہاں دائرے میں کہیں نقطہ ہے سمٹ کر پنہاں

مدسیں تن اپنا الف صاف چھپائے ہوے ہے

سر کو دامن میں ہر ایک قاف چھپائے ہوے ہے

تیسرے اور چوتھے مصرے میں اقلیدس کی یہ نزاکت بھی حسن تعلیل کے ساتھہ بتائی گئی ہے کہ نقطہ دائرہ اور حرف سبھوں کا منبع صرف ایک چیز ہے - ایک ہی پر تینوں کی بنیاد ہے۔ حرف اور دائرہ کیا ہے یا تمام لکیریں کیا ہیں صرف نقاط کا مجموعہ اور کچھہ نہیں —

... ...

نہیں ثابت کہ تشدد میں ہے تشدید کدھر بزم کا عزم ہے بالجزم کہ اب یاں نہ ٹھہر

... ...

... ...

لفظ جو ہیں عربی ان میں ہے تازی ہل چل یک قلم آ گیا آپس کی روابط میں خلل

... ... جتنے عامل ہیں اٹھے جاتے ہیں ان سب کے عمل

... ...

جو کے عاطف تھے وہ معطوف ہوے جاتے ہیں

... ...

لفظ یوں ہوتے ہیں تر سے متفرق ہر جا جیسے تقطیع میں ہو رکن سے ہر رکن جدا

رخ ضمیروں کے بھی دہشت سے پھرے جاتے ہیں

ہو کے بے حس الف اصل گرے جاتے ہیں

اردو میں کثیر تعداد میں مرثیے اور اکثر مرثیوں میں چہرے ہیں: مگر مختلف مرثیہ گویوں سے قطع نظر خود ایک ہی ممدوح کی شان میں ایک ہی مرثیہ گو کے دو یا زائد مرثیے کے چہرے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں

یہی حال تمام مقامات کا ہوتا ہے، جدت اور قادرالکلامی اسی کا نام ہے۔ ان چھہ مصرعوں کے پڑھنے کے بعد مردم نا شناس زمانے کے ہاتھوں سے دکھہ اٹھاتے ہوئے دلوں میں نئی روح دوڑ جاتی ہے —

نفیس

... ...

خود اپنے اوج پہ نازاں ہوں انکسار کے ساتھہ یہ بے خزاں مجھے گلشن ملا بہار کے ساتھہ

انیس

دیکھئے خود ستائی عیب ہے مگر جائز تعلی حسن ہے (ع) ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے۔ اس واسطے کہ تعلی ایک قسم کی حقیقت نگاری ہے اور پھر جب انیس تعلی کی باتیں کریں تو حسن واثر کا کیا کہنا —

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری فاطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

... ...

ایک قطرہ کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں بحر مواج فصاحت کو تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذرہ کو انجم کردوں گنگ کو ماہر انداز تکلم کردوں
درد سر ہوتا ہے بیرنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھہ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

چوتھے مصرعے میں مبالغہ نہیں ہے واقعہ ہے - اگر کوئی شخص فطری گنگ پیدا ہوا ہو جب بھی ماہر انداز تکلم ہو ہی سکتا ہے ورنہ ہر درجے کے گونگے مناسب علاج و نگاہداشت سے صاحب تکلم بن سکتے ہیں ۔

بیت میں بعض ہمعصروں سے کتنی اچھوتی چشمک ہے سب کچھہ کہہ گئے

مگر استقراء کا اتنا زر نگار اور ریشمی پردہ کھچا ہوا ہے کہ اہل نظر سے قطع نظر معمولی نگاہیں محض ظاہری پھول پتوں کی صنعت اور چمک دمک میں کھو کر وہیں کی وہیں رہ جاتی ہیں —

دوسرے مصرعے میں میں نے کو ——— دو لفظ لکھے ہیں چونکہ مجھے یقین نہیں ہو سکا کہ انیس نے 'کو' لکھا تھا یا 'میں' لہذا میں نے بھی دونوں نسخوں کے دونوں لفظ باقی رکھے ہیں صاحبان نظر خود ہی فیصلہ کرلیں گے خدا جانے کیوں جس طرح اسمانی کتاب والوں کو کتب یزدانی میں کسی قسم کی تحریف نا پسند ہے اسی طرح مجھے بھی انیس کے کسی لفظ کو کہیں سے ہٹا دینے یا بدل دینے میں بڑا دکھہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی انیس ہی کا ساصاحب کمال نہو اسے کسی تحریف کا قانونی یا اخلاقی ' ادبی یا علمی یا کسی اور طرح کا کوئی حق ہی نہیں ہے —

——— * ———

نثر بے سجع نہیں نظم معلے موزوں کہیں سکتہ نہیں آسکتا کجا نا موزوں

تول لے عقل کی میزان میں فہمیدہ ہے

بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

* قلزم رحمت معبود کا قطرہ ہوں میں

جس میں لاکھوں درے مرجان ہیں وہ دریاہوں میں ———

———

دیکھئے کتنی اچھوتی دعا مانگتے ہیں

——— * ———

——— * ———

جد و ابا کے سوا اور کوئی تقلید نہ ہو
لفظ گنجلک نہ ہو تغلق نہ ہو تقلید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
ششجہت میں ہو یہ غل ہے بہ قام طرۂ حور لفظ اور حرت میں ہو قدرت صانع کا ظہور

— — — — — — — — —
— — — — — — — — —

قلزم فکر سے کھینچوں جو کہیں بزم کا رنگ شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
— — — — — — — — — خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ

— — — — — — — — —

بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

دیکھئے جو مضمون اس مصرعہ میں ادا ہوا ہے وحید نے بھی اسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے ع انکھہ سے دیکھتے ہیں چلتی ہوئی شمشیریں - اب دونوں کا فرق آپ خود ہی دیکھہ لیجئے - ایک بجلی کے لفظ سے انیس نے نفس مضمون کو کس درجہ بلند کر دیا ہے - تیزی اور چمک کی دو خوبیاں ایسی انوکھی پیدا کردی ہیں کہ حسن بھی دوبالا ہو گیا ہے اور مفہوم فطرت سے بھی زیادہ قریب ہوگیا ہے اس لئے کہ خیالی شمشیریں بس ایسی ہی دکھائی دیتی ہیں جیسے بجلی چمک کر چھپ جائے —

انیس دعا ہی کے سلسلے میں ان تمام خصوصیات کا ذکر عجیب خوبی سے کرجاتے ہیں جو ان کے کلام کی جان ہیں اور جو ان کے یہاں ہر جگہ موجود ہیں

روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب و لہجہ ہو وہی ساری متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے تیر گی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے

سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

دانند ایں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

یہی بات ہے جو اکثر ناظمین کو مرتے دم تک نصیب نہیں ہوتی انیس عام طور پر فصیح مشہور ہیں میں عرض کروں گا کہ ان کے کلام میں فصاحت کے دوش بدوش ایسی حد تک بلاغت بھی موجود ہے لوگ غلطی سے دقیق کلام کو بلیغ سمجھتے ہیں - اس جگہ صاحب موازنہ کو بھی دھوکا ہو گیا ہے - حالانکہ بلاغت کی بہترین تعریف یہ ہے کہ " ایراد لفظ بر محل " جو انیس کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے —

نفیس

(سخن کی مدح)

— — — — — — — — زندہ ہیں دل میرے سخن لاجواب سے

— — — — — — — — سرسبز نظم ہے کرم آبوتراب سے

شاداب اس طرح ہیں ریاض سخن کے پھول

جیسے بہار میں تر و تازہ چمن کے پھول

خشبوئے جس سے باغ جناں یہ وہ باغ ہے جس میں نہیں ورود خزاں یہ وہ باغ ہے

ہر گل ہے جس کا عطرفشاں یہ وہ باغ ہے — — — — — — — —

یاں کیوں نہ بلبلوں کے اڑیں باربار رنگ

جس میں ہزار قسم کی بو ہے ہزار رنگ

رشید

اپنے دل کے متعلق

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — —

گرم آہوں کے سبب گرم ہوا آتی ہے
یوں دھڑکتا ہے کہ ماتم کی صدا آتی

— — — — — — — — — — — — — — — —

یہی دل تھا کہ جو رکھتا تھامراپہلوگرم اسی سے آنے لگے انکھہ میں اب آنسو گرم
روز دن رات میں منھہ کو کئی بار آتا ہے
خوب رولیتا ہے جب یہ تو قرار آتا ہے

سلیس

وہ گل ہوں کہ جس پاس خزاں آنہیں سکتی وہ باغ ہوں صرصر جسے مرجھانہیں سکتی

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

ڈر ہے مجھے گلچین کا نہ دھڑکا ہے خزاں کا

زمانہ کا رنگ ناقدری کا عالم اور ہمت دلانا

ہر چند جہاں میں چمن نظم ہے بیرنگ ہر غنچہ دہن گلشن دنیا میں ہے دل تنگ
جو قلب کہ تھے نرم وہ اب ہوگئے ہیں سنگ باہم گل و بلبل میں محبت کا نہیں ڈھنگ
پژمردہ نہالان گلستان جہاں ہیں
آنسو گل نرگس کی بھی آنکھوں سے رواں ہیں

گلزار جہاں میں کوئی دل شاد نہیں ہے وہ کون سا ہے پھول جو برباد نہیں ہے
قمری کو توجہ سوے شمشاد نہیں ہے بلبل کو بجز نالوں کے کچھہ یاد نہیں ہے

گلشن میں خس و خار کا انبار عیاں ہے
شبنم کے عوض خون رگ گل سے عیاں ہے

لیکن شجر طبع میں آئے ہیں نئے بار ہے دل میں کہ خرمن میں لگا دیجئے انبار
ان پھولوں سے گلدستہ نو کیجئے تیار شرمائے جسے دیکھ کے فردوس کا گلزار

... ...

... ...

تعشق

جناب حر کی شان کا مرثیہ ہے۔ واقعات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ حر دسویں محرم کی صبح تک اعدا کی فوج میں شامل تھا۔ لہذا شاعر عالم تصویر میں اس کی رات کے جذبات کی بے چینی کا خیال کر کے دلدوز تصویریں کھینچتا ہے مگر ایسا اچھا استقرا کرتا ہے کہ عالمگیر حسن و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نہ بتایا جاے کہ مرثیے کا چہرہ ہے تو امانت کے واسوخت کا لطف آتا ہے —

سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے دمبدم آرزوے مرگ سوا ہوتی ہے
آہ سینے کے لئے تیر جفا ہوتی ہے دل جلاتی ہے جو ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے

زندگی کہتی ہے دنیا سے گذر جانے کو
دل تڑپتا ہے گلا کاٹ کے مر جانے کو

کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آتا آرام بستر فرم پہ سونے کو سمجھتے ہیں حرام
سو طرح کے دل بیتاب سے ہوتے ہیں کلام جان آتی ہے جو لیتا ہے کوئی موت کا نام

طائر جان قفس جسم میں گھبراتا ہے
دل سوے کوچۂ محبوب کھچا جاتا ہے

دونوں آنکھوں سے بہا کرتے ہیں اکثر آنسو دل جو اُمتے تو نکل آے نہ کیونکر آنسو
ہجر محبوب میں تھمتے نہیں دم بھر آنسو جب لیا نام نکل آے برابر آنسو

بات کرتا ہے کوئی کر تو بری لگتی ہے
سانس لینے میں کلیجہ پہ چھری لگتی ہے

غم دوری میں کہاں ذکر پر ستاریء دل درد اٹھتا ہے جگر میں پئے غمخواریء دل
کھینچتی ہے طرف دوست گرفتاریء دل بے لئے جان کے جاتی نہیں بیماریء دل

لاکھ راحت ہو تو دم زیست سے کھبواتا ہے
نزع میں زانوے محبوب پہ چین آتا ہے

کرب میں رات جدائی کی بسر ہوتی ہے مثل کلونگ جہاں خون جگر ہوتی ہے
دل کو تعجیل فراق تن و سر ہوتی ہے عید ہوتی ہے جو ملنے کی سحر ہوتی ہے

لاکھ روکیں رہ الفت کے بھلانے والے
جاتے ہیں کوچۂ محبوب کے جانے والے

عشق میں ہے شب مہتاب جدائی شب تار پھول کو دیکھ کے چھپتے ہیں کلیجے میں خار
ذکر محبوب جو ہوتے ہیں میاں اغیار چلتی ہے عاشق کامل کے جگر پر تلوار

سخن دشمنی دوست جو سن پاتا ہے
لڑکے مر جاے عاشق کو یہ جوش آتا ہے

عشق میں حال بنایا نہ پریشاں کس نے دل پہ کھائیں نہ غم و درد کی چھریاں کس نے
نہ کئے دوست پہ قرباں دل و جاں کس نے بے قراری میں نہ کاٹی شب ہجراں کس نے

یوں تو کس کس پہ نہ فرقت کی مصیبت گذری
حر پہ لیکن شب عاشور قیامت گذری

کوثر

یہ چہرہ بھی اپنے رنگ میں بے مثل ہے دو رنگی عالم اور بہار خزاں کے مناظر

ایسے دیدہ زیب کھینچے گئے ہیں کہ بس پڑ ھئے اور لطف لیجئے - ایجاز و اشارات کا اتنالطیف صرف کیا گیا ہےکہ کربلا کے واقعات کی تصویریں جاننے والوں کی نگاہ میں آپ سے آپ پھرنے لگتی ہیں —

ہمیشہ گلشن عالم کا ایک حال نہیں ... ...
... ... وہ کون ہے جسے دنیا میں کچھ ملال نہیں
... ...

کہیں برات جنازہ کہیں نکلتا ہے

غرض دو رنگی عالم کا ہے عجب عالم سحر کو خلعت شادی ہے شام کو ماتم
کہیں توعیش و طرب ہے کہیں ہے رنج وغم ... ...

کہیں تو عاشق و معشوق ساتھ سوتے ہیں
اور اک جگہ کہیں میت پہ بین ہوتے ہیں

خوشی خوشی کوئی حجلہ میں بن رہی ہے دولہن کوئی ہے لاش پہ شوہر کی اپنے نعرہ زن
کسی کے جامۂ نو ہو رہا ہے زیب بدن کہیں کسی کے لئے قطع ہو رہا ہے کفن

کسی کو بیاہ سے اپنے فراغ ہوتا ہے
کسی غریب کا گھر بے چراغ ہوتا

کسی کو عیش کے ساماں ہیں سب بہم یکسر پڑا کراہتا ہے کوئی اپنے بستر پر
کوئی ہے شاد کوئی پیٹتا ہے اپنا سر پرائے دیس میں ویرل کسی کا ہوتا ہے گھر

کہیں ہے بیاہ رچا جمع سب خدائی ہے
کسی کے گھر میں کہیں سے سنائی آئی ہے

کہیں ہے عیش و نشاط و سرور کا ساماں کہیں ہے نزع ہنگام اور بند زبان
کہیں تو لہ فرزند سے کوئی خندان جواں پسر کے لئے رو رہی ہے کوئی ماں

کسی کے حال پہ الطاف کریم ہوتا ہے
مگر کہیں کوئی بچہ یتیم ہوتا ہے

کسی کو بخشی ہے خالق نے مسند زر تار ہر ایک طرح کے سامان عیش ہیں تیار
ہے ایک بستر غم پر پڑا ہوا بیمار دوا تلک نہیں ملتی اسے کہ ہے نادار
غذا نہیں ہے میسر تو غم وہ کھاتا ہے
کوئی نہیں ہے عیادت کو پر غش آتا ہے

کسی کے پاس ہے دنیا میں دولت بے حد ... ...!
مکان بنانے میں کرتا ہے کوئی جد و جہد کسی کے واسطے تیار ہو رہی ہے لحد
کہیں خوشی ہے کسی ماں کی گود بھرتی ہے
کہیں اجڑتی ہے مانگ اور نتھ اترتی ہے

ہر ایک سمت دو رنگی جہاں میں ہے عیاں کہیں بہار ہے گلشن میں گاہ دخل خزاں
کہیں ہیں پھولوں کے انبار اور کہیں ویراں شجر ہیں سبز کبھی گاہ زرد گہہ عریاں
کبھی بہار میں سب جانور چہکتے ہیں
ہوا سے تند سے پتے کبھی کھڑکتے ہیں

بہار آئی چمن میں ہوا عجیب سماں ہنسی گلوں میں ہے اور بلبلوں میں شور فغاں
چمن میں اڑنے لگی خاک جب کہ آئی خزاں یہ حال دیکھ کے شبنم بھی روتی ہے اگریاں
نہیں ہے نام کو بھی اب نشان سنبل کا
مقام بوم ہے جو آشیاں تھا بلبل کا

پڑے ہیں اٹے گلوں کے ایاغ ایک طرف بپا درختوں پہ ہے شور زاغ ایک طرف
جو فرش سبزہ تھا ہیں اس میں داغ ایک طرف نہ کھیچے ہیں جو افنان باغ ایک طرف
نہیں صفا کہیں یہ حال آب جو کا ہے
جہاں بہار تھی اب وہ مقام ہو کا ہے

چلی کچھہ ایسی ہوا جو اجڑ گیا گلشن لٹا ہوا ہے جوانان باغ کا جوبن
پڑے ہیں سوکھے ہوے پھول کچھہ میاں چمن انہیں کے سوگ میں ہے عندلیب نعرہ زن

بہیں نہ آنکھوں سے کیوں اشک حال بلبل پر
پروں کو کھول کے بیٹھی ہے مشہد گل پر

عجب طرح کی یہ کی ہے خزاں نے بیدردی کہ شکل باغ کی ظالم نے کیا سے کیا کردی
نسیم چلتی ہے اور نہ سحر کی ہے سردی ہر ایک سو چمنستان پہ چھاگئی زردی

چمن میں سوکھہ گئے ہیں درخت پھولوں کے
مگر بہار پہ ہیں سب شجر ببولوں کے

بگولے اٹھتے ہیں ہر سمت اڑ رہا ہے غبار ہیں جا بجا حسن و خاشاک کے لگے انبار
لباس چھن گئے عریاں کھڑے ہیں سب اشجار مگر جو خشک ہیں بیلیں وہ ہیں گلے کا ہار

نہ شور کبک نہ پائے صبا کی اہٹ ہے
مگر کبھی کبھی پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ ہے

نہ باقی نام کو سبزی رہی فضاؤں میں عوض میں پانی کے مٹی بھری ہے تھالوں میں
ہیں خشک نہریں تری تک نہیں ہے نالوں میں جو تازگی ہے تو بلبل کے دل کے چھالوں میں

ہیں سوکھے پھول جو مل مل کے ان سے روتی ہے
بس آج باغ سے بلبل وداع ہوتی ہے

نیسان

اے قلم معرکۂ جنگ کی تصویر کھینچ جو کشش حرب کی ہو صورت شمشیر کھینچ
عطر گلہاے جراحت دم تحریر کھینچ جو کھنچے مد صفت نعرۂ تکبیر کھینچ

سطریں دکھلائیں چمک برق سے ہتیاروں کی
ہو صریروں میں صدا تیغوں کی جھنکاروں کی

ماجد

(انکسار)

ہو اثر جن میں ان الفاظ پہ قدرت ہو نہیں　　سخن و شعر کی ناچیز کو عادت ہی نہیں
پانوں میں معرکہ میں رکھوں یہ ہمت ہی نہیں　　رنگ سحر و ہنر جیسا یہ طبیعت ہی نہیں

... ...

... ...

(التجا)

میری ہر بات میں ایک درد کا پہلو نکلے　　شور تحسین نہ سہی آنکھ سے آنسو نکلے
آہ سینے سے لئے پھولوں کی خوشبو نکلے　　بن کے ہر نالۂ دل سرو لب جو نکلے

دوست کیا بزم سے روتا ہوا دشمن جائے
نیالہ نرگس کا ہر ایک دیدۂ تربن جائے

... ...

... ...

چھٹا مصرعہ مرثیے کے مقصد اولین یعنی "گریہ" کی طرف اشارہ کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص اپنے الفاظ پر اس قدر قادر ہو کہ دوسروں کو رلا دے وہ سامع یا مخاطب پر ہر طور کا اثر ڈال سکتا ہے۔ اور ہنسانے سے رلا دینا کہیں زیادہ مشکل کام ہے —

"مونس" [اے شیر طبع آہوے مضمون شکار کر (جناب عباس کی شان میں]

(آمد جناب عباس)

آتا ہے شیر نارس دلدل ترائی میں　　دریا کے بند و بست کا ہے غل ترائی میں
فوجوں کا مت گیا ہے تجمل ترائی میں　　خشکی میں تھلکہ ہے، تزلزل ترائی میں

پسپا ہیں گھات سے جو صفیں ہیں بڑھی ہوئی
اتری ہوئی ہے خوف سے ندی چڑھی ہوئی

(غازی کی حالت)

یہ سن کے پرشکن ہوئی عباس کی جبیں آیا بل ابروؤں پہ ہوئی چشم خشمگیں
نعرہ کیا غضب میں چڑھا کر جو آستیں گاو زمیں سمت کے جھکی دب گئی زمیں
جنگل بھی تھرتھرا گیا سارا ترائی میں
ثابت ہوا کہ شیر دکارا ترائی میں

چوتھے مصرعہ میں جو مضمون ادا ہوا ہے، وہ جغرافیہ دانان ایشیا کا قدیم اعتقاد ہے یعنی آسمان متحرک ہے زمین ساکن ہے اور پانی پر بچھی ہوئی ہے پانی میں ایک بڑی سی مچھلی ہے جسے حوت کہتے ہیں اس پر ایک بیل ہے جسے ثور کہتے ہیں بیل کی سینگوں پر ہماری زمین سنبھلی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بیل ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر بوجھ ڈالتا ہے تو زلزلہ آتا ہے اب تو تمام دنیا جانتی ہے کہ آسمان حد نظر ہے زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور ہزاروں مختلف سیاروں کی طرح کرہ فضا میں خود بھی ایک سیارہ ہے اور زلزلۂ زمین گرم معدنیات کے قبض و بسط کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ دونوں نقاط نگاہ اگر نہ لکھہ دیئے جاتے تو مصرعہ کا پورا لطف نہ آتا —

بیت کے آخری مصرعہ میں ایک لفظ 'دکارا' صورت و ہیت کے لحاظ سے بہت با تمکین ہے اور پھر ترائی کی تخصیص نے بڑا لطف دیدیا ہے۔ دکار نے کی کچھہ کیفیت ان سے پوچھئے جنھوں نے سرکسوں میں یا تماشوں میں یا حیوانات کے باغوں میں پنجرہ میں بند شکار کو دکارتے سنا ہو یا پھر ان سے پوچھئے جنھوں نے جنگلوں میں آزاد شیروں کے دھڑکے سنے ہوں۔ معض پڑھ کر ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے —

سر اپا

(لباس اور ہتیار)

... ... کب تھی یہ تاب آنکھ ملاے جو آفتاب

قبضہ میں تیغ وقسم قاتل ہے جس کی آب جوشن تو بر میں فرق پہ خود ابو تراب

پر تو سے پنجۂ علم بے مثال کے

تارے چمکتے آتے ہیں حمزہ کی ڈھال کے

(جبین ' ابرو ' آنکھ ' پلک ' پتلی)

چین جبیں سے ہے غضب وقہر آشکار کرتی ہے ابروؤں کی شکن کار ذوالفقار

تھرائے دل ہزیر کا آنکھ ایسی رعب دار پلکیں جو ہل گئیں تو چلے خنجروں کے وار

سرکش ہر ایک چشم کی پتلی سے زیر ہے

گویا کہ سبزۂ لب کوثر میں شیر ہے

(لڑائی کا آغاز)

... ...

... ... شیر خدا کے شیر پہ جنگل سے آے تیر

(حواس صف شکن کی کیا حالت ہوئی)

جوش غضب سے پھر تو عجب حال ہوگیا

ایسے چبا ے ہونٹھ کہ منہ لال ہوگیا

کیا ہر شجاع انسان کا ایسے موقعوں پر یہی حال نہیں ہو جاتا کیسی سچی بات کہی ہے اور کیسی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے ۔ شیر کو ذرا سا ٹوک دیجئے پھر دیکھئے کیسا بپھر جاتا ہے —

(بھاگڑ)

یہ بھی خوب چیز ہے ' ظرافت کے متین موقع پر بکھیرتا ہے اور سلیقے کا ذاکر جب چشم و ابرو ' دست وانگشت اور آواز

لے زیر رہم سے مدد لے کر ان مضامین کو ادا کرتا ہے تو سامعین بہت محظوظ ہوتے ہیں —

کیا قہر حق کے سامنے فوج ستم تھمے برچھے نہ سرکشوں کے تھمے نہ علم تھمے
عباس کا نہ ہاتھ نہ ان کے قدم تھمے جا کر تھمے بھی گر تو میان عدم تھمے
سر اڑ گئے تنوں سے قیامت بپا ہوئی
پہلی تو صف نظر بھی نہ آئی کہ کیا ہوئی

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلوان کے پانوں چلنے میں جیسے کانپتے ہیں ناتواں کے پانوں
رن میں جمے رہے تو اسی نوجوان کے پانوں اٹھ اٹھ گئے سپاہ ضلالت نشان کے پانوں
(لڑائی کی شان)

گی جس پہ ضرب دوہرے پر کالے دھال کے مغفر بھی فرق پر نہ رہا بد خصال کے
جھپکا لعیں تو ہاتھ کو پٹکے میں ڈال کے دو برچھیوں سمند سے پھینکا اچھال کے
لی سانس بھی نہ یوں تہ و بالا کیا اسے
رستے ہی میں اجل نے نوالا کیا اسے
گھوڑا

ستھراؤ کر رہی تھی ادھر تیغ سر بلند پامال کر رہا تھا ادھر فوج کو سمند
گردش تھی اس کی آہوئے خورشید سے دوچند سرعت سے جست وخیز سے دم تیاہرن کا بند
جس پر رکھا جھپٹ کے قدم وہ فنا ہوا
پھرتا تھا فوج شام میں بجلی بنا ہوا

... ...

وا روں سموں سے اس کے سیاہ جو مل گئی سمٹا لیا بدن کو کنوتی بدل گئی
اڑنے کا ٹھاٹھ دیکھ کے پریاں اچھل پڑیں
سیلے سے منھ ملا دیا آنکھیں اُبل پڑیں

گھوڑے کی تیزی کی کیسی پیاری تصویر کشی کی گئی ہے - آج کل ریل ' موٹر ' ٹریم اور ہوائی جہاز کے سامنے گھوڑے کو کون پوچھتا ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ ' طیارہ ' ہم آپ آج دیکھتے ہیں نئی چیز معلوم ہوتی ہے پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خیال پرانہ ہے ' ہوائی جہاز کیا ہے چند فطرت کے راز جو دریافت ہوگئے ہیں اس کے اظہار کا ایک مادی آلہ ہے تخت سلیمانی اور اژن کھٹولے کی کہانیاں تمام قدیم کتابوں میں بھری پڑی ہیں ' جادو کے گھوڑے بھی مشہور ہیں - بعض اس خیال کی بنا پر کہ ہم نے انھیں دیکھا نہیں ہم ان کہانیوں کو غلط نہیں کہہ سکتے اس واسطے کہ منطق کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ " کسی چیز کا نہ دیکھنا اس کے نہونے کی دلیل نہیں ہے " ہم خدا یاھدا ' یا ایتھر کا محض اس لئے انکار نہیں کر سکتے کہ ہم اسے نہیں دیکھتے اور یہ خیال بھی غالطہ منطقیہ سے خالی نہ ہو گا کہ ہم صرف اس سبب سے تخت سلیمان یا اژن کھٹولے کے وجود سے انکار کر دیں کہ وہ مشرقی تخیل کا نتیجہ ہے جو غلو اور مبالغہ کے مناسبت ہوا کرتی ہے - بہر طور گھوڑا آج بھی گھوڑ دوڑ میں سواری ' فوج میں اور خصوصاً عرب کے بعض دشوار گذار حصوں میں بڑی قیمتی چیز سمجھا جاتا ہے - اور سچ بھی یہی ہے کہ عربی اصل گھوڑوں کا جواب پردۂ دنیا میں نہیں ہے - ان کے باقاعدہ شجرے رکھے جاتے ہیں - وہ ایسے سدھے ہوے ہوتے ہیں کہ سوار نے جہاں چاہا کاٹھی اتار لی ' لگام اتار لی اور پاس کے جنگل میں چھوڑ دیا جب ضرورت ہوئی سیٹی دی گھوڑا آکر کھڑا ہو گیا سوار پیٹھ پر بیٹھا چلدیا - سمجھدار ایسے ہوتے ہیں کہ مختلف طور پر ہنہنا کر سوار کو خطرات سے بچاتے ہیں باوفا ایسے کہ سوار زخمی ہو جائے تو کسی چشمہ کے کنارے آرام سے لیجاتے ہیں یا دشمنوں

کی صفوں سے بھاتے ہوے صاف نکال لے جاتے ہیں اگر سوار زخمی ہو کر زمین پر گر جاتا ہے اور بیہوش ہو جاتا ہے تو کمر بند کا تسمہ دانتوں میں داب کر کسی محفوظ گوشہ میں لاکر لٹا دیتے ہیں ایسے گھوڑے اب بہت کم ہیں مگر عرب کے صحرائیون اور بدووں کے پاس اب تک ہیں وہ لوگ ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خصوصاً گھوڑیان کسی کو نہیں دیتے کہ نسل خراب ہوجائے گی ناصرالدین شاہ قاچار حکمران عراق کے مہمان ہو کر گئے ایک بدو نے انھیں دعوت دی ناصرالدین شاہ گئے مگر کہنے لگے کہ جب تک تم میری ایک شرط نہ پوری کروگے میں ایک لقمہ بھی نہ کھاونگا بدو نے کہا اپ کھالیں جان تک حاضر ہے - مہمان اگر بھوکا چلا گیا تو ہمارا قبیلہ سارے جہان میں بے آبرو ہو جائے گا ناصرالدین نے قول لینے کے بعد کھانا کھایا اور کہا کہ اپنی یہ سفید گھوڑی مجھے دیدو بدو سناٹے میں آگیا - دیر کے بعد اس نے کہا اچھا جہانپناہ کل صبح چھاونی پر گھوڑی پہنچ جائے گی عرب اپنی بات کا بڑا دھنی ہوتا ہے - دوسرے دن صبح کو ایک بڑے خوان میں کچھ رکھے ہوے بدو آیا شاہ کے سامنے خوان پوش اٹھا تو سفید گھوڑی حلال کی ہوئی رکھی تھی - شاہ نے پوچھا یہ کیا بدو نے کہا حضور گھوڑی ہے مردہ یا زندہ کی تو کوئی شرط نہ تھی غرض ان باتوں سے میری مراد صرف اتنی تھی کہ مرثیوں میں جب [illegible] کی تعریفیں پڑھیں تو صرف مبالغہ سمجھ کر پس پشت نہ ڈالدیں بلکہ عربی اصیل گھوڑے کی خاص صفات کو بھی نگاہ میں رکھیں —

(ایک دشمن)

... ... نکلا ادھر سے جنگ کو ایک پہلوان شام

... ...

(وہ اپنے گھوڑے پر نہ تھا بلکہ)

ایک کوہ آہنی نظر آتا تھا کوہ پر

جیسے دن رات کے مقابلے میں پہچانا جاتا ہے اسی طرح بدقسمت دشمن کے رو برو حسین غازی کی تصویر بہت لطف دیتی ہے ہماری آپ کی فطرت میں ہے کہ ہر چیز کا مقابلہ کسی دوسری برابر کی چیز سے ضرور کرتے ہیں اور مقابلے کے بعد آسانی سے سمجھتے ہیں مرثیہ گو بھی اس راز سے واقف ہے اور اکثر جگہ ایسے پنہان مواز نے کرتا ہے کہ آپ خوش بھی ہو جاتے ہیں اور اس کا کام بھی نکل جاتا ہے یعنی ممدوح کی پوری عصمت و جلالت کا اندازہ آپ کو ہو جاتا ہے —

(دونوں کا مقابلہ)

اب تو تمام توپخانے - اور توپیں چلتی ہیں ایک صدی کے بعد محض زہریلی گیسوں اور آتش گیر مادے سے بنے ہوئے بم کے گولوں کی لڑائی ساری دنیا میں باقی رہ جائیگی جس طرح دنیا بدل گئی ہے اور ہم پرانی لڑائیوں کے انداز ہتیار اور مصرف اسلحہ سے بے خبر ہوگئے ہیں ویسے ہی آیندہ نسلیں ہماری طرز جنگ اور آلات حرب سے بے خبر ہو جائیں گی مگر تاریخ زمانے میں تحقیق کے فدائیوں کے لئے مرثیہ گو حضرات کے یہاں جنگ کے متعلق جتنا کچھ ذخیرہ اکھٹا کر دیا گیا ہے وہ جواہر خانہ بن کر باقی رہے گا - اگر میرے موضوع سے الگ نہ ہوتا تو میں مختلف زمانوں کے طرز جنگ پر ضرور بحث کرتا پھر بھی اتنا تو عرض ہی کروں گا کہ مرثیہ گو کا کام مورخ سے زیادہ باریک اور صنعت کا ہے اس لئے کہ مورخ کو محض

سادہ اور خشک واقعات اور سنین و تواریخ کو مرتب کر دینا ہوتا ہے مرثیہ گو کو رسم و رواج کے علاوہ تمام نکات پر نگاہ ڈالنی ہوتی ہے ہے اور سب کو ایک اچھوتی ترتیب اور انوکھی طرز سے پیش کرنا پڑتا ہے

(بھالے کی لڑائی)

لایا انی کو متصل قلب وہ دنی یعنی دکھا دوں تاب و توان تہمتنی
یاں ناخنوں میں تھا ہنر شیر افگنی چٹکی میں ہت کے مثل قلم تھام لی انی
کھینچا تو ٹوٹ آئی سنان ان کے ہاتھہ میں
مار اس کے ہاتھہ میں تھا زباں ان کے ہاتھہ میں

(گرز کی لڑائی)

... ...

... ...

چوبی تھی کیا یہ تیغ کہ خط تک پڑا نہیں

اب غازی نے ایسا ہاتھہ جمایا کہ

... ...

... ...

... ...

تصویر نیم رخ وہ ستمگار ہو گیا

اب حضرت عباس لڑتے لڑتے نہر تک پہونچ گئے اور اتر کر مشک بھرنے لگے

ناگاہ نہر میں وہ بہشتی اتر گیا دریا میں بحر عزو شرف کا گہر گیا

فرخداحبابوں کی آنکھوں میں بھرگیا تھا نور برج آب میں شہ کا قمر گیا

ٹپکا جو خوں میں مل کے رخ با صفا کا عطر

خوشبو سے آب نہر بنا موتیا کا عطر

خون دشمنوں کا تھا پسینہ حضرت عباس کا تھا۔ عطر میں رنگ کے گوئی خاص موتیہ نہیں محض خوشبو اصل چیز ہے مگر موتیا کا عطر سفید کیسے ہوتا اس لئے دشمنوں کے خوں کی سرخی سے ضرورت رفع کی گئی ہے —

پر تو وہ رخ کا اور علم سبز کا وہ نور ... ...

... ... لہریں کرن بنی ہوئی پہونچی تھیں دور دور

گویا جڑاؤ مچھلیاں ترتی تھیں آب میں

چہرے سے ضو کی پانی کی چادر تھی جلوہ گر پیدا تھی قطرے قطرے سے شفافیٔ گہر

چشمہ تھا آفتاب کا گویا ہر ایک بھنور خیرہ ہوئی تھی مردم آبی کی بھی نظر

سمجھی تھیں مچھلیاں کہ ہیں آب حیات میں

غوطے لگاتی پھرتی تھیں پریاں فرات میں

چہرے تک چونکہ مجھے اس بات کی ضرورت تھی کہ مختلف حیثیات

و موضوعات کو دکھا دوں لہذا میں نے ترتیب فہرست کے ماتحت مختلف مراثی کے چہرے ایک جگہ جمع کردئے تھے - اب اس کے بعد ضرورت یہ ہے کہ منازل کی تقسیم اور دیگر مقامات جس طور پر جس مرثیے میں آئے ہیں وہی ترتیب قائم رہے لہذا فہرست بالا کے مطابق ہر مرثیہ کے انتخابات دیتا جاؤں گا اور پھر وہی کہتا ہوں کہ محض عالمگیر روشن پہلو دکھانے مدنظر نہ ہوتے تو ہر ممدوح کے متعلق نوٹ دیتا جاتا اس وقت آپ کو مرثیہ گو کے کمال اور کلام کی پوری قدر ہوتی - خیر کسی اور سلسلے میں سہی —

نفیس

[ہاں اے سنان غم جگرو دل کے پار ہو - (حضرت علی اکبر کی شان میں)]

(میداں کو چلنا اور گھوڑے کی تعریف)

کاندھے پہ رکھ کے تیغ جو چھیڑا سمند کو کویا کہ پر ملے فرس سر بلند کو

... ...

کیلیں ہیں نعل پر کہ ستارے ہلال پر

(چال کی نزاکت)

ٹوٹے نہ سم کے بوجھ سے شیشہ گلاب کا

وہ تھوتھنی وہ سینہ وہ گردن وہ انکھڑیاں　　خوش قد سبک خرام سبک رو سبک عنان

(حضرت علی اکبر کا سراپا)

(گیسو)

ان گیسوؤں میں چہرۂ تابان کا ہے یہ نور　　یا دو شبوں میں ایک مہ کامل کا ہے ظہور

بہتر ہزار ماہ سے جو ہے وہ شب یہ ہے

' لیلۃ القدر ' یعنی شب قدر ہزار راتوں سے بہتر ہوتی ہے یہ شب یعنی گیسو کی شب تو ہزار مہینوں سے بہتر ہے پھر اس کی منزلت کا کیا پوچھنا

ابرو

یا دو ہلال یکشبۂ آسمان جاہ

ابرو نہیں ہے چشم مروت خصال پر
حیدر کی ذوالفقار ہے حمزہ کی ڈھال پر

پلکیں

پلکیں جری کی ترکش نصرت کی تیر ہیں — — — — — — — — —
— —
— — — — — — — —

جن سے خدنگ دشمن ہیں یہ وہ خدنگ ہیں

آنکھیں

ہیں نرگس ریاض جناں چشم سرخ فام پتلی ہے نور مردمک دیدۂ امام
کوثر کا وہ تو یہ مئے تسنیم کا ہے جام ہے ایک جا * سواد وبیاض † صباح و شام
— — — — — —
— — — — — — — —

عارض و بیلی

— — — — — — — — بینی ہے یا سہا ہے میان دو آفتاب
ہیں رنگ و بو میں یہ گل رخسار لاجواب صلعلے بہار پہ ہے گلشن شباب
— — — — —
— — — — — — —

لب

— —
— —

دیکھو قریب رخ لب لعل جناب کو
ہمسایۂ مسیح ملا آفتاب کو

* سیاہی † سپیدی

دندان

دندان ہیں اختر فلک نزہت و جہاں ہمسر ہوں ان سے گوہر یکتا یہ کیا مجال

اک سبحہ میں یہ صنعت صانع کے دانے ہیں

گردن

گردن ہے صبح مملکت جانفزا ے حسن

حسن اس کے واسطے ہے یہ گردن برائے حسن

سینہ

سینہ صفائے حسن میں سینہ نبی کا ہے قرآن کی ہے یہ لوح سفینہ نبی کا ہے

باب علوم دیں * ہے مدینہ نبی کا ہے مخزن ہے فیض حق کا خزینہ نبی کا ہے

بازو ، ساعد ، پنجہ

بازو ہیں شاخ نخل ریاض شہ زمن ساعد ہیں صاف ساعد محبوب ذوالمنن

پنجہ ہے یہ کہ پنجۂ ضرغام بت شکن

زور آوراں دھر کو کب مانتے ہیں یہ

خیبر کا در سپر سے سبک جانتے ہیں یہ

---

* "انا مدینۃالعلم و علی بابہا" کی طرف اشارہ ہے

قسم

کوہ وقار ہیں یہ قدم وقت گیر وہار ان پانوں کا ثبات ہے عالم پہ آشکار
دیں کا ستوں انہیں کے قدم سے ہے استوار آئے جو زلزلہ تو نہ سرکیں یہ ذی وقار

— — — — — — — —

میداں کو چھوڑتے نہیں یہ وہ پہاڑ ہیں

تیسرے مصرے کا لطف جب ہے جب خواجہ اجمیری کی فارسی کی یہ رباعی اور رباعی کا خصوصیت سے ساتھ چونتھا مصرعہ نگاہ میں رکھئے

شاہ است حسین بادشاہ است حسین دیں است حسین و دیں پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

اکبر کی خوش بیانی

پڑھنے لگا رجز جو دل و جان مصطفے — — — — — — — —
— — — — — — — — — — — — — — — —

تھا سب کو وجد وادئ عنبر سرشت میں
غل تھا کہ لو چہکتا ہے بلبل بہشت میں

— — — — — — — — — — — — — — — —

تن کر پڑھے رجز کے جو اشعار پانچ سات دو چار گام ہٹ گئے پیچھے زبون صفات

— — — — — — — —

— — — — — — — —

مونس

[اے طبع رسا صیقل شمشیر زبان ہو (حضت علی اکبر کی شان میں)]

سراپا

کہتے ہیں یہ گردوں پہ ملک ماہ یہی ہے
عالم کے حسینوں کا شہنشاہ یہی ہے

(موازنہ سے ترجیح)

حسن مہ کنعاں کو بوی ہم دیکھہ چکے ہیں سو مرتبہ سر تابہ قدم دیکھہ چکے ہیں
جو چاہ میں گذرے وہ ستم دیکھہ چکے ہیں شاہو کے بوی سب جاہ و حشم دیکھہ چکے ہیں
یہ حسن رخ اس ماہ* کی شیدائے نہ دیکھا * ماہ کنعان
اس چاند کو افسوس زلیخا نے نہ دیکھا

... ...

ہے صاف عیاں جلوۂ تنویر سراپا آنکھوں کو نظر آتی ہے تصویر سراپا
آئینہ ہے ہر عضو بدن سر سے قدم تک
گلدستہ ہے مجموعۂ تن سر سے قدم تک

(رو، دندان، لب)

اس رو کے مقابل کوئی ابرو نہیں رکھتا آئینہ میں تو ہے نقطہ ابرو نہیں رکھتا
خوش رنگ ہے لالہ پہ یہ خوشبو نہیں رکھتا بو رکھتا ہے گل ان کی سو پر خو نہیں رکھتا
دندان ہیں صدف کے لب خنداں نہیں اس کے
غنچہ کا دہن ہے پر دندان نہیں اس کے

قامت

قامت ہے یہ شمشاد گلستان نزاکت یا مصرعۂ برجستۂ دیوان نزاکت
... ... ہے جس کی نزاکت پہ فدا جان نزاکت

... ...

... ...

جبین

آئینہ اقبال سکندر یہ جبین ہے ... ...

... ... رو شنگر خورشید منور یہ جبین ہے

... ...

... ...

ابرو

... ... ہاں سجدہ گہ کعبہ پرستان ہے یہ ابرو

... ... کافر کے لئے تیغ سر افشاں ہے یہ ابرو

اس تیغ نے دشمن کا جگر آب کیا ہے

کیا زہر نے آنکھوں کے سیہ تاب کیا ہے

چشم، پتلی، پلک

یہ چشم ہے یا نرگس شہلائے ارم ہے گردش میں یہ پتلی ہے کہ آہوے ارم ہے

یا شرم سے با دلم کا بھی آنکھوں میں دم ہے* سرمہ کی کشش کیا ہے کہ شمشیر دو دم ہے

... ...

پلکیں نہیں جوہر ہیں یہ تیغ صفہان کے

زلف

اس زلف کی ہمسر تو کوئی زلف نہیں آج سا را ختن اس جعد معنبر کا ہے محتاج

زیبا ہے ہر اک شام جو سمجھے اسے سرتاج کس رخ پہ ملی ہے شب معراج کو معراج

---

* یا شرم سے آنکھوں میں بھی بادام کا دم ہے

... ...

... ...

وہ زلف دلاویز تصور سے جو بل کھائے ... ...

... ...

گردن

... ... ہے آئینۂ مہر سے بھی صاف یدِ گردن

... ...

... ...

گویا پس خورشید قیامت کی سحر ہے

سینہ

سینہ ہے کہ آئینۂ روشن ہے حلب کا ... ...

پرنور ورق اس کو لکھوں مصحف رب کا ... ...

... ...

... ...

شانہ

شانوں کی صفا صاف ہو یدؑ ہے قبا سے ... ...

... ... کٹ جاتا ہے مہتاب جہاں تاب حیا سے

... ...

یاں روز ترقی ہے تنزل نہیں ہوتا

بازو، ساعد

ہاتھ آئی ہے کیا بازوے انور کو صفائی یہ ضو یہ تجلی ید بیضا نے نہ پائی

ساعد جو کھلا نور کی مچھلی نظر آئی ... ...

... ...

... ...

تلوے

... ...

... ...

تاج سر افلاک ھیں اور زیب زمیں ھیں
اک چانہ کے دو ٹکڑے ھیں تلوے یہ نہیں ھیں

رخصت ھو کر باھر نکلنا

روتا ھوا شہزادۂ عالم نکل آیا بیٹے سے یدالله کا ضیغم نکل آیا
پردے کے ادھر نور مجسم نکل آیا سر کاٹے گھتا نیر اعظم نکل آیا

... ...

پرتو سے بنے نجم جلو خانے کے ذرے
گھوڑا

آیا جو وہ اچپل تو عجب ناز سے آیا ... ...

— — — — — — — —

ظل تھا کہ پرستان میں بھی گھوڑا نہیں ایسا
اصطبل سلیمان میں بھی گھوڑا نہیں ایسا

پہنچا نہیں شاھوں کو بھی ادھم بہم ایسا ھوے گا عرب میں بھی نہ شیر اجم ایسا

— — — — — — — —

گر دیکھ لے چال اس کی تو سیارہ بھک جاے
دے گشت میں ساتھ آھوے خورشید تو تھک جاے

... ...

قمچی لگی گویا جو پڑا زلف کا سایہ ... ...

... ...

بھرتا ھوا ٹھیکے صف جنگاہ میں پہنچا
شمشیر

غصے میں ادھر رنگ بدلنے لگی شمشیر گویا دل شمشیر پہ چلنے لگی شمشیر
... ... ھر مرتبہ کاٹھی سے اگلنے لگی شمشیر

غضب سے کبھی کاسۂ سر توڑ کے نکلی جوش سے کبھی صدر کا در توڑ کے نکلی
پھر دل میں جو آئی تو جگر توڑ کے نکلی پٹکے سے جو الجھی تو کمر توڑ کے نکلی

چو رنگ اُسے کہتے ہیں اسوار بھی دو تھا
زین پر سے کھچا ہاتھہ تو رہوار بھی دوتھا

بھاگڑ

میدان سے جنا کار جھجکتے ہوے بھاگے آگے نہ بڑھے پیچھے سرکتے ہوے بھاگے
مڑ مڑ کے سنہ اس تیغ کا تکتے ہوے بھاگے تلواروں کو ڈھالوں پہ پٹکتے ہوے بھاگے

... ...
... ...

بن فوفل

جوں فیل دمان فوج سے نکلا جو وہ بدمست لنگر کئے دیتا تھا لنکا ور کی کمر پست
قدگی سے زرہ تن میں ہوئی جاتی تھی پیوست ... ...

دشمن کی حالت

زور آنکھہ ملاتے ہی ہوا ہو گیا تن سے
دل ٹوٹ گیا خنجر ابرو کی شکن سے

نیزے کی لڑائی

تھی مد نظر پہلے جو نیزے کی لڑائی رہوار کو چمکا کے انی اس نے دکھائی
اللہ رے تیغ علی اکبر کی صفائی یہ بھی نہ کیلا پھر گئی کب سر پہ کب آئی

جس جا تھی وہیں مثل پری جلوہ کنان تھی
یاں نیزے کو دیکھا تو نہ بوزی نہ سناں تھی

تیر کی لڑائی

پایا جو قلم نیزۂ خطی کی سناں کو دانتوں میں دبا یا ستم آرائے زباں کو
بس روک کے جلدی فرس گرم عناں کو ترکش سے لیا تیر کو شانے سے کماں کو

چلے سے ملا تیر جو اس دشمن دیں کا
اک خم ہو اک راست ہوا ہاتھ لعیں کا

کی طائر ناوک نے نشیمن سے جو پرواز گھوڑا علی اکبر کا ازا صورت شہباز
خالی گیا وہ تیر سناتا ہوا آواز جا پہنچی ادھر شیر کی شمشیر سرانداز

ظالم کو تپ لرزہ چڑھی خانہ زین پر
تھی نصف کماں ہاتھ میں اور نصف زمیں پر

گرز کی لڑائی

سنبھلے ادھر اکبر کہ ادھر سر پہ چلا وار ... ...
سیدھی سوے گرز آئی جو ترچھی گئی تلوار دو طول میں اور چار ہوا عرض میں اکہار

کس حسن سے گرز ستم ایجاد کو کاٹا
ککڑی کی طرح تیغ سے فولاد کو کاٹا

مونس

[پنہان ہوے کوکب جو سرا پردۂ شب میں (امام حسن)]

نماز

پنہان ہوے کوکب جو سرا پردۂ شب میں پیاسوں کو ہوئی صبح عجب رنج و تعب میں
سجادے بچھے بزم شجاعان عرب میں مصروف ہوے خاصۂ رب طاعت رب میں

بشاش تھے مرنے پہ وہ مولا کے موالی ... ...
بے حال ریاضت سے یہ چہروں پہ بحالی زردی کے عوض پھول سے رخساروں پہ لالی

... ... دریا سے خود ان کوثریوں کو تھا کنارہ
ہاتھوں کو تیمم کے لئے خاک پہ مارا گویا تھا یہ ہر ایک نمازی کا اشارہ

قبریں یہیں ہوں گی تہ افلاک ہماری
اس خاک میں مل جائے گی اب خاک ہماری

دی آٹھ کے اذان اکبر گلرو نے بصد جوش طائر جو چہکتے تھے وہ بس ہو گئے خاموش
... ... گلشن میں ہوئی ہلچل شیدا ہمہ تن گوش

جب بعد اقامت کے ہوا نعرۂ تکبیر ... ...

مصروف سماعت ہوے سب صاحب توقیر وہ حمد و ثنا سنتا تھا خود مالک تقدیر

قدسی نگران تھے فلک نیلو فری سے

رخصت تھی مسافر کی نماز سحری سے

(دشمنوں کی حالت)

گرگینوں نے بڑھ کر جو سرورد کو بجایا ایک ایک جوان جنگ کے ہتیار سج آیا

ہر بانیء شر خود رکھے سر پہ کج آیا جو آیا وہ بدلے ہوے میدان میں دھج آیا

آہن میں زرہ پوش بھی پنہاں نظر آے

فولاد کے پتلے سر میدان نظر آے

تلوار خود کہتی ہے

... ...

یہ تیز دمی برق کہولاے کہاں سے نسبت کبھی دی تھی مجھے اس شعلہ فشاں سے

پھرتی ہے دکھاتی ہوئی اپنی چمک اب تک

جامے میں سماتی نہیں برق فلک اب تک

بھاگڑ

بھاگڑ تھی کہ لے سکتے نہ تھے شیر ببر دم اژدر بھی چراے ہوے تھے ترسے ادھر دم

تلوار کا منہ دیکھتا تھا کوئی نہ پھر کے

کیا تر تھا کہ سر بچا گئے تھے خاک پہ کر کے

توسن

تلوار کی وہ برق وہ جولانیء توسن سر پٹکے تو صر صر نہ کبھی چھوسکے دامن
... ... اسوار کے سینے سے ملی جاتی تھی گردن

تھی تیز کلوتی کی دوپیکاں تھے نکیلے

لڑنے کو جو جھپٹے تو لہو شیر کا پی لے

تیسرے مصرع میں گھوڑے کے جیداری کا کمال دکھایا ہے اس لئے کہ عام طور پر شیر سے مقابلہ کرنا کیسا اس کی بو سے بھاگتے ہیں ع: گھوڑے دماغ پا ہوے بو آئی شیر کی —

اڑتا ہوا جس صف پہ وہ جاتا تھا سمٹ کر گر پڑتے تھے رہوار سواروں پہ الٹ کر
بھاگے ہوے جب سامنے آتے تھے پلٹ کر یہ بازی شیرانہ دکھاتا تھا جھپٹ کر

گھوڑا اسے مارا اسے تاپوں سے کچل کے

دشمن

یہ سن کے فرس ارقم موزی نے نکالا چار آئینے والوں کا چلا ساتھ رسالا
ان سب سے دو بالا تھا لعین کا قد بالا بالا وہ دلیروں سے جو جائے نہ سنبھالا
مغفر تھا وہ رومی کہ جو خود سر پہ گراں تھا
خفتان عراقی میں تن نحس نہاں تھا

نیزہ کی لڑائی

... ...

... ...

طعن اس کی چلی تھی کہ گری برق مجسم دو ٹکڑے سنان ہو گئی برہم ہوا ارقم

موذی نے سر اس طرح دھنا خانۂ زین پر
اژدر کبھی بل کھاتا ہے جس طرح زمین پر

گرز کی لڑائی

ظالم نے کیا سامنے سے دور کے اک وار پھرتی سے ادھر آ گیا شبیر کا رہوا
پہنچی جو کلائی پہ یدالدہ کی تلوار پنجہ لئے رہتی پہ گرا گرز گراں بار

... ...

گردن جو پھری بائیں طرف ظالم دوں کی ران اڑ گئی عذرا کی طرح تیرہ دروں کی
بنیاد ستی خانۂ بدعت کے ستوں کی ندی سر بھی خاک پہ خوں خوار کے خوں کی

حضرت نے صدا دی بہت آیا تھا بگڑ کے
اب کھیت سے یکراں کو بڑھا تیغ پکڑ کے

یکراں عمدہ گھوڑے کو کہتے ہیں مگر اس جگہہ دشمن کی بھی ایک ران اڑ گئی ہے لہذا یکراں میں ایک اور پہلو پیدا ہو گیا ہے —

یہ کہہ کے بڑھے سنہ بی اصغر کا ہوا زور لے تیغ ہوا کیا اک ہاتھہ وہ نادرہ
بھڑکا جو فرس نعرۂ شہ سے دم ناورہ گرنے لگا پٹھوں پہ بدن ہونے لگا سرہ

پنجے میں گریبان زرہ شیر نے پکڑا

کم تھا یل خود سر کا نہ کچھہ دیو سے لنگر ... ...
اونچا جو کیا ہاتھہ اسے زین سے اٹھا کر مغفر سے بھی بالا ہوے کچھہ پڑے ستمگر

... ...

... ...

پٹکنے کے بعد

... ...

یوں چور ہوے عضو تن ظالم مغرور جس طرح کہ تصویر گلی سنگ سے ہو چور

... ...

... ...

وحید

[اے قلم دامن کاغذ پہ گہر ریز ہو پھر (جناب عباس)]

[میدان میں) آمد (دشمن غازی کی سواری کو دور سے دیکھ کر کہتے ہیں]

... ... انگلیاں اٹھنے لگیں سب ہوے باہم نگراں

کوئی کہتا تھا کہ وہ ہے تنق گرد عیاں کوئی کہتا تھا وہ دیکھو نظر آتا ہے نشاں

وہ پھریرا ہے بلندی پہ جو لہراتا ہے

پنجہ بجلی سا وہ ہر بار چمک جاتا ہے

تلوار

دھن قبضۂ فولاد سے پھل ہے جو عیاں کلۂ اژدر خوں خوار سے نکلی ہے زبان

ہے مناسب جو کہیں نوم کا اس کو طرفان یا یہ تیزاب ہے اژدھے کا تووہ آب رواں

... ...

... ...

... ...

... ...

کشتیٔ عمر رواں غرق کرے گھات ایسا
دم میں جس سے حق و باطل ہو جدا کات ایسا

ملکر بھی ہے دم جنگ جفا جو بھی ہے جس میں تل جاتی ہے ضربت وہ ترازو بھی ہے
بادشاہوں کے لئے زینت پہلو بھی ہے تخت حشمت پہ مکیں سر زانوں بھی ہے

... ...

... ...

... ...

جوہروں پر جو کیا دھیان تو سو جھی یہ مثال ... ...

... ...

دیکھہ اُن فرط فزاکت سے رگیں ظاہر ہیں
اشہب

... ...

رنگ سبزہ تو چمک نقرۂ خالص سے فزوں جلد نازک وہ کہ ظاہر ہے ادھر رحمت خوں
ہیں عیاں خوبیاں جو چشم خوش اسلوب کی ہیں
یہ نمودی ہیں کہ دو انگلیاں محبوب کی ہیں

تھوتھنی وہ جسے سب شنجرف دھن خود چوسیں وہ جبیں زہرہ جبینوں میں ہیں جسکی دھومیں
کنکی ایسی کہ حسیں دیکھہ کے پیروں جھومیں جو ہے چتروں میں نہ دیکھا وہ اثر جادو میں

... ...

... ...

... ...

... ...

... ...

غنچہ چٹکے تو سمجھتا ہے صدا کوڑے کی

سینہ و تنگ کمر پتلی و پتلے و بھرے خم و گردن کو و مکیڑا جسے دیکھا ہی کرے

... ...

... ...

... ...

جوڑ بند اس کے و پر زور و اعضا محکم تن و پر گوشت کرچی جادو و بے چین قدم

ہنہنانا یہ غضب سر و ہلا کر ہر دم ... ...

... ...

... ...

... ...

ابلی و انکوڑیاں نتھنوں کی و دم نرفر خیط میں آ کے دہانہ و چبانا کر کو

... ...

... ...

... ...

و سبک رو کہ اگر شاخ گل تر پہ پھرے پھول کے جام سے اک قطرۂ شبنم نہ گرے

چال کا لطف دکھانے پہ جو آ جائے کبھی

زلو سم برگ سلجالو بھی نہ کھجلائے کبھی

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

گر حبابوں پہ بھی دوڑے تو ذرا بار نہ ہو

سم پڑے کاسۂ چینی پہ تو جھنکار نہ ہو

ایک دشمن

یک بہ یک فوج سے اک بانیء بدعت نکلا ... ...
... ... بہ تبختر بہ تکبر بہ خشونت نکلا
... ...
کوہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی گویا
تھا خم بادۂ سر جوش کہ فرق مردک تبل وہ جس پہ ہو جائل میں سیدد بوکاشک
وہ جبین جس سے خجل پیل دماں کی سنک ... ...
... ...
جانور واہ سے ڈر ڈر کے ہٹے جاتے تھے
سراپائے مردود

گنبد مرقد ضحاک تھا خود سنگی ... ...
تن پہ لادے ہوے آلات سراسر جنگی فربہی اس کی دکھاتی تھی زرہ کی تنگی
دستانوں سے نہ وہ دست قوی باہر تھے
سر نکالے ہوے دو غاروں سے دو اژدر تھے
... ...
تھے حرارت سے کھڑے بال بدن کے سارے سرخ آنکھیں تھیں دہکتے ہوے دو انگارے
تھا عیاں موے پریشان سے نشان دوزخ کا
پیچ و تاب اپنا دکھاتا تھا دھواں دوزخ کا
لال تھا چہرۂ ناری صفت صورت نار تھا تنور اس کا شکم ہاتیہ پر اک شانہ خمار
منہ سے ہر بار تکلم میں نکلتا تھا بخار سر بسر آگ کا پتلا تھا شریر و مکار
... ...
... ...

نیزے کی لڑائی

خود اس کی فوج والوں نے طعن و تشنیع کی اور گفتگو میں زک اٹھا کر کیا ہوا؟

سن کے یہ طعن بتانے لگا انیان مغرور بند باندھے کبھی بڑھ بڑھ کے کبھی ہٹ گیا دور

... ...

... ...

... ...

اسطرت

- - - -

- - - - - - - - - - -

ٹوٹ کر چھن سے گری خاک پہ مکار کی تیغ

باندھ کر آیا تھا دو ھری جو پٹے جنگ شقی پھیک دی ہاتھ سے یہ مڑکے کمر سے وہ لی

نصف شمشیر بھی میان سے نکلی بھی نہ تھی ڈور کر مثل اسد تھام لی مٹھی اس کی

چھن لی تیغ مگر ہاتھ نہ چھوڑا اس کا

جھک کے جرار نے پے کر دیا گھوڑا اس کا

ساقی نامہ

ساقیا بادۂ گلرنگ کا ساغر ھے کہاں صاف و خوش ذائقہ و طاھر و اطہر ھے کہاں

سرخرو کرتی ھے جو وہ مئے احمر ھے کہاں دم پھڑکتا ھے مرا خون کبوتر ھے کہاں

- - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - -

دریا کے کنارے

پہنچا دریا کے کنارے پہ جو وہ بحر کرم پانی بڑھنے لگا افراط طرب سے پیہم

- -

گھاٹ کے سمت حبابوں کی بھی سب فوج بڑھی

پیشوائی کو بہادر کی ھر اک موج بڑھی

وحید

[جام جہان نما سخن آبدار ھے (امام حسین)]

آبہ

دھوار پہ جو چڑھکے چلے رن کو شاھدیں جراءت کے ولولہ میں ھوئی پرشکن جبیں

— — — — — — — — — سایہ ھلا لرز کے سرکنے لگی زمیں

پہونچے قریب فوج تو چتوں ہی ار تھی

ہاں برق طبع شاہ فشانی دکھا سجے ہاں زور طبع سحر بیانی دکھا سجے
ہاں تیغ طبع سیف زبانی دکھا سجے ہاں بحر طبع اپنی روانی دکھا سجے

(لشکر کی کثرت)

وہ صورتیں مہیب سواروں کی وہ اٹھا تیور وہ دیو ہیاں سیاہ کہ گھگور گھٹا تھا
آواز وہ سلام کی ہرسو وہ غل پڑا شوخی وہ راہواروں کی ٹاپوں کی وہ صدا

ڈھالیں وہ اور سیاہ وہ سب شامیوں کا رنگ ثابت یہ تھا کہ جمع ہے بالکل سیاہ زنگ
اندھیری تیرگی کہ نہ ایاں تھا شب کا رنگ

اندھیر تھا جہاں میں نیا طرفہ بات تھی
گردوں پہ دن زمین کے طبقہ پہ رات تھی

(باجے)

باجے پہ فہرہ لعینوں نے جب بجائے تاشوں نے سینے پیٹ لئے تاب پھر نہ لائے
باہم لے تو ہاتھ جلادل کے تھرتھرائے شہزا نے ہاتھ اٹھا کے صدا کی کہ ہائے ہائے

دشمنوں کا بڑھنا

چلوں میں تیر جوڑ کے ناوک فگن بڑھے مستی میں جیوٹے ہوئے سب پیلتن بڑھے
تیغوں کی طرح چین بہ جبین تیغ زن بڑھے

- - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - -

تلوار

کو ندا اِدھر جو صاعقۂ قہر یک بیک پھونچی تڑپ کے آئینۂ اچرخ تک چمک

- - - - - - - - - - -

تیغ کی چمک

وہ تیغ کی لپک وہ چمک اس کی سربسر وہ آب وہ تعاب وہ جوہر ادھر ادھر
غل تھا کہ برق ابر میں ہوتی ہے جلوہ گر ظاہر ہے آج طرفہ تماشہ کرو نظر

بجلی میں ابر ابر میں تارے خدا کی شان

جوہر

دستۂ تیغ پر جو نقوش اور خطوط بنے رہتے ہیں انہیں جوہر کہتے ہیں دمشقی فولادی ولایتیوں میں اڈر بدری اور پھل کاری کے کام پھل پر بھی بنے رہتے ہیں اسے بھی جوہر کہتے ہیں —

یا آب میں خطوط شعاعی کا ہے ظہور لکھی ہوئی ہے یامہ نو پر دعائے نور

بجلی کے تن میں خلعت زرتار دیکھ لو

ذیشان و حور پیکر و خوش رو و ماہ رو رفرف نزا د و برق شتاب و براق خو
آتش مزاج و آفت دوراں پئے عدو میداں نور و تفرقہ پرداز و جنگ جو
عرصہ بناؤ میں نہ بگڑ نے میں دیر تھی
صیحہ میں صاف ہیبت آواز شیر تھی

محو سبک روی ہو اگر یہ سبک عنان صحرا کی ریگ پر نہ پڑے نعل کا نشان

سم پڑ کے پست ہونہ بلندی حباب کی

دشمن سے لڑائی تلوار کی جنگ

کوشش کا ایک حال ادھر بھی ادھر بھی تھا نعرہ دم جدال ادھر بھی ادھر بھی تھا
سو طرح کا خیال ادھر بھی ادھر بھی تھا ہر ضرب میں کمال ادھر بھی ادھر بھی تھا

— — — — — — — — —

پر آپ با حواس تھے وہ بے حواس تھا

— — — — — — — — — — — — — — — —

آنے لگی جو رگ کی طرف ضربت شقی خود بچ کے دست نحس سے اوجھڑ سپر کی دی
پہنچا زبس رگوں پہ یہ صدمہ کلائی میں
کاذب کا ہاتھہ بھی ہوا جھوٹا لڑائی میں

ہاتھہ کے اکھڑ جانے اور بیکار ہو جانے کو ہاتھہ کا جھوٹا ہونا کہتے ہیں

— — — — — — — — — — — — — — — —

اٹھا نہ ہاتھہ قصد کیا گرچہ ہر گھڑی رگ رگ شقی کے دست نحس میں تھی ہتکڑی
مغرور تھا کہ رستم دشت اجل ہوں میں
آخر کہلا کہ قہرمئی دام اجل ہوں میں

— — — — — — — — — — — — — — — —

جسم گرا سمند سے خم ہوکے مثل دال آواز دی زمین نے کہ دب اور زبوں خصال
سر دار کفر تھا جو لعین کاٹ کی طرح
پائی جگہ میان سقر قاف کی طرح

کفر کا سر یعنی پہلا حرف کاٹ ہے سقر کے لفظ میں ق سین اور ر کے درمیان ہے اسو طرح دشمن کو بھی عین جہنم میں جگہ ملی —

ابرو

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

باھم ھیں یوں کہ فرق نہیں ایک بال کا
کس حسن سے قران ھے یاں ھو ھلال کا

رخ و زلف

ھالے میں زلف کے رخ روشن ھے مثل بدر نو روز کی وہ صبح ھے یہ شام صبح قدر

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

لب

صدقے حسین کے لب شیریں پہ شہد و قند جس کی ثنا میں ھے یہ حلاوت کہ لب ھے بند

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

دندان

کھل جائیں گر یہ گوھر دندان ھم سخن الماس کھائیں شرم کے مارے در عدن

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

صدف کے موتی الماس کھائیں یعنی ھیرے کی کنی کھا کر جان دیدیں

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

کاکل

— — — — — — — — — — — — — — — —

اس زلف عنبریں کی پہونچ جائے ہو اگر — — — — — — — — —

— — — — — — — — —

عقدے ہر ایک حور کی زلفوں کے کھل پڑیں

چشم

— — — — — — — — یہ چشم پاک عین عطا ہے برائے خلق

مژگاں بھی ہاتھ اٹھائے ہے بہر دعائے خلق — — — — — — — —

— — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

گلو

کیا نور کا گلا ہے گلوئے شہ امم — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — پڑتی ہے جس کی چھوت گریباں پہ دمبدم

— — — — — — — — — —

تکمہ کا پیرھن کے ستارہ چمک گیا

پہلے عبا اور کرتہ سب میں بٹن کے بجائے گھنڈیاں اور تکمے لگتے تھے

سینہ

کیا لکھئے مدح سینۂ سلطان بحر و بر معمور ہے یہ علم الٰہی سے سر بہ سر

کینہ کا دخل یاں نہ کدورت کا یاں گذر مخزن ہے عدل و داد کا لطف و عطا کا گھر

— — — — — — — —

— — — — — — — —

[illegible] ہیں شاہ انام کے پاؤں پیچھے کبھی ہٹتے نہیں میدان میں جمکے پاؤں

[illegible] ہر بار بوسہ کے پاتے ہیں ثابت قدم کے پاؤں

— — — — — — — —

— — — — — — — —

[illegible] کو آتا ہے — نیزے کی لڑائی

[illegible] اک آگ تن میں لگ گئی اس بد خصال کے

[illegible] آیا امام پاک پہ بھالا سنبھال کے

[illegible] لگا تو غل ہوا گروہوں سے لعن کا

[illegible] جواب مل گیا ایک ایک طعن کا

[illegible] — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — —

چلتی تھی یوں سنان شہ عالم پناہ کی

جیسے زبان لپکتی ہے مار سیاہ کی

نیزی

[illegible] کبھی ادھر کبھی در آئی کاہ خود میں کاٹی سپر کبھی

[illegible] ہوئی جلوہ گر کبھی زیر زرہ گئی کبھی بالائے سر کبھی

ہر سمت دیکھ بھال تھی ہر سو خیال تھا

ظالم کو اپنی جان بچانا محال تھا

[illegible] میں گرچہ بہت تھا وہ پرغرور پر بندہ سکا نہ بند کوئی شاہ کے حضور

نیزہ اڑا کے نیزے سے بولے شہ غیور دیکھو اس کو بند کہتے ہیں اوسرہ بے شعور

سرکش کہیں بچے ہیں دلیروں کے سامنے

پھر فوج کی نہ لیجیو شیروں کے سامنے

شمیم کے مرنے کے بعد بھاگڑ

- - - - - - - - - - بھاگے شریر مورچے میدان میں چھوڑ کے
جو جو بڑھے تھے تیر کمانوں میں جوڑ کے پہلے وہی ہوا ہوئے رخ موڑ موڑ کے
راکب تو پیدلوں کی قطاروں پہ گر پڑے
مرکب الٹ الٹ کے سواروں پہ گر پڑے

تلوار

تھی آبدار آگ کا لیکن مزاج تھا قبضہ تھا یا کہ فرق پہ نصرت کا تاج تھا
لیتی تھی جان تنوں سے یہ اس کا خراج تھا اس کی زبان کا گھاؤ ہر اک لاعلاج تھا
سینکین اگر تو زخم میں آتش کا گھر بنے
ٹانکا جو دیں تو ہاتھ میں سوزن شرر بنے
سینے میں فوک سے کبھی سوراخ کر گئی گہ تن کو منہدم صفت کاخ کر گئی
اک دم میں خون ظالم گستاخ کر گئی نخل ستم کی قطع ہر اک شاخ کر گئی
- - - - - - - - - - -
نے برچھیوں میں پھل تھے نہ ڈھالوں میں پھول تھے
بید ست سیکڑوں ستم ایجاد ہو گئے بے سر ہزاروں بانیء بیداد ہو گئے
ٹکڑے ہزاروں خنجر فولاد ہو گئے کوچے دیار کفر کے برباد ہو گئے
کم تھے دم اجل سے نہ جھونکے حسام کے
گل کر دئے چراغ شجاعان شام کے

جوہر

- -
- -

جوھر تھے سر سے تابہ قدم اس جلوس کے
گویا بندھا تھا ماتھے پہ سہرا عروس کے

دشمنوں کی کیفیت

ڈوبا ھوا تھا خون میں نزدیک شط کوئی بازو کٹائے لوٹ رھا تھا فقط کوئی
آیا وفا کو سامنے گر خود غلط کوئی یوں سر کٹا کہ خاصے پدے جیسے قطاکوئی

زخموں کے خط پڑے تھے تن نحس وزشت میں
کیونکر مٹے لکھا ھو جو کچھہ سر نوشت میں

نفیس

[میری زبان کو شرف مدح پنجتن سے ملا (امام حسین)]

صبیح

چنار باغ کی سب پتیاں دھکتی تھیں کھلے ھوے تھے چمن کھیتیاں لھکتی تھیں
نہال نخل تھے سب ڈالیاں لچکتی تھیں بغل میں گل کو لئے بلبلیں چہکتی تھیں

- - - - - - - - - - - -

شمیم باغ سے طاوس مست پھرتے تھے

روانہ ھونے کی شان

بڑھا سمند سبک سیر شاہ نیک خصال چلا رکاب ظفر انتساب میں اقبال
پڑا جو آئینۂ رخ کا عکس وقت زوال زمین چمکنے لگی نیّر فلک کے مثال

ھوے یہ فاز کنان اپنی شان پر ذرے
ستارے بن کے چلے آسمان پر ذرے

لباس

عمامہ سر پہ گلابی وہ جس میں بوئے گلاب عبا وہ دوش پہ ضو جس کی غیرت مہتاب
قمیص یوسف کنعاں تھی زیب جسم جناب - - - - - - - - - - -

— — — — — — — —

نظر ہے فوج پہ حمزہ کی ڈھال دوش پہ ہے
رن میں پہونچ کر

... ...

... ...

صبا کو بادشہ مشرقین نے روکا
فرس کو رانوں کے نیچے حسین نے روکا
جری کے پہونچنے سے

تمام فوج میں ایک تہلکہ ہوا برپا کہاں سے ہو گئے سب سہم کر خدنگ جدا
— — — — — — — — — سفید رنگ سیہ بیرقوں کے در سے ہوا

نشان خم ہوے پرچم پہ پیچ پڑنے لگے
علم زمیں پہ گر گر کے سر رگڑنے لگے
رجز کے بعد — دشمنوں کی صف بندی

دم زوال چمکنا وہ سب سنانوں کا وہ ہر پرے میں کڑکنا کڑی کمانوں کا
وہ زور اور وہ بل فوج کے جوانوں کا وہ غل یلوں کا وہ انبوہ پہلوانوں کا
ہر اک کا قول تھا سر ہنگ و خانہ جنگ ہوں میں

زمیں بھی کہتی تھی کثرت سے ان کی تنگ ہوں میں
تھر آئے لڑائی ہونے لگی — دشمنوں کی ہلچل

— — — — — — — — — — — — — — — — — — — —

اچھل رہا تھا یہ پانی کہ کھل گئے تھے بھنور فرات کا وہ کنارا ادھر — ادھر کا ادھر

— — — — — — — — — —

الٹ پلٹ تھی زمیں منقلب زمانہ تھا

علم کہیں تھے سپاہ ستم شعار کہیں کہیں تھے فوج کے افسر رسالہ دار کہیں
کہیں فرس تھے پیادے کہیں سوار کہیں — — — — — — — —

فوس سواروں کے خالی نظر جو آتے تھے
پیادے فوج کے بڑھ بڑھ کے بھاگے جاتے تھے

پکار ی گاؤ زمیں ہوشیار ہو جاؤ قدم ٹھہر تے نہیں ہوشیار ہوجاؤ
چلے مکاں مکیں ہوشیار ہو جاؤ — — — — — — — —

لرز رہا ہے فلک جب تو کیا یہ گیتی ہے
جہاں الٹتا ہے کروٹ زمین لیتی ہے

ایک پہلواں سے گرز کی لڑائی

خفیف ہو کے اٹھایا شقی نے گرز گراں اُدھر سے وہ تو اِدھر سے بڑھے امام زماں
چلی جو حیدر صفدر کی صارم براں وہ گرز اڑ کے گرا واں کھڑا تھا شمر جہاں

یہ کیا غضب ہوا دھمن یہ کر کے شور گرے
دھل کے خاک پہ دس بیس کاو زور گرے

گرز کلۂ گاؤ سے بنایا جاتا تھا اور کچھہ عجب نہیں کہ غلط طور پر پھرا نے سے اور جھٹکا کھانے سے پورا گرز اڑ کر بیس تیس گز کے فصل سے گرا ہو کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آج بھی قوت والے مشاق نوجواں لوھے کے بڑے بڑے وزنی گولے گھما کر پندرہ پندرہ گز تک پھینکدیتے ہیں —

کمان کی لڑائی

کمان سے تیر ملایا شریر نے ہت کر بڑھے حسین تو زور اس کا رہ گیا گھت کر
لگائی تیغ جو سبط رسول نے تت کر گرا زمین پہ وہ ناوک معہ کمان کٹ کر

وغا میں شمع حواس شریر بھی نہ بچی
ہوا سے تیغ کی قندیل تیر بھی نہ بچی

بھالے کی لڑائی

اٹھایا ہاتھ میں بھالا شقی نے کھبراکر جھکا کے نیزہ کو آیا قریں وہ بانی شر
فرس کو ہنہنے طرت لائے شاہ جن و بشر چلی چمک کے جو دو چار بار تیغ دو سر

نہ جھو نک روک سکا سینہ زور نیزے کی
زمیں پہ کٹ کے گری پور پور نیزے کی

ساقی نامہ

پلادے ساقی گلرو شراب ناب مجھے نظر پڑا ہے گلابی میں * آفتاب مجھے
ملیں قدم پہ قدم آج بے حساب مجھے دکھادے شیب میں کیفیت شباب مجھے

... ...

... ...

ملادے جام لبوں سے کہ ہے خمار مجھے عطا ہو بادۂ سر جوش و خوشگوار مجھے
ریاض فتح کی دکھلادے پھر بہار مجھے فزوں ہو نشۂ توصیف کار زار مجھے

... ...

... ...

انیس

[دوزخ سے جب آزاد کیا حر کو خدا نے (عون و محمد)]

" حورین "

ذہنی خیالات کی کتنی پاکیزہ صورتیں کھینچی گئی ہیں کہ حسن و رعنائی کے مجسمے آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں اور تصور و درک کے مرقع نگاہوں میں کھب جاتے ہیں —

حوروں کے وہ چہرے وہ ضیائے در دندان کوئی متبسم کوئی گریاں کوئی خنداں
باتوں کی حلاوت لب شیریں سے دو چنداں سن پائیں تو چاٹا کریں ہونٹوں کو سخنداں

---

* شراب

سودا ہو پری دیکھ لے گر حور کی آنکھیں
سورج کی چمک چاند کا منھ نور کی آنکھیں

ہاتھوں پہ وہ کوثر کے چھلکتے ہوئے ساغر پانی وہ خنک اور وہ لپکتے ہوئے ساغر
شیشے وہ بلوریں وہ چمکتے ہوئے ساغر وہ مشک کی خوشبو وہ مہکتے ہوئے ساغر
پژمردہ اگر غنچۂ خاطر ہو تو کھل جائے
برسوں نہ لگے پیاس کر اک جام بھی مل جائے
رخصت ہو کر دونوں بچے میداں کی طرف چلے

... ...

تیغوں میں چلے جنس شہادت کے طلب گار باگیں جو اٹھائیں تو ہوا ہو گئے رہوار
ساتھ ان کے ہرن جست میں نہ گشت میں پہونچے
اڑتے ہوئے طاؤس چمن دشت میں پہونچے
یوں آئے کہ جس طرح نسیم چمن آئے گھوڑے تھے کہ دو آہوئے چین ختن آئے
سو نکلائے ہوئے دھوپ میں گل پیرہن آئے فوجوں میں ہوا شور کہ وہ صف شکن آئے

... ...

... ...

دونوں کے گھوڑے

دو صاعقہ لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے دو شعلے تھے آندھی میں لپکتے ہوئے آئے
ہو شیر صف جنگ کو تکتے ہوئے آئے دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے
تھا شور کہ ہوش اڑ گئے یاں کبک دری کے
گھوڑے ہیں کہ جھونکے ہیں نسیم سحری کے
غصہ میں جو ہر بار ٹھہر جاتے ہیں چل کے آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے اجل کے
اس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے گر ہاتھ میں ہو جام لبالب تو نہ چھلکے

... ...

بچوں کی سواری سے خبردار ھیں دونوں

وہ برق یہ صرصر و چھلا وہ یہ پری ھے وہ آھوئے صحرا ھے تو یہ کھک ھری ھے

سرعت جسے کہتے ھیں وہ رگ رگ میں بھری ھے ھر گام نئی چال نئی جلوہ گری ھے

نعل ان کے کہیں برق ھیں شمشیر کہیں ھیں

آھو کہیں چیتے ھیں کہیں شیر کہیں ھیں

(دشمنوں کی پیش دستی جو منافی شجاعت ھے)

سرھنگ و جفا جوئے جنگ آئے ادھر سے یاں سے جو بڑھے لعل تو سنگ آئے ادھر سے

— — — — — — — — بل پڑ گئے ابرو پہ خدنگ آئے ادھر سے

ڈھالیں تھیں بہم گرز بھی ھاتھوں میں تلے تھے

نیزے بھی لپکتے تھے پھر ھرے بھی کھلے تھے

اس وقت کی حالت

کڑکیں دو کمانیں کہ ھوا فوج میں کڑکا تیغوں کی سپیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا

گہہ بجھہ گیا خورشید کا شعلہ کبھی بھڑکا ھر دل کو ھلا دیتا تھا سر کتنے کا دھڑکا

دانتوں میں سواران عرب ڈاڑھیاں دابے وہ صورتیں خونخوار وہ گھوڑے ڈورکا بے

وہ گردنیں وہ سر تھے کہ سمکوس قرا بے* وہ آگ کے پتلے تھے تو شبدیز شتا بے

— — — — — — — —

— — — — — — — —

آغاز جنگ

قبضے پہ ادھر ھاتھہ سلحشوروں نے ڈالے تیر آئے کمانوں سے بڑھے ظلم کے بھالے

یاں نیمچے شیروں نے نیاموں سے نکالے — — — — — — — —

---

* عرب کے جھجھر

— — — — — — — —

دو شیروں نے حملہ کیاآہو کی صفوں پر

ساقی نامہ

کوثر کا بھرا جام پلا دیجئے مولا ... ...
... ... شمشیر فصاحت کو جلا دیجئے مولاہ

میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
مدت سے جو چپ ہوں تو زبان صاف نہیں ہے

گوپیرھوں پر زور جوانی ہے ابھی تک سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
قبضہ میں وہ تیغ صفہانی ہے ابھی تک دندان نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک

جوھر ہے وھی باڑھ وھی گھات وھی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وھی ہے

نیمچے

لو نیمچے شہزادوں کے چلتے ہیں خبردار او بانکیوں سے ناک نکلتے ہیں خبردار
رنگ افعی خونخوار بدلتے ہیں خبردار لو مار سید زہر اگلتے ہیں خبردار

جل جاتا ہے وہ آنچ ذرا لگتی ہے جسکو
پڑ جاتے ہیں نیل اسکے ہوا لگتی ہے جسکو

بے مثل وعدیل ایک تو یکتائے جہاں ایک ان باغیوں پر باد سموم ایک خزاں ایک
اک آتش جانسوز ہے اور آب روان ایک گھات ایک برش ایک چمک ایک زبان ایک

میان اسکی الگ ہے تو غلاف اس کا جدا ہے
اک جان دو قالب انہیں کہئے تو بجا ہے

ترجیم

گر برق کہوں برق میں یہ تاب کہاں ہے پانی میں روانی ہے پہ یہ تاب کہاں ہے
آئینہ میں جوھر ہے پہ یہ داب کہاں ہے آتش ہے تو آتش میں بھلا آب کہاں ہے

خم ہے پہ دم ایسا تو مہ نو میں نہیں ہے
ایسی تو چمک مہر کے پرتو میں نہیں ہے

بھاگڑ

ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھہ کے بھاگے - - - - - - - - - - - -
نامرد فراق سروتن دیکھہ کے بھاگے بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھہ کے بھاگے
دریا پہ بھی در سے کوئی پہرا نہیں جاتا
بھاگڑ میں یہ ہے شور کہ ٹھیرا نہیں جاتا

دونوں بچوں کی لڑائی

سینوں کو سنانوں سے ملا دیتے تھے دونوں ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتے تھے دونوں
آئینہ نصرت کو جلا دیتے تھے دونوں پانی انہیں تیغوں کا پلا دیتے تھے دونوں
یوں مرتے ہیں کرتے ہیں برائی جو بھلوں سے
تھا زہر ہلاہل کہ اترتا تھا گلوں سے

کڑکا

وہ غل عربی باجوں کا وہ تیغوں کی جھنکار قرنا کی صدا وہ کہ ہلے گنبد دوّار
کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دھواں دھار بڑھ بڑھ کے یہ کڑکیت صدا دیتے تھے ہر بار
ہاں آج نمود سپہ شام کا دن ہے
اے لشکر یو نام کرو نام کا دن ہے

پھر آئے کمیں سے جو کماندار سمٹ کر پہونچے وہیں شہزادوں کے رہوار سمٹ کر
تھراتے تھے در سے جو ستمگار سمٹ کر چلے بھی اتر جاتے تھے ہر بار سمٹ کر

... ...
... ...
... ...

انیس

[نمک خواں تکلم ہے فصاحت میری (امام حسین)]

صبح

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور زمزمے کرنے لگے یاد الٰہی میں طیور

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — —

صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

مرثیہ کا پہلو انیس کہیں نہیں چھوڑتے میں نے جو تین مصرعے چھوڑ دئے ہیں اس میں اُداسی کی کیفیت دکھائی ہے مگر جیسا کہ کسی جگہ پہلے بتا چکا ہوں میں مضمون کی اس کڑی میں صرف ان پہلوؤں کو دکھا رہا ہوں جو درد سے خالی ' روایات اور معتقدات سے جدا صرف روشن پہلو ہیں ' بجائے خود مکمل ہیں اور ادب سے بھرے ہوئے ہیں ورنہ بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ " درد " کا نمک طعام کلام کے لئے ضروری ہے انگلستان کا ایک زبردست شاعر یہی بات کس حسن سے کہہ گیا ہے اس کا یہ مصرع زبان زد ہے اور ضرب المثل بن گیا ہے —

Our Swee test Songs are those that tell of saddest thohugt ...

ہمارے شیریں ترین گیت وہ ہیں جو انتہائے درد کے جذبات کے مظہر ہوں - خیر آگے سنئے —

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیابان وہ سحر دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر

اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر اوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر

دشت سے جھوم کے جب باد صبا آتی تھی

صاف طائروں کے چہکنے کی صدا آتی تھی

قریب قریب یہی اخیال تعشق کے یہاں بھی ایک شعر میں ادا ہوا ہے۔ یہ کسی غزل کا مطلع ہے —

نجد سے جانب مجنون جو ہوا آتی ہے دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

معلوم نہیں انیس نے پہلے کہا ہے یا تعشق نے بہر طور سرقہ نہیں ہے تو ارہ ہے پھر بھی انداز بیان اور انتخاب الفاظ کا فرق ظاہر ہے :—

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کو اکو!

وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے
نماز

وہ مصلی کہ زبان جن کی حدیث و قرآن وہ نمازی کہ جو ایماں کے تن پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

وہ عمامے وہ عبائیں وہ قبائیں ان کی حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی
ذکر خالق میں جو لب ان کے ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شاخوں سے کھلے جاتے تھے

یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے جس طرح تیغ دودم دست سپاہی میں رہے

وہ تخشع و تضرع وہ رکوع اور وہ سجود وہ تہلل وہ دعائیں وہ قیام اور وہ قعود

یاد حق قلب میں سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود — — — — — — — — —

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

موم فولاد ہو آواز میں وہ سوز و گداز اپنے معبود سے سجدے میں عجب راز و نیاز

— — — — — — — — —

چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے

علم کا کھلنا

— — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — علم فوج کو عباس نے کھولا اکبار

دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی

عرش تک سبز پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہروہ سبزہ پھریرے کی وہ پنجہ کی چمک شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشید فلک

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — —

— — — — — — — — —

آغاز جنگ

لو کھپی تیغ دوسر فوج پہ آفت آئی ... ...

اِفتتم تسلیم کو اداب کو نصرت آئی فخر سے غاشیہ برداری کو شوکت آئی

چوم لوں پانوں جلال اس تگ ودو میں آیا

ہاتھ جوڑے ہوے اقبال جلو میں ایا

گھوڑا

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلا تیور دونوں انکھیں اُبل آئیں کہ ترے بانی شر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور ... ...
... ... —
... ...

تلوار

... ...
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارہ جیسے
... ...
... ...
تیغیں آری ہوئیں ڈھالوں کے اڑے پر کالے بند سب بھول گئے خوف سے بھالے والے
... ... تیغ کہتی تھی یہ سب ہیں میرے دیکھے بھالے
... ...

ایسے عقدے میرے ناخن نے بہت کھولے ہیں
... ...
دو زبانوں سے صدا کار قلم لیتی ہوں چہرے کٹ جاتے ہیں جب فوج میں دم لیتی ہوں
— — — — — — — —

طبلقین کتنی ہیں چہرے نظری ہوتے ہیں
کبھی چہرہ کبھی شانہ کبھی بکتر کاٹا کبھی درآی گلے میں تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر کبھی ترکش کبھی پیکر کاٹا طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا
پی گئی خون ہزاروں کا پہ منہ صاف رہا
— — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — تیغ کیا تھی کہ ایک اڑتی ہوئی ناگن آئی

غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھیر نے کا نہیں

زہر اس کا جو چڑھے کا تو اتر نے کا نہیں

دھوپ

— — — — — — — — — — — — — — — — — — — —

دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال لوں تھی وہ لوں کہ پگھلتے تھے حرارت سے جبال

سنگریزوں میں تب و تاب تھی انگاروں کی

سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

نفیس

[معجز بیان ہوں فیض رسا تتمآب سے (حسن و محمد)]

جنت

اس مہم کے صلہ میں عنایت ہوا مجیب — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — کوثر پہ ہوں کبھی کبھی تسنیم کے قریب

خوشبو ہوا ہو ڈالیاں پھولوں کے ساتھ ہوں

حلے گلے میں حوروں کے ہاتھوں میں ہاتھ ہوں

ہنس ہنس کے دیکھوں گلشن فردوس کی بہار نرگس پہ کبھی نظر ہو کبھی سوئے لالہ زار

خنداں کبھی ہوں زیر درختان میوہ دار — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

صبح

جسدم ہوا سپہر بریں پر ظہور صبح نکلا حجاب شب سے رخ صاف حور صبح
غالب ہوا ضیائے کواکب پہ نور صبح پھیلی زمین پہ روشنی شمع طور صبح
پنہاں ستارہ ہائے شب تار ہو گئے
طالع خدیو صبح کے بیدار ہو گئے

جھونکے وہ باد صبح کے سردی وہ معتدل سبزہ وہ جس سے ہو فلک اخضری خجل
خوشبوو تازہ پھولوں کی جس سے خوشی ہو دل مرغان دشت ودر کی صدائیں وہ متصل

وہ لطف طائران چمن کی صفیر کا
دم بھر رہے تھے عشق خدائے قدیر کا

وہ تازگی گلوں کی وہ گلزار کی بہار گلبانگ عندلیب وہ بالائے شاخسار
طاؤس کا وہ رقص تہ نخل سایہ دار اٹکھیلیاں نسیم سحر کی وہ بار بار
ایک وجد تھا نہال نہ پھولے سماتے تھے
رہ رہ کے غنچہائے چمن مسکراتے تھے

شبنم کی برگ سبز و گل سرخ پر چمک ہیرے کے تگ تھے لعل و زمرد پہ دورتک
وہ جھومنا درختوں کا باہم تہ فلک لالے کی وہ لہک گل خودرو کی وہ مہک
جلوہ تھا چار سمت سحر کی بہار کا
گلشن کھلا تھا قدرت پروردگار کا

فوج حسینی میں

دو چار وہ مسن کہ جوانوں میں انتخاب قربان جن کے شیب پہ کیفیت شباب
طاقت میں دبدے میں شجاعت میں لاجواب قد غیرت ہلال پہ رخ اشک آفتاب
جویائے آبرو وہ بدیع الجمال تھے
قد خمیدہ دین کی دولت پہ دال تھے

... ...

... ...

خم ہو کے سیدھے ہوتے تھے یوں کار زار میں
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے کچھار میں

... ...

... ...

فوجوں میں نوجوانوں سے پیچھے نہیں رہے
سر کٹ کے ان کے پاؤں جہاں تھے وہیں رہے

روانگی

آئے سجے ہوئے در دولت پہ راہوار رکھہ کر کمر میں چھوٹے سے دامن ہوئے سوار

... ...

... ...

دو بجلیاں تڑپ کے برابر نکل گئیں

گھوڑے

... ... خوشخو پلنگ ہیبت و جاندار و تیز گام
کوتاہ سم فراخ کفل تیز و خوش لجام ... ...

... ...

رعب نگاہ ان کے لئے تازیانہ ہے

انیس نے بھی کہیں کہا ہے تار نگاہ ان کے لئے تازیانہ ہے - دیکھئے محض ایک لفظ کے فرق سے حسن، حقیقت، لطف زور اور اثر میں کتنے درجات کا فرق ہو گیا ہے —

مثل نسیم صبح سبک رو سبک عنان پتہ ہلے نہ ایک جو پھولوں پہ ہو رواں

... ...

سمجھیں یہ گل کہ قطرۂ شبنم کا بار ہے

رجز کے بعد دشمنوں کی حالت

بجنے لگا سپاہ میں نقارۂ سرود جنگی صفیں بڑھیں کہ بڑھے جیسے موج رود

تلواریں تھیں میان کمر ہاتھ میں عمود کاندھوں پہ ڈھالیں برمیں چمکتے سروں پہ خود

... ...

دو لاکھ شہسواروں کے نیزے بلند تھے

ہاں سیف خامہ تیز زبانی دکھا مجھے ... ...

... ... نصرت کی اور ظفر کی نشانی دکھا مجھے

... ...

دو نیمچے جو مل کے اٹھیں ذوالفقار ہوں

نیمچے

وہ نیمچے وغا میں عجب ضو دکھا گئے شعلوں کا رنگ برق کا پرتو دکھا گئے

... ... اٹھے تو سب کو اوج مہہ نو دکھا گئے

... ...

ہر سے اگر تو ابر تھے چمکے تو برق تھے

آفت بپا تھی چلتے تھے یوں رن میں نیمچے ... ...

... ... تسمہ لگا نہ رکھتے تھے گردن میں نیمچے

... ...

تارے نفس تھے قطع بلا کی صفائی تھی

سراپہ

ان گورے گورے ہاتھوں میں تیغوں کی وہ جھلک تھی برق دست قہر میں گویا تہ فلک
چاک آستیں کے الٹے ہوئے مرفقوں تلک لاکھوں سے معرکے میں جھپکتی نہ تھی پلک

یوں غیظ میں جھپٹتے ہر نابکار پر
جنگل میں جیسے شیر کے بچے شکار پر

میدان کی حالت

ہر دل سے نیمچوں کی چمک وار پار تھی تھے جسم پارہ پارہ توصف تار تار تھی
ضربت جو دو طرف سے ادھر بار بار تھی بکتر تھے چاک چاک زرہ تار تار تھی

یوں ٹکڑے ٹکڑے جسم میں چار آئینے ہوئے
ہر آئینہ کے کٹ کے ہزار آئینے ہوئے

تھے جابجا زمین پہ دو رستہ سروں کے ڈھیر ڈھالوں کے اس طرف تو ادھر مغفروں کے ڈھیر
نیزوں کے ڈھیر ادھر تو ادھر خنجروں کے ڈھیر یاں برچھیوں کے ڈھیر ادھر جمدھروں کے ڈھیر

... ...

جنگل کی سب زمین سلح خانہ ہوگئی
دو دشمنوں سے لڑائی

دونوں طرف سے چلنے لگے وار بار بار شیروں کے نیمچے تھے شرر بار بار
بڑھتے تھے جب ادھر سے وہ جرار بار بار ہٹتے تھے پیچھے دب کے وہ غدار بار بار

... ...

روباہ سنہ پہ شیر کے آتے نہیں کبھی

نیزہ دو نیم ادھر ہوا گرز گراں ادھر تیر اس طرف قلم ہوئے شاخ کماں ادھر
خود اس طرف کٹا سپر پہلواں ادھر زخمی ادھر کلائی ہوئی انگلیاں ادھر

سرکش کو پست کرتا ہے کلمہ غرور کا
دونوں کے پاس ایک نہ حربہ تھا دور کا

... ...

سن سے چلیں جو چھوٹی سی تیغیں ادھر ادھر تن پر نہ اس کا فرق تھا نہ دوسرے کا سر
گھوڑوں کے بھی زمین میں قدم گڑ کے رہ گئے
دونوں کے سر جو پاس گرے لڑ کے رہ گئے

رشید

[محضر خون شہیدان ہے میرا دامن دل (امام حسین)]

صبیح

صبح عاشور کی جب دشت میں تنویر ہوئی لیلئی شب کی جوانی نہ رہی پیر ہوئی
رن میں جو شے تھی وہ ایک نور کی تصویر ہوئی دل جلے سرد ہوا میں نئی تاثیر ہوئی
یوں ہلے برگ و شجر شور و فغاں اٹھنے لگا
شبنم اڑنے لگی آہوں کا دھواں اٹھنے لگا

سورج

تاج زریں سے ہوا جب سر گردوں پر نور خضر نے چاہا کہ ہو قلزم اخضر سے عبور
رنگ وہ چرخ کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سبزے میں دور
کوئی معشوق بہ صد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بھورق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

بہار

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی کہ نظر باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
غنچے گل ہونے لگے باد صبا آنے لگی ٹھنڈی ٹھنڈی لب دریا سے ہوا آنے لگی

بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زلفیں ہلنے لگیں دامان قبا اڑنے لگے

لطف پیدا کیا شبنم نے سوا رو رو کے غنچے شاداب ہوئے اور بھی تر ہو ہو کے
کیسو آراستہ سنبل نے کئے دھو دھو کے لب جو انان چمن اٹھنے لگے سو سو کے
پانوں رکھتی ہے نیم سحری بن بن کے
اپنے کو دیکھتا ہے سرو ہر اک تن تن کے

پھولوں نے فصل بہار آتے ہی رنگت پائی زر گل مل گیا گلچین نے یہ دولت پائی
پانی کے زور سے فواروں نے قوت پائی دست دیا بیلوں نے پھیلاؤ نے راحت پائی
ہے سکون سب کو ہر اک بات میں آسانی ہے
آئینہ چو کھتے میں نہریں یا پانی ہے

رنگ لالہ کا نیا ہے نئی زیبائی ہے تختہ سوسن کا کھلا ہے کہ کھٹا چھائی ہے
سب زلیخا کے جوانی کی روش پائی ہے ہے سوا حسن چمن جا کے بہار آئی ہے
جس کو سمجھے تھے برا لوگ وہ اچھا نکلا
باغ میں سبزۂ بیگانہ یگانہ نکلا

ہے جوانان چمن کی ہر ادا خوش اسلوب کیسے خوش رنگ لباس اٹکے و ہ شکل مرغوب
... ... سایہ شمشاد کا ہے روکش قد محبوب
بہ لی آ آ کے جوہر بار سرک جاتی ہے
کہیں دھوپ اور کہیں چھانوں نظر آتی ہے

... ...

ہے ملاپ آج نہیں ہے گل و بلبل میں بکاؤ بیٹھی ہے جا کے قریں دیکھ کے پتوں کی آڑ
پائے صیاد کی آہٹ جو ذرا پاتی ہے
سیکڑوں باتیں سناتی ہوئی اڑ جاتی ہے

باغ میں فصل بہار آئی کہ ایام شباب باغبان سے ہوی خوش یے کے زر گل کا حساب
حسن کے واسطے سنبل کو دیا پیچ و تاب اسطرح سبزے کو روندا کہ ہوا وہ شاداب

ناز دیکھو کہ جدھر باد بہار آ کے چلی
تو ہر اک غنچہ کو ہر پھول کو ٹھکرا کے چلی

بیلیں خوش ہیں کہ بہار آئی گئی فصل خزاں سب ثمر ہیں پے نذر چمن آرائے جہاں
آرزو ہے کہ اسی رنگ پہ پھر ہو بستاں علم نخل میں چلے ہیں یہ بیلیں ہیں کہاں

پھر حسین آئے ہوا باغ کی کھانے کے لئے
منتیں مانی تھیں ایام گل آنے کے لئے

عورتیں اپنی منتوں کے لئے حسینی جھنڈوں میں ناریے کے چھلے باندھ دیتی ہیں جن کو لکھنؤ کی زبان میں لوگ چلہ کہتے ہیں —

مہندی

اس قدر کثرت گل ہے کہ نہیں کوی حساب تتی مہندی کی ہر اک شب کے یہ کرتی ہے خطاب
میں پیسی جاتی ہوں یہ جان پہ کیسا ہے عذاب دمبدم فصل بہاری اُسے دیتی ہے جواب

شوق محبوبوں کا ہر دم اسی تدبیر میں ہے
روز اول ہی سے پسنا تری تقدیر میں ہے

پاتے ہیں حسن کا سامان بہ آسانی گل عکس سبزہ سے نظر آنے لگے دھانی گل
زلف سنبل کی ہے افشاں جو ہیں افشانی گل کہیں کانٹا نہ لگے مانگتے ہیں پانی گل

حد نہیں باغ میں ہر پھول کی سرشاری کی
دھبے دامن کے خبر دیتے ہیں میخواری کی

کہیں کانٹا نہ لگے کے تین معنی ہیں - جب پیاس کی شدت سے گلا سوکھ جاتا ہے تو کانٹا لگنا کہتے ہیں کہیں نشتر نہ چبھے دوسرے معنی یہ ہیں اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ کانٹے نکل نہ آئیں جوش بہار سے -

قطرے شبنم کے ہر اک سمت ہزاروں ہیں عیاں ہیں شجر سارے مرصع یہی ہوتا ہے گماں
جوہری آتے ہیں دھو کے میں یہاں بستاں ابر نیساں کا بھلا کون اٹھاتا احساں

کئے ہیں فصل بہاری نے یہ جوہر پیدا
کہ درختوں میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

روانگی

... ...
... ...

قدم شاہ سے ہر ایک شرف پانے لگا
نور آنکھوں میں رکابوں کے نظر آنے لگا

گھوڑا

گئی جو آہستہ سے مہمیز ہوا تیز فرس ... دوں نئے دیتی تھی دل شیرور کے آواز جرس
کچھ عجب پیار سے فرماتے تھے حضرت بس بس ... ...

— — — — — — — —

جس طرف پھرتا ہے عشاق کے دل پھرتے ہیں

... ...
آج تک خلق میں سمجھا نہ کوئی چال اس کی ... منھ کا کف پارہ ہے اور برق ہے پامال اس کی

نقش پا اس کے جو مٹ جاتے ہیں سارے بن کے
بام گردوں پہ چلے جاتے ہیں تارے بن کے

چال اس طرح کی ہے پریوں کے دل ملتی ہے — — — — — — — —
— — — — — — — — کستا ہے سینہ سے ہیکل جو ذرا ڈھلتی

لباس

... ...

سنتے ھیں چار طرف ابر کرم چھائے ھیں
ھم فقیروں کی طرح آج ادھر آئے ھیں

- -

— — — — — — — — کہے دیتے ھیں کہ سمجھائے نہ کوئی زنہار
جوش میں جام سے شیشے ابھی لڑجائینگے
نام توبہ کا سنیں گے تو بگڑ جائیں گے

- - - - - - - - - - - - - کیا سبب جام میں آنے لگی تھم تھمکے شراب
- - - - - - - - - - - - میرے ساقی ترے صدقے مجھے سب دیدے شتاب

دامن صبر میرے ھاتھہ سے اب چھٹتا ھے
دم رکا جاتا ھے شیشہ کا گلا گھٹتا ھے

میرے ساقی نے منگائی ھے شراب کوثر میں بڑھائے ھوے ھوں ھاتھہ جھکائے ھوے سر
... ... سبب جنبش ساغر ھے حریفوں کی نظر
آنکھیں مشتاق ھیں دیکھیں یہ کسے ملتی ھے
دل میرا ھلتا ھے جب جام میں مے ھلتی ھے

رشید

[عباس نے جب رن کی رضا شاہ سے چاھی (حضرت عباس)]

ساقی نامہ

اے ساقی مہوش مجھے جلدی کوئی دے جام مدت سے میری روح تڑپتی ھے پے ء جام
حسرت ھے یہ کانوں میں صدا آئے کہ لے جام یاں ذکر لڑائی کا ھے شیشے سے لڑے جام

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

گھوڑا

اس ھاتھہ میں ھے باگ ادھر ھاتھہ میں کوڑا جس سمت نظر پھرتی ھے پھر پڑتا ھے گھوڑا

گو یا کہ لجام اس کی ھے تار نظر ان کے

سب شامیوں سے بھر کے طرارا نکل آیا
شب ختم ھوئی صبح کا تارا نکل آیا

تلوار

بھر بھر کے لہو میں ھوئی تیغ دوسراتش

ھے گرمی رفتار کہ منھہ لال ھوا ھے

" سلیس "

[وہ گل ھوں کہ جس پاس خزاں آنہیں سکتی (حضرت عباس)

صبح

جب تاج رکھا فرق پہ سلطان سحر نے مغرب کو کیا کوچ شب تیرہ نے
ھاتھوں پہ لیا نور پہ نذر قمر نے رخساروں کو شبنم سے بھگویا گل تر نے

وہ آمد خورشید وہ مہتاب کا جانا سردی وہ دم صبح کی وہ وقت سہانا
جنگل میں صبا کا وہ دبے پانوں سے آنا ھر نخل پہ طاؤس کا وہ شور مچانا

— — — — — — — — —
— — — — — — — — —

باجے

نوبت کی وہ آواز وہ شہنا کی صدائیں وہ وردیاں لشکر کی جو سوتوں کرجگائیں
وہ نے کی صفیریں کہ دل سخت بھرآئیں تاسے وہ کہ جو گنبد گردوں کو ہلا ئیں
سب ارض و سما غل سے جو قرنا کے بھرے تھے
سکان فلک ہاتھوں کو کانوں پہ دھرے تھے

وہ خندۂ گل اور وہ بلبل کا چہکنا شبنم کا وہ ہر برگ رگ گل سے ٹپکنا
تاروں کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا وہ سبزۂ نو خیز کا رہ رہ کے لہکنا
صحرا میں ہر اک پھول کی خوش بو جو نئی تھی
چال اپنی نسیم سحری بھول گئی تھی

داچھ سپ وہ جنگل وہ خنک واں کی ہوائیں جنت سے فرشتوں نے دیں کہیں و دفزائیں
وہ چار طرف نغمہ بلبل کی صدائیں — — — — — — —

— — — — — — — —
— — — — — — — —

میدان وہ کف دست سا وہ صبح کا عالم خنکی مگر ایسی نہ زیادہ نہ بہت کم
وہ چہچہے مرغان خوش آواز کے باہم — — — — — — — —

— — — — — — — —
— — — — — — — —

تعشق

[سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے (جناب حر رم)]

علم

— — — — — — — — — — — — — —

جب صف آرا ہوا تھوڑا سا وہ شہ کا لشکر علم سبز کھلا سرو قدوں کے سر پر

علم سبز کے پرتو سے جو ممتاز ہوا
سبزۂ خط رخ خورشید پر آغاز ہوا

سنگریزوں میں زمرد کا دمکتا تھا رنگ　　— — — — — — — —
پستیٔ اطلس دریا نے کیا پیدا رنگ　　ہلکا ہلکا جو کہیں تھا تو کہیں گہرا رنگ

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

وہ عجب رنگ پہریرے کا وہ پنجے کا نور　　سبز پرے سے نکالے ہوئے تھی چہرۂ حور

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — —

— — — — — — — —

صبح

طرف شرق و سامان طلوع خورشید　　اشک شبنم سے ٹپکتی تھی بہار جاوید
پیرہن نور کا پہنے ہوئے تھی صبح امید　　بہر زخم دل بلبل تھے نمک پھول سفید

دیکھے ان کو تو ہوں عارت کے جگر کے ٹکڑے
کوسوں پھیلے ہیں گریبان سحر کے ٹکڑے

بہار

شاخہ گل کی نزاکت کے نرالے ہیں ڈھنگ　　سرخ منہ ہوگئے ہیں برمیں جو ملبوس ہے تنگ
اشک شبنم کا ترشح ہے اُنہیں بارش سنگ　　میاں آنکوہ ان پہ جو پڑجائے تو میلا ہو رنگ

آگ پھولوں کو ہے بلبل کے جگر کی گرمی
زرد کر دیتی ہے سبزہ کو نظر کی گرمی

... ...　　پیرہن سبزۂ نو خیز کے بر میں دھانی
... ...　　سوندھی مٹی کی خوشبو وہ معطر پانی

... ...

ہو گذر خاک کے پتلے کا تو آدم ہو جاے

یعنی جان پہن جاے ' جب اللہ کو انسان کی خلقت منظور ہوی تو فرشتوں سے مٹی کا ایک پتلا بنوایا اور اس میں خود ہو جان پھنائی -

وجد چوپایوں کو تھا دیکھہ کے جنگل کی بہار ... ...

کبک و طاوس کا وہ شور میان کہسار قمری و فاختہ و طوطی و بلبل کی پکار

بندگی کا جو طریقہ ہے ادا کرتے تھے

سب کے سب ایک زبان حمد خدا کرتے تھے

جوش عشق چمن آراے جہاں تھا جو عظیم ... ...

... ... نیم باز آنکھہ سے نرگس کی ہوے قلب دونیم

... ...

بلبلیں شاخ سے پھولوں کی طرح گرتی تھیں

تھی یہی ایک زبان سور وملہم کی تقریر رازق خلق معین الضعفا رب قدیر

حاضر و ناظر و صانع ہے تو ہی تو ہے بصیر تو ہے آزاد کنندہ ترے ہم سب ہیں اسیر

کھیتیاں محو تھیں ساری اسی افسانے میں

صاف تسبیح کی آواز تھی ہر دانے میں

بلبلیں لاتی تھیں سر کو قدم گل کے پاس مسکراتے تھے یہ غنچے کہ خدا لائے راس

تازگی دیکھی جو سبزہ کی تو جاتی رہی پیاس اوس کھاے ہوے سبزہ کی وہ ٹھنڈی بو باس

کہیں پڑ مردہ نہ ہو جاے یہ ڈر رکھتی تھی

پانوں سبزہ پہ تکلف سے نظر رکھتی تھی

بلبل جان نے مزہ صنعت حق کا لوٹا چہچہہ کیا دل میں جہان خاک سے سبزہ پھوٹا

محو محبوب حقیقی ہے ہر اک گل ہوٹا غنچہ چٹکا تو یہ جانا دل بلبل ٹوٹا

... ...

... ...

سواری کی شان

بس گئی راہ جدھر حر کی سواری آئی پھول دامن میں لئے باد بہاری آئی

... ...

خلد تک کوچۂ گیسو کی ہوا جاتی تھی

نیند حوران بہشتی کو چلی آتی تھی

تلوار

دل جگر نذر میں وہ حور شیم لیتی تھی ... ...

... ... رکھکے سرشانۂ حر پر کبھی دم لیتی تھی

تہ شمشیر جو رہ رہ کے صفین آتی تھیں

تہ یاں خون کی اتری ہوی چڑھ جاتی تھیں

بھاگڑ

سب کے آب دم شمشیر پہ دم جاتے تھے اڑکے سر بھاگتے تھے پانوں جو تھم جاتے تھے

... ... منھہ چھپائے ہوئے دامن سے علم جاتے تھے

تیغ کے سامنے جھکتی تھیں عجب حالوں سے

بیرقین ہاتھوں کو باندھے ہوئے رومالوں سے

وکھتے تھے پانوں پہ سر ناز اٹھانے والے ٹھوکرین کھاتے چلے آتے تھے آنے والے

کیا ستائے گئے تھے جلد ستانے والے گلے مل مل کے لہو روئے رلانے والے

- - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

صورت زندگی اہل جفا بگڑی تھی چار دیوار عناصر کی بنا بگڑی تھی
تیغ بگڑی ہوئی تھی، یا کہ قضا بگڑی تھی اسکے پانی سے زمانہ کی ہوا بگڑی تھی
کاٹتی تھی جو شجر کو تو لہو دیتا تھا
پھول کھلتا تھا جہاں زخم کی بو دیتا تھا

کوثر

[ہمیشہ گلشن عالم کا ایک حال نہیں (واپسی اہلبیت)]

گھوڑے

تھے جتنے فوج میں بسمل تھے انکی چھل بل کے نظر جھپک گئی اڑنے میں نعل گر جھلکے
قدم چلے تو رکے سینکڑوں کے دل مل کے وہ مینھی پوئی کتورا نہ ہاتھہ کا جھلکے

... ...

... ...

وہ چوڑے ماتھے وہ انکی کنوتیاں پیاری نظر پھسلتی تھی پٹھوں کی ایسی تیاری
اڑے وہ دونوں تو حیرت میں فوج تھی ساری ہوئے جو نعل دراتش تو پھک گئے ناری
بگڑ بگڑ کے کبھی وہ ہوا سے لڑتے تھے
دھنی سے گرتے تھے کف یا کہ پھول جھڑتے تھے

بھاگڑ

سوار گھوڑوں کو سرپٹ بھگائے جاتے تھے کہیں امان کا گوشہ عدو نہ پاتے تھے
جو تیغزن تھے لڑائی سے جی چراتے تھے شریر بھاگتے تھے اور یہ مسکراتے تھے
پناہ تیغ سے انکی کہیں نہ ملتی تھی
فرات اچھلتا تھا ہاتھوں، زمیں اچھلتی تھی

تلوار

دلوں کے ساتھہ کیا قطع سب ارادوں کو کبھی تو کاٹا کیا دوں کو کہ کمانوں کو
نہ چھوڑا اسنے سواروں کو نہ پیادوں کو حلال کر دیا اسنے حرا سزادوں کو
تھی خون کی نہر روان سر جو کٹ کے گرتے تھے
لہو میں ڈوب کے لاشے عدو کے ترتے تھے

دبیر

[کیا خلق حسن تھا حسن سبز قبا میں (امام حسن)]

کیا خلق حسن تھا حسن سبز قبا میں ... ...
... ... دل یاد خدا میں تو زبان ذکر خدا میں
... ...
... ...

سراپا - چشم - دست - قدم

... ...
ملظور نظر چشم کو مردم پہ عنایت اور دست گہر بار کو دستور سخاوت
- - - - - - - - - - - - - - - - - - -
عینک تھا ہر اک نقش قدم اھل زمین کو
- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

دندان جو کھر تھے تو دھن معدن گوھر تقریر تھی سلک در شہوار سے بہتر

- -

... ...

... ...

سخاوت

گھر اپنا لٹایا رہ معبود میں سو بار مال و زر و اسباب نہ باقی رہا زنہار
اک حاکم مفسد نے لکھا اے شہ ابرار اسراف میں تو خیر کے ظاہر نہیں آثار
حضرت نے کہا خیر میں اسراف نہیں ہے
اسراف حسن ہے تجھے انصاف نہیں ہے

نیسان

[اے قلم معرکۂ جنگ کی تصویر کھینچ (حضرت عباس)]

آمد

کیوں نہ تزلزل میں حدیں واد ی پیکار کی ہیں — — — — — — — —

... ...

جیوٹوں میں ہے یہ چرچا کہ دلیر آتا ہے
غل ہے نیزوں کے نیستاں میں کہ شیر آتا ہے

- -

— — — — — — — — مورچے قلب کے تھراتے ہیں غالب یہ ہول

ہوش سر سے صفت رنگ اڑے جاتے ہیں
سنہ بساں ۵م شمشیر سڑے جاتے ہیں

سردار لشکر کی حالت

گرد یوں فوج تھی فولاد کا جیسے ہو حصار اسطرح سے ادھر آتا تھا نظر کوہسوار
صف زرہ پوشو نکی باندھے ہوے جنگی ہتھیار روبرو خیمے کے لوہے کی کھچی تھی دیوار
اس حفاظت پہ ستمگار ڈرا جاتا تھا
بہ اجل فرط تردد سے مرا جاتا تھا

طعن و طنز

طنز کی راہ سے کہتا تھا یہ کوئی مغرور کل سے ہم سب کی حفاظت جو نہوتی منظور
لڑتے جی کھول کے اس معرکہ میں آپ ضرور کرتے یا مصلحت وقت سے لیکن مجبور
منحصر آپ پہ ہے فتح و ہزیمت سب کی
آپ کے عزم کی تابع ہے عزیمت سب کی

آپ سا آج جو ہوتا نہ یہاں تجربہ کار تہلکہ میں ابھی پڑجاتی یہ فوج غدار
ایسے افسر نہیں ملتے ہیں کسی کو ہشیار آپ کی رائے پہ انسب ہے جو ہو دار ومدار
ساتھ سب لشکر جرار کا پورا دیں آپ
جان محفوظ رہے جس میں وہ شورا دیں آپ

پسر سعد نہ ارشاد سے باہر ہوگا جا کے کہئے ابھی وہ خیمہ کے اندر ہوگا
کچھ توقف جواب اس پر میں ۵م بپھر ہوگا حشر ہوگا تہ شمشیر یہ لشکر ہوگا
دیکھئے حکم ہے رن چھوڑ کے ہٹ جانے کا
یا اب اس فوج کے بے فائدہ کٹ جانے کا

جب رخصت ہو کر چلے

... ... عجب انداز سے آیا فرس تیز نفس

پاس خیمہ کے نظر جلوۂ قدرت آیا
جھومتا ابر قریب در جنت آیا

گھوڑا

ٹھیکے بھرتا ہوا اس ناز سے آیا شبدیز جسطرح باغ میں آتی ہے نسیم گل بیز

جنبش ابرو کو جو ہو بھر کے طرارا اُڑجائے
چشم راکب کا جدھر پائے اشارا اُڑجائے

... ... چاروں نعلوں میں تھا شمشیر دو دم کا عالم

گرد بھی چھوڑ کے رستہ کو ہٹتی جاتی تھی
راہ چلتی ہوئی تیغوں سے کٹتی جاتی تھی

سراپا - چہرہ

آئینہ ہے یہ قمر ہمسر سیمائے حضور گل کہاں اور کہاں چہرۂ زیبائے حضور
انمیں جو رنگ ہے رنگت ہے کہاں پھولونمیں
سرخی خون شہادت ہے کہاں پھولوں میں

چہرہ

— — — — — — — — — — — — — — — —

زرد و رنگ و چہرے کی دمک و رونق جیسے آئینے سے اپٹتا ہوا سونے کا ورق

— — — — — — — — — — — — — — — —

... ...

... ...

ابرو

— — — — — — — — — — — — — — — —

... ...

نور ماتھے کا جو ابرو پہ چمک جاتا ہے
آئینہ طاق میں کعبہ کے نظر آتا ہے

کجی ابرو

... ...

... ...

— — — — — — — —

پشت اسلام ہوا راست انہیں کے خم سے
آنکھیں

نشۂ بادۂ جرات سے ہیں سرشار آنکھیں ... ...

... ...

... ...

رنگ یاقوت بھرا ہے انہیں پیمانوں میں

لب

— — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — —

فیظ میں ہونٹہہ ہیں حضرت نے چبائے جب سے
رنگ نیلم کا نمایاں ہے عقیق لب سے

دھن

دھن تنک ہے گنجینۂ رازیزداں — — — — — — — — — —
— — — — — — — — آج ہے خشک وہی چشمۂ آب حیواں
— — — — — — — — —
خاک اڑتی ہوئی آتی ہے نظر کوثر میں

زبان

موج دریائے فصاحت ہے زبان اطہر — — — — — — — — —
— — — — — — — — پڑگئے کانٹے یہ ہے پیاس کی شدت کا اثر
— — — — — — — — —
پنکھڑی پھول کی الجھی ہوئی ہے خاروں میں

کمر

وہ کمر واہ خدا میں اجو رہی مستحکم — — — — — — — — —
... ...
— — — — — — — — —
راست سرو چمن مرتضوی ہے اس سے

ماجہ

[میری تقریر کو تاثیر عطا کر یارب (علی اکبر)]

ساقی نامہ

ساقیا آج کوئی جام چھلکتا دینا ساغر گل سے جو بڑھ کر ہو مہکتا دینا
قدم مہر منور سے چمکتا دینا دست نازک سے جو تیرے ہو لچکتا دینا

- - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

جام پر جام ملے جائیں چڑھا تا جاؤں گل مضمون کے میں انبار لگاتا جاؤں
پی کے مے جوش طبیعت کا بڑھا تا جاؤں نور خالق کی میں تصویر دکھا تا جاؤں

— — — — — — — —

— — — — — — — —

— — — — — — بادۂ ناب سے بھر دے مرا ساغر ساقی
جام میں آئے نظر رنگ گل تر ساقی ابتو اگلے بط مے خون کبوتر ساقی
خیر ہو خم کی ترے میکدہ آباد رہے
آج وہ دور چلے مدتوں جو یاد رہے

نماز

....
کٹ گئی رات اب احوال عبادت سنئے گوش دل کھولئے تر تیل و تلاوت سنئے
ذکر خالق میں دم صبح مزا ملتا ہے
چلتی ہے باد سحر غنچۂ دل کھلتا ہے
پیچھے انصار کی صف آگے ہیں شاہ صفدر — — — — — — —
... — ... ... ان کی تکبیر کے لہجے ہیں پسند داور

شوق سے صوت حزیں رب علا سنتا ہے
سمع اللہ پہ کہتے ہیں خدا سنتا ہے

— — — — — — — — یہ زمیں پر ہیں سرعرش دعائیں ان کی
حق تعالے کو ہیں محبوب صدائیں ان کی — — — — — — — — —
— — — — — — — — — — — — — — — — — — — —
— — — — — — — —

معجزہ ہے اثر حسن تکلم ان کا
ان کی تکبیر نمازوں میں جو ہوتی ہے بلند ہوتی ہے خالق اکبر کو نہایت وہ پسند
— — — — — — — — — — — — — — — — — — — —

ہ ی ہے اللہ نے تاثیر عجب باتوں میں
باتیں کرتے ہیں خدا سے یہ مناجاتوں میں

صبح

وہ فضا دشت کی وہ سرد ہوائے لب جو وہ نسیم اور گلوں کی وہ اچھوتی خوشبو
کہیں طاوس کہیں کبک کسی جا تیہو کرتے تھے ذکر خدا اپنی زبان میں ہر سو

غل تھا جنگل میں کہ قدرت کی بہار آئی ہے
جس طرف آنکھ اٹھاؤ چمن آرائی ہے

جلوہ گر تھے سنبل قطرات شبنم صاف جیسے گہر آسودہ ہو زلف پر خم
معتدل قد وہ صنوبر کہ زیادہ تھے نہ کم وہ دم صبح حسینان چمن کا عالم

شب کی پھیلی ہوئی مسی جو تھی وہ چھٹتی تھی
ہ دولت حسن خدا داد سحر لٹتی تھی

سرو و شمشاد اب و وہ گل اور وہ تلیوں کی مہک وہ کھلا دشت وہ سبزہ کی ہ ل آویز لپک
ہ ر شبنم کی ہر ایک برگ پہ وہ صاف جھلک ذرۂ ارض نکا ہوں میں تھے خورشید فلک

— — — — — — — —

صاف آتا تھا نظر وادی ایمن صحرا

وہ گل وسبزہ جو آنکھوں کو تراوت بخشیں تازگی روح کو اور قلب کو فرحت بخشیں

سرد وہ جھونکے جو بیمار کو صحت بخشیں دل بیتاب کو آسائش و راحت بخشیں

جانفزا دشت میں تھے باد صبا کے جھونکے

دم عیسیٰ تھے کہ اس نرم ہوا کے جھونکے

اب تو بتائیے " بگڑا شاعر مرثیہ کو " ہے یا نہیں ؟ ۔ اور زبان و ادب پر کس کا احسان زیادہ ہے ؟

روسی ادب

تیسرا باب

روسی شاعری، پہلا دور

پشکن

از

[جناب محمد مجیب صاحب بی۔ اے آنرز (آکسن)]

ادبی دنیا میں روس کا پہلا نمائندہ، ایک سائذر سرکے یوج پشکن سنہ ۱۷۹۹ ع میں پیدا ہوا۔ اُس کا خاندان بہت پرانا تھا، اور روسی تاریخ میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔ پشکن کی ماں پیتر اعظم کے ایک حبشی غلام کی پوتی تھی، اور اسی وجہ سے پشکن حلیے میں کسی قدر حبشی نظر آتا ہے۔ شاعر کا بچپن فرانسیسی استادوں کی نگرانی میں گذرا، جنھوں نے اسے آخر عمر تک اس وہم میں مبتلا رکھا کہ وہ فرانسیسی اپنی مادری زبان سے بہتر جانتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم پشکن نے پیتر برگ کے ایک مشہور کالج میں حاصل کی، لیکن وہ بہت نکما طالب علم تھا، اور اس کے استادوں میں سے اکثر کی یہ راے تھی کی وہ کبھی کسی مصرف کا نہ ہوگا۔ استادوں کی اس راے، اور پشکن کے "نکمے پن" کا سبب اس کا ادبی ذوق اور ادبی مشاغل تھے۔ اس نے پندرہ برس کی عمر سے رسالوں میں مختلف کلاسیکی شعرا کے ترجمے بھیجنا شروع کردیے، کالج میں ایک ادبی ادارہ قائم کیا اور ادارے کی طرف سے

ایک رسالہ بھی جاری کیا جس میں زیادہ تر طالب علموں کے مضامین چھپتے تھے یوں کالج سے نکلتے ہی پشکن روس کی ادبی دنیا طوفانی سمندر میں کود پڑا، اور اپنے کلام اور طبیعت کی شوخی سے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ ۱۸۱۸ میں اس نے اپنی پہلی ادبی نظم "روسلان اور لودملا" لکھی لیکن نظم شائع ہونے سے قبل ہی وہ ایک فحش قصیدہ لکھنے کی سزا میں روس کے جنوبی صوبوں میں جلا وطن کردیا گیا۔ سزا یابی نے اس کی شہرت اور بڑھا دی۔ اس کا قصیدہ ایسا لغو تھا کہ صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی وہ سزا کا مستحق تھا، لیکن سب جانتے تھے کہ ریاست نے قصیدے کو محض ایک بہانہ بنایا ہے، اور پشکن کی جلاوطنی کی اصل وجہ چند نظمیں ہیں جو اس نے آزادی کی مدح میں اور آزادی کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے لکھی تھیں۔ جلا وطنی کے چار سالوں میں پشکن نے جنوبی صوبوں کی سیر کی، اور اگر وہ اپنی ہمت اور قابلیت کی فضول نمائش میں وقت ضائع نہ کرتا تو ممکن ہے اس کی اس زمانے کی نظمیں بھی بہت بہتر ہوتیں۔ مگر افسوس ہے وہ متانت اور ضبط نفس کی خوبیوں سے نا آشنا تھا، اس کے حسن پرستی کے شوق اور من چلے پن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا وقت زیادہ تر زبان اور قلم سے حسین عورتوں کی تعریف کرنے میں گذرتا تھا، اور اس سے جو ذرا فرصت ملتی وہ رقیبوں سے لڑنے جھگڑنے میں صرف ہوتی۔ سنجیدہ مشاغل کے لئے بہت کم وقت بچتا تھا، اور اس تھوڑی سی مہلت میں بھی، جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، اس کو اکثر نازیبا جذبات کا خمار پریشان رکھتا تھا۔ جلا وطنی کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ پشکن اپنے باپ کے ایک گانو میں نظر بند کردیا گیا۔ اس کی حرکتوں نے جنوبی صوبوں کی پولیس کو حیران کر دیا تھا، اور پولیس والے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھڑائیں۔ محض شرارتوں کی شکایت کرنا بے فائدہ تھا، مگر جب پشکن پر انگریزی

شاعر شے لی* کی ایک نظم پڑھنے سے الحاد کا غلبہ ہوا' اور اس کا ایک خط پکڑا گیا' جس میں اس نے کسی دوست کو اپنی روحانی کیفیت کی اطلاع دی تھی تو اس کے خلاف کاروائی کرنے کا بہت اچھا حیلہ مل گیا. پشکن اپنے آبائی گانو سیخائلوف سکولے بھیج دیا گیا' اور اسے جو ذرا گھومنے پھرنے کی آزادی تھی وہ بھی چھین لی گئی. وہ یہیں تھا جب ۱۸۲۵ میں زار نکولائی اول کی تخت نشینی کے موقع پر دے کا برئیست† بغاوت ہوئی' باغیوں میں سے اکثر شاعر کے گھرے دوست تھے' لیکن اتفاق سے اسے وقت پر خبر ہوگئی' اور جب پولیس اس کے مکان اور کاغذات کی تلاشی لینے آئی تو وہ کاغذات جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جلاچکا تھا' ورنہ اس کی باقی عمر بھی سائبی بی ریا کے کسی قید خانے میں گذرتی. ایک مرتبہ بچ نکلنے کے باوجود بھی پشکن کو معتوب ہونے کا خوف رہا' اور زار کی بدگمانی رفع کرنے کی غرض سے اس نے کئی نظموں میں زار کی مدح سرائی کی اور اپنی نمک حلالی کا فخریہ اعلان کیا۔ ایک سال کے اندر زار کو اس کی خیر خواہی اور وفاداری پر اتنا اعتماد ہوگیا کہ وہ پیٹر برگ بلا لیا گیا' اور اسے مزید عذر خواہی اور قدم بوسی کے لئے خلوت میں باریابی عطا ہوئی - مگر زار کی یہ مہربانیاں کیا تھیں گویا شاعر کو اور زیادہ قابو میں رکھنے کی ترکیبیں تھیں نکولائی اول نے اپنے آپ کو پشکن کا محتسب قرار دیا' اور اسے اپنے قریب رکھنے کی غرض سے دربار میں ایک عہدے پر معمور کردیا جو شاعر کی عمر اور اس کا مذاق دیکھتے ہوئے بہت نامناسب تھا. بادشاہ کے احتساب اور درباریوں کی نفرت اور عداوت نے پشکن کو اس قدر عاجز اور بیزار کردیا کہ وہ اپنی عقل کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگا ۱۸۳۱ میں پشکن نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کرلی جو حسن

---

* پرسی بشے شے لی (۱۷۹۲ - ۱۸۲۲) آزاد خیالی کا بہت جوشیلا مبلغ تھا۔

† اس تحریک کا ذکر "سیاسی تحریکوں اور تصانیف" کی تحت میں آے گا۔

تو تھی مگر ساتھہ ھی فضول خرچ سرد مہر اور کسی قدر آوارہ' اور بیچارے شاعر کے سر بیوی کی خاطر داری اور نگہداشت کی ایک اور مصیبت آن پڑی . ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ھوا کہ پشکن پیتر برگ آکر بجاے ادبی دلچسپیوں میں محو ھونے کے رئیسانہ زندگی کے لغو مشاغل میں گرفتار ھوگیا' سیخائلوات سکویے کی نظربندی کے مقابلے میں پیتر برگ کے قیام کے دس گیارہ برس بہت کم بار آور ثابت ھوئی . آخری سالوں میں پشکن نے شاعری ترک کرکے نثاری اختیار کرلی' کچھہ اس وجہ سے کہ بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے اس نے سرکاری مورخ کا عہدہ حاصل کرلیا تھا' اور اسی سلسلے میں اس نے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا اس سے تاریخی مضامین لکھنے کا شوق پیدا ھوگیا' کچھہ اس وجہ سے کہ اس کی پابندیاں ایسی ھوگئی تھیں کہ شاعری کا حوصلہ کرنا ھی بےکار سا ھوگیا تھا - ۱۸۳۷ میں اسے اپنی بیوی کی آبرو بچانے کے لئے ایک دیوئل * لڑنا پڑا' اور اسی میں وہ ایسا زخمی ھوا کہ چند روز بعد دنیا سے رخصت ھوگیا .

پشکن نے شروع شروع میں جو ترجمے کئے اور نظمیں لکھیں وہ بھی اپنے زمانے کے معیار کے مطابق بہت اعلیٰ تھیں' لیکن اس کی پہلی تصنیف جو اس وقت بھی قابل قدر سمجھی جاسکتی ھے اس کی داستان "روسلان اور لود ملا" ھے. کریلوف کی کہانیوں کے بعد یہ پہلی نظم تھی جس میں مروجہ طرز کے برخلاف انتہائی سادگی اختیار کی گئی تھی' اور ھر قسم کے تصنع اور رسمی اصطلاحوں اور استعاروں سے قطعی پرھیز کیا گیا تھا' اس لئے قدیم طرز کے پیرو اسے پڑھ کر بہت برھم ھوے . لیکن مخالفت اور اعتراضوں کے باوجود "روسلان اور لود ملا" نہایت مقبول ھوئی' اس کی اشاعت کے ساتھہ روسی شاعری میں ایک نیا طرز جاری ھوگیا اور پرانے

* یورپ میں پچھلی صدی تک شرفا کی یہ رسم تھی کہ جس معاملے کا وہ قانوناً تصفیہ نہ کرانا چاھیں اسے ایک دوسرے سے لڑکر طے کرلیں-ان لڑائیوں میں سے اکثر کا انجام ایک فریق کی موت ھوا کرتی تھی -

کلاسیکی شاعروں کی نقل کرنے کا قاعدہ بالکل ترک کردیا گیا۔ اس تاریخی اہمیت کے علاوہ "روسلان اور لود ملا" کی تعریف میں کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ ۱۸۲۸ع میں پشکن نے اصل نظم میں ایک تمہید کا اضافہ کردیا جس کا مقصد داستان کی طلسمی فضا کی ایک جھلک دکھانا ہے، اور وقت جو خاص خوبی نظم میں نظر آتی ہے وہ اسی مختصر سی تمہید کی وجہ سے ہے جلا وطنی کے زمانے میں پشکن انگریزی شاعر بائرن* کا گرویدہ رہا، اور اسی کے انداز میں ایک اور نظم "قفقازیہ کا قیدی" لکھی، جس میں ایک روسی قیدی کی سرد مہری اور ایک لڑکی کے اس پر عاشق ہوجانے اور اسے آزاد کرکے خود کشی کرلینے کا قصہ ہے۔ "قفقازیہ کے قیدی" کے علاوہ پشکن نے بہت سی مختصر نظموں میں بھی بائرن کی نقل کی، لیکن دونوں شاعروں کی سیرت اور ذہنی رجحان میں اتنا اختلاف تھا کہ پشکن پر بائرن کا رنگ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا، یہ اس کی نظم "نت"† میں صاف ظاہر ہوتا ہے، جو اس نے نظر بندی کے ابتدائی سالوں میں لکھی، اور جس میں اس نے روسی نفسیات پر پہلی مرتبہ بحث کی۔

"نت" کا ہیرو الے کو بائرن کے مشہور کیریکٹر چائلڈ ہیرالڈ سے کچھ سطحی مشابہت رکھتا ہے، لیکن در اصل وہ روسی زندگی کا ایک مظہر ہے جسے بائرن کی شاعری اور تخیل سے کوئی واسطہ نہیں مشہور ناول نویس دستہ ئف سکی کا خیال

---

* جورج گورڈن نوئل، لارڈ بائرن (۱۷۸۸-۱۸۲۴) بے باک من چلے پن کا ثنا خوان اور آزادی کا شیدائی۔ انیسویں صدی کے شروع میں صرف انگلستان میں نہیں بلکہ یورپ کے اکثر ملکوں میں اس کا بہت اثر تھا۔

† ایک خانہ بدوش قوم جسے انگریزی میں Gipsy کہتے ہیں۔ ابھی تک اس کا قطعی طور پر فیصلہ نہیں ہوسکا ہے کہ یہ کس نسل کے لوگ ہیں اور ان کا اصل وطن کہاں تھا۔

ہے* کہ الیکو اس سیرت اور مزاج کے لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جنھیں اس زمانے کی سوسائٹی کی ذہنی اور روحانی بیماری کی علامت سمجھنا چاہئے۔ تعلیم یافتہ روسیوں نے اس کے نزدیک یورپی طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات اختیار کرنے سے اپنے آپ کو قوم کے باقی طبقوں سے اور اپنی سر زمین سے بالکل بے تعلق اور بے گانہ کرلیا تھا۔ قانوں فطرت کی اس خلاف ورزی نے ایک قسم کی انسانی ہستی پیدا کردی "جسے کسی طرح چین نصیب نہیں ہوتا" جو کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوسکتی، جسے اپنی سر زمین اور اس کی قوتوں پر مطلق اعتبار نہیں ... جو اپنے ہم وطنوں سے محبت اور ہمدردی نہیں کرنا چاہتی۔ زندگی کے بنیادی اصولوں سے انکار اور ہم جنسوں سے بے تعلقی ایسی ہستیوں کو ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رکھتی ہے"۔ پشکن کی سب سے لمبی نظم اور اس کا ادبی کارنامہ، "یف گے نئی اون یے گن" اسی سیرت کو دوسری شکل اور دوسرے ماحول میں دکھاتی ہے، اور ان دونوں سیرتوں کی عمومیت کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ پشکن کے بعد جس کسی انشا پرداز نے تعلیم یافتہ روسیوں کا مثالی نمونہ پیش کرنا چاہا اس نے الیکو اور یف گے نئی اون یے گن کی بہت سی خصوصیات اپنے ہیرو کی سیرت میں شامل کیں۔

"نت" کا قصہ یہ ہے کہ ایک روسی الیکو اپنے دیس اور دیسی زندگی سے بیزار ہوکر نٹوں کے ایک قبیلے کے ساتھ ہو لیتا ہے اور ایک نٹنی زمفیرا سے اس کے عاشقانہ تعلقات ہوجاتے ہیں۔ دو ڈھائی سال بعد زمفیرا کی طبیعت اس کی صحبت

---

* دستہ ٹف سکی نے ۱۸۸۰ میں پشکن پر ایک تقریر کی جو پشکن کے تخیل کی بہترین تشریح ہے اور جس نے قوم کی نظروں میں شاعر کی عظمت بہت بڑھادی۔ دستہ ٹف سکی "سلاف دوست" تھا اور یورپ کی تقلید کا سخت مخالف، لیکن اس کی تشریح میں کوئی مبالغہ نہیں معلوم ہوتا اور اس کی رائے ان نقادوں سے یقیناً زیادہ مستند ہے جو پشکن کو بائرن کا نقال قرار دیتے ہیں۔

اورمحبت سے سیر ہو جاتی ہے ' اور نٹوں کی آزاد رسم کے مطابق وہ کسی اور شخص سے آشنائی کر لیتی ہے . روسی اس کی سرد مہری محسوس کرتا ہے ' اور ایک مرتبہ رات کو زمفیرا اور اس کے آشنا کو یکجا پا کر دونوں کو مار ڈالتا ہے. اس جرم کی سزا میں نٹ اسے اپنے قبیلے سے نکال دیتے ہیں . نظم کی خوبی داستان میں نہیں ' بلکہ من موجی روسی اور سادہ لوح نٹوں کی سیرت اور ذہنی خصوصیات کے موازنے میں ہے - روسی نے شہر اور شہری طرز معاشرت سے بیزار ہو کر نٹوں کی سادہ زندگی میں پناہ لی ہے . اپنی معشوقہ کے سوال پر وہ شہری زندگی کی یوں شکایت کرتا ہے :

" وہاں لوگ ذراسی جگہ میں بھچ بھچ کر رہتے ہیں "
صبح کی ٹھنڈی ہوا ان کے آنگنوں تک نہیں پہنچتی '
نہ بہار کے موسم میں سبزہ زار کی خوشبوئیں .
وہ محبت سے شرماتے ہیں ' دل کی امنگوں کو ابھر نے نہیں دیتے '
اپنی آزادی دوسروں کے ہاتھہ بیچتے ہیں '
مورتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں '
اور روپیے کے لالچ میں غلامی کی زنجیریں پہنتے ہیں .
شہر چھوڑ کر میں نے کیا کھویا ؟ دغابازی کی تکلیفیں '
تعصب کے فیصلے ' عوام کی ایذا رسانی
اور بھڑک دار عیب !

اب وہ روسی نٹوں کی صحبت میں رہنے لگا . جہاں بظاہر اسے ہر طرح کا سکون تھا ؛

وہ سویرے اٹھہ کر اپنا دن
خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتا '

لور زندگی کے ھنگامے
اس کی آسودگی میں خلل انداز نہیں ھوتے تھے .
صرف کبھی کبھی شہرت کا افسوں گر ستارہ
اسے دور سے لبھاتا تھا . . .
مگر خدا کی پناہ ! ، نفسانی جذبات
اس کے بے بس دل کے ساتھ کس طرح کھیلتے تھے ،
اور اس کے مصیبت زدہ سینے میں
کس زور شور سے ابل اٹھتے تھے !

اس حالت میں زمفیرا کی محبت اس کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی، لیکن جب اسے معلوم ھوا کہ اس عورت کی طبیعت اس سے ھٹ گئی ھے اور وہ دوسرے آھنا کی تلاش میں ھے تو بجائے اور نٹوں کی طرح مسکرا کر سر جھکا لینے کے وہ اپنے رقیب کو جان سے مارنے پر تل گیا . زمفیرا کے بوڑھے باپ کی دلیلیں کہ

جواں دل پرندوں سے بھی زیادہ خود سر ھو تے ھیں ،
ان کو قابو میں رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں ؛
مسرت باری باری سے ھر ایک کو ملتی ھے ،
مگر جو کچھہ ھو چکا وہ پھر سے ھونے والا نہیں ،

روسی کی سمجھہ میں نہیں آتی ھیں . وہ جواب دیتا ھے :

نہیں ، میں ایسا نہیں ھوں ، میں بغیر لڑے ھوئے
اپنے حق کو ھر گز نہ چھوڑوں گا ،
یا کم از کم بدلہ لے کر اپنے جی کو خوش کر لوں گا .
نہیں ، اگر میں سمندر کے کنارے ، کسی اونچے چٹان پر
اپنے دشمن کو سوتا پاؤں ،

تو قسم کھاتا ہوں . . . بغیر کسی افسوس یا تامل کے اس ظالم کو
لات مار کر سمندر کی موجوں میں پھینک دوں.
اس کی اچانک بیداری اور خوف کے لرزے کا
ایک خونخوارانہ قہقہے سے جواب دوں '
اور بہت دنوں تک اس کے گر نے کی آواز
یاد کر کے ہنسوں اور خوش ہوں .

ایسی طبیعت ظاہر ہے کسی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی . شہروں سے وہ خود بھاگتی ہے ' سادہ لوح انسان اسے اپنی صحبت کے لئے موزوں نہیں پاتے . زمفیرا کا بوڑھا باپ آخر کار اپنے کو سے کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ .

ہمارا ساتھ چھوڑ دے ' اے مغرور آدمی !
ہم وحشی ہیں ' ہمارے لئے کوئی قانون نہیں '
ہم نہ جرم کرتے ہیں نہ سزا دیتے ہیں '
ہم کو خون اور آہ زاری کی حاجت نہیں ؛
مگر ہم قاتل کے ساتھ رہنا نہیں پسند کرتے .
تو آزاد زندگی کے لئے نہیں پیدا ہوا '
تو صرف اپنی مرضی پر چلنا چاہتا ہے . . .
ہمارے دل مضبوط نہیں ' مگر ہم دل کے اچھے ہیں '
تو بہ طینت اور بے باک ہے —
ہمارا ساتھ چھوڑ دے .

وحشیوں کی سماج سے روسی اس شان سے نکالا گیا ' مہذب شہری زندگی میں اس کی بے چینی اور وحشت زدہ طبیعت جو رنگ لاتی ہے اسے پشکن نے اپنے ناول " یف کے نئی لوئن بے گن " میں دکھایا ہے .

یف کے نئی اون یے گن ' داستان کا ہیرو پیتر برک میں پیدا ہوا . اس
کا باپ ایک اعلیٰ عہدے پر نوکر تھا ' اور صاحب جائداد بھی ' مگر ایسا
فضول خرچ کہ اس کی بسر اوقات قرضے پر ہوتی تھی ' اور آخر کار
دعوتیں دیتے دیتے اس کا دیوالہ نکل گیا : لیکل اون یے گن پر مہربان تھی .
پہلے اس کے لئے ایک فرانسیسی کھلائی رکھی گئی اور اس کے بعد ایک فرانسیسی استاد' جو.

اس خیال سے کہ بچہ پریشان نہ ہو
ہر چیز اسے کھیل کھیل میں پڑھاتا تھا '
سخت اخلاقی تعلیم سے اسے آزردہ نہ کرتا '
شرارت کی سزا میں ذرا جھڑک دیتا
اور بڑے پارک میں ٹہلانے لے جاتا .

اون یے گن جب سولہ سترہ برس کا ہوا تو فرانسیسی استاد نکال باہر کیا گیا ' اور
لیجئے میرا اون یے گن آزاد ہو گیا .
جدید ترین طرز پر بال کٹائے ہوئے '
لندن کے چھیلوں کی طرح بنا ٹھنا
وہ دنیا دیکھنے نکلا .

اس کی تعلیم معمولی ہوئی تھی ' علمی استعداد کم تھی . لیکن
وہ بے تکلفی سے فرانسیسی
بولتا اور لکھتا تھا '
مزرکا * بڑی نزاکت سے ناچتا '
اور لوگوں سے اخلاق سے ملتا جلتا تھا .

---

* ایک خاص قسم کا اجتماعی ناچ جو اس زمانے میں بہت موقوف تھا

اس سے زیادہ چاہئے کیا ؟ سوسائٹی نے طے کیا
کہ وہ بڑا قابل ہے اور بہت ہی پیارا

سوسائٹی کی عام رائے کے باوجود پشکن بتا دیتا ہے کہ اس کا ہیرو نظم کی بحروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا ' اور روسی مصنفوں کو گالیاں دیتا تھا ۔ عالم معاشیات سمجھے جانے کے سوا اسے اور کوئی علمی حوصلہ نہ تھا ' اور یہ بھی محض اس وجہ سے کہ ان دنوں روس میں ایڈم سمتھ * کا بہت بڑا چرچا تھا ۔ اون یے گن کی اس بے پروائی کا اصل سبب یہ تھا کہ اس نے ایک فن میں کمال حاصل کیا تھا جس کے مقابلے میں اور سب کچھ ہیچ ہے ۔

ہم کو جنسی جذبات شروع ہی سے پریشان کرتے ہیں '
اور جیسا کہ شتوب ریاں † نے لکھا ہے ؛
ہم کو عشق کا پہلا سبق فطرت نہیں پڑھاتی
بلکہ پہلا گندا ناول ۔
ہم زندگی کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں
اور ناول ہمیں سب کچھ بتا دیتے ہیں ۔
یوں عمر گزر تی جاتی ہے اور ہم
اس سے کوئی لطف نہیں اٹھانے پاتے ۔
ایک دلفریب تجربے کو قبل از وقت حاصل کر کے
ہم اپنی زندگی بے مزا کر دیتے ہیں '
مسرت ہماری نظروں سے چھپ جاتی ہے ' اور اسی کے ہمراہ
جوانی کا جوش بھی غائب ہو جاتا ہے ۔

---

* انگریز ماہر معاشیات (۱۷۲۳ - ۱۷۹۰)
† فرانسیسی انشاپرداز (۱۷۶۸ - ۱۸۴۸)

اون یے گن پر بھی یہی گذرا ' لیکن اس کے عوض میں
اس نے نسوانی فطرت کو بھی کیا خوب سمجھ لیا !

اس نے مکر اور حسد اور دھوکا بازی ' روٹھنا ' بگڑنا ' افسردہ اور بیمار بننا سیکھا ' دلبری کی راہ و رسم میں انتہائی مہارت حاصل کی ' اور اپنا شکار پھانسنے میں مشاق ہو گیا ' اوباشی نے اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں ڈالا ' اس کے پاس ہر طرف سے دعوت نامے آتے تھے ' اور دو پہر سے جب وہ سو کر اٹھتا ' تیں چار بجے صبح تک ' جب وہ ناچ سے تھک کر اپنے گھر واپس جاتا ' اس کا سارا وقت کپڑے بدلنے اور ایک میزبان کے یہاں سے دوسرے کے یہاں جانے میں صرف ہوتا . درمیان میں ' رات کے آٹھ نو بجے کے قریب ' وہ کبھی کبھی تھیٹر چلا جاتا ' لیکن شاعر افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ فنون لطیفہ سے محظوظ ہونے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ تھی

ایسی زندگی کی ظاہری چمک دمک سے اون یے گن کی طبیعت بہت جلد اکتا گئی حسن پرستی اور عیاشی اور معصوم دلوں کا ور غلانا بھی ایک بے لذت شغل ہو گیا اون یے گن کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے لگا ' کچھ دن کتابوں کے مطالعے میں گذارے ' اور پھر وہ بھی چھوڑ دیا . زندہ مردوں اور عورتوں سے بیزاری ' اور جدید اور قدیم تخیل سے بے تعلقی نے اس کی طبیعت افسردہ اور اس کی زبان زہریلی کر دی ' اور یہی دو کیفیتیں اس کے احساسات کا کل سرمایہ رہ گئیں . اور لوگوں کی حالت بھی کبھی کبھی ایسی ہی ہو جاتی ہے ؛ مگر تمام عمر کی مایوسی کے بعد یا کسی سخت صدمے سے - اون یے گن کی عمر ابھی صرف بیس سال کی تھی ' اور قسمت نے اسے ہر صدمے سے محفوظ رکھا تھا . یہ کیفیتیں اس کی فطرت کا ایک پہلو تھیں اور اس کی تربیت اور طرز معاشرت کا ایک لازمی نتیجہ .

اسی دوران میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ' اور قرضداروں کا اس کے گھر ہجوم ہونے لگا . اُن سے پیچھا چھڑانے کو اون یے گن نے اپنی آبائی جائداد ان کے نذر کردی . خوش قسمتی سے انہیں دنوں اسے یہ خبر ملی کہ اس کا چچا بستر مرگ پر ہے اور بھتیجے سے ملنے کا بہت مشتاق ' کیونکہ اس نے بھتیجے کو اپنا وارث بنایا ہے . اون یے گن شہری زندگی سے ویسے بھی اکتا گیا تھا ' اور اس امید میں کہ شاید دیہات زیادہ دلچسپ ثابت ہو فوراً اپنے چچا کے گاؤں کو روانہ ہو گیا . وہاں پہنچا تو چچا کا دم نکل چکا تھا ' اور لوگ اسے دفن کرنے کا انتظام کر رہے تھے تجہیز و تکفین میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے انہوں نے حسب قاعدہ ہمدردی ظاہر کی ' خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اون یے گن کو اس کی ملکیت سپرد کر کے چلدئے .

دو تین دن اسے ہر چیز نئی معلوم ہوئی '
سنسان کھیت ' اندھیرے کنجوں کی خنکی '
چشمے کے بہنے کی آواز :
تیسرے دن کنج اور پہاڑی اور میدان سے
اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی .
پھر اس نے دن رات اونگھنا شروع کیا '
اور اس پر صاف صاف ظاہر ہو گیا
کہ شہر کی طرح گاؤں میں بھی جی گھبراتا ہے '
اگر چہ وہاں نہ سڑکیں ہیں نہ عالی شان عمارتیں
نہ ناچ ' نہ تاش ' نہ شعر و شاعری
افسردہ گی نے اسے آ گھیرا '
ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگی '

جیسے پرچھائیں یا وفادار بیوی ۔

پہلے پہل ہمسائے اس سے ملنے آیا کرتے تھے ' لیکن چونکہ ان کے چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی اون یے گن پچھواڑے سے گھوڑے پر بیٹھ کر غائب ہو جاتا تھا ' سب اس سے خفا ہو گئے اور آمد و رفت بند کر دی ۔

ہمارا ہمسایہ جاہل ہے ' خبطی ہے '

وہ فرانسٹن ہے ایک ' گھونٹ میں

لال شراب کا پورا گلاس پی جاتا ہے ؛ *

وہ عورتوں کا لحاظ نہیں کرتا '

ہمیشہ " ہاں " کہتا ہے اور " نہیں " ' نہ " جی ہاں "

نہ " جی نہیں " ۔ یہ عام رائے تھی '

انہیں ہمسایوں میں ایک نوجوان لن سکی بھی تھا ۔ طبیعت اور مزاج میں وہ اون یے گن سے اسی قدر مختلف تھا جیسے پانی سے آگ ' چونکہ دونوں باقی تمام ہمسایوں سے بہت گھبراتے تھے اور ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے علمی اور ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے اس لئے دونوں میں خاص دوستی ہو گئی ۔ لن سکی شاعرانہ مزاج کا لڑکا تھا ' جسے دنیا میں ابھی تک کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا تھا ۔ اسے محبت اور عشق کے خواب نظر آتے تھے ' " زندگی کے مقصد کو ایک دلفریب معمہ سمجھ کر وہ اسے حل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا " ' حالانکہ اس کے دوست اون یے گن نے بہت پہلے سے قطعی طور پر معلوم کر لیا تھا کہ زندگی میں کوفت اور بد مزگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ لیکن اون یے گن کو اپنے نئے دوست کو قائل

---

* لال شراب چونکہ میٹھی اور قیمتی ہوتی ہے اس لئے لوگ عموماً اسے مزہ لے لے کر اور آہستہ آہستہ پیتے ہیں

کر نے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی اور نہ اس کے سامنے زہر اگلنے کی ' اس وجہ سے کچھ عرصے تک دونوں میں خوب نبھی .

لن سکی نے اون یے گن کا لارن نامی ایک خاندان سے تعارف کرایا اس خاندان میں ماں اور دو بیٹیاں تھیں ' جن میں سے چھوٹی لڑکی اولگا کی لن سکی سے منگنی ہوچکی تھی اولگا میں صورت اور سیرت کی تمام خوبیاں تھیں ' " لیکن " ' شاعر کہتا ہے '

"کوئی فاول اٹھا کر دیکھ لیجئے '

اس میں آپ کو اولگا کی تصویر مل جائے گئی .

وہ بہت پیاری ہے ; مجھے بھی کسی زمانے میں وہ پسند آئی تھی '

مگر اب میں اس سے بہت گھبرا گیا ہوں " .

اولگا کی بڑی بہن تت یانا میں نہ اس کا جیسا حسن تھا نہ اس کی سی شگفتگی ' نہ اور کوئی نمایاں اوصاف جو لوگوں کو متوجہ کرسکیں . وحشت زدہ ' مغموم ' خاموش ' وہ اپنے گھر میں بیگانی معلوم ہوتی تھی ' نہ ماں باپ سے محبت کا اظہار کرتی ' نہ بچوں کے کھیل کود میں شریک ہوتی . اپنے تصورات میں محو رہنا اس کا سب سے عزیز شغل تھا ' اور اکثر وہ پورے دن کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیتی تھی . ناولوں کا اسے بہت شوق تھا اور اس نے بچپن ہی میں ماں کے تمام فاول چرا چرا کر پڑھ ڈالے تھے . دیہاتی زندگی اور فضا نے اس کی طبیعت میں ایک عجیب بے چینی پیدا کردی تھی ' اسے ہر وقت ایک لطیفہ غیبی کا انتظار رہتا تھا۔ اون یے گن سے ملاقات ہوئی تو تت یانا کو یقین ہو گیا کہ اس کے سارے خوابوں کی تعبیر ' اس کے تمام حوصلوں کی بارآوری ' اسی شخص کا آنا ہے ' کیونکہ اون یے گن اسے ان تمام خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوا جن سے اس نے اپنے خیالی دوست کی ہستی کو

آراستہ کیا تھا . تت یانا کے جذبات پاک اور معصوم تھے ' اور اسی سبب سے زیادہ قوی . محبت کے جوش نے اسے بالکل بے بس کر دیا ' دو چار روز میں اس کا رنگ پیلا پڑ گیا ' نہ رات کو نیند آتی نہ دن کو چین ملتا .

اس کا محبت کرنا کوئی مذاق نہ تھا '
اس نے ایک ناتجربہ کار بچے کی طرح
اپنے آپ کو بالکل جذبات کے حوالے کر دیا .
اس نے یہ نہ سوچا کہ " ابھی ذرا ضبط سے کام لوں —
اس سے محبت کی قیمت بڑھ جائے گی '
اور شکار کا پھنسنا یقینی ہوجائے گا .
پہلے امید دلا کر نہال کروں '
پھر خفا ہو کر دکھہ پہنچاؤں
اور اس کے سینے میں رشک اور حسد کی آگ بھڑکاؤں
ورنہ مطلب حاصل کر کے اس کا جی بھر جائے گا
اور چالاک قیدی زنجیریں تڑاکر
بھاگنے کو ہر وقت بیٹھا رہے گا . "

آخر کار تت یانا سے صبر نہ ہوسکا ' اور اس نے اُن سے یے گن کو خط لکھہ کر اپنی محبت کی داستان سنائی . اون یے گن نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا . چند روز بعد جب تت یانا چھپ کر اس سے ملنے جا رہی تھی اور اتفاق سے باغ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی تو اون یے گن نے اسے ایک لمبا چوڑا لکچر سنایا ' اپنی مجبوری ظاہر کی اور تت یانا کو اس کی حماقت سے آگاہ کیا . آخر میں اس نے تت یانا کو یقین دلایا کہ " اگر گھریلو زندگی میری قسمت میں لکھی ہوتی تو میں آپ کے سوا کسی سے

شادی نہ کرتا،

مگر میں ان مسرتوں کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں،

ان سے میری روح بیگانہ ہے۔

آپ کا میرے ساتھ رہنا گویا اپنے حسن و جمال کو ضائع کرنا ہے،

کیوں کہ میں اس کی قدر نہیں کرسکتا۔

یقین جانئے (میرا ضمیر گواہ ہے)

ازدواجی زندگی ہمارے لئے عذاب جان ہو جائے گی۔

مجھے آپ سے چاہے جتنی محبت ہو،

آپ کی صحبت کا عادی ہوا تو وہ جاتی رہے گی،

آپ روئیں گی اور آپ کے آنسو

میرے دل پر کوئی اثر نہ کرسکیں گے۔

بلکہ اس کی وحشت کو اور بڑھا دیں گے۔

آپ خود فیصلہ کیجئے۔ شادی کرکے ہم کیسی مصیبت میں پڑجائیں گے،

اور ممکن ہے برسوں اس سے پیچھا نہ چھٹے۔"

اون یے گن نے اس ملاقات کے بعد تت یانا کے یہاں آمد و رفت بند کردی،

اور گرمی اور جاڑا گھر بیٹھے بیٹھے کاٹ دیا۔ لیکن تت یانا کی سالگرہ

کے دن لن سکی اسے پھر تت یانا کے گھر پکڑلے گیا، اور اتفاق سے کھانے

کے وقت دونوں آمنے سامنے بٹھا دئے گئے۔ تت یانا کی بے چینی اور اس

کا مصیبت زدہ چہرہ دیکھ کر اون یے گن کو دعوت میں شریک ہونے

کا سخت افسوس ہوا۔ اسے تت یانا کے گھر بلانے کا ذمہ دار لن سکی تھا

اور اس نے لن سکی سے بدلہ لینے کا پکا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ کھانے کے بعد

وہ ہر مرتبہ لن سکی کی منگیتر اولگا کے ساتھ ناچتا رہا لن سکی کو

اس کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ لن سکی نے یہ شرارت دیکھ کر اپنے دل میں یہ طے کیا کہ پستول کے سوا ان دونوں میں کوئی چیز فیصلہ نہیں کرسکتی، اور ڈیوئل لڑنے کا تہیہ کرکے اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن اس نے اون یے گن کے پاس ڈیوئل لڑنے کا چیلنج بھیج دیا۔ اون یے گن رات کی سرگذشت بھول گیا تھا، اور لن سکی سے اب اسے کوئی شکایت بھی نہیں تھی، لیکن اس نے چیلنج منظور کرلیا اور مفاہمت کی ذرا بھی خواہش نہیں ظاہر کی۔ ڈیوئل جس دن کے لئے مقرر ہوا تھا وہ معصوموں کی نیند سوکر بستر سے اٹھتے ہی معینہ مقام پر بھاگا ہوا گیا، جہاں لن سکی کچھ دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈیوئل میں لن سکی کے سینے پر گولی لگی اور وہ وہیں گر کر مرگیا۔ اسے مار کر اون یے گن نہایت درجہ سکون قلب کے ساتھ مکان واپس آیا، اور کچھ روز بعد یورپ کی سیر کے لئے روانہ ہوگیا۔

لن سکی کے قتل کی خبر سن کر تت یانا کے گھر میں ماتم برپا ہوگیا لیکن یہ غم صرف چند روزہ تھا، اولگا سے ایک فوجی افسر نے شادی کرلی اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ اگر یہ حادثہ کسی پر گراں گذرا تو تت یانا پر، جو اپنے رنج میں گھٹتی رہی۔ اس کے جذبات کے خلوص اور شدت نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ اولگا کی طرح کسی اور سے شادی کرلے اور جو کچھ ہوا تھا اسے بھول جائے۔ وہ شادی کرنے سے قطعی انکار کرتی رہی، یہاں تک کہ اس کی ماں بہت پریشان ہوگئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اگر تت یانا ماسکو جائے تو شاید اسے اپنی پسند کا شوہر مل جائے، اور تت یانا کی ماں اس کو اسی غرض سے ماسکو لے گئی۔ ماسکو جاکر تت یانا نے اپنی رائے نہیں بدلی، نہ اون یے گن کی محبت کو اپنے

دل سے نکالا۔ مگر ماں اور تمام عزیزوں کے اصرار پر اس نے ایک امیر جنرل سے نکاح کرلیا۔ اس کی شادی کے دو سال بعد اون یے گن یورپ سے واپس آیا اور پیٹر برگ کی کسی محفل میں تت یانا کو اس نئے رنگ میں دیکھا۔ صورت سے زیادہ اسے تت یانا کی سیرت کے تغیر پر حیرت ہوئی۔ وہی لڑکی جو جذبات کی شدت سے بے بس ہوجایا کرتی تھی اب ایک معزز خاتون تھی جسے اپنی طبیعت اور زبان اور چہرے پر پورا قابو تھا، جس کا چھوٹے بڑے سب لحاظ کرتے تھے، اور جسے اپنے وقار کو قائم رکھنے کا راز معلوم تھا۔ تت یانا سے جب اون یے گن کا تعارف کرایا گیا تو تت یانا اپنی محبت کو، جو ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی، کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اون یے گن سے یوں مخاطب ہوئی گویا دونوں کی پہلی مرتبہ ملاقات ہورہی ہے۔ اون یے گن اس کی شان و شوکت سے بہت مرعوب ہوا، اور اسے اس شہرت پر بہت رشک آیا جو دراصل تت یانا کی سادگی اور خلوص کا ایک ادنیٰ معاوضہ تھی۔ اس نے تت یانا سے پرانے تعلقات دوبارہ قائم کرنے چاہے کئی خط لکھے جن کا کوئی جواب نہیں ملا، ملاقات کی، مگر مطلب کی باتیں نہیں کرسکا۔ اسی اثناء میں وہ بیمار پڑگیا، اور آخر کار ایک روز وہ بستر علالت سے اٹھ کر سویرے تت یانا کے محل پر اپنی قسمت کا قطعی فیصلہ کرانے کے ارادہ سے گیا۔ خادموں نے اسے سیدھا تت یانا کے کمرے میں پہنچا دیا، اور اس نے دیکھا کہ تت یانا بیٹھی رو رہی ہے۔ اون یے گن اس کے پیروں پر گر پڑا، لیکن تت یانا نے اسے صاف صاف سمجھا دیا کہ اسے یہ نیا انداز ناگوار معلوم ہوتا ہے اور اپنی بے رخی کی وجہ بھی بتا دی:

کیا یہ غلط ہے کہ اُن دنوں، اس ویرانے میں

جہاں ہماری محبت کا چرچا کرنے والے نہ تھے ،
میں تمھیں نہیں پسند آئی ؟ ... اب کیا ہوا
جو تم میرا پیچھا کئے ہو ؟ ... اس کا سبب بس یہ ہے
کہ میں رئیسانہ مجلسوں میں شریک ہوتی ہوں ،
میں امیر اور مشہور ہوں ، ... اب میری بد نامی کی خبر
ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جائے گی ،
اور ممکن ہے سوسائٹی میں تمہارے مذاق کے لوگ
اس کارنامے کی وجہ سے تم پر رشک کرنے لگیں ...
لیکن میں اسی وقت بڑی خوشی سے
اس مہمل زندگی کی نمائش ، شور و غل اور دھوئیں کو
کتابوں کی ایک الماری ، ایک خود رو باغ ،
اپنے اجڑے آبائی مکان
یا اس مقام کے بدلے چھوڑنے پر تیار ہوں
جہاں ، اون یے گن ، تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ،
اس حقیر قبرستان کے بدلے
جہاں میری بوڑھی کھلائی کی قبر پر
ایک صلیب گڑی ہے اور درختوں کا سایہ ہے ...
اب میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ...
میں نے شادی کرلی ہے . تم کو چاہئے
کہ ... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو .
میں باتیں نہیں بناتی ; مجھے تم سے محبت ہے
لیکن میں دوسرے کی بیوی ہوں

اور ہمیشہ وفادار رہوں گی۔

تت یانا یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور اون یے گن کے ابھی تک حواس درست نہیں ہوئے تھے کہ اسے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور تت یانا کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ پشکن نے اپنی داستان اسی نازک موقع پر ختم کردی ہے۔

خوش قسمت ہے وہ جو دنیا کے دستر خوان سے
جلد اٹھ گیا؛ جس نے زندگی کی شراب سے لبریز پیالے کو
بالکل خالی نہیں کردیا؛
جس نے زندگی کا فسانہ آخر تک نہیں سنا
بلکہ دفعتاً اٹھا اور رخصت ہو گیا
جیسے میں اپنے اون یے گن سے

پشکن کا ظرافت آمیز طرز بیان پڑھنے والے کو محسوس نہیں ہونے دیتا کہ "یف گے نئی اون یے گن" کی داستان کس قدر درد ناک ہے اور اس کا انجام کتنا عبرت انگیز۔ اس کی بھی شاعر خاص طور سے کوشش کرتا ہے کہ اس کا رنج یا غصہ یا تعصب کوئی مصنوعی فضا نہ پیدا کردے جس میں نظم کے اشخاص اصل سے ذرا بھی مختلف نظر آئیں، اور وہ اپنے ذاتی احساسات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ نکتہ سنج قدر داں ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اسے اپنے ہیرو کی گمراہی پر کتنا افسوس ہے اور اپنی ہیروئن کی سرگذشت پر وہ کیسے گرم آنسو بہاتا ہے۔ لیکن اس ضبط کے باوجود بھی "یف گے نئی اون یے گن" کی داستان روسی قوم کا نوحہ کہلاتی ہے، اور بصیرت افروز حقیقت نگاری کا روسی ادب میں پہلا نمونہ۔ اون یے گن اور تت یانا کا قصہ کوئی اتفاقی مظہر نہیں۔ یہ دونوں

تعلیم یافتہ روسیوں کے مثالی نمونے ہیں' اور ان پر جو کچھ گذرا وہ نوجوان روسیوں کے عام تجربے کی ایک شکل ہے . اون یے گن نے جو تربیت پائی' اس نے جو "کمالات" حاصل کئے' اور اس کی سیرت نے جو رنگ اختیار کیا وہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں تھا بلکہ ایک وبا کا اثر جس سے کوئی روسی نوجوان بالکل محفوظ نہ رہا ہوگا . اور اون یے گن کی نسبت پیٹر برگ کے شرفا کی عام رائے کہ "وہ بڑا قابل ہے اور بہت ہی پیارا" مروجہ فلسفۂ حیات پر مبنی تھی اور کوئی جانب دارانہ فیصلہ نہیں کہی جا سکتی . پشکن نے محسوس کیا کہ ماحول کے اثرات سے ایک خاص ذہنیت اور مزاج کے لوگ پیدا ہورہے ہیں' اور ایک ایسے شخص کی تصویر بناکر جس میں یہ نیا رنگ بہت نمایاں تھا اس نے قوم کو اس مظہر کی خطرناک اصلیت سے آگاہ کر دیا . اون یے گن کے مقابلے میں تت یانا کی سیرت دکھاکر اس نے اپنا مطلب اور بھی واضح اور عبرت آموز کر دیا . تت یانا نے ناول تو پڑھے ہیں اور ان کے پڑھنے سے کسی قدر جذبات پسند بھی ہوگئی ہے' لیکن اسے اپنے قومی آئیں اور طرز معاشرت سے بہت لگاؤ ہے' اپنی خود داری کا بہت پاس ہے' اور جیسا کہ نظم کے انجام سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے اصولوں پر ذاتی مسرت اور آرزوئیں نثار کرنے کی ہمت رکھتی ہے - اون یے گن کی سیرت میں بہت سی خرابیاں' اس کی نیک نامی پر بہت سے داغ ہیں' لیکن تت یانا جیسی لڑکی کے جو ہر نہ پہچان سکنا ایسی کم ظرفی اور بدشوقی کی دلیل ہے جو نہ شاعر معاف کرسکتا ہے نہ داستان کے ناظرین - اور پشکن کا گلہ یہی ہے کہ روس میں اون یے گن جیسے ہزارہا نوجوان ہیں' اور تت یانا جیسی ہزارہا لڑکیاں جو اپنے اپنے طور پر نسوانی سیرت کی اعلیٰ مثالیں ہیں' مگر

بے قدری ان کے حسن پر پردہ ڈالے ہوے ہیں۔

اون یے گن اور تت یا نا کا قصہ داستان کا مرکز ہے ' لیکن قصہ سنانے کی پابندی سے پشکن کا موضوع یا اس کی نظر محدود نہیں ہو جاتی۔ دارالسلطنت کی زندگی ' اعلیٰ سوسائٹی کی شخصیتیں ' اور صورت ' مزاج اور مذاق کے وہ عجوبے جو اس طبقے میں کثرت سے پاے جاتے ہیں نہایت دلچسپ طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔ مگر پشکن کی مصوری کا کمال روس کی دیہاتی فضا اور مختلف موسموں کے مناظر اور کیفیتوں کے بیان میں نظر آتا ہے۔ روسی بچے اب تک پشکن ہی کے اشعار پڑھ کر دیہاتی زندگی کو شاعرانہ نظروں سے دیکھنا اور اس سے پورا لطف اُٹھانا سیکھتے ہیں اور یہی ان کے واسطے وطن پرستی کا پہلا سبق ہوتا ہے۔ اون یے گن اور تت یا نا کی داستان کا دیہاتی پس منظر اس کی تاثیر کو اور بھی بڑھا دیتا ہے ' اور پڑھنے والے کے ذہن میں روسی معاشرت اور سر زمین کا ایک خاص مفہوم قائم کر دیتا ہے۔ پشکن کے زمانے تک ایسا کوئی مفہوم نہیں تھا ' اور پشکن نے اسے جس شکل میں اور جس انداز سے پیش کیا وہ آئندہ نسلوں کے لئے صرف بصیرت افروز نہیں بلکہ ہمت افزا اور تسلی بخش بھی ثابت ہوا۔

" یف گے نئی اون یے گن " کی تصنیف میں نو سال صرف ہوئے۔ اس عرصے میں پشکن نے اور بھی نظمیں اور ڈراما کے طرز پر داستانیں بھی لکھیں۔ " نخچی سرائے کا فوارہ " ایک تاتار سردار کے حرم کا قصہ ہے جہاں ایک بیوی دوسری کو مار ڈالتی ہے اور جرم کی سزا پاتی ہے۔ " پولتاوا " میں پیتر اعظم اور سویڈن کے بادشاہ چارلز دوازدہم کی مشہور جنگ بیان کی گئی ہے ' اور اسی کی آڑ میں آزادی اور قوم پرستی

کی مدح سرائی بھی کی گئی ہے، کیوں کہ چارلز دوازدہم کے ساتھیوں میں چند ایسے سردار بھی تھے جو اپنے وطن کو پیتر اعظم کے قبضے سے چھڑانے کے لئے لڑ رہے تھے۔ "کنجوس امیر"۔ "موتسارت اور سالیری" اور "پتھر کی مورت" طرز کے اعتبار سے تو دراسے ہیں، لیکن ان کی اصل خوبی مثنوی کی ہے۔ اور پشکن کا مقصد بھی شاعری تھا، اس لئے انہیں نظمیں ہی سمجھنا چاہئے۔ "موتسارت اور سالیری" کا موضوع حسد ہے، اور اس ڈراما میں سالیری، موسیقی کا ایک استاد جو "زور بازو" سے اپنے فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کامیاب نہیں ہوتا، موتسارت کو زہر دیدیتا ہے، کیوں کہ موتسارت کو اپنی حیرت انگیز خلقی استعداد کی وجہ سے مہارت اور شہرت دونوں بن مانگے مل گئی ہیں۔* "پتھر کی مورت" میں ہسپانیہ کے ایک نامی نسوانی دلوں کے رھزن دون جو آن کی سرگذشت کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور روسی نقادوں کا دعوی ہے کہ دون جو آن کی سیرت اس سے بہتر کہیں نہیں پیش کی گئی ہے † لیکن شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے "یف گے نئی اون یے گن" کے بعد ان کہانیوں کا درجہ آتا ہے جو پشکن نے نظر بندی کے زمانے میں اپنی بوڑھی کھلائی کی زبانی سنیں اور عوام کے طرز پر نظم کیں۔ پشکن کا

---

* وولف گانگ امادے تس موتسارت (۱۷۵۶ - ۱۷۹۱) یورپ کے سب سے ممتاز موسیقی کے ماہروں میں سے تھا۔ اس کی موت طبعی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ کسی نے اسے زہر دیدیا ہے۔

† دون جو آن کی شخصیت مختلف شکلوں میں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں ملتی ہے۔ انگریزی شاعر بائرن نے بھی "دون جوآن" کے عنوان سے اس کے متعلق ایک نظم لکھی ہے۔

کانو کانو چرچا ہوا تو اس کی اعلیٰ ادبی تصانیف سے کہیں زیادہ ان کہانیوں کی وجہ سے، اور اس وقت تک "زار سلطان" "دولھا" "پادری اور اس کا نوکر بادا" "مچھلی اور ماھی گیر" اور سنہرا مرغا" اسی قدر مقبول ھیں جتنی وہ پشکن کے زمانے میں تھیں۔

"یف گے نئی اون یے گن" کی تصنیف کے بعد بھی پشکن نظم میں داستانیں لکھتا رہا۔ ان میں سے بہترین، "تانبے کا سوار" پیتر برگ کے ایک باشندے کا قصہ ھے جس کی معشوقہ کا مکان دریاے نے وا کے ایک سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود ڈوب کر مر گئی۔ اس شخص کا صدمے سے دماغ پھر گیا، اور اس کے مجنونانہ تخیل پر پیتر اعظم کی مورت کے رعب اور پیتر برگ کی فضا کا جو اثر ہوتا ھے وہ پشکن نے اس طرح سے بیان کیا ھے کہ پیتر اعظم ایک جادو گر معلوم ھونے لگتا ھے اور پیتر برگ ایک طلسمی شہر۔ پیتر اعظم کا بنایا ہوا شہر روس کے اور شہروں سے اتنا ھی مختلف، اور ملک کے لحاظ سے اتنا ھی ناموزوں تھا جتنے وہ روسی اپنی قوم سے جدا اور بیگانہ ہوگئے تھے جنھوں نے پیتر اعظم کی پیروی میں اور اس کے حکم کے مطابق اپنی پرانی وضع چھوڑی تھی پشکن کی طرح بہت سے انشا پردازوں نے پیتر برگ کی خاص فضا اور وہ کیفیتیں جو وہ انسان میں خود بخود پیدا کرتی ھے بیان کی ھیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس فضا کا پیتر برگ کے باشندوں کی سیرت پر بہت اثر ہوا ھے اور اکثر برا۔ یہ بھی پشکن کے وجدان اور ادراک کی خوبی تھی کہ اس نے وہ اثر محسوس کر لیا جس کی بعد کو "سلاف دوست" مصنفوں نے شکایت کی اور اسے بیان بھی اس طرح کیا کہ ترمیم کی بہت کم گنجائش رھی۔

"تانبے کے سوار" اور متعدد مختصر نظموں کے علاوہ پشکن نے ۱۸۳۳ میں ایک ڈراما "بوریس گو ووفوت" بھی لکھا جس کا موضوع اوان چہارم کی موت کے بعد کی طوائف الملوکی ہے اور دیتری نامی ایک شخص کی بغاوت جس نے زار کے بڑے بیٹے ہونے کا دعوی کیا تھا۔ پشکن ڈراما نویس نہیں تھا، اور یہ مشق اسے فن میں ماہر بنانے کو بہت ناکافی تھی۔ روسی نقاد شکایت کرتے ہیں کہ پشکن نے اس ڈراما میں نہ کوئی کیرکٹر اچھی طرح دکھایا ہے نہ کسی قسم کی جدت کی ہے لیکن پھر بھی نظم کے لحاظ سے ڈراما میں دو تین سین اچھے ہیں، خصوصاً وہ جہاں ایک بڈھا راہب رات کو چراغ کے سامنے بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ راہب مورخ ہے، اور چونکہ وہ بہت بوڑھا ہوگیا ہے اس کی تاریخ، جس میں اس نے اپنے زمانے کے تمام واقعات درج کئے ہیں، ختم ہونے والی ہے۔

بس ایک آخری داستان لکھنی ہے
اور میری تاریخ ختم ہوگئی۔
وہ فرض جو خدا کی طرف سے مجھ گنہگار کے لئے مقرر ہوا تھا
ادا ہوگیا۔ خدا نے مجھے اس طویل دور کا
عینی گواہ بلاوجہ نہیں بنایا،
نہ مجھے لکھنے پڑھنے کا سلیقہ بیکار عطا کیا
کبھی نہ کبھی کسی محنت کش راہب کو
میری گمنام مگر شوق اور ایمانداری سے لکھی ہوئی داستان ملے گی،
میری طرح وہ بھی اپنا چراغ جلائے گا،
اور اس کے صفحوں سے صدیوں کی گرد جھاڑ کر
اس کے سچے واقعات کو نقل کرے گا ...
میں بڑھاپے میں دوبارہ زندہ ہورہا ہوں * !

---

* پشکن نوشتہ داستانیں پڑھ کر۔

جو کچھہ دیکھہ چکا ہوں وہ پھر آنکھوں کے سامنے آرہا ہے .
کیا بہت عرصہ ہوا کہ زندگی کا طوفانی سمندر
موجیں مارتا ہوا گذرا تھا ؟
اب وہ خاموش اور پر سکون ہے ؛
مجھے بہت کم صورتیں یاد ہیں ،
بہت کم باتیں ،
اور جو کچھہ بھولا ہوں وہ ہمیشہ کے لئے ،
لیکن چراغ بجھہ رہا ہے ، دن قریب ہوگا .
بس ایک آخری داستان اور لکھنی ہے.

پشکن کی مختصر نظمیں زیادہ تر دشقیہ ہیں ، لیکن اس کے میدان کی وسعت اور مذاق کی ہمہ گیری ثابت کرنے کو " پیغمبر " " شاعر اور کتب فروش " " زندگی کی رتھہ " " بھوت " " نو حہ " " ہم مشربوں سے خطاب " بہت کافی ہیں . ان کے علاوہ پشکن نے مغربی سلاف نسلوں کے بہت سے گیتوں اور داستانوں کا ترجمہ کیا ، اور فارسی . عربی ، قدیم یونانی اور رومن . اطالوی ، ہسپانی ، فرانسیسی ، جرمن ، پول ستانی اور انگریزی شاعروں کے مخصوص قومی طرز میں بھی طبع آزمائی کی . اس کے کلام کے مجموعہ میں قرآن شریف کی چند آیتوں کا ترجمہ بھی موجود ہے . مگر پشکن کا علم اس کے مذاق کی طرح ہمہ گیر نہیں تھا . انگریزی اور فرانسیسی شاعروں کے سوا اس نے کوئی ترجمہ براہ راست اصل سے نہیں کیا ، اور دوسروں کے طرز کی کامیاب نقل کرنے کے لئے اس کی معلومات کافی نہیں تھیں . اسے ایک خامی نہ سمجھنا چاہئے ، بلکہ اس کے برعکس اس شوق کی تعریف کرنا چاہئے جو کسی کارنامے سے مطمئن نہ ہوسکا اور ہمیشہ وسعت

اور بلندی کا آرزو مند رہا۔

پشکن کی ایک عشقیہ نظم ملاحظہ ہو :

مجھے زندگی کا وہ حیرت انگیز لمحہ یاد ہے
جب تو میرے سامنے نمودار ہوئی
ایک دیدار کی طرح جو چشم زدن کے لئے عطا ہوا ،
ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا ۔
بہت دنوں تک جب کوئی لا دوا درد مجھے تڑپاتا
یا میں دنیا کے شور و غل اور لغویات سے پریشان ہو جاتا
تو تیری نرم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ،
اور تیرا پیارا چہرہ مجھے خواب میں نظر آیا کرتا ۔
زمانہ گزرتا گیا ۔ جذبات کی باغیانہ شورشوں نے
پرانے خواب منتشر کر دئے ؟
میں تیری نرم آواز بھول گیا
اور تیرا پیارا چہرہ ۔
جلا وطنی کے گوشے ، جدائی کی تاریکی میں
میری عمر اپنی سست رفتار سے گذر تی رہی ؟
نہ کوئی ایسا تھا جس کی ناز برداری کروں ؟ یا جو میرے جسم
میں جان پھونکے ،
نہ آنسو تھے ، نہ زندگی ، نہ محبت ۔
میرے دن پھرے ، میرا دل بیدار ہوا ،
تو پھر میرے سامنے نمودار ہوئی ،
ایک دیدار کی طرح جو چشم زدن کے لئے عطا ہوا ،

ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا .
میرا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے —
اسے ناز برداری کا شرف حاصل ہوا ہے ،
اسے ایک ہستی ملی ہے جو اس میں دو بارہ جان پھونک سکتی ہے ،
اور اب اسے پھر جینا نصیب ہوا ہے اور آنسو بہانا اور محبت کرنا .

روسیوں کی طبیعت عام طور سے حقیقت بین اور حقیقت نگاری کی طرف اس قدر مائل ہوتی ہے کہ فلسفیانہ تصورات اس کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے . اسی وجہ سے روسی شاعری میں فلسفیانہ رنگ کی نظمیں شاذ و نادر ملتی ہیں ؛ پشکن کی نظم " زندگی کی رتھہ " تخیل ، استعارے اور حقیقت نگاری کی اس خاص آمیزش کی بہت اچھی مثال ہے جو روس میں فلسفے کا کام دیتی ہے :

رتھہ پر اگر چہ بوجھہ بہت ہے
مگر وہ آسانی سے چل رہی ہے :
زمانہ ، ایک سن رسیدہ مشاق ہانکنے والے کی طرح
بغیر سستائے ہم کو بھگائے لئے چلا جاتا ہے .
ہم سویرے سے رتھہ میں بیٹھتے ہیں .
جب ہمیں ہڈی پسلی ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں ہوتا ،
آرام اور آسودگی کی فکر نہیں ہوتی ،
اور تب ہم چلاتے ہیں : چل جلدی چل
لیکن آدھا دن گذرنے تک یہ جوش نہیں رہتی ،
ہم بہت ہچکولے کھا چکے ہوتے ہیں ،
ڈھلواں زمین اور خندقوں کا ہمیں خوف ہوتا ہے ،
اور تب ہم چلاتے ہیں : سنبھل کر چل ، بیوقوف !

رتھہ پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے ۔
شام تک ہم اس میں بیٹھنے کے عادی ہو جاتے ہیں ،
زمانہ رتھہ کو تیزی سے چلاتا رہتا ہے
اور ہم اونگھتے ہوئے خواب گاہ تک پہنچ جاتے ہیں ۔

" بھوت " میں شاعر برف کے طوفان کو وہمی دیہاتیوں کی نگاہوں سے دیکھتا ہے - ترجمے میں الفاظ کی تاثیر جاتی رہتی ہے ، اور اس قسم کی نظموں میں اثر زیادہ تر الفاظ کے وزن اور تال کا ہوتا ہے ۔ یہ نظم اپنی اصل صورت میں پڑھی جائے تو طوفان اور برف باری کی فضا اور وہ مہیب شکلیں جو خوف زدہ تصور ایسے موقعوں پر گویا اپنے آپ کو ڈرانے کے لئے بنایا کرتا ہے سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں اور شاعر کی طرح پڑھنے والے کا دل بھی دہل جاتا ہے ۔

بادلوں کے بھونچال ہیں ، بادلوں کا طوفان ہے
کہیں سے چھپ کر چاند
اڑتی ہوئی برف کو چمکارہا ہے ؛
آسمان متوالا ہے ، رات متوالی ۔

میں سپاٹ میدان میں گاڑی پر چلا جارہا ہوں ، چلا جارہا ہوں -
گھوڑوں کی گھنٹی ٹن ٹن ٹن بول رہی ہے ۔
انجان مقاموں سے گذرتے ہوئے
دل بے اختیار کانپ اٹھتا ہے ۔
" ارے کوچوان ، جلدی کر ! " " حضور مجھ میں سکت نہیں ،
اور گھوڑوں کے پیر مشکل سے اٹھتے ہیں :
برف کا طوفان میری آنکھیں اندھی کئے دیتا ہے ،

تمام رستے نظر سے چھپادئے ھیں ،
سمجھے تو اب کوئی مارے بھی تو میں رستہ نہیں بتا سکتا.
ھم بھٹک گئے ھیں ، کریں تو کیا کریں ؟
ھم کو بھوت میداں میں گھسیٹے لئے جاتا ھے
اور ادھر ادھر چکر دے رھا ھے .
دیکھئے وھاں کھیل رھا ھے ، وھاں ،
میرے منہ پر کچھہ پھونکتا ھے اور تھوکتا ھے ،
وہ دیکھئے اب چمکنے والے گھوڑے کو
گڑھے میں دھکیل رھا ھے ؛
وہ لیجئے اب جھوت موت میل کا پتھر بن کر
میرے سامنے زمین میں گھڑ گیا ،
اب دیکھئے وہ چنگاری کی طرح چمکا
اور اندھیرے میں غائب ھو گیا . "
بادلوں کے بھونچال ھیں ، بادلوں کا طوفان ھے ،
کہیں سے چھپ کر (چاند)
آسمان سٹیالا ھے ، رات سٹیالی .
ھم میں اب چکر لگانے کی طاقت نہیں ،
گھوڑوں کی گھنٹی خاموش ھے ،
گھوڑے کھڑے ھوگئے ھیں . . . " ارے وہ سامنے کیا ھے ؟ "
" میں کیا بتاؤں ؟ کسی درخت کی جڑ ھو گی ، یا بھیڑیا . "
طوفان جھلاتا ھے ، طوفان روتا ھے ؛
بھڑکنے والے گھوڑے پھنکار تے ھیں ؛

لو ! اب بہوت دور بھاگا جاتا ہے ،
صرف وہ آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دھک رہی ہیں .
گھوڑے پھر سے چلنے لگتے ہیں ،
گھنٹی ٹن ٹن ٹن بولتی ہے .
برف سے سفید میدانوں پر
مجھے بہوت جمع ہوتے دکھائی دیتے ہیں .
بے شمار ، بد صورت اور ڈراونے ،
چاند کی متیالی روشنی میں
ہر ہر طرح کے بہوت چکر لگا رہے ہیں ،
جیسے پت جھڑ میں پتیاں .
کتنے ہیں ، کدھر بھاگے ہوئے جارہے ہیں
کیوں سب ایسی درد ناک آواز میں گا رہے ہیں ؟
کیا کوئی بہوت دفن کیا جا رہا ہے ،
یا کسی چڑیل کی شادی ہے ؟
بادلوں کے بھونچال ہیں ، بادلوں کا طوفان ہے ،
کہیں سے چھپ کر چاند
اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے ؛
آسمان متیالا ہے ، رات متیالی .
گروہ در گروہ ، بہوتوں کا بھونچال
آسمان کی بلندی میں غائب ہو رہا ہے .
ان کی درد ناک چیخیں اور آہیں
میرے دل کو زخمی کر رہی ہیں .

"بھوت" کے مقابلے میں دیہاتی روس کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو جو صرف شاعرانہ کیفیت سے خالی ہی نہیں بلکہ ایسا ریگستان ہے جس میں زندہ دلی کا چشمہ ہی سوکھ جائے .

میرے سرخ و سپید نقاد ، میرے موٹے تازے ہنسی اڑانے والے ،
تو ہمیشہ میرے افسردہ افکار کو اپنے مضحکے کا تختہ ، مشق بناتا ہے :
ذرا ادھر آ ، میرے پاس بیٹھ ، اور پھر ہم دونوں دیکھیں گے
کہ میری بدبخت افسردگی کا کوئی علاج ہے یا نہیں . . .
دیکھ یہاں کا منظر کیسا نفیس ہے : ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی
ایک قطار ،
اور اس کے پیچھے سیاہ زمین ،میداں کی ہلکی ہلکی ڈھال ،
اور سب کے اوپر ڈھلے ہوئے گنجان بادلوں کی پٹی .
لہلہاتے کھیت کہاں ہیں ، گھنے جنگل کہاں ،
اور دریا کدھر ؟ صحن میں جنگلے کے پاس
آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کو وہ بیچارے درخت کھڑے ہیں :
صرف دو درخت ، اور ان میں سے بھی ایک کو
خزاں کی بارش نے بالکل ننگا کردیا ہے ؛
دوسرے کی پتیاں زرد ہیں ؛ بھیگتے بھیگتے گل گئی ہیں
اور اب ہوا کے کچھ تیز جھوکوں کی منتظر ہیں ، کہ تالاب میں
گر اسے پاٹ دیں .
بس اور کچھ نہیں . آس پاس کسی کتے کی آواز تک نہیں .
ہاں ، وہ دیکھ ایک کسان ہے اور اس کے پیچھے دو عورتیں ؛
کسان ننگے سر ہے بغل میں بچے کا تابوت دبائے ہے ،

اور دور سے کامل چھوٹے پادری کو پکار رہا ہے
کہ وہ بڑے پادری کو بلالے اور گرجا گھر کھول دے :
بہت جلد ' اب انتظار کی گنجائش نہیں '
بچے کو بہت پہلے ہی دفن کردینا چاہئے تھا .

ایسے مناظر سے بہت زیادہ ہمت شکن دارالسلطنت کی وہ رنگیلی زندگی تھی جس میں پشکن نظر بندی کے بعد مبتلا ہو گیا . زار کا احتساب ایک طرف ' اور دوسری جانب خود پشکن کی طبیعت کی کمزوریاں ' دونوں نے مل کر اس کی شاعری کا کام تمام کردیا . ایک نظم میں اس نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ اسے دیوانگی سے بچائے رکھے : یہ " نوحہ " بھی اسی رنگ میں ہے .

دیوانگی کے زمانے کا بجھتا ہوا سرور
میرے دل پر گراں ہے جیسے شراب کا خمار '
اور شراب ہی کی طرح گذرے ہوئے دنوں کا غم
میرے دل میں جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی تیز بھی
میرا راستہ سنسان ہے ' میرے مستقبل کا موج زن سمندر
مجھے رنج اور کلفت کے طوفانوں کا پیغام دے رہا ہے .
لیکن دوستو ' مجھے ابھی مرنا منظور نہیں .
مجھے جینا ہے ' کہ آرزوؤں کا بیج بوؤں اور مصیبت کا پھل چکھوں !
اور مجھے معلوم ہے کہ رنج اور فکر اور پریشانیوں میں بھی
میرے عیش و عشرت کا سامان ہوگا —
کبھی کبھی نفس اور روح کی ہم آہنگی میرے گیت کا موضوع ہوگی
میں پھر اپنے خیال کی شوخی پر خوشی کے آنسو بہاؤں گا '

اور ممکن ہے کہ میری شام حرمان
عشق کے الوداعی تبسم سے روشن ہو جائے .

آخر میں ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں پشکن اپنے ہم مشربوں کو خطاب کرتا ہے :

شاعر ' تو عوام کی محبت پر اعتبار نہ کر !
تعریف کے نعروں کا شور دم بھر میں مٹ جائے گا '
تجھے بیوقوف کی رائے سننی ہوگی اور سنگ دلوں کی ہنسی ؛
مگر تو اپنا وقار اور سکون قائم رکھہ ' اور غم سے ہم کنار رہ .
تو بادشاہ ہے ' تنہا رہ ' اپنے سیدھے رستے پر چل '
جہاں تجھے تیرا آزاد ذہن لیجائے وہاں جا '
اپنے محبوب خیالات سے اپنی دنیا تعمیر کر
اور اپنی بلند امنگوں کا صلہ کسی سے نہ مانگ . . .

شاعر کے رتبے کی نسبت ایسے بلند خیالات رکھتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ پشکن زیادہ دن تک ان پابندیوں کو برداشت کرے جن سے وہ پیٹر برگ میں جکڑ دیا گیا تھا ' اور عمر کے آخری چار پانچ سالوں میں اس نے اتنی کم نظمیں لکھیں کہ یہ سمجھہ لینا چاہئے اس نے شعر کہنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا . اس کی بجائے اس نے اخبار نویسی ' ادبی تنقید اور افسانہ نویسی کا شغل اختیار کیا . اس کے سیاسی مضامیں اس زمانے کے عام معیار سے بہتر نہیں ' لیکن ادبی تنقید کے مسائل میں اس کی رائے مستند مانی جاتی ہے - اس کے رسالے کے ذریعہ سے کئی انشا پردازوں اور شاعروں کا جو کہ بعد کو بہت مشہور ہوئے ادب کے سرپرستوں سے پہلے پہل تعارف ہوا ' اور معاصر مصنفوں میں سے پشکن

نے جس کسی کی نسبت جو رائے قائم کی اس کی بعد کو عام رائے نے عموماً تصدیق کی - ناول نویس * گوگول کی عظمت کا پشکن نے سب سے پہلے اعترات کیا ' اور ناظریں سے اسے اس کا حق دلوانے میں پشکن ھی کی کوششیں زیادہ کامیاب ھوئیں . شاعر † چیوچف کے کلام کو بھی پشکن نے گمنامی سے بچایا ' اس کی پہلی نظمیں پشکن نے اپنے رسالے میں شائع کیں ' اور وہ اصرار نہ کرتا تو ممکن ھے چیوچف کی نظمیں اشاعت سے بالکل محروم رھتیں . اِن ادبی خدمات سے بہت زیادہ قابل قدر پشکن کی اپنی نثر کی تصانیف ھیں . اس کا تاریخی مضمون " پوگاچیوف کی بغاوت " تاریخ اور ادب دونوں میں خاص اھمیت رکھتا ھے ' اس کا ناول " کپتان کی بچی " ' جس کا قصہ پوگاچیوف کی بغاوت پر مبنی ھے اب تک شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ھے اور روسی تاریخی ناولوں میں اس کا درجہ بہت بلند ھے . پشکن کے افسانے موضوع کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر نہیں ' اگرچہ ان میں سے ایک " حکم کی بیگم " کا ایک روسی ماھر موسیقی نے " ‡ اوپیرا " بنا کر بہت چرچا کردیا . پشکن کی نثر کی تصانیف کا جوھر ان کی زبان کی فصاحت اور لطافت ھے ' اور کارا مزن اور تور گنف کے سوا روسی نثاروں میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا

پشکن کے مذاق کی ھمہ گیری اور اس کی نظر کی وسعت کا ذکر آچکا ھے . یہ خصوصیت دستۂ ئف سکی کی رائے میں ذاتی نہیں بلکہ قومی ھے.

* گوگول کا ذکر روسی ناول نویسوں کے سلسلے میں اگلے آئے گا -

† چیوچف کا ذکر اسی سلسلے میں ھوگا -

‡ ناٹک اور گانے کے فنوں کی آمیزش ' جس میں ایکٹر بولنے کے بجائے گاتے ھیں اورساتھہ ھی باجے بھی بجائے جاتے ھیں -

یورپ پرستوں کی تعلیم اور سیاسی مصلحتوں کے باوجود دستہ ئف سکی کے نزدیک روسی قوم میں انسانی ہمدردی کا وہ خاص جزبہ جو دوسری قوموں کی تہذیب اور تمدن سے دلچسپی ' ان کی اعلیٰ امنگوں اور آرزوؤں سےگہرا روحانی تعلق پیدا کردیتا ہے کمزور نہیں پڑا ہے اور ابھی تک روسی قوم کی سب سے نمایاں اورسبق آموز صفت ہے . روسی قوم تنہا اور سرد مہر نہیں رہ سکتی ' اور ہر سچے روسی کے دل میں یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کے طرز معاشرت اورفلسفۂ حیات سے واقفیت حاصل کرے اور اس کی حقیقت سمجھ لے ، اپنے اور پرائے کے دکھ سکھ میں شریک ہو ' اور اس فساد کو جو جہالت ' خود غرضی اور تنگ نظری کی وجہ سے قوموں کے درمیان قائم ہے اور انھیں ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہے اسے اپنی ہمہ گیر محبت ' روا داری ' حقیقت بینی اور حق پرستی سے رفع کردے - یہ قومی وصف دستہ ئف سکی کے خیال میں پشکن کی شخصیت اور اس کے کلام کا خاص جوہر ہے ' اور اسی کی بنا پر پشکن کو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہا جاسکتا ہے . لیکن پشکن میں صرف دوسروں کا مذاق اور خیالات سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی . الے کو ' اون یے گن اور تت یانا کی سیر تیں ' روس کے دیہاتی مناظر اور گاؤں کی بود و باش کی دلکش تصویریں ' اس کے ساتھ ہی عوام کے تخیل اور ان کی تہذیب سے گہرا لگاؤ ' اور وطن کی سچی محبت ' یہ سب دلیلیں ہیں اس بیدار دلی اور مخلصانہ قوم پرستی کی جو پشکن کو روسی شاعروں اور انشا پردازوں کا سر تاج بنا دیتی ہے . دستہئف سکی کا خیال صحیح ہو یا غلط ' پشکن کی روس میں جو عظمت ہے اور اس کی ذات کا جو احترام کیا جاتا ہے اسے سمجھنے

کے لئے ضروری ہے کہ اس قسم کے دعوے جیسے دستہ ئف سکی نے پشکن کے حق میں کئے ہیں نظر انداز نہ کئے جائیں. پشکن فلسفی یا کسی بصیرت افروز تخیل کے سوانح کی حیثیت سے بہت زیادہ ممتاز نہیں' نظم کی خوبیاں بھی اس سے زیادہ اور بہت سے شاعروں کے کلام میں مل جائیں گی ' مگر قومی ذہنیت پر جو اثر پشکن کا ہوا' قومی سیرت کا عکس جیسا اس کی نظموں میں ملتا ہے اور قوم کے عام مذاق سے جو مناسبت اس کے کلام کو ہے۔ اس کی مثال جرمن شاعر گوئٹے کی شخصیت اور کلام کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی . یہی وجہ ہے کہ گو پشکن ہمت اور جوش ایثار سے محروم اور اخلاقی رہبری کے لئے ناموزوں تھا' اس کی نظموں نے قوم کو بیدار اور اپنی اصلیت سے آگاہ کرنے میں بہت مدد دی ' اور آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں اسے روس کا صرف پہلا نہیں بلکہ سب سے بڑا شاعر اور مدبر بنا دیا .

سسی پنوں

از

جناب قاضی فضل حق صاحب ایم-اے، پی-ای-ایس
پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

عنوان بالا کے تحت میں پنجاب کے دو مشہور ادیبوں "جناب نور الٰہی و محمد عمر صاحبان" کے قلم سے مجلۂ اردو کے نمبر ۳۶ میں ایک نہایت دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس میں ان دو اصحاب نے اپنے انداز خاص میں سسی پنوں کے قصے کی تمثیلی حیثیت پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ اور اس افسانہ کے سندھی اور پنجابی پلاٹ کے جزئیات پر محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ مگر اس مضمون کی تمہید میں بعض باتیں مزید تتبع اور دقت نظر کی محتاج رہ گئی ہیں —

مثلاً ہمارے دوست لکھتے ہیں کہ "ہیر رانجھا کی کہانی کو وارث شاہ اور فضل شاہ دو شاعروں نے آسمان پر پہنچا دیا۔ مگر لاہور اسنگھ اور مقبول کی تصنیفات بہت ادنیٰ درجے کی کاوشیں ہیں"۔ مقبول ایک چار ورقہ سی حرفی کا مصنف ہے۔ جس میں ہیر اور اُس کی ماں کا صرف مکالمہ درج ہے۔ اور بس۔ ادبی حیثیت سے بے شک وہ "بہت ادنیٰ درجے کی کاوش" ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے۔ کہ قابل مضمون نگاروں نے اس کا وارث شاہ یا فضل شاہ سے کس بنا پر مقابلہ کیا ہے۔ غالباً مضمون نگار صاحبان کی مراد مقبول کی ہیر سے ہے —

وارث شاہ سے بہت پہلے پنجابی زبان کا ایک مشہور شاعر شاہ جہاں نام گذرا ہے

جس کا تخاص مقبل تھا۔ اور آنکھوں سے نا بینا تھا۔ علاوہ "جنگ نامہ" کے "ہیر و رانجھا" کا قصہ بھی اُس کی یاد گار ہے۔ یہ کتاب نہ صرف کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ بلکہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوچکا ہے۔ بلحاظ زبان اور اسلوب بیان کے فضل شاہ کی کتاب سے کسی صورت میں بھی "ادنیٰ" نہیں ہے اور اگر وارث شاہ سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ خود وارث شاہ نے بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے بہت سے اشعار بجنسہ یا بادنیٰ تغیر وارث شاہ کی ہیر میں موجود ہیں۔ اس کو اتحاق کہہ لو یا توارد۔ بہر حال یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ اگر مقبل کی تصنیف وارث شاہ کے زندہ جاوید کارنامہ کے مد مقابل نہ بھی ہو۔ تاہم اُس کے مقابلے میں "بہت ادنیٰ درجہ کی کاوش" نہیں

پھر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ مخزن کے دور اول میں اس قصہ کو "ہندوستان پسند بنانے کی کوشش کی گئی تھی" مگر اس کی ناکامی کی یہ وجہ تھی کہ "اہل دہلی و لکھنو اس قصہ کو مبتذل اور عامیانہ مذاق کی چیز خیال کرتے رہے ..... چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے دو نامور شاعروں کے دو شعر اس حقیقت پر بلا واسطہ روشنی ڈالتے ہیں۔

۱ ـ انشا سنایا رات کو قصہ جو ہیر و رانجھے کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

۲ ـ بحر سن کے میری سرگذشت احباب یہ کہنے لگے
بحر کا قصہ بھی افسانہ ہے رانجھے ہیر کا

میں نہیں سمجھ سکا انشا اور بحر کے اشعار سے اس قصے کا "مبتذل اور عامیانہ مذاق کی چیز" ہونا کس طرح مستنبط ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے خلاف یہ دونوں شاعر اس قصہ کی درد انگیزی اور دلچسپی کا اقرار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ـ

مضمون نگار صاحبان کی رائے ہے۔ کہ "شعراء فارسی اور اردو نے اس قصہ کی طرف بنظر التفات نہیں دیکھا۔ ورنہ ایک خوبصورت دلفریب مثنوی آسانی سے تیار ہو جاتی" اور یہ کہ "خود پنجاب کے شعراء نے ان قصوں کو درخور اعتنا خیال نہ کیا" یہ دونوں نظریے حقیقت کے خلاف ہیں۔ اس موضوع پر اردو و فارسی زبان میں متعدد کتابیں اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے اکثر اس وقت راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:—

(ا) فارسی نثر

(۱) سب سے قدیم فارسی کتاب جو اس موضوع پر تصنیف کی گئی ہے وہ گور داس کو ہلی ساکن سنکھتر کی داستان "ہیر رانجھا" ہے" جو دراصل دمودر کی پنجابی ہیر کا ترجمہ ہے۔ اور سنہ ۱۱۲۱ ہجری سے پہلے کی تصنیف ہے۔ کیونکہ میرے قلمی نسخے کا سن کتابت یہی ہے—

(۲) اس کے بعد منشی منسا رام نے سنہ ۱۱۵۷ ہجری میں اسی کتاب کی عبارت کو زیادہ مغلق اور پیچیدہ بنا کر اپنے نام سے شایع کیا۔ اس کا قلمی نسخہ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے—

(۳) پنجاب کی حدود سے باہر "منشی" وزیر علی متخلص بہ 'عبرتی' نے سنہ ۱۲۵۲ ہجری میں قصہ ہیر و رانجھن نثر میں لکھا۔ جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ تھے۔ 'عبرتی' عظیم آباد (پٹنہ صوبہ بہار) کا رہنے والا تھا۔ اور علاوہ اس کتاب کے ایک تذکرۃالشعراء بھی اس کی طرف منسوب ہے—

(ب) فارسی مثنویاں -

(۱) سب سے پہلے اس قصے کو فارسی نظم میں "میتا پسر حکیم درویش" نے سنہ ۱۱۱۰ ھجری میں اورنگ زیب کے عہد میں لکھا تھا - حکیم درویش موضع "کیلاس" یا "کٹہ کیلاس" ضلع گوجراں والا پنجاب کے رہنے والے تھے اور عہد شاہ جہانی میں بہت مشہور طبیب تھے - ان کی کتاب خیرمنکھہ (ویدک طب میں) بہت مشہور ہے —
ان کے بیٹے میتا خود بھی حکیم اور شاعر تھے - مثنوی کا نام انھوں نے عشقیہ پنجاب رکھا ہے میتا اور ان کی مثنوی پر اورنٹیل کالج لاہور میگزین بابت ماہ نومبر سنہ ۲۸ ع میں مفصل مضمون شایع کرا چکا ہوں —

(۲) ہیرو رانجھا مصنفہ 'لائق' اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے ساری مثنوی میں لائق یا اس کے عہد کے متعلق کوئی صریح اشارہ نہیں پایا جاتا مگر میں نے رسالہ طور (لاہور) بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۸ ع میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لائق اورنگ زیب کا معاصر اور اسلام خان مشہدی (ہمت خان) عالمگیری کے متوسلین میں سے تھا - اور اس کا نام محمد عاشق یا محمد مراد تھا —

(۳) مثنوی ناز و نیاز - شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کی یادگار ہے شاہ صاحب ذات کے گوجر اور گوت کے "جویہ" تھے - بقول آزاد بلگرامی یہ کتاب سنہ ۱۱۴۳ ھجری میں زیر تالیف تھی - شاہ صاحب کا انتقال سنہ ۱۱۵۳ ھجری میں ہوا —

(۴) مثنوی یکتا - مصنفہ احمد یار خان یکتا - اس کے اسلاف خوشاب ضلع پھیرہ میں متوطن تھے - اور اس کا انتقال خوشاب ہی میں سنہ ۱۱۴۷ھ

میں ہوا۔ یہ مثنوی شائع ہو چکی ہے۔ اور بازار میں ملتی ہے۔

(۵) "مثنوی باقی" یہ کتاب بھی میرے پاس اس وقت موجود ہے پہلے دو تین صفحے غائب ہیں۔ دیباچہ میں "شاہ عالم پناہ اکبر شاہ" کی تعریف ہے۔ غالباً یہ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی ہے بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ کتاب خواجہ باقی باللہ کی تصنیف ہے جو عہد اکبری کے صوفیاء کرام میں سے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو یہ سب سے پہلی فارسی مثنوی ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی تھی۔

(۶) مثنوی ہیرو رانجھا مصنفہ سندر داس آرام۔ اس کا ایک نسخہ کپورتھلہ لائبریری میں موجود ہے۔ آرام میر معین الدین (المعروف بہ میر منو) حاکم لاہور کا معاصر تھا۔ اس نے یہ کتاب سنہ ۱۱۷۱ ہجری میں لکھی۔ اور اس کا تاریخی نام "گلشن راز عشق و وفا ہے"۔

(۷) میر قمر الدین منت دہلوی نے بھی اس قصہ کو فارسی نظم میں لکھا ہے۔ تاریخ تصنیف سنہ ۱۱۹۶ ہجری ہے۔ قصہ عشق ہیرو رانجھن نام ہے۔ یہ کتاب مسٹر رچرڈ جانسن (صاحب لغات فارسی و انگریزی) کے نام پر معنون ہے۔ اسی مسٹر جانسن نے منت کو کلکتہ کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے سامنے پیش کیا۔ اور ملک الشعرا کا خطاب دلوایا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ اس وقت زیر نظر ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ سردار عبدالقادر افندی نے لکھ کر چھپوادیا ہے

(۸) "نکاریں نامہ المعروف بہ ہیرو رانجھا" لالہ کنہیا لال ہندی ایگزیکٹو انجینیر پنجاب کی تصنیف ہے۔ اور سنہ ۱۲۹۹ ہجری میں چھپی تھی بازار میں ملتی ہے۔

(۹) اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں ایک نامکمل فارسی مثنوی موجود ہے - آیون هود روسی مستشرق نے اپنی فہرست میں شاعر کا نام فدائی یا ساقی دیا ہے —

(ج) اردو نثر کا سرمایہ بھی اس حصہ سے خالی نہیں ہندو پریس دہلی میں سنہ ۱۸۷۴ ع کی چھپی ہوئی ایک کتاب موسوم بہ قصہ ہیر و رانجھا میرے پاس موجود ہے - اس کا مصنف "مقبول احمد ابن مولوی قدرت احمد فاروقی گوپالوی ... وارد انبالہ" ہے - جو اس کتاب کا سبب تالیف یوں بیان کرتا ہے کہ، "افسانہ ہیر و رانجھا سر زمین ہند میں عجیب دلچسپ نمکین و رنگین طرفہ ظرافت آئین و خاوس آگیں واقع ہوا ہے ... ہرچند فقیر پر تقصیر کو ایسے مقدمات کے قلمبند کرنے سے سروکار نہ تھا - بلکہ ننگ و عار تھا - مگر بعض آشنایان صدق و وفاق نے تکلیف مالایطاق دی - خیال نظم فارسی نے دل میں جا کی - کچھ اشعار لکھے - پھر دھیان آیا - کہ فی زمانہا رواج اردو کا بیشتر ہے اور نظم سے نثر وسعت اثر حاصل مطلب خلاصہ مقصد حشو و زوائد منفی و مسجع بطرز نو طرز مرصع* بپاس خاطر احباب مخلص تحریر کیا"

(۵) اردو نظم میں بھی کم از کم ایک مثنوی "آبلۂ حرارت عشق" نام مصنفۂ قیس موجود ہے - یہ کتاب جیسا کہ اس کے تاریخی نام سے معلوم ہوتا ہے - سنہ ۱۳۲۷ ھ میں لکھی گئی تھی - اور ۵ سال بعد سنہ ہجری میں کانپور میں طبع ہوئی - قریباً تین سو صفحہ کی کتاب ہے - میرے پاس اس کا ایک ناقص الذول نسخہ موجود ہے —

---

* قصہ چار درویش کا مشہور اردو ترجمہ ہے - اسکا مصنف محمد حسین عطا خاں ہے جس نے اس کتاب کو سنہ ۱۷۹۸ ع میں لکھا تھا —

ممکن ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ اور تصنیفات بھی اس موضوع پر موجود ہوں اندریں حالات یہ کہنا درست نہیں - کہ اردو و فارسی شعراء اور اہل قلم نے اس قصہ کو در خور اعتناء خیال نہ کیا" اور اس قصہ نے "صوبیاند" حدود سے باہر قدم نہیں رکھا* —

آنریبل سر چوہدری شہاب الدین کی زبانی معلوم ہوا ہے - کہ بقول ایک انگریزی خاتون کے یہ قصہ عربی میں بھی لکھا گیا ہے —

اب رہا قصہ سسی و پنوں - سو اس کے متعلق صاحبان مضمون نے فارسی کی صرف تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے —

میر محمد بھسکری کی مثنوی "حسن و ناز" اور قاضی مرتضیٰ مرتضیٰ کی مثنوی "شہید ناز" کا ذکر ادبیات فارسی میں میری نظر سے کہیں نہیں گذرا - نہ ہی صاحبان مضمون نے ان کے متعلق کوئی مزید واقفیت بہم پہنچائی ہے - اس لئے اس کے زمانہ کا تعین ناممکن ہے - ہاں "چوہدری" (شہباز) کی کتاب "وقائع پنوں" کا ایک قلمی نسخہ اس وقت زیر نظر ہے - شہباز موضع بدوملہی ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا مسلمان جاٹ تھا - اس نے یہ کتاب سنہ ۱۲۵۰ ھجری میں نہیں (جیسا کہ صاحبان مضمون نے لکھا ہے) بلکہ سنہ ۱۲۵۱ ھجری میں مکمل کی تھی - کیونکہ وہ اپنی تصنیف کے آخر میں لکھتا ہے -

چوں در غم یار فزاریدم خوں خوار و دل افگار و حیراں
تاریخ گذار (گذا) این نظم شدم غم یار بہ فہم اسرار نہاں

---

* اورنگ زیب عالمگیر کے پچاسویں سال جلوس میں ایک شخص گوپ داس نے اسے بھاکا (ہندی) میں لکھا تھا - اس کا قلمی نسخہ میری نظر سے گذر چکا ہے - اس کے علاوہ بھی ہندی زبان میں ایک ترجمہ موجود ہے (دیکھو میرا مضمون بعنوان "قصۂ ہیر و رانجھا" ملحد رجہ رسالہ رہنما ۔ بابت ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۲۷ ع)

اور یہ ظاہر ہے - کہ "غم یار" کے اعداد ۱۲۵۱ ہوتے ہیں -

یہ بالکل صحیح ہے - کہ "وقائع پنوں" میں پنوں کے بے ہوش ہوجانے کے بعد کا حال کسی دوسرے شخص کے قلم کا مرہون منت ہے - اور صاحبان مضمون اس کا نام "منشی محمد حسین" بتاتے ہیں - شہباز اسی کا نام صرف "حسین" لکھتا ہے- اور اس کو "ولی" کے نام سے مخاطب کرتا ہے - مضمون مذکورہ کی عبارت سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے - کہ شہباز نے پنوں کے بے ہوش ہوجانے تک کا حال لکھا - اور بعد ازاں "منشی محمد حسین" نے اسے مکمل کیا —

حالانکہ شہباز کا بیان یہ ہے - کہ "حسین ولی" نے اس سے قبل قصہ سسی پنوں کا آخری حصہ لکھا جو بہت مختصر ہوا - بحر کی ندرت کی وجہ سے اس کے اکثر اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے تھے شہباز نے اپنے دوست "پیرالدین" متوطن "شہر جلال‌آباد" کی فرمائش پر قصہ کا ابتدائی حصہ اس بحر اور روش پر لکھ کر کتاب کو مکمل کیا - وہ کہتا ہے کہ :

"لیکن زیں پیش حسین ولی" کرداست بیان احوال سسی ز آغاز نہ کرد
شروع او را انجام نمودہ بہ فہم رسی

من جہت تمام نمودن آن شازم گشتم از بوالہوس
من نکس نارس زار ہوس جہت اتمامش گشتم خواہاں

.....

باعین حسین چہ می سنجد ایں اسرب پر غبن اے یاراں

یہ بھی ممکن ہے کہ حسین کی مثنوی کا ابتدائی حصہ ضائع ہوگیا ہو - اور شہباز نے اسے مکمل کیا ہو شہباز کی عمر اس کتاب کی تصنیف کے وقت چالیس برس

کی تھی - اس حساب سے اس کی پیدائش کا سال سنہ ۱۲۱۱ ھجری ہوتا ہے—

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ بھی فارسی زبان میں یہ قصہ متعدد بار لکھا گیا تھا - میرے علم کے مطابق سب سے پہلے سید علی نے (جو ٹھٹھہ سندھ کے صاحب تقدس بزرگ تھے) ۱۰۵۳ ھجری سے پہلے اس کہانی کا سندھی زبان سے فارسی نثر میں ترجمہ کیا —

اس کے بعد رضائی نام ایک شاعر نے زیبا و نگار کے نام سے ایک مثنوی اس موضوع پر لکھی - اس کا ماخذ سید علی کی مذکورہ بالا تصنیف منشور تھی - چونکہ سسوی اور پنوں کے اجنبی نام ایرانی کانوں کے لئے نامانوس تھے - اس لئے انھیں زیبا و نگار میں تبدیل کردیا - یہ کتاب سنہ ۱۰۵۳ ھجری میں لکھی گئی اور تاریخ تصنیف اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے:

گل اندر باغ خواندم از حسابش
کہ ہم تاریخ باشد ہم خطابش

ان کے علاوہ میرے پاس ایک فارسی قلمی نسخہ موجود ہے جس کا نام آخر میں کاتب نے "قصہ سرگزشت سسی و پنوں" درج کیا ہے - مگر مصنف خاتمہ پر اس کا نام نگاری نامۂ عشق" یا "گلستان رنگین" بتاتا ہے:

بحمد اللہ کہ نوک خامۂ عشق رقم زد ایں نگاریں نامۂ عشق
در ایام مبارک ماہ رمضان (کذا) بہار آورد ایں رنگیں گلستاں

مصنف نے اپنے اور اس قصہ کے متعلق اس مثنوی میں یہ حالات دیے ہیں—

اس کا نام اندرجیت تخلص 'منشی' ہے - پنجاب کے شہر نکودر میں وطن تھا - وطن سے لاہور میں آیا - اور یہاں کسی بزرگ کی خدمت میں انیس سال تک رہا - بزرگ کا نام نہیں دیتا - مگر شمع عالم (اور ایک دوسرے نسخے کے مطابق شیخ عالم) کے لقب سے ملقب کرتا ہے - ان کی وفات کے

بعد کچھ عرصہ تک سید "شہامت" خاں کی خدمت میں رہا۔ اور اسی کتاب کی تصنیف کے وقت وہ نواب عبدالصمد خاں لاہوری کا منشی تھا۔ سنہ ۱۱۴۱ ھجری میں وہ نواب مذکور کی معیت میں ملتان گیا وہاں اُس نے یہ داستان سنی۔ اور اسی وقت اسے منظوم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے دسویں سال جلوسی میں ماہ رمضان میں ختم کی۔ وہ اشعار جن میں وہ ان واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ درج ذیل ہیں:—

مرا درعرت اندر جیت نام است — مرا 'منشی' تخلص در کلام است
وطن گاہم بود در ملک پنجاب — نگو در قصبۂ سر سبز و شاداب
مرا چوں از وطن قسمت جدا کرد — بہ بزم شمع عالم آشنا کرد
بجاں شاد و طبع فارغ البال — نمودم خدمتش تا نو زدہ سال

چو شیخ از دار فانی رخت برداشت — مرا میر شہامت خاں نگہ داشت

کنونم منشی عبدالصمد خاں — خدا را جملہ ہزاراں فضل و احسان

سن ہجری ہزار و یک صد و چہل — کہ از لاہور بستم محمل دل
بہلتان آمدم ہمراہ نواب — دل خورسند و طبع شاد و شاداب

دریں بستان سرائے شاد و خرم — کہ بودم یک زمانے فارغ از غم
شنیدم از لب آتش زبانے — ز حسن و عشق رنگیں داستانے

در ایام مبارک ماہ رمضان بہار آورد ایں رنگین گلستان
سن عشر از جلوس ظل سبحان محمد شاہ غازی شاہ شاہان

صاحبان مضمون تحریر فرماتے ہیں کہ "پنجاب میں اس قصے (سسی پنوں) کے باوا آدم حافظ برخوردار ہیں" - اور اس کی وجہ یہ دی ہے کہ "پنجابی میں سب سے پہلے حافظ رانجھا برجوردار نے سنہ ۱۱۷۶ ھجری میں اس قصہ کو کتاب کی صورت میں پیش کیا" —

اگر اس موضوع پر سب سے پہلے کتاب لکھنے کے لئے حافظ صاحب کو "باوا آدم" کا خطاب دیا گیا ہے - تو یقیناً وہ اس کے مستحق نہیں - کیوں کہ حافظ صاحب مذکور سے پہلے سنہ ۱۱۷۲ ھجری میں اس قصہ کو پنجابی زبان کے پانچ مختلف تحریروں میں لکھا تھا - خاتمہ پر 'آرام' کہتا ہے :—

ختم ہویا ایہ عشق پاک جو آکھہ سنایا
گل ختمی 'آرام' ایس قصے تے پایا
سمجھہ کلام کر پنج بھر تاریخ ملائی
سسی پنوں وے جوش عشق پنج ندوھائی

مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ کپورتھلہ کی لائبریری میں موجود ہے اور پروفیسر محمد شفیع نے اورنٹیل کالج لاہور میگزین میں اسے شائع کیا ہے —

صاحبان مضمون کو ہاشم کی سسی پنوں کی "تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں ملتا" واقعی کتاب مذکور میں ہاشم نے اپنے زمانے کے متعلق

کچھ نہیں لکھا۔ مگر پیر کرامت اللہ امرتسری کے رسالہ "چشمۂ حیات" میں جو منشی مولا بخش کشتہ کی ہیر کے پہلے اڈیشن کے ساتھ بطور دیباچہ شائع ہوا ہے۔ لکھا ہے۔ کہ ہاشم رنجیت سنگھ کے معاصر تھے اور رنجیت سنگھ اکثر دفعہ ہاشم کو بلوا کر اُن کی زبانی سسی پنوں سنا کرتا تھا۔ واللہ اعلم۔

حافظ برخوردار کے متعلق صاحبان مضمون لکھتے ہیں کہ "اُن کا نام "رانجھا" تخلص برخوردار حافظ قرآن تھے۔ حافظ بھی تخلص کرتے تھے وطن مالوف ہزارہ ہے۔ جوان ہو کر وہاں سے نکلے۔ اور لاہور میں آکر تعلیم میں مشغول ہوگئے۔ وغیرہ وغیرہ ..."

تھوڑا عرصہ ہوا۔ میں نے حافظ صاحب مذکور کی تصنیف کردہ بیس کتابوں کا مطالعہ کرکے اُن کے حالات زندگی انہی کی زبان سے مرتب کئے تھے۔ جو بصورت مضمون رسالہ پنجابی دربار لائل پور بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مضمون کا خلاصہ درج کرتا ہوں:۔

ان کا نام برخوردار تھا اور ذات کے "رانجھا جاٹ" تھے۔ وطن مالوف موضع مسلمانی تپاجو تخت ہزارہ ہے (جو ہیر کے عاشق رانجھا کا وطن ہے) مشرق کی طرف واقع تھا۔ پہلے حافظ صاحب نے تخت ہزارہ میں (جو اُس زمانہ میں بہت بارونق و آباد قصبہ تھا۔ اور اسمیں بہت سے مدارس و مکاتب موجود تھے) تعلیم پائی۔ اور اس کے بعد موضع جہانآباد میں تحصیل علم کرکے سیالکوٹ کے اہل علم و فضل کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ ان کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کرتے ہیں اپنے لاہور آنیکا ذکر بھی کرتے۔ اپنی ایک کتاب میں اپنے ایک اُستاد کا نام عبدالحکیم لکھتے ہیں

ممکن ہے کہ یہ عبدالحکیم فاضل سیالکوٹی ہوا ہوں —

غالباً یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ پنجابی ادبیات میں دو شاعروں کا نام ملتا ہے جو ہردو حافظ بھی تھے۔ شاعر بھی۔ اور ہمنام (برخوردار) بھی۔ اور غالباً معاصر بھی تھے اسکے علاوہ موضع چیتی ضلع سیالکوٹ کے ایک اور شاعر "رانجھا" نام کا بھی ذکر آتا ہے۔ جو ذات کا مراسی اور بہت مقبول عام شاعر تھا —

تاریخ بلوچستان میں رائے بہادر ہتو رام نے بلوچی زبان میں اس قصہ کو نقل کیا ہے۔ اور ہر شعر کے نیچے اُس کا تحت اللفظ اردو ترجمہ دیا ہے۔ رائے بہادر کا قول ہے۔ کہ "یہ قصہ بلوچستان کے شاعروں نے بلوچی زبان میں بطور نظم کے بنایا تھا۔ اور بڑے شوق سے لوگ اسے گاتے ہیں"

میں اس قصہ کا پلاٹ اپنی عبارت میں لکھتا ہوں۔ تاکہ اہل ذوق پنجابی اور سندھی پلاٹوں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی مطالعہ کر سکیں :—

کیچ کے علاقے میں ایک جوان 'فنو' نام تھا۔ (اس کے باپ) عالی نے اس کا ناطہ کرنے کی تجویز کی۔ فنو نے اپنے باپ سے کہا کہ ساری کیچ میں میرے جوڑ کا کوئی آدمی نہیں۔ اور نہ ہی 'مکران' کے علاقے میں کوئی عورت میری ہمسر ہوسکتی ہے۔ اس پر فنو کے وکیل نے کہا۔ کہ مجھے سو سوار دو کہ میں غیر علاقوں میں جاکر اس کے لئے بیوی کی تلاش کروں۔

چنانچہ وہ سو سوار لے کر اصفہان اور لاہور کے علاقوں میں پھرتا ہوا قندھار اور بعد ازاں سندھ کے باغستان میں بھی گیا۔ شہر بھنبھور کے دروازے پر ڈیرے ڈال دیے —

وہاں اس نے ایک خوبصورت اور حسین لڑکی سسوی نام دیکھی اور لوگوں سے اس کا پتہ و مقام پوچھا - لوگوں نے کہا - کہ یہ ایک بے ماں باپ کی لڑکی ہے - ایک دفعہ ایک کبتری (دھوبی) کپڑے دھونے دریا پر گیا تھا - وہاں اُس نے ایک صندوق لہروں پر تھرتا ہوا پایا تھا - یہ لڑکی اس میں بند تھی اپنی انگلیاں چوس رہی تھی اور ان سے دودھ جاری تھا - کبتری اسے گھر لے آیا اور اپنی بیوی کے سپرد کردیا —

جب لڑکی جوان ہوئی - تو لوگوں نے اس کے رشتے کے واسطے کوشش کی - مگر کبتری نے کہیں بھی حامی نہیں بھری —

وکیل یہ سن کر دھوبی کے پاس گیا - اور کہا کہ میرا آقا فنو کے نام سے مشہور ہے - اور تیری لڑکی کے لئے بہت موزوں بر ہے - کبتری مان گیا - اور وکیل یہ خوش خبری لے کر کیچ پہنچا - اور جاکر فنو کو مژدہ سنایا - کہ میں نے ایک لڑکی شہر بھنبور میں دیکھی ہے - اس کا نام سسوی ہے - اور وہ ماہ پیکر تیرے نکاح کے لائق ہے -

فنو وکیل کو ساتھ لے کر سندھ کو روانہ ہوا - بعد وقم کے سو اونٹوں پر کپڑوں کے تھان اور سونا چاندی لادے - سو خدمت گار اور سو لونڈیاں - تین سو نیزہ دار سوار اور ایک ہزار عمدہ سپاہی ساتھ لے کر باغستان سندھ میں پہنچا —

شہر کے باہر خیمے لگائے - اور رات کو مشک اور زعفران آٹے میں گوندھ کر اونٹوں کو کھلادیا - صبح جب اونٹوں نے جگالی کی - تو سارا شہر دکان عطار بن گیا - لوگ دیکھنے آئے - سسوی نے بھی فنو کو دیکھا - تیر عشق نے گھائل کردیا - اور سہیلیوں کو مخاطب کرکے کہنے لگی - کہ خواہ کچھ بھی ہو میں اسی جوان سے شادی کروں گی —

غرض وکیل دھوبی کے پاس گیا - اور نکاح کا پیغام دیا اس نے کہا کہ مجھے کوئی عذر نہیں - کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم دولت مند ہو - مگر میری دو شرطیں

ماننی پڑیں گی - اول یہ کہ ایک دفعہ سارے شہر کے کپڑے دھونے پڑیں گے اور دوسرے یہ کہ اسی شہر میں رہنا پڑے گا - فنو نے دونوں شرطیں منظور کرلیں سارے شہر کے کپڑے دھوے اور واپسی پر ہر کپڑے کے دام میں سونے کی مہر باندھکر کپڑوں کے مالکوں کو واپس کر آیا —

اب شادی کے نقارے بجنے لگے - اور ایک مہینہ تک شادی کی دھوم دھام رہی اس کے بعد وکیل واپس چلا گیا - اور فنو اپنی بیوی کے ساتھ وہیں رہا - ایک سال کے بعد فنو کے باپ کی محبت نے جوش مارا - تو فنو کی طلبی کے لئے خط لکھا - جب اس کا کوئی اثر نہ ہوا - تو اپنے دوسرے بیٹے کیانی نام کے ساتھ اونٹ کجاووں میں سوار ہو کر عازم سندھ ہوا - وہاں پہنچ کر خیمہ لگایا - سسی اور پنوں کو بلایا - اور بظاہر خوشی ظاہر کرتے ہوے دونوں کو خوب شراب پلوائی - جب وہ بے ہوش ہوگئے - تو فنو کو سانڈنی پر لاد لیا - اور وہاں سے نیچ کی طرف کوچ کیا جب سسی ہوش میں آئی - اور اسے مکرانیوں کی دغا بازی کا علم ہوا - تو رات تو جوں توں کر کے گزاری - صبح سویرے ہی جوش محبت نے بے تاب کیا - اونٹوں کے نقش قدم پر برق رفتاری سے چل نکلی - تین منزل طے کرنے کے بعد پاؤں میں چھالے پڑگئے - اور بھوک پیاس کی شدت سے ناتواں ہو کر گر پڑی - اتنے میں ایک گدریا آنکلا - وہ سسی کی طرف لپکا - لیکن سسی نے کہا - کہ میری طرف نہ آؤ جاؤ کہیں سے دودھ کا ایک پیالہ لاؤ - میں بھوک و پیاس سے مری جاتی ہوں - گدریا ڈر کر اپنے گلے کی طرف گیا —

سسی کو اس کی نیت میں فتور محسوس ہوا - خدا کی درگاہ میں دعا کی - کہ خدایا مجھے اس لعین جاٹ کی دست درازی سے محفوظ رکھیو - دعا مقبول ہوئی - زمین شق ہوئی - اور سسی اندر سما گئی —

اُدھر جب پنوں ہوش میں آیا - تو دیکھا کہ ظالمو نے اُسے اپنی محبوبہ سے جدا کردیا ہے - سخت پیچ و تاب میں آکر اور ان درندوں کو چھوڑ کر سندھ کی طرف بھاگا —

عین اس وقت جب کہ ٹھریا سسی کے غائب ہونے پر متعجب تھا - اور اس کے کپڑوں کے نشان پر زمین کو کھود رہا تھا - پنوں بھی آ پہنچا جب یہ حقیقت حال معلوم ہوئی - تو اُس نے بھی دعا کی کہ اے میرے خدا! میری جان تجھ پر قربان - مجھے اپنی محبوبہ سے جدا نہ کیجو!"

زمین دوبارہ پھٹی اور سسی نے پنوں کو اپنے آغوش میں لے لیا - اور دونوں زمین میں غائب ہوگئے —

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ...

اعتذار

من جانب محمد عمر نور الٰہی صاحبان

—— * ——

چند ماہ ہوے ہمارا ایک مضمون بعنوان "سسی پنوں" شایع ہوا تھا ہمارا مقصد صرف پنجاب کی اس مقبول عام کہانی کو کتابی پیش کرنے سے تھا، باقی امور بر سبیل تذکرہ آگئے - ہم نے جو کچھ لکھا بعد تحقیق لکھا، لیکن ہم اس کے اکمل و مکمل ہونے کے مدعی نہیں - ہمیں پنجابی بولی سے ذرا بھی توشغف نہیں اور اس لئے ہم اس دشت کے سیاحوں سے کوئی گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں غلط ہو یا صحیح، ہم پنجابی کو علمی و ادبی زبان تسلیم نہیں کرتے اور پنجابی کی پرستاری ہماری نگاہ میں تضیع اوقات سے زیادہ منزلت نہیں رکھتی —

نور الٰہی و محمد عمر

تنقید پر اعتراض

از

(جناب محمد احتشام الدین صاحب ایم اے دہلوی)

جرائد اردو کی رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے ایک عمر ہوگئی لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک ان میں تنقید سے مدعا عملاً و عمداً اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتا ہے اور تحقیق سے مراد کسی کا نام لے کر چٹھا! اپنا علم اجتاناً دوسرے کی محض نفی کرنا یا اگر مولف سے کچھ رابطہ دوستی ہے تو اس کی تعریفوں کے پل باندھ دینا۔ دشمنی ہے تو اس کو جھنڈے پر چڑھا دینا! رسالۂ اردو کے حولائی نمبر میں حیات حافظ کی ایک تنقید نظر پڑی جسے تنقید کہنا زیبا نہیں اس میں کتاب مذکور کے صرف عیب چھانٹے گئے ہیں خوبیوں سے سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔ اس تعریف سے بھی معرا رکھا گیا ہے جو حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقامات بہت سا متفرق مواد یکجا فراہم کردینے کی بناء پر مولف حیات کا واجب حق ہے۔ عیب اور صواب دونوں پائے جاتے ہوں تو صواب

کا اشارہ بھی تنقید میں ہونا چاہئے قلیل باشد خراہ کثیر۔ حیات حافظ اردو میں بلا مبالغہ پہلی کتاب ہے جس میں حضرت حافظ شیراز کے حالات و سوانح کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صاحب شعرالعجم کے نوشتہ سوانح حافظ سے بھی پیشتر شایع ہوئی تھی۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ترتیب میں بھی کچھ نہ کچھ مفید و مؤثر ہوئی ہو گی۔ یقیناً موثر ہونے میں تو کچھ شک بھی نہیں کیونکہ صاحب شعرالعجم حیات حافظ سے پہلو بچاتے ہوے گئے ہیں لیکن اس طرز سے بہت کچھ سواد دیدہ دانستہ ترک ہو گیا ہے شاید اسی وجہ سے کہ حیات حافظ میں پہلے آ چکا تھا مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ صاحب شعرالعجم نے اس سوال کو کہ حضرت حافظ پر میخواری کا الزام کہاں تک صحیح ہے" اٹھایا ہے مگر غیر منفصل چھوڑ دیا ہے۔ آئندہ بھی جو کتاب حضرت کے حالات میں لکھی جاے گی حیات حافظ سے متاثر ہوگی اور ممنون اگر نہ ہوگی تو اسی طرح تشنہ رہے گی جیسا کہ بعض لحاظ سے صاحب شعرالعجم کا مقالۂ حافظ اس بیچارہ کی ہے کوئی چارہ نہیں' قاعدہ یونہی جاری ہے کہ الفضل المتقدمہ!

قابل تنقید نگار کے ناظرین زیادہ تر ممنون ہوتے اگر واقعی بعض صحیح تاریخ کی غلطیاں حیات حافظ سے نکال کر دکھا دیتے اور یہ لب و لہجہ استعمال نہ فرماتے جو تنقید میں جا بجا سموم خراش ہے۔ غلطیاں جو نکال کر پیش کی گئی ہیں ان میں بہت کچھ خلاف اور اختلاف کی گنجائش خود موجود ہے۔ عجیب تر یہ ہے کہ صحیح تاریخ کی فاش غلطیاں اس چار صفحہ کی تنقید میں بھی موجود ہیں اور غلط فہمیاں بھی بآواز بلند بول رہی ہیں --

(۲) پہلا اعتراض یہ ہے کہ "حافظ صاحب کے نام و نسب کو صاحب شعرالعجم

نے عبدالنبی کے حوالے سے نقل کیا ہے مگر حوالہ دیدیا ہے۔ حیات حافظ میں مرزا فرحت شیرازی سے نقل کیا گیا ہے مگر حوالہ نہیں دیا گیا ہے " یہ ایک معمولی اور غیر اہم فروگذاشت ہے۔ خواجہ حافظ کا نام ونسب مرزا فرحت کی تصنیف نہیں جس کا بلا حوالہ نقل کردینا مرزائے مذکور کے کسی خاص طغرزاد مضمون یا شعر کے سرقہ کے مرادف ہو سکے!

۳- مولف پر ناقد کا دوسرا اعتراض پیر " ماخذ سے روگردانی " کا ہے جس کو وہ " ایک بڑی بھاری غلطی " بتاتے ہیں " مگر عبارت اعتراض کی ایسی ناصاف اور مبہم ہے کہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ ماخذ کی عبارت کو بڑی بھاری غلطی کہا گیا ہے یا ماخذ سے روگردانی کو؟ بہرحال جب یہ اعتراف ہے کہ " مولف نے خطوط وحدانی میں کچھ عبارت لاکر اپنا قلم تاریخی غلطی سے بچا لیا " تو اعتراض ماخذ سے روگردانی کا ہی رہ گیا۔ ان کو معلوم ہو گا کہ ماخذ کا حوالہ نہ دینا کوئی غلطی نہیں بلکہ ایک فروگذاشت ہے اور معمولی، بڑی بھاری غلطی تو ٹھوکر کہی جا سکتی ہے۔ تاریخ میں واقعات ہوتے ہیں طغرزاد چیز نہیں ہوتا پھر ماخذ کا حوالہ نہ دینا کیا گناہ ہے؟ —

۴- ایسی معمولی فروگذاشتوں پر اتنا بڑا ہاؤ ہو کرنے مولف پر صاف کرنے کے بعد ناقد آگے لکھتے ہیں کہ :- " مولف نے جو خواجہ حافظ کی تاریخ پیدائش اور عمر کی نسبت قیاس دوڑایا اس کی اصلیت بھی پہلے دکھائی جا چکی ہے " ناقد نے مگر یہ تحریر نہیں کیا کہ یہ اصلیت کب، کہاں، کس تالیف، تصنیف، تقریر یا تحریر میں اور کیا دکھائی جا چکی ہے؟ یہ نکتہ ایک

فروگذاشت ہے اور بعض ناظرین کے لئے ضرور باعث زحمت کہ وہ اس کو بے پتہ کہاں تلاش کریں گے ۔ الناظ سے قطع نظر اعتراض کا لبھہ ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ کی تاریخ پیدایش اور عمر کے متعلق مولف کا قیاس ناقد کے نزدیک اصلیت سے دور ہے لیکن اگر کسی مستند تذکرے وغیرہ میں خواجہ حافظ کی تاریخ پیدایش مل گئی ہے تو فبہا ورنہ قیاس دوڑانے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے ؟ ایک قیاس مولف نے دوڑایا ہوگا ، دوسرا قیاس ناقد نے ، تیسرا قیاس صاحب شعر العجم کا ہوگا ، ایک قیاس چنانچہ ہم بھی دوڑا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مظفر کے عہد میں جب قریب دو سال شراب بند رہکر ہوا بن گئی اور شجاع کے شروع دور میں پھر کھلی تو حافظ صاحب قبلہ کی عمر اس وقت چالیس سال تھی چنانچہ فرماتے ہیں —

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

شجاع کے تخت نشین ہوتے ہی میخانے کھل گئے تھے اس کا سنہ آمد جلوس ناقد نے اپنی عبارت ذیل میں سنہ ۷۶۰ ھجری لکھا ہے عبارت یہ ہے —

" آخر کار سنہ ۷۵۴ ھجری میں مظفر نے بواسحاق کو شیراز کے قریب شکست دی وہ بھاگ کر اصفہان پہنچ گیا وہاں چار پانچ سال تک مقابلہ پر تلا رہا آخر کار قید ہوا مظفر نے اس کو قتل کر ڈالا ۔ لیکن مظفر کا خون بہت برا حشر ہوا اس کے لڑکے شاہ شجاع نے اسے پکڑ کر سنہ ۷۶۰ ھجری میں اندھا کر دیا " —

دیوان حافظ میں مگر بواسحاق کے واقعۂ قتل پر دو قطعات تاریخ موجود ہیں اول قطعہ میں اس کی خواصان حرم کو گویا نام بنام مخاطب کر کے حضرت مطلع فرماتے ہیں —

سنبل و سرو سمن یاسمن و سوسن و گل هست تاریخ وفات شه سنبل کاکل

خسرو روے زمیں شاہ زمان بو اسحٰق که به مه طلعت او نازد و خنده بر گل

جمعه و بست و یکم ماه جمادی الاول در پسین بود که پیوسته شد از جزو به کل

آخری بیت کے آخری لفظ کُل کے اعداد کا مجموعہ سنہ ۷۵۰ یعنی سنہ ۷۵۰ ھ برآمد ہوتا ہے - مکرر قطعۂ دوم میں فرماتے ہیں ؛

بروز کات و اثنے از جمادی الاول به سال فال و دگر فون جاعل لاطان

خدایگان سلاطین مشرق و مغرب خدیو کشور لطف و کرم باستحقاق

سپهر حلم و حیا آفتاب جاه و جلال جمال دنیا و دین شاه شیخ بو اسحاق

گذاشت عرصهٔ میدان خود به تیغ عدم نهاد بر کف اعداب خویش داغ فراق

مصرعۂ ثانی بیت اول سے مکرر توثیق ہوتی ہے کہ سنہ ۷۵۰ ہجری میں بو اسحاق شہید ہوا - بو اسحاق کے قتل کی اس تطعی اور مکرر شہادت سے ناقد کا یہ تمام علم و تحقیقات غلط اور غلط ہوجاتی ہے کہ سنہ ۷۵۴ ھ میں بو اسحاق کو مظفر نے شکست دی، وہ اصفہان چلاگیا وہاں بھی مقابلہ پر تلا رہا اور چار پانچ سال تک زندہ اور ہاتھ پاؤں مارتا رہا! سنہ ۷۵۰ ہجری میں سر کٹ جانے کے بعد جسد بو اسحاق نے کچھ ہاتھ پاؤں ضرور مارے ہوں گے ناقد کی مابقی عبارت کو باور کرنا محال ہے اور اس کا محل کہ :-

"میں ان کو الزام دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

الغرض ان قطعات تاریخ سے قطعاً ثابت ہے کہ ناقد نے چار پانچ سال پیشتر جو واقعات گزر چکے تھے ان کو چار پانچ برس بعد قرار دیا ہے - شجاع کی تخت نشینی کا سال بھی چار پانچ برس بعد سنہ ۷۶۰ ہجری لکھا ہے جو چار پانچ برس پیشتر تسلیم ہونا چاہئے یعنی قریب سنہ ۷۵۵ ہجری کے شجاع کی تخت نشینی ہوئی اور شراب پھر کھلی تو حافظ صاحب نے یہ شعر موزوں فرمایا :-

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

سنہ ۷۵۵ ھجری میں سے چالیس سال حضرت کی اس عمر میں خود فرمودہ عمر کے منہا کئے جائیں تو سنہ ۷۱۵ ھجری رہ جاتے ہیں یہ تو بیک وقت سالہ ہے جو مؤلف نے حیات حافظ میں حضرت کی پیدائش کا قیاس کیا ہے تمام ناقد کے علم و تحقیقات سے زیادہ قرین صحت ثابت ہوتا ہے!

۵ - کوئی الزام تنقید میں اٹھایا جائے تو اس کو آخر تک ثابت کرنا چاہئے برعکس اس کے وہ وہ فاش غلطیوں کا الزام کاکر خود ہی ان غلطیوں میں مبتلا پایا جائے تو اس سے بدتر الزام نہیں ہو سکتا۔ ناقد نے مولف کو سطور ذیل میں کس قدر مطعون کیا ہے :

"امرا و سلاطین کا دیباچہ" کے عنوان کے تحت مولانا (مؤلف حیات حافظ) نے وہ وہ فاش غلطیاں کی ہیں کہ الامان و الحفیظ یہ لوگ (بچہ اور بوڑھے بھی الزام کی چپیٹ میں آئے ہیں!) لفاظوں کا تو کہیں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن جب تاریخ کا معاملہ آتا ہے تو محض پیدل!"

یہ سخت لہجۂ اعتراض اور پیدل جیسا کلمہ ایک معزز اہل قلم کے لئے باب تنقید کے قطعاً خلاف ہے ذہن جب اس دعوے کی تفصیل کرنے کا رخ کرتا ہے تو وہ وہ فاش غلطیوں کی لفاظی جس کی شکایت کی گئی ہے وہ "ذیل کے بیان میں چند غلطیوں" کا لقب پاتی ہیں۔ مزید تصریح اس کی جو فوراً کی گئی ہے اس سے بھی زیادہ ہنسی پر مبنی ہے ملاحظہ فرمائیے ہیں کہ :

"ذیل کے بیان میں چند غلطیاں ہیں خاندان اینجو کی تاریخ اس قدر صحت نہیں جس قدر کہ مولانا (مولف حیات) نے لکھدی ہے (گویا کہ صاف تر لکھنا بھی تصویر میں کوئی

دفعہ جو م ہے !) میں حتی الوسع بیان کرنے کی کوشش کرتا
ہوں (اُلجھاکر بیان کرتا ہوں ؟) "

آخری جملہ غرض تنقید سے زیادہ اپنا مبلغ علم و تحقیق جتانے پر بھی ناقد کو بے چین ثابت کر رہا ہے بہر حال اس اظہار عزم کے بعد جو شبدیز قلم کو جولانی دی گئی ہے تو کئی فرسخ تک تاریخ فارس کے ایک ناہموار میدان اور جھاڑ جھنکاڑ میں پر افشاں چلا گیا ہے اگر مولف حیات اس کو نقل کردیتے تو وہ حیات حافظ میں خاندان اینجو کی تاریخ ہوجاتی - لہذا اس کو پڑھنے کے بعد بھی یہی ثابت رہا جو مؤلف نے مختصر مفید خس و خاشاک سے پاک کرکے صاف تر اکھدیا ہے اور حیات حافظ کی ضرورت کے لایق کالماح فی الطعام کافی ہے یعنی واقعی :

"حضرت حافظ کے ابتدائے عہد میں سلطان ابو سعید بہادر کا
بادشاہ تھا اس کے وقت میں شیخ حسین نامی پسر امیرالامرا
چوپان شیراز کا والی تھا اہل شیراز اس سے عموماً ناراض
بھی تھے سنہ ۷۳۶ ھجری میں فی العقیقہ سلطان ابو سعید نے
لا ولد انتقال کیا اور جس کا جہاں بس چلا قابض ہوگیا -
شیخ حسین سچ مچ جان کے خوف سے شیراز سے بھاگ گیا
اور بو اسحاق جو سابق والی شیراز محمد شاہ اینجو کا
بیٹا تھا موقع پاکر بے شک شیراز اور اصفہان کا حکمران
بن بیٹھا - (حیات حافظ)

تنقید کے الفاظ یہ تھے کہ بڑی ناش غلطیاں اور تاہجرہ و کھواں رسیدہ اغلاطیاں ہوں لیکن اس بیان کی صفائی کے ناقد بعدہ معترف ہو چکے ہیں اس مختصر کی عام صحت بیانی کی بھی اس کی مطول

مویدہ ہے ، لفاظی کا بھی اس میں نشان نہیں گو الفاظ یہ تھے کہ یہ لوگ لفاظی کو کہاں تک پہنچا دیتے ہیں " ہم حیران ہیں کہ لفاظی کہاں ہے ؟ شاید کچھہ اور لوگ ذہن میں ہوں گے مگر ہاتھہ آگئے سر دست مولف حیات حافظ ، لہذا وہی مخاطب کر دئے گئے !

اب رہیں " وہ وہ غلطیاں " تو ، کوہ کندن و موش برآوردن" صرف دو اختلات روایت ہیں یعنی حیات حافظ کا ماخذ بیان ابن بطوطہ ہے جو انہی ایام میں (سنہ ۷۲۸ لغایت سنہ ۷۴۸) دوبار شیراز گیا اور اس کے ملکہ حفظ واقعات کو حیرت انگیز تسلیم کیا جاتا ہے وہ شیخ حسین کو میر چوپان کا بیٹا لکھتا ہے اور اس کا سلطان بوسعید کی حیات میں والی شیراز ہونا بیان کرتا ہے - لیکن ناقد اس ہمعصر کا اعتبار نہیں کرتے روضتہ الصفا کو سند لاتے ہیں اور شیخ حسین کو امیر چوپان کا پوتا اور بوسعید کے بعد از وفات والی شیراز مقرر ہونا باور کرتے ہیں ہمعصر کی روایت کو چھوڑنا خود ایک کمزوری ہے لہذا ناقد سنہ مزید کے لئے کبھی ان سا ئیکلو پیڈ یا ات اسلام میں چلے جاتے ہیں جس کا کوئی حصہ ترتیب حیات حافظ کے وقت شائع نہ ہوا تھا اور کبھی فرس نامۂ ناصری کا آئینہ دکھاتے ہیں جو ایک جدید تالیف ہے اور غیر معروف ہندوستان میں تو صرف نام سے تاریخ کی کتاب بھی نہیں سمجھی جاسکتی فرس نامۂ رنگین کے قیاس پر گھوڑوں کے احوال میں کوئی تالیفہ سمجھی جا سکتی ہے اختلات روایت کو بڑی بڑی اور فاش غلطیاں نہیں کہا جاسکتا مولف حیات حافظ پر ناقد کی بڑی زیادتی ہے کہ وہ اختلات روایت پر اس قدر فضیحت فرماتے ہیں اور بطوطہ کی سند پیش ہوتی ہے تو خود بطوطہ ہی پر پلٹ پڑتے ہیں حالانکہ پوتا لکھدئے جانے سے بھی امیر شیخ حسین نہ امیر چوپان کی فرزندی سے خارج ہوتا ہے نہ ولایت شیراز سے قطعا محروم رہ جاتا ہے یعنی کچھہ بھی تسلیم ہوتا ہے ہو مگر اہم

ہے اور حیات حافظ کے بیان کی عام صحت میں اس سے کچھ فرق نہیں آتا پس فاش غلطی کیا غلطی بلکہ غلط فہمی کا بھی اسپر اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اگر غلطی ہو بھی تو جس بیان کے مولف حیات حافظ تنہا ذمہ دار نہیں بلکہ ایک عہد مورخ ابن بطوطہ بھی ہے اس پر غریب مولف کی اسقدر ہجو کہ "محض پوستکی بھی لکھدیا اور الامان والحفیظ! کے نعرے لگائے ہیں مبالغہ اغراق اور غلو ہے۔

ناقد کو فراموش نہ ہوا ہوگا کہ بو اسحاق کے قطعات قتل کی شہادت سے ان کو اپنے ادعا میں سنہ کی اتنی بڑی ٹھوکر ابھی لگ چکی ہے کہ اس کے اثر سے ان کے بیان کردہ متعدد واقعات میں سے ایک بھی واقعہ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہا البتہ یہ کوئی بےضرر اور غیر اہم غلطی نہیں ہوسکتی بلکہ خطرناک غلطی ہے مثلاً اگر ہم ان کے غلط سنہ تاریخ (سنہ ۷۶۰ ہجری) کا اعتبار اور خواجہ حافظ کی عمر کا استخراج اسکی بنیاد پر کرتے تو کبھی صحیح سنہ پیدائش کے قریب نہ پہنچ سکتے اور نامور ان عالم میں سے ایک مشہور ومعروف ہستی کے تعین عمر و سال میں کتنی بڑی غلطی رونما ہوتی۔ اگر روضۃ الصفا اور فرس نامہ اور اسلامی ان سائیکلو پیڈیا میں بھی یہی سنہ ۷۶۰ شجاع کی تخت نشینی کا تحریر کیا ہے تو ان سندات کا اعتبار بھی معلوم ہوا لیکن اگر ناقد نے ان ماخذوں سے نہیں دیکھکر لکھا تو مولف حیات حافظ سے ہی ان ماخذوں میں تحقیق کے ترک کا مواخذہ نہیں ہو سکتا ناقد بھی ملزم ہیں بلکہ تنہا وہی ملزم ہیں کس واسطے کہ حیات حافظ کی تدوین کے وقت انسائیکلو پیڈیا تو وجود ہی میں نہ آئی تھی اور فرس نامۂ ناصری بھی جیسا کہ اشارہ گزر چکا، فرس نامۂ رنگین۔ کے رنگ کی یعنی علاج معالجہ و اقسام فرس پر کوئی کتاب معلوم ہوئی ہے تاریخ کا اس پر ہندوستان میں کم گمان ہوسکتا ہے جدید تالیف ہونے کے علاوہ غیر معروف ہے اور پہلے یہاں نایاب بھی رہی ہو تو عجب نہیں۔

۲ ۔ ناقد کو مؤلف سے بڑی شکایت ہے کہ انہوں نے مظفر کے شیراز پر آخری حملہ کے وقت بو اسحاق کو ، بےخبر ، لکھدیا ہے ناقد بو اسحاق کو بحوالہ حبیب السیر مطلع اور باخبر ظاہر کرتے ہیں حبیب السیر کی عبارت یہ ہے :-

" در اوایل سنہ اربع و خمسین و سبعمائۃ (سنہ ۷۵۴)
ہمت بلند ار جمند مبارز الدین مظفر را برآں داشت کہ
کمند اندیشہ بر کنگرہ تسخیر شیراز انداخت - امیر شیخ
بواسحاق بعد از تقدیم مشورت عمدۃ المتاخرین قاضی
عضدالدین را برسم رسالت نزد امیر مظفر فرستاد الخ

حبیب السیر کی یہ عبارت البتہ اس لفاظی اور فاش غلطی کا نمونہ ہے جس سے ناقد نے الامان طلب کی ہوتی لیکن جب نظر پڑی تو گلے لگالیا اور سند بنا لیا - اس کی لفاظی تو " ہمت بلند ار جمند اور کمند اندیشہ بر کنگرۂ تسخیر انداخت " کے نوحہ نگاروں سے آشکارا ہے اور فاش غلطی سنہ ۷۵۴ ہجری ہے جو عبارت عربی میں کاتب کی غلطی سے محفوظ کر کے لکھا گیا ہے - لیکن مکرر واقعات تاریخ قتل بواسحاق کی شہادت سے ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ سنہ ۷۵۴ ہجری کسی سنہ ۷۵۰ کے ختم سے پہلے ہی بو اسحاق کا کام تمام ہو چکا تھا - صاحب حبیب السیر نے سنہ ۷۵۴ ہجری غلط اور تھوڑے غلط نہیں ، بہت غلط لکھے ہیں - چار پانچ برس کا تفاوت ہے کیا انہی سطور کے اعتبار پر جن میں اس قدر غلط سنہ موجود ہے مظفر کے حملہ سے بواسحاق کو مطلع اور باخبر ثابت کیا جاسکتا ہے - برخلاف اس کے بواسحاق اس حملہ کے وقت واقعی بے خبر ثابت ہوتا ہے حافظ صاحب کے عمر ذیل سے جو بواسحاق کے مرثیہ کا مقطع ہے اور ہر دیوان

میں موجود ہے -

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ ؟
کہ ز سر پنجۂ شاہیں قضا غافل بود !

اس شعر میں لامحالہ کبک خراماں بواسحاق ہے ' شاہیں قضا مظفر اور غافل بود مبتدا کی خبر ہے -

حافظ صاحب بو اسحاق کے ہمعصر ' ہمدم اور اپنے عہد کی زبان تھے اور ان میں سے کوئی حیثیت صاحب حبیب السیر کو حاصل نہیں لہذا بموجود گی تصدیق حافظ صاحب حبیب السیر کی سند ہے جس میں غلطی کا ایک سخت غوطہ بھی موجود ہے اس روایت کی تکذیب نہیں ہو سکتی کہ مظفر کے حملہ کے وقت بواسحاق بے خبر تھا - یہاں تک کہ اگر مظفر خود زندہ ہو کر بھی تصدیق کرے کہ بو اسحاق کو کافی التی میتم دینے کے بعد حملے آور ہوا تھا ' تب بھی ' باطل است انچہ مدعی گوید ' حبیب السیر کی عبارت خود کب اس گنجا ئش قیاس کو مانع ہے کہ حملہ اول اچانک ہوا بو اسحاق اس کے لئے آمادہ نہ تھا اسی لئے جویاے صلح ہوا ؟

غرض کہ مولف حیات حافظ جنہوں نے ابواسحاق کو بے خبر باور کیا تاریخ کے معاملہ میں پسھتی ثابت نہیں ہوے البتہ حبیب السیر کی روایت کا مضبوط محل آن پڑا جس کے نیچے ناقد بھی دبے ہوے نظر آرہے ہیں اور دیکھئے کیونکر نکلتے ہیں !

۷ - تنقید میں حیات حافظ کے اس بیان کو بھی بے بنیاد ظاہر کیا ہے کہ " حاجی قوام الدین حسن نے خواجہ حافظ رح کے لئے ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا " مگر یہ تردید رسالہ اردو کے جنوری نمبر کا محض حوالہ دیدینے سے اس مضمون میں ثابت نہیں ہو جاتی اس کو ملاحظہ کئے بغیر

بھی حاجی قوام‌الدین حسن کے اس سلوک کی روایت کو بوجوہات چند قریب قریب باور کیا جاسکتا ہے :-

(۱) حاجی قوام کا انتہا درجہ غنی اور متمول ہونا لہذا ایک مدرسہ کی تعمیر پر قادر ہونا اس کے قطعہ تاریخ وفات موجودہ دیوان حافظ کے پہلے ہی شعر سے مسلم ہے " سرور اہل غنائم " کو تین دیواروں پر ایک سائبان تان‌دینا کیا مشکل تھا وہ قطعہ‌تاریخ کا شعر یہ ہے --

سرور اہل غنایم " شمع جمع انجمن صاحب صاحبقران حاجی قوام‌الدین حسن

(۲) حاجی موصوف کا حد درجہ مخیر اور فیض رساں ہونا اسی دیوان میں حاجی موصوف کے ایک دوسرے قطعہ تاریخ وفات سے ثابت ہے

اعظم قوام دولت و دین آنکہ بردرش از بہر خاک بوس نمودے فلک سجود
تاکس امید جود نہ دارد ز کس دگر آمد حروف سال وفاتش امید جود

(۳) ان کا اپنے بعد بھی نام نیک یادگار چھوڑنا حضرت حافظ کے اس شعر سے مستنبط ہوتا ہے --

دگر قویم چو حاجی قوام دریا دل کہ نام نیک بہرد از جہان بخشش و داد

(۴) حافظ صاحب کے حاجی صاحب سے گہرے تعلقات اور تقرب پر بھی ان کے یہ اشعار دال ہیں —

ہز مکاہے دل نشیں چون‌قصرفردوس‌بریں گلشنے پیرامنش چون روضۂ دارالسلام
نکتہ دان نغز گو چون‌حافظ‌شیریں‌سخن بخشش آموز جہان‌افروز چون حاجی قوام

(۵) حافظ صاحب کے اشعار سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کا کسی مدرسہ میں درس تدریس کا شغل رہا کرتا تھا —

بخواہ دفتر اشعار و رو بصحرا کن چہ‌وقت‌مدرسۂ و درس‌کشف و کشاف‌است

(۶) مکرر آپ کے کلام سے سند ملتی ہے کہ ایک مدت عمر آپ کے اوقات شریف مدرسہ کی قیل و قال میں بسر ہوتے رہے

بر در مدرسہ تا چند نشینی حافظ خیز تا از در میخانہ کشادے طلبیم
طاق رواق مدرسۂ و قیل و قال فضل در راہ جام و ساقی مہر نہادہ ایم

(۷) حضرت کے جامع کلام مولانا گلفام کے نوشتہ دیباچۂ دیوان کی عبارت ذیل سے بھی حضرت کا تا آخر حیات مشغول افادہ و استفادہ رہنا مستفاد ہوتا ہے :—

" ولے محافظت درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیۂ کشاف و مصباح و مطالعۂ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تجسس دواوین عرب از جمع ابیات و غزلیاتش مانع آمدے "

جو شوق و ذوق اور کثرت اشتغال درس و مطالعہ ان الفاظ سے مترشح ہے وہ قریب قریب مستلزم ہے کہ کسی مکان مدرسہ کے قفل اور قبالے مستقل طور پر آپ کے پاس ہوں - آخر یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ حاجی قوام کے حضرت حافظ بھی غریق نعمت تھے —

دریاے اخضر فلک و کشتی ہلال هستند غرق نعمت حاجی قوام ما

پس اگر در ایتاً ظاہر ہو تو روایت کی اس سے تائید ہو جاتی ہے اور اس تمام مطالعہ سے جو یہاں جمع کر کے دکھایا گیا ہے وہ مدرسہ تعمیر ہو جاتا ہے جسکی حیات حافظ میں خبر دیگئی ہے تردید کی محنت سفت کی مزدوری ہو گی -

امیر مظفر کی سخت گیری ' بے رحمی ' ناحق کشی ' قشقام دھی تنقید میں تسلیم ہے اس کا نتیجہ اگر حیات حافظ میں عام بغاوت کا ہو جانا لکھہ دیا گیا تو یہ کوئی بعید قیاس نہیں ' نہ اس قیاس میں کچھہ غلطی ہے کہ شجاع نے اس بغاوت کی سر داری کر کے سلطنت کو آل مظفر کے قبضہ سے

نکل جانے سے بچا لیا" مولف کے یہ سب قیاسات انہی عبارات کے بین السطور میں پڑھے جا سکتے ہیں جو تنقید میں تردید کے طور پر پیش ہوئی ہیں لفظی معنی پر اکتفا کرنا اور معنی مستفاد پر نظر نہ ڈالنا یہی اسکے مترادف ہے کہ مفید مطلب روایت اخذ کرلی مخالف مدعا مضمون چھوڑ دیا جس کی تنقید میں حد درجہ مذمت کی گئی ہے - غور کیجئے تو مظفر کی بے رحمی' نادق کشی' حد سے زیادہ ہیبت ناکی اُسپر بد زبانی اور دشنام گوئی وہ بارود ہے جس نے عوام و خواص سب کے قلوب برگشتہ کرکے سخت گیر و تندمزاج بادشاہوں کو اس طرح اُڑا دیا ہے کہ —

به یک گردش چرخ نیلو فری نه نادر به جا ماند نے نادری!

ایک شام کو نادر اپنے سرداروں کو نادر پدر سناتا ہے دوسری صبح سے پیشتر اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے! بعینہ یہی واقعہ مظفر کو پیش آیا اس فرق کے ساتھہ کہ نادر کا سر کاٹ لیا گیا تھا مظفر کی آنکھیں نکال لی گئیں - اگر مظفر کے آخر عہد میں رعایا کی عام بغاوت مرقوم و مسطور نہیں ہے اور شجاع کی ہی جاہ طلبی سوجھتی ہے تو دل میں خیال کرسکتے ہیں کہ شجاع کے پاس خود کوئی فوج و سامان نہ تھا باپ کی ہی قوت و حشمت تھی - شجاع نے اس کی سازش سے ایسے قوی بازو باپ کو چشم زدن میں اسیر کرلیا یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہوسکتا کہ مظفر کی سختیوں اور گالیوں سے سب نالاں اور برگشتہ ہوچکے تھے - ذات شجاع نے صرف دیا سلائی کا کام دیا - اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو شجاع کو تاج و تخت کی وراثت سے محروم نہونے دینے کے لئے ایسے ہیبت ناک شخص کے مقابلہ میں کسی کا آمادہ ہونا محال تھا - شجاع اس بغاوت کے وقت پر قید اور قید قفس میں تھا لوگوں نے ہی اس کو قید سے نکال کر اپنا سردار بنایا' تخت پر بٹھایا - اب یہ سمجھنے کی بات ہے کہ لوگ مظفر

کے علی‌الرغم شجاع کے ممدود تھے اس کی رہائی کی دعائیں مانگتے ہوں گے اور اس کی کامیابی پر باغ باغ بھی ہوگئے ہوں گے - ازاں جملہ حافظ صاحب کو بھی تصور کرنا چاہئے جو بعض اشعار میں رہائی کے لئے دست بدعا معلوم ہوتے ہیں مثلاً دیوان میں ایک جگہ مسلسل اشعار رہائی کی تمنا میں پائے جاتے ہیں —

تا کے چو صبا بر تو گمارم دم همت — کز غنچه چو گل خرم و خنداں بدر آئی
در تیره شب هجر تو جانم به لب آمد — وقت است که همچون مه تابان بدر آئی
جاں میدهم از حسرت آں لعل روان بخش — باشد که چو خورشید درخشاں بدر آئی
شاید که بآبے فلکت دست بگیرد — گر تشنه لب از چشمهٔ حیواں بدر آئی
بر خاک درت بسته‌ام از دیده دو صد جوی — شاید که تو چون سرو خراماں بدر آئی

حافظ مکن اندیشه که آں یوسف مصری
باز آید و از کلبهٔ احزاں بدر آئی !

پھر جب یہ یوسف مصری قید سے چھوٹ کر ماہ کنعاں بنتا ہے تو کس شادمانی کا قطعہ لکھتے ہیں —

ساقیا آمدن عید مبارک بادت — واں موا عید که کردی فرود از یادت
در شگفتم که دریں مدت ایام فراق — بر گرفتی * ز حریفاں دل ودیں میدادت
بر سان بندگی دختر رز گو بدر آے — که دم همت ماکود زبند آزادت
شکرایزد که ازیں باد خزاں رخنه نه یافت — بوستاں سمن و سرو گل و شمشادت
شادی مجلسیاں در قدم مقدم تست — جائے غم یاد هرآں دل که نخواهد شادت

* "برگرفتن ز حریفاں" و "دیں دادن حریفاں" ان الفاظ میں غالباً قوج مظفر کے شجاع سے ملجانے اور مدد پر آمادہ ہوجانے پر حیرت کا اظہار ہے - یہ سب واقعات شیراز میں نہیں یزد میں ظہور میں آئے ہوں گے - یزد منتظر کا پایہ تخت تھا - شیراز شجاع کے وقت میں ہوا —

چشم بہ دور کز ان تفرقہ خوش باز آورد طالع نامور و دولت مادر زادت

حافظ از دست مدہ صحبت آں کشتی نوح

ورنہ طوفان حوادث ببرد بنیادت

آخری شعر مقطع سے حافظ صاحب کا اس سازش و بغاوت میں شامل ہونا یعنی شجاع کی پارٹی میں ہونا ٹپک رہا ہے - طالع " مادر زاد " کے حوالہ سے شجاع کا باپ سے قطع تعلق بول رہا ہے - اور " چشم بہ دور " سے مظفر کی آنکھوں کا بے نور ہو جانا جھلک رہا ہے - " بندگی دختر رز " اور " گو بدر آئے " سے شراب کے بند ہونے اور کھل جانے کی طرف لطیف کنایے ہیں - ان تمام قراین سے یہ غزل یا قطعہ جو کچھہ کہا جاے اِس تمام واقعہ پر کسقدر چست اوردرست بیٹھتا ہے کہ احتیاج بیان نہیں - اس کے بعد جب شجاع خاص شیراز میں آکر تخت نشیں ہوتاہے تو ایک غزل موزوں ہوتی ہے جس کا یہ شعر مظفر کی برطرفی اور شجاع کی تخت نشینی پر کیسا عبرت ناک و مسرت آمیز سماں کھینچتا ہے —

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر جام در قہقہہ آمد کہ کجا عد مناع !

اس سے ظاہر ہے کہ عوام و خواص شجاع کی کامیابی پر پھولے نہیں سماتے تھے ؟ مگر تنقید میں اس پر بھی اعتراض ہے — عجب ہے کہ لوگ ایک ظالم کے پنجۂ ظالم استبداد سے رہائی پائیں مگر ان کی رہائی پر شادمانی مستنبط نہ ہو سکے صرف اس لئے کہ حبیب السیر یا روضۃالصفا میں لفظاً اس کا مذکور نہیں ہے ؟

۹ - تنقید میں مولف کو ہر طرح مطعون کرنے کی سعی کی گئی ہے اس پر بھی بر افروختگی ہے کہ شجاع کو " عالم و عادل درست بڑا دیندار

کیوں لکھ دیا مگر مولف نے ہرگز اس قدر شدومد سے نہیں لکھا جیسا کہ خود ناقد کی پیش کردہ سند حبیب‌السیر میں مرقوم ہے :—

"(شجاع) در امر معروف و نہی منکر و تقویت ایمان و ارکان شریعت خیرالبشر صلعم مبالغہ بسیار نمود و در تعمیر مساجد و مدارس و خوانق مساعی جمیلہ مبذول داشت و ملازمت علماء کرام اختیار نمود !"

مسئلہ یہی ہے کہ اگر ۹۹ فی صدی علامات کفر ہوں اور صرف ایک علامت اسلام تو دیندار سمجھنا چاہئے جس کی علامات اسلام اتنی بمبالغہ بسیار ہوں جیسی کہ حبیب‌السیر میں لکھی ہیں اور خدمات دینی ایسی عظیم‌الشان ہوں تو بے شک بڑا دیندار کہا جا سکتا ہے۔ ناقد کی منطق پر آفریں ہے کہ مظفر کو ظالم ' بے رحم ' خونی ' ہیبتناک ' متعدد قتل خون ناحق کا مرتکب ' تند خو ' دشنام گو تسلیم کریں اور بڑا دیندار سمجھیں اور شجاع کو ایک بار شاہزادگی میں غنیم کو مار بھگانے کی شادمانی میں اور دوسری بار آخر عہد سلطنت میں بغداد و سلطانیہ تک فتح کرنے کی خوشی میں جشن فیروزی منانے کی وجہ سے اس لقب کا مستحق نہ سمجھیں ۔ کیا دیزہ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا ؟

رندی آموز و کرم کن کہ نہ چندیں ہنر است
حیوانے کہ نہ نوشد مے و انسان نہ شود

شجاع کے ایام شاہزادگی اور آخر آوان سلطنت میں فتح کے بعد عیش و جشن منانے کی خبر حبیب‌السیر میں الفاظ 'درآن ایام' کی قید سے مقید ہے یعنی ان ایام میں ایسا ہوا ' لیکن رواج و رونق دین کے کاموں میں مبالغہ بسیار بجا لانے ' مساجد و مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرنے

علماء کرام کی صحبت اختیار کرنے کی خبر کے ساتھ بھی اگر کوئی الفاظ تعین زمان پر مشعر حبیب السیر میں موجود تھے تو ان کو بھی صاحب حبیب السیر کی عبارت میں ہونا چاہئے تھا ۔ لیکن نظر نہیں آتے پھر کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شجاع کسی خاص زمانہ میں چند روز کے لئے مصلحتاً دیندار اور خوش اطوار بن گیا تھا ۔ فتح پر عیش و جشن منانا اس عہد کے بادشاہوں کا دستور تھا ۔ حافظ صاحب کے اس مصرع میں کہ "ہر کسے پنجروز نوبت اوست" پنج روز نوبت سے یہی جشن مراد ہیں ۔ جو بادشاہ غنیم پر غالب ہوتا یا فتح پاتا تھا ایسے جشن مناتا تھا ۔ مظفر مُلّا خشک تھا اور اس نے شاہزادوں کے اس طرح بعد فتح جشن منانے پر بھی گرفت کی اس لئے تاریخ میں یہ واقعہ ناقد کی انگشت نمائی کے لئے باقی رہگیا ۔ شجاع سے جو حرکات ان ایام میں ظہور میں آئیں اس کا تاسف خود اس کو ہوا وہ بہرحال اس سے کم تر تھیں کہ ایک ملین سے زیادہ خلق دہلی قتل ہوتی رہی لیکن امیر تیمور کو فتح کے بعد جشن پنجروزہ کے معمولی انہماک میں اس تہلکۂ عظیم کی خبر تک نہ ہونے پائی ۔ تاہم امیر تیمور جیسے فاتح عالم اور جلیل القدر سالار اعظم کو تاریخ میں یہ لقب محض شرابی کا نہیں دیا گیا جو تنقید میں شجاع کے لئے تجویز فرمایا گیا ہے ۔ امیر تیمور جو اقصائے شمال سائبیریا میں پہنچ کر اذان دلائے اور نام حق بلند کرے شرابی اور ہم گھر میں بیٹھے کاغذ پر قلم چلانے والے ایماندار مسلمان گویا کہ شراب پینا یا نہ پینا ہی ایک معیار کفر و اسلام ہے اور کچھ نہیں ۔ تنقید نگار تو ان صحابی کو بھی جو میخوشی کی قید کی ہتکڑیاں بیڑیاں تڑا کر جنگ قادسیہ میں مسلمانوں کو تگمگاتا دیکھ کر کود پڑے اور لشکر اسلام کو شکست سے بچا لیا ' شرابی ہی کہیں گے

لیکن قدر شناس ادب داں ان کو اعاظم صحابہ ہی میں شمار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے —

گر مسلمانی همین است که نافذ دارد
وائے گر از پس امروز بود فردائے

۱۰ - شجاع کے حافظ قرآن، عالم علوم عقلی و نقلی ہونے سے ناقد منکر نہیں لیکن جب حافظ صاحب کا یہ شعر اس کی شان میں پیش ہوتا ہے کہ

مظہر لطف ازل روشنی چشم امل
جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

تو قلم تنقید چراغ پا ہونے لگتا ہے، الفاظ گستاخ ہو جاتے ہیں فرماتے ہیں کہ :-

" حافظ قصیدہ خوانی میں ایسا ہی تھا جیسے کہ دوسرے شاعر "

دوسرے شاعر یہ ہیں :—

خاقانی، انوری، مذرچہری، سلمان ساوجی، بدر چاچ، عرفی وغیرہ وغیرہ جن کے قصاید کے مجلدات ضخیم موجود ہیں - اگر پوچھا جائے کہ حافظ صاحب کو ایساہی قصیدہ خواں الخ تو دھڑ سے کہہ دیا آیا کوئی مجلد حضرت کے قصائد کا بھی نظر سے گذرا ہے ؟ تو بغلیں جھانکنے کے سوا چارہ نہ ہوگا صرف ایک قصیدہ کی بنیاد پر کہ وہ بھی معرض شک میں ہے اور معتبر نسخوں میں نہیں پایا جاتا، ایسا ہی قصیدہ کو الخ کہدینا شبدیز قلم کی مذہ زوری کے سوا اس کی اور کیا تعبیر کی جا سکتی ہے؟ مؤلف حیات حافظ سے رد و کد میں اس قدر بڑھ جانا کہ حافظ شیراز سے بھی الجھ پڑنا اعتدال سے حد درجہ انحراف ہے - حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی تنقیصہ فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ :

با درد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

حضرت کا دیوان کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے لیکن یہ اس کلام کی کرامت ہے کہ معترض کے اعتراض ایک سے زیادہ اس کلام کی روشنی میں پا در ہوا ہو کر رہ گئے!

ایک کیا ایک سے زیادہ بھی اگر قصائد ہوں تو وہ محض اس دلیل ناقص سے کہ "اگر خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہ ہوں تو پھر حافظ صاحب ہی کے ہیں" واقعی حافظ صاحب کے ثابت نہیں ہوسکتے اس میں منطقی مغالطہ باقی رہے گا بھلا کیونکر ہمارے زمانہ کے اردو قصاید سب امیر کے نہیں تو داغ کے اور داغ کے نہیں تو امیر کے قرار دیے جاسکتے ہیں جب کہ معلوم ہے کہ ہزارہا شاعر اور بھی گزرے ہیں جو غیر مشہور رہ گئے؟ یہ تسلیم نہ کرنا کہ حافظ نے قصاید سے اپنا دامن کم سے کم آلودہ کیا بلکہ الٹا مجرم ٹھہرانا تنقید نہیں کٹوہ ملائیت ہے:

عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو ترک انصاف مکن بہر دل عامے چند

۱۱ ـ نقاد کا حافظ صاحب کو باوجود قصیدہ گوئی میں ان کا کم سے کم اشتہار تسلیم ہونے کے معناً ایسا ہی "بھات کہنا جیسے کہ اور بھات تھے" تنقید کی سخت بے اعتدالی ہے ایسا قلم قلمدان میں ہی رہے تو بہتر اور یہ تلوار نیام سے نہ نکلے تو خوشتر کہ دوست دشمن میں تمیز نہیں کرتی سب کو ایک لکڑی ہانکتی ہے —

قصاید کے بدلے دیوان میں کسی شعر کا مدح میں پایا جانا، حسن ظن ہو، تو دلیل اس کی نہیں کہ حافظ صاحب بھی ایسے ہی قصیدہ گو تھے جیسے کہ عام خوشامدی تھے، بلکہ دلالت اس کی ہے کہ قصیدہ گوئی پر حالات وقت سے مجبور بھی ہوتے تو ایک آدھ شعر غزل میں ہی مدحیہ لکھ کر ٹال دیتے تھے مثلاً ایک

غزل کے یہ آخری شعر :

آں شاہ تند حملہ کہ خورشید شیر گیر پیشش بروز معرکہ کمتر غزالہ بود

دیدم کہ شعر داکش حافظ بہدم او ہر بیت ازاں سفینہ بہ از صد رسالہ بود

پہلے شعر میں خورشید شیر گیر' مظفر ہے اور شجاع ' شیر' جو آخر ایام میں مظفر کی دارو گیر میں تھا لیکن مقابلہ میں شیر کے مظفر کہتر از غزالہ ثابت ہوا اور ایک شکار زبوں کی طرح (شجاع) شیر کے پنجہ میں گرفتار ہوگیا - آخری شعر میں قصیدہ گوئی سے صاف معذرت مترشح ہے فرماتے ہیں کہ "میرا ایک ہی شعر کفایت متصور ہو" ! اس طرح حضور نے ایک شعر پر ٹالا اور پھر دیکھئے تو اس ایک شعر میں بھی : دندان تو ہمہ در دہانند! کے سوا اور کچھ نہیں کہا ایک امر واقعہ کا بیان خورشید شاہ و شیرو غزالہ کے تلازمہ میں ہے - شجاع کے مظفر پر اخری حملۂ غالبانہ کو تند حملہ کہا تو کوئی خوشامد نہیں کی چند کو صرف چاند کہہ دیا ہے - مظفر جیسے ہیبتناک کا چوکڑی بھول کر شکار زبوں کی طرح قابو میں آجانا اس میں جو کچھ بھی شجاع کی تعریف نکلتی ہو بے جا و خلاف واقعہ نہیں —

۱۲ - حافظ صاحب کے مدحیہ کلام کا ایک بڑا وصف و کمال یہ ہے کہ باوجود اوج کیواں حسن شاعری پر ہونے کے جیسا کہ ابھی ثابت ہوا کہ مظفر و شجاع کے درمیان جو معرکہ گذرا اس کا بہترین الفاظ میں نقشہ کھنچا ہوا ہے کلام واقعہ سے اگر کم و بیش نہ پایا جائے گا چنانچہ اس شعر کا بھی کہ —

مظہر لطف ازل روشنی چشم امل جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

ہر ایک جز و فرداً فرداً لفظاً اور معناً بجائے خود صحیح' مطابق واقعہ

اور شجاع کے حق میں ثابت ہے —

مظہر لطف ازل :—

یوں تو ہر ایک نفع رساں شے حتی کہ آب نوشیدنی بھی مظہر لطف ازل ہے ۔ شجاع کو مثلاً مظفر کے ظالم واستبداد سے ہی خلق اللہ کو نجات دلانے کے واسطہ میں مظہر لطف ازل کہا جا سکتا ہے اور بھی بیشمار انعام الٰہی مخلوق پر شجاع کے واسطہ اور ذریعہ سے مبذول ہوتے ہونگے —

روشنی چشم امل :—

امید واری کی آنکھ کی روشنی با لفاظ دیگر امید واروں کی آنکھیں جس سے روشن ہوں یہ بھی کچھ مبالغہ نہیں من حیثیت بادشاہ وہ روشنی چشم امل سے بھی کچھ بڑھکر بلکہ قبلہ حاجات جہان ہی تھا —

جامع علم و عمل :—

اس میں بھی شک نہیں ' عالم علوم ہونا اس کا تاریخ میں مسلم ہے علم پر کچھ عامل ہونا بھی اسی عبارت حبیب السیر سے پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے جو پھر نقل کر دیجاتی ہے —

در امر معروف ونہی منکر وتقویت ایمان وارکان
شریعت خیر البشر صلعم مبالغہ بسیار نمود و در تعمیر
مساجد و مدارس و خوانق مساعی جمیلہ مبذول داشت و
ملازمت علمائے کرام اختیار نمود "۔

ناقد کہتے ہیں کہ حافظ صاحب نے شجاع کو جامع علم و عمل کہہ کر خوشامد کی ۔ واقعہ یہ ہے کہ جامع علم و عمل حافظ صاحب نے اس کو تعریفاً تو کیا تعریضاً البتہ کہا ہے وہ اس کو سناتے رہتے تھے کہ تو علم پر عمل

کرتا ہے حکمت * و شرع پر عمل نہیں کرتا، چنانچہ ایک اور شعر میں بھی فرماتے ہیں —

از رسوم شرع و حکمت با ہزاراں اختلاف
نکتۂ ہر گز نہ شد فوت از دل دانائے تو

شجاع رسم شرع کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اصل شرع پر عامل ہوتا تھا مثلاً شرع یہ ہے کہ ان مقامات پر جہاں غیر مسلم آبادی ہو شہر سے باہر شراب کی کشید و فروخت کا کام روا رکھا جا سکتا ہے۔ مظفر نے اصل شرع سے تجاوز کر کے رسم شرع پر عمل کیا۔ شجاع نے اصل شرع پر رجوع کر کے کشید و فروخت شراب پر جو ممانعت مظفر نے کر دی تھی اٹھا لی —
جان جہاں :—

جہاں ملک اور بادشاہ اس کی روح رواں عقلاً و نقلاً آج تک بھی تسلیم کیا جاتا ہے مطلب اس سے مرکز و مرجع و مدار ملک ہے اس میں کوئی مبالغہ ہے نہ خوشامد۔ حیرت یہ ہے کہ اس شعر میں نہ صرف یہ کلمات بلکہ شجاع کا نام بھی جو وارد ہوا ہے خلاف واقعہ اور مبالغہ نہیں شجاع بےشک ایک بہادر بادشاہ اور فاتح لاکلام تھا —

تنقید میں بہت زور شور سے اصرار کیا گیا ہے کہ اگر حافظ صاحب نے اس شعر میں شجاع کو چنیں چناں لکھدیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ واقعی ایسا تھا۔ حافظ بھی ایسا ہی قصیدہ خواں تھا جیسے کے دوسرے شاعر! حافظ صاحب کا شعر تو غور سے لفظاً و معناً دونوں طرح صحیح اور واقعہ

---

* نور حکمت سے مراد یہاں وہی ہے جو قرآن پاک میں ویعلمہم الکتاب و الحکمۃ سے سمجھی گئی ہے یعنی "علم دین" مراد سائنس یا علوم حکمیہ نہیں ہیں —

کے مطابق ثابت ہوا لیکن مدعی کے دعوے میں سوائے پھونک کے کیا نکلا ؟ تخت نشینی کے قریب ایام کی غزل میں اس کو جیسا وہ اس وقت تک تھا کہدینا کوئی خوشامد نہ تھی - اس سے وہ حرکات آخر عہد کی جن کی بنیاد پر تنقید میں اس کو محض شرابی خطاب دیدیا گیا ہے ظہور میں آنے میں ہنوز سالہا سال کا عرصہ درمیان میں تھا تاہم یہ خیال نہ ہو کہ شجاع کو اس سے پہلے اچھا کہا تھا تو آخر عمر میں رنگ رلیاں منانے پر کچھہ نہیں کہا - نہیں بلکہ حضرت خود شجاع کی بزم عیش نشاط میں گویا اس کی مستانہ حالت کا مجسم آئینہ بنکر غزل میں بولتے بنکار تے پھونچتے ہیں اور شراب خانہ کے ایک چھوکرے کی زبان سے اسے غیرت دلاتے ہیں —

دوش رفتم بہ در میکدہ خاک آلودہ خرقہ تر دامن و سجادہ شراب آلودہ
آمد افسوس کنان مغبچۂ بادہ فروش گفت بیدار شو اے رهرو خواب آلودہ
بہ هوائے لب شیریں دهنان چند کنی جوهر روح بہ یاقوت مذاب آلودہ
بہ طهارت گزر از منزل پیری و مکن خلعت شیب بہ تشریف شباب آلودہ

شجاع کا جواب بھی موجود ہے کہتا ہے کہ فتح و فیروزی کے موقع پر تھوڑا سا عیش منالینا ایسا ہی ہے جیسے بہار میں دامن گل پر شبنم کے قطرے —

گفتم اے جان جہان دفتر گل بیہبے نیست کہ شود وقت بہار از مے ناب آلودہ

شجاع کی اس منطق سے مگر مغبچہ قائل نہیں ہوتا جھڑک دیتا ہے اور اس کی جھڑکی کے مزے پر غزل ختم ہو جاتی ہے —

گفت حافظ برو و نکتہ بہ یاراں مفروش آہ ازیں لطف با انواع عتاب آلودہ !

یہ تھا حضرت کا رنگین انداز نصیحت ! مے و مینا و جام کے ظروف

اور مطرب کے ساز و آواز کے پردوں کے ذریعہ وقت اور موقع کے مناسب حال نصیحت کانوں میں پہونچا کر حلق سے اُتار دیتے تھے - حضرت شیخ سعدی کی نصیحت ایک خشک لکڑی ہے جس کا حلق سے اترنا محال ہوتا ہے - حافظ صاحب کی غزل کو عین عیش میں ارباب نشاط کی آواز و ساز میں سننے کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اگر اس کا تصور کیا جائے کہ خود شیریں دہنوں کے ہی لب سے یہ نصیحت سنائی جارہی ہے اور مغبچۂ ساقی ہی سے جو جام بھر بھر کر دے رہا ہے حیف و افسوس و تنبیہ کرائی جا رہی ہے تو حافظ صاحب کے طرز نصیحت کو گلستان بوستان کی کوئی عبارت نہیں پہونچتی - دونوں مکتب کے طاق پر رکھی رہجاتی ہیں مگر آپ کے نصیحت بھرے کلام کے حافظ خودارباب نشاط ہوتے ہیں اور تا حد مقدور خوش الحانی کیساتھہ سناتے ہیں - رہا نصیحت ماننا یا نہ ماننا - " ایں سعادت بزور بازو نیست " حضرت شیخ کی گلستان بوستان پر بھی کون عمل کرتا ہے وہی جن کو اس کی ازل سے توفیق عنایت ہوئی ہے !

۱۳ - حبیب السیر کی قطعی شہادت کی موجود گی میں اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ شجاع نے بادشاہ ہو کر رونق دین کے کاموں میں انہماک و مبالغہ کیا اور علماء و صالحین کی صحبت اختیار کی - مگر تنقید میں اس کی وجہ علت نمایش اور تالیف قلوب کی ضرورت قرار دیگئی ہے - حبیب السیر میں یہ کہیں مرقوم نہیں - تنقید نگار کی ایجاد بندہ ہے - درایتاً اگر دیکھا جائے تو مظفر ملائے خشک کے انعام کا جو کچھہ تجربہ ہوا تھا اس کے بعد لوگوں کی تالیف قلوب اس میں نہ تھی کہ زہد و تقوے کا اظہار کیا جاتا بلکہ لہو و لعب میں کچھہ آزادی دینے میں البتہ متصور ہوسکتی ہے باوجود اس کے بھی اگر شجاع نے رونق دین متین کے کاموں میں مبالغہ

بسیار کیا اور صالحین کی صحبت اختیار کی تو یہ فعل اس کا خالص دل سے اور رو و ریا سے پاک متصور ہونا چاہئے ۔ تنقید میں نتیجۂ معکوس نکالا گیا ہے لہذا شجاع کے بارے میں اس افراط و تفریط میں ناقد خود بھی کچھہ کم مبتلا نہیں جس کا ملزم وہ مولف حیات حافظ کو بار بار گردانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ " مولف کو شجاع سے کچھہ خاص صحبت معلوم ہوتی ہے " ۔ مولف کی صحبت و حمایت شجاع کی اب تک تو اس بحث و استدلال میں مبنی بر وجوہات و معقولات ہی ثابت ہوئی یہاں تک کہ یوروپین سورخ کو جو جواب حیات حافظ میں بحمایت شجاع دیا گیا وہ بھی حبیب‌السیر کی خبر پر مبنی ہے اور کوئی تاویل شجاع کے کسی فعل کی نہیں کی گئی ہے ۔ البتہ تنقید میں شجاع سے کچھہ خاص لاگ ہو سکتی ہے کہ جب اس دو رونق دیں کے کاموں میں انہماک اور صحبت صالحین اختیار کرنے پر اچھا کہنے کا وقت آتا ہے تو اس کے ان افعال کو مبنی بر ریا و مکر و خود غرضی قرار دیا جاتا ہے جس کے ثبوت میں ناقد کی فراست کے سوا کوئی تاریخی عبارت نہیں پیش ہوتی اور قرینہ اس کے ان اعمال خیر کے مبنی بر ریا و مکر ہونے سے انکار کرتا ہے اور جب مظفر کی خشکی اور کٹرپن سے نالان قلوب کی تسکین کے لئے وہ شراب کی ممانعت کشید و فروخت اٹھا لیتا ہے تو پھر تو کیا کہنے ہیں خاص موقعہ ہی اس کو برا کہنے کا اور مطعون کرنیکا ہاتھہ آجاتا ہے ! فرماتے ہیں کہ :—

" اب غور کرنے کی بات ہے کہ کیا شراب خانے کھلوا
دینا حالانکہ اس کے باپ نے ان کو بند کر دیا تھا ،
کوئی عیب کی بات ہے یا نہیں "

اگر غور کی فرمایش ہے تو غور دو طرح کا ہوسکتا ہے . موٹا اور مہین ' موٹا غور تو کر لیا گیا اور شراب خانہ کھلوا دینے کو عیب قرار دیدیا گیا - مہین غور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باپ نے شجاع کے میخانے بند نہیں کئے تھے بلکہ اپنی حکومت کی بیخ کنی کے لئے جہاں اور سختیاں اور ظلم کئے تھے ایک ظلم اور سختی یہ بھی تھی اور اس اندھا دھند عمل پر شریعت کا مزا اس نے اندھا ہو کر عمر بھر چکھا - پانچ چھ صدی پہلے کا ذکر ہے اس وقت فارس میں آج سے بہت زیادہ تعداد مغان آتش پرست کی تھی جن کی بنائی ہوئی شراب خصوصاً شراب شیراز ' دور دور ملکوں ملکوں جاتی تھی مغوں کا خاص کاروبار روزگار اور تجارت شراب تھی - مظفر کے اس سخت حکم اور یک لخت ممانعت سے ان کی تجارت برباد اور وہ تمام آبادی نادار اور تکڑوں کو محتاج ہونے لگی تھی ادھر جو لوگ عادی تھے وہ یکایک باز نہیں آسکتے تھے . خانگی کشید کر کے پیتے تھے اور بیچتے تھے - عقدہ کھل بھی جاتا تھا - ادھر مظفر کی شدت اور بےرحمی پر اعتبار کر کے بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سزائیں بھی شائستہ نہیں ملتی تھیں - درے پڑتے ہونگے اور کھال کھینچی جاتی ہوگی - یہ سب کچھ جس قدر حکم شرع کے مطابق تھا اس سے زیادہ شرع کے خلاف تھا - غیر مسلم آبادی کو شراب کی کشید و فروخت کی شہر سے باہر شرع میں ممانعت نہیں ہے - مظفر نے اس کو بالکل بر طرف کر دیا تو یہ اس کی عین جہالت اور تقشف تھا - شجاع نے تخت نشین ہو کر صرف یہ کیا کہ مظفر کے احکام ممانعت سے پہلے جو عمل درآمد تھا اس کو بدستور کر دیا - اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی سلطنت کی بنیاد بھی تھیں رہتی اور اصل شرع کی بھی کوئی تعمیل اس میں نہ تھی - اسی طرح دیگر امور میں بھی شجاع کا

دہل اصل شرع پر معلوم ہوتا ہے۔ حافظ صاحب کے اس شعر میں اس کو الزام و تحسین دونوں نکلتے ہیں :

از رسوم شرع و حکمت با ہزاراں اختلاف نکتۂ ہرگز نشد فوت از دل دانائے تو

یعنی شرع ظاہر سے سخت اختلافات کے باوجود بھی شجاع کا پائے ثبات ایمان قائم و برجا رہا۔ یہ ہے شجاع کے متعلق اصل رائے جو حافظ صاحب نے ظاہر فرمائی۔ علم و علما کے شوق صحبت اور اجتہاد پر رغبت سے شجاع کسی قدر اکبر کے ٹائپ کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ اکبر چونکہ خود عالم نہ تھا ظاہر اسلام پر قدم ایمان برجا قایم نہ رکھ سکا۔ شجاع چونکہ خود علوم عقلی و نقلی پر حاوی تھا اجتہاد علم پر عمل میں وہ دائرۂ شرع سے متجاوز نہ ہوسکا۔

۱۴ - اس عہد کے لوگوں نے نہ سلاطین الزمان بادشاہ دیکھے نہ ان کی حکومتوں میں کوئی زمانہ زندگی کا بسر کیا۔ ایک ہوا پر کہاں کھینچ لی جاتی تھی، بغداد و بخارا تہ تیغ بے دریغ کردیے جاتے تھے، دہلی قطب سے اجاڑ کر دولت آباد دکن میں لاکر آباد کردی جاتی تھی۔ ہم نے قریب زمانہ مرزا غالب کے نشو و نما پائی اور یہ دیکھ کر کہ مرزا لال قلعہ کے عضو معطل پنشن خوار کمپنی کی پچاس روپلی قلعہ کی تنخواہ کے لئے

اے شہنشاہ آسماں اورنگ اے جہاندار آفتاب آثار

کہہ کر خوشامد کرتے ہیں، قیاس کرلیا کہ ایسی ہی بلکہ اس کے زیادہ خوشامد خدا نخواستہ حضرت حافظ شیرازی بھی اپنے عہد کے فراعنہ کی کیا کرتے ہوں گے اور جس طرح مرزا نے بہادر شاہ کو نہ مبالغہ سے متجاوز دعا دی کہ :

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حضرت خواجہ حافظ نے بھی ایسی ہی زلل قافیہ دعا قوام الدین علی کو اس کے نام کے قطعہ میں دی ہے یعنی :

ہزار سال بقا بخشدت مدایم من چنیں متاع نفیسے بچوں تو ارزانی

اول تو یہ قطعہ ہمارے زیر نظر اور معلوم دیوان کے نسخوں میں نہیں ملتا اور حافظصاحب کےزمانہ سے نہایت قریب تر لکھے ہوے قلمی بادشاہی نسخے (مکتوب سنہ ۸۱۸ ھجری) میں تو یہ قطعہ ہے اور نہ کوئی قصیدہ، تاہم یہ تسلیم کرکے بھی کہ یہ قطعہ خاص الخاص حافظ صاحب کا ہی ہے اس میں کوئی خوشامد قوام الدین علی کی نہیں ہے اگر کچھہ نکلتی ہے تو اس مضمون میں کہ "میرے کلام کے طفیل و تصدق میں تیرا نام بھی ہزار برس تک قایم رہ سکے گا" اس کی کچھہ تحقیر ہی نکلتی ہے! حضرت کا اپنے کلام کے بقاء دوام کے واجبی احساس کی بنیاد پر یہ دعوی کچھہ بے بنیاد بھی نہیں ثابت ہوا ہے قریب چھہ سو برس کے تو قوام الدین علی کا نام اس قطعہ کی (حضرت کے دیوان کے کسی نسخہ میں شمولیت کی) بدولت قائم رہ ہی چکا ہے چار سو برس جو ہزار برس میں باقی ہیں وہ بھی کوئی شک نہیں کہ پورے ہوکر رہیں گے! بادعا میں چھ صدی تک تو علانیہ بھی ثابت ہو ہی چکا ہے کہ کوئی مبالغہ نہ تھا —

علی هذاالقیاس اس مصرع میں کہ :

دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش!

اور اس کے مابعد اشعار غزل میں حافظ صاحب نے جو کچھہ شجاع کو کہہ دیا ہے ایک سخت دلیری اور جرأت بلکہ جان سے ہاتھہ دھونے کا کام کیا ہے شجاع جاہل غبی اور نادان نہ تھا جو اپنی ہجو کو نہ سمجھتا جبکہ ناقد کو بھی بارجود بعد زمان و زبان اقرار ہے کہ حافظ صاحب نے ان اشعار میں شجاع کی رواداری شراب کا مذاق اوڑایا ہے، اسکو جان بوجھہ کر بھی تنقید میں یہ شایستہ الفاظ کہ :- حافظ بھی قصیدہ خوانی میں ایسا ہی تھا جیسے کہ دوسرے شاعر ! یہ تنقید کرنا نہیں تنقید کی ٹانگ توڑ دینا ہے -

شیر کے منہ میں ہاتھہ دے دینے کے بعد اس غزل میں چند لفظ اگر ایک مطلق العنان کے غصہ کی روک تھام کے لئے واقعی درج ہوجاتے تو حافظ صاحب نے جو دلیری کی تھی اسمیں کوئی فرق نہیں آسکتا تھا مگر تنقید میں یہ سمجھا گیا ہے کہ اشعار ما بعد میں شجاع کی محض خوشامد کی گئی ہے - اشعار یہ ہیں :

محل نور تجلے ست رائے انور شاہ چو قرب او طلبی درصفائے نیت کوش
بجز ثنائے جلالش مساز ورد ضمیر کہ ہست گوش دلت محرم پیام سروش

رموز مصلحت خویش خسروان دانند
گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش

ناقد اگر ان اشعار کو شجاع کی محض خوشامد شاعرانہ سمجھے ہیں تو ضرور انھوں نے اول دو شعر کے معنی یہ کئے ہیں کہ ۔ بادشاہ کا دل روشن تر اور نورِ تجلے کا (محل نہیں بلکہ) مقام ہے بادشاہ کے تقرب کے لئے اس کی لایلتی کی زنجیر ہلاتے رہنا چاہئے ہر وقت بادشاہ بادشاہ جپتے رہنا چاہئے اس واسطے کہ بادشاہ کیا ایک نبی اللہ ہے جبریل اس کے کانوں میں ہر دم تیاپیغوں پھونکتے رہتے ہیں! لیکن

ز شعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

ان شرایط سے متصف ہونا عام طور پر ممکن نہیں لیکن غور مزید و مکرر میں حضرت حافظ کی اس شاہکار غزل میں گوناگوں معانی کی جھلک بے تکلف نظر آ جائے گی۔ حافظ صاحب نے وہ سلسلۂ نصیحت جو بادشاہ کو بحیثیت ایک رند مدبر کے اشعار ماقبل میں فرما رہے تھے ترک نہیں کیا ہے نصیحت کی شان ان اشعار پر پھونچکو شاہانہ اور درویشانہ ہو جاتی ہے اور فرماتے ہیں کہ :—

"محلے دل (اے) بادشاہ محل نزول نور تجلی ہو (سک) تا ہے اس (خدا) کا قرب چاہے تو صفائے قلب میں سعی جاری رکھے سوائے اس کی ثنائے جلال کے دل کا وظیفہ کچھہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ دل کے کان محل نزول الہام ہیں مطلب یہ ہے کہ قلب صاف ہوگا تو

تو انسان اپنے ارادوں میں ملہم من اللہ ہوتا رہے گا اور
اچھی ہی بات اس کے دل میں آئے گی—

یہ عظیم الشان اور مفید کل معنی ان اشعار کے چھوڑ کر جو انہی الفاظ سے پیدا ہیں ' وہ معدود و مبتذل معنی شجاع جیسا نکتہ سنج بادشاہ تو لے نہ سکتا تھا ' صاحب تنقید کو اختیار ہے —

رند بنکر جو غزل سنانی شروع کی تھی آخر میں درویش بنکر اس کو ختم کرتے ہیں —

"گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش! کجا درویش گوشہ نشیں طالب حق
کجا معاملات دنیا و رموز سلطنت "۔

امور دنیاوی میں مصروفیت شغل درویشی کو سخت مضر اور منع ہے۔ ایک اور جگہ بھی آپ نے فرمایا ہے کہ :—

گفتگو آئیں درویشی نبود ورنہ با تو ماجرا ها داشتیم

الغرض حافظ صاحب خاموش ہوتے ہیں تو بادشاہ کو اچھی طرح سنا کو ڈانٹ کر ' نصیحت کر کے خاموش ہوتے ہیں اور خاموشی کی نہایت درجہ معقول وجہ پیش کرتے ہیں یعنے زیادہ بحث و تکرار میں پڑنے سے گریز کسی جبن و بزدلی کی بنیاد پر نہیں ایک وجہ معقول پر اس کی بنیاد ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کتنا فرق ہے حافظ صاحب کی اس توجیہہ خاموشی میں کہ:۔ گدائے گوشہ نشینے الخ اور حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کی اس تعلیم خاموشی میں جس کو تنقید میں بڑے ناز سے پیش کیا گیا ہے کہ زیر دستاں را نشاید جز سخن گفتن چنیں! حق بات کہنے سے سعدی نہ صرف خود خاموش رہتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی منع کرتے ہیں لیکن اگر بادشاہوں کے پیشدست جو زیر دست بھی ہوتے ہیں سچی بات کہنے سے اس نصیحت کے بموجب پرہیز کریں تو احوال عالم کیا ہو؟ اس کے برعکس حافظ صاحب

گدائے گوشہ نشین کے علاوہ کسی اور کو یہ تعلیم نہیں فرماتے اور آپ بھی خاموش ہوتے ہیں تو شجاع کو بزوک سنا کر خاموش ہوتے ہیں - حضرت شیخ نے ایک لفظ بھی بوبکر سعد زنگی اپنے ممدوح کو ہلاکو کی برات میں شاہ بالا بنکر بغداد جانے ' خلافت اسلام کو برباد کرنے ' مسلمانوں کا خون بہانے ' آل عباس (رض) کا نام و نشان مٹانے پر نہیں کہا - کہنے سے پیشتر ہی خاموشی پر کار بند ہوگئے اور دوسروں کو بھی اس عمل کا نمونہ خود بننے کے علاوہ صریح تعلیم بلکہ تاکید فرمائی ہے —

دو ایسے بزرگوں کو مقابلہ میں لانا مستحسن نہیں مگر تنقید میں اس ادب کا لحاظ نہ ہونے سے نا چار رفع غلط فہمی میں پڑنا پڑتا ہے تنقید میں اس رائے کا حافظ صاحب کی نسبت صاف اظہار کیا گیا ہے کہ حضرت شیخ سعدی نے کبھی اتنی خوشامد نہیں کی کہ وہ کسی کو ہزار سال زندگی کی دعا دیں - ہزار سال تک جینے کی دعا کا مفصل جواب اوپر گزر چکا ہے کہ وہ دعا تو ہے ہی نہیں ادعا ہے اور ایک بات ہے وہ بھی مخاطب کی تحقیر کی ! معہذا مبالغہ ثابت نہیں ہوی —

۱۵ - اب حضرت شیخ سعدی کے ان اشعار کو بھی دیکھنا ہے جن کا مصرع : زیر دستان رانشاید جز سخن گفتن چنین " حافظ صاحب کے مصرع " گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش " سے ٹکرا کر پاش پاش ہوچکا ہے - شیخ کے اشعار یہ ہیں —

خسروا غوث زمان !! بوبکر سعد !!! آنکہ اخلاقش پسندیدہ است و اصافش گزیں
مصلحت بود اختیار رائے روشن بین او زیر دستان را نشاید جز سخن گفتن چنیں

بغداد کی بیداد پر غوث زماں کہنے کے بعد آخری شعر میں اس ظالم

اظلم کے دست و بازو کو حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ دعائے فتح و نصرت و اقبال دیتے ہیں

روزگارش با سعادت باد و سعدی مدام گو رایتش منصور و بختش یار و اقبالش قرین

ناقد کہتے ہیں کہ "ہمارا شیخ کبھی کسی بادشاہ کو صاف اور سچ بات سنا دینے سے نہیں ڈرتا تھا" ہم کم سے کم شیخ کے معتقد سے ہی نہ ڈریں سنادیں اور سعدی کے ہی راگ میں سرملا دیں کہ

دست و بازوئے ہلاکو را ستودی سعدیا آفریں بر همت تو آفریں!! صد آفریں!!

تباہی بغداد کے جانگداز مرثیہ کے آخر میں حضرت شیخ کے ان اشعار کی مثل ایسی ہے جیسے انیس کے کسی پر سوز و دلخراش مرثیہ کے آخر میں یزید نہیں تو ابن زیاد (اس کے گرگہ) ہی کی تعریف کا ایک بند بڑھا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ ابوبکر سعد کو ہلاکو کی زبردستی گھسیٹ کر بغداد لے گئی ہو لیکن اس مرثیہ میں حضرت شیخ کو کیا چیز اسے صاف سنانے سے روک رہی ہے۔ یہ نہیں تو اس زنگی کی تعریف کے اشعار سے اس نفیس مرثیہ اسلام کو داغ لگانے اور مسلمانوں کے زخموں کی نمک پاشی پر کون بات مجبور کر رہی ہے؟ خوف جان ہے یا خرشاد؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے بلکہ ہم تو ادب کی نگاہ سے تنقید نگار کے اس فقرہ کو بھی مان لیتے ہیں کہ

"حافظ اور سعدی میں زمین آسمان کا فرق ہے"

بے شک! حافظ زمین اور سعدی آسمان ہیں۔ آسمان بھی کیسا جس میں چاند اور ستارے بھی نظر آرہے ہیں! ملاحظہ ہو

اگر شہ روز را گوید شب است این بباید گفت اینک ماہ و پروین

(گلستان)

حافظ مگر تر کے سارے کہتے ہیں

ما آبروے فقر و قناعت نمی دہیم با بادشاہ بگوے کہ روزی مقدر است

القصہ کہاں تک اس بحث کو طویل کیا جا سکتا ہے اور دو بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ طول دیا جاسکتا ہے - خاموش ہوجانا اور اقرار کرلینا بہتر ہے کہ حافظ شیراز اور حافظ (شاہ) شجاع اور حافظ اسلم سب " محض پوستی " اور صرف تنقید نگار " میری " ہیں --

اے چنگ فر و بردہ بخون دل حفاظ شرمت مگراز حرمت قرآن خدا نیست !

(حافظ)

تبصرے

نام کتاب	صفحہ
ادب	
اکبر الہ آبادی	۷۶۹
کلیات نظم حالی جلد اول	۷۷۲
یادگار نسیم	۷۷۳
تاریخ نثر اُردو	۷۷۴
ضحاک	۷۷۵
بہارستان عثمانی	۷۷۶
محشر خیال	۷۷۷
رود جہلم	۷۷۷
چینی اور جاپانی افسانے	۷۷۸
تعلیم	
اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب	۷۷۸
رہنمائے اُردو	۷۷۹
جغرافیہ ریاضی و طبعی	۷۸۰
جبر و مقابلہ	۷۸۰

نام کتاب	صفحہ
بچیوں کا قاعدہ	۷۸۱
مکمل ہندسہ عملی	۷۸۱
مذہب	
نبوت کا ظہور اتم اتمعروف نبیء کامل	۷۸۲
کتاب الحجاب	۷۸۲
مخزن نجات	۷۸۳
متفرق	
تلاش حق	۷۸۳
شوپنہار	۷۸۷
اُردو کے جدید رسالے	
چاند	۷۸۸
ادیب	۷۸۸
کوثر	۷۸۹
خیالستان	۷۸۹
(تصحیح)	۷۸۹

تبصرے

ادب

اکبر الہ آبادی،

(مولفۂ جناب طالب الہ آبادی - مطبع انوار احمدی الہ باد - صفات ۴۸۲
قیمت قسم اول مجلد سات روپے آٹھہ آنے ' قسم دوم مجلد پانچ روپے)

زمانۂ حال میں اردو کے تین بڑے شاعر ہوے ہیں جنھوں نے غزل کی تنگنا سے نکل کر شاعری کے صحیح مفہوم کو سمجا - تینوں کے کلام میں زمانے کا رنگ نظر آتا ہے - حالی کے کلام میں جو درد اور سوز و گداز ہے وہ کسی کو نصیب نہ ہوا - وہ مسلمانوں کی خانہ خرابی پر آنسو بہاتا ہے اور اس کے ساتھہ اس بگڑے ہوے گھر کے بنانے کا شوق دلاتا ہے - اقبال کا کلام جوش اور غیرت سے بھرا ہوا ہے - وہ مسلمانوں کو عمل کی دعوت دیتا ہے اور مغربی تہذیب اور ہندی اثر سے بچنے اور آئین اسلام پر قائم رہنے کی ہدایت کی ہے وہ چاہتا ہے کہ اسلام پھر سارے عالم پر چھا جاے اور دنیا کی خرابیوں کا علاج کرے - اکبر مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہے اور جب وہ

مسلمانوں کو اس رنگ میں دیکھتا ہے تو اس سے نہیں رہا جاتا اور ظرافت میں بجھے ہوے نشتر سے کام لیتا ہے - اس کے کلام کی بڑی خصوصیت ظرافت بلکہ طنز و تشنیع ہے اور اسے وہ اس مزے سے کہہ جاتا ہے کہ جن کے خلاف ہے وہ بھی لطف لیتے ہیں —

اکبر کے حالات اور کلام پر متعدد مضامین اور رسالے شائع ہو چکے ہیں لیکن طالب صاحب نے جس تحقیق اور محنت اور تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام کی خوبیوں کو دکھایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا - وہ اکبر کے سچے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس کے ساتھہ صحیح ذوق رکھتے ہیں، تلاش اور جستجو سے گھبراتے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکبر کے جو حالات محنت اور تحقیق سے جمع کئے ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا، اور اس سے زیادہ امید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے - حالات سے زیادہ ان کے کلام سے بحث کی ہے اور مختلف عنوانات کے تحت میں ان کے کلام کا بہترین انتخاب بڑے سلیقے سے اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ جن کو اکبر کا ضخیم کلیات مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں وہ اسے پڑہ کر بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں - کلام کے بعد ان کے بیشمار خطوں کے اقتباسات اس خوبی سے دئے ہیں کہ ان کی زندگی کے ظاہر و باطن کا سارا حال آشکارا ہو جاتا ہے - اکبر کے خطوں میں بہت کم وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام میں ہیں —

اکبر مذہبی شخص ہیں مگر متعصب نہیں - وہ پرانی وضع کے سچے مسلمان ہیں وہ اس وضع پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی وضع میں دیکھنا چاہتے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نئے خیالات امڈے چلے آتے تھے اور پرانے خیالات کے پانوں اکھڑ رہے تھے کہ اکبر نے مشرقی تہذیب کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور مغربی تہذیب کے شیدائیوں کی حماقتوں اور فضولیوں کی ہنسی اڑانی شروع کی - وہ علی گڈہ کی جدید تحریک پر زہر میں بجھی ہوی چوٹیں کرتا ہے، وہ بے پردگی پر طرح طرح کی پھبتیاں کہتا ہے اور نئی تحریکوں اور جدید خیالات کا خوب خاکہ اڑاتا ہے - وہ والٹیر کا بالکل ضد ہے - اس کا خیال ہے کہ یورپ کی مادیت سے اسلام اور اسلامی تہذیب خطرے میں ہے اور ان کو مغربی

سائنس اور فلسفے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے - " نئی روشنی کا سخت دشمن ہے اور اس کی طرح طرح تضحیک کرتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جدید خیال کے دیو کو پست کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ سامنے سے لڑ رہا ہے اسے ایسے کوتہ اندیش ہندی جو اپنی ظاہری طرز معاشرت میں یورپینوں کی نقالی کرتے ہیں ایک آنکھہ نہیں بھاتے - ان کے خلاف اس کا غصہ اور اس کی نکتہ چینی سچے دل سے ہوتی ہے —

اس کا طرز شستہ اور ظریفانہ ہے - لیکن اس کے اشعار ہمیشہ بے عیب نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ لفظوں کے الٹ پھیر اور قافیہ بندی سے بہت کچھہ اثر پیدا کرنا چاہتا ہے - اکثر شعر محض قافیہ کے خاطر کہے ہیں ' وہ شعر شعر نہیں رہے لطیفے ہوگئے ہیں - اس میں بہت کچھہ شبہ ہے کہ آیندہ نسلوں میں بھی وہ ایسا ہی مقبول ہوتا جیسا وہ اپنے زمانے میں تھا یا آج کل ہے- اس کا فیصلہ کرنا ابھی مشکل ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے شعرا میں تھا یا نہیں' لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے رنگ میں بے نظیر ہے اور اس کی تقلید نہایت مشکل ہے —

مذہب پر اکبر کا بہت بڑا اعتماد تھا وہ ایک باخدا اور صوفی منش آدمی تھے - لیکن ساتھہ ہی وہ بہت بزدل اور ڈرپوک بھی تھے - اس اعتقاد پر یہ بزدلی بہت حیرت انگیز ہے —

زمانہ انتقام لئے بغیر نہیں چھوڑتا اکبر جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے سخت دشمن تھے اپنی اولاد کو اس سے نہ بچا سکے اور خود انہوں نے ان کو وہی تعلیم دلائی جس کی وہ عمر بھر مخالفت کرتے رہے —

طالب صاحب نے اکبر کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جہاں کہیں ان کو کوئی سقم نظر آیا ہے تو اسے بھی بے تکلف ظاہر کر دیا ہے - اس سے قبل جن صاحبوں نے اکبر پر کچھہ لکھا ہے ان پر کسی قدر سختی سے تنقید کی ہے خاص کر مولف تاریخ ادب اردو پر - واقعات کی تحقیق میں لغزش ہوھی جاتی ہے اس پر اس قدر تشدد درست نہیں خصوصاً جب کہ لکھنے والے کی کوئی بد نیتی نہ ہو- اس کتاب میں طالب صاحب نے دو جگہ اس مشہور قطعہ کو جس کا دوسرا

مصرع " دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا " ہے، سودا سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ یہ قطعہ قاضی محمد صادق خاں اختر کا ہے اس قسم کی لغزشوں سے کوئی پاک نہیں اور اس لئے ایسی فروگزاشتوں پر سختی سے نکتہ چینی کرنا جائز نہیں —

ہم طالب صاحب کی محنت، تحقیق اور ذوق کی دل سے داد دیتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تمام اہل ذوق اس کتاب کی قدر کریں گے —

کلیات نظم حالی جلد اول

(مرتبۂ محمد اسمعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری
پانی پت قیمت-قسم اول دو روپے بارہ آنے قسم دوم ایک روپیہ بارہ آنے)

اس جلد میں صرف قطعات، غزلیات اور رباعیات ہیں - بہت سی نئی غزلیات اور رباعیات جو دیوان حالی میں نہیں ہیں اور اس کے طبع ہونے کے بعد لکھی گئی ہیں وہ بھی اس میں شریک کردی گئی ہیں - اس سے قبل شیخ محمد اسمعیل صاحب نے جواہرات حالی کے نام سے ایک مجموعہ طبع کیا جس میں بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن کی خبر تک نہ تھی یا جو متفرق طور پر بعض رسالوں یا اخباروں وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شایع ہوئی تھیں شیخ محمد اسمعیل صاحب نے یہ ایسا اچھا کام کیا ہے کہ بے اختیار ان کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے - ہمیں امید ہے کہ وہ کلیات حالی کے باقی حصے بھی جلد طبع کرنے کا انتظام کریں گے کیونکہ مولانا حالی مرحوم کا کلام اردو زبان کا سرمایہ افتخار ہے اور جوں جوں زمانہ بڑھتا جائیگا اس کی قدر بھی بڑھتی جائے گی —

کتاب بہت صاف اور اچھی چھپی ہے اور صحت کا خاص اہتمام کیا ہے —

یادگار نسیم

" مرتبہ مولوی اصغر حسین صاحب اصغر مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد صفحات ۱۱۶ بڑی تقطیع لکھائی چھپائی اچھی کاغذ عمدہ قیمت درج نہیں"

مثنوی گلزار نسیم کسی تعارف کی محتاج نہیں - یک ربع صدی قبل چکبست و شرر کے معرکہ نے اس کو غیر معمولی شہرت اور اہمیت بخشی ہے اس زمانے کے مشہور رسالوں مثلاً اردوے معلی ' دلگداز ' پیام یار ' اتحاد اور اودھ پنچ وغیرہ میں اس پر خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں اور عرصہ تک مشہور ادیب اس ادبی مہم میں شریک رہے اردو زبان کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس مثنوی کی طرح تنقیدی نزاع کا موجب رہی ہو —

جناب اصغر حسین صاحب نے طلبہ کے لئے اس کو مرتب کیا ہے اور آخر میں ۱۲ صفحوں پر نسیم کے دیوان کا انتخاب بھی دیا ہے - حاشیہ پر فرہنگ الفاظ اور تشریح بھی درج ہے جو طلبہ کے لئے مفید ہے اس طبع میں بعض ایسے اشعار حذف کردئے گئے ہیں جن کا طلبہ کی نظر سے گزرنا بزعم مرتب مناسب نہیں

فاضل مرتب نے شروع میں ۴۶ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں نسیم کے مختصر حالات ' مثنوی کی سرسری تاریخ اور گلزار نسیم کی خصوصیات ' سے بحث کی ہے - گلزار نسیم اور سحرالبیان کے موازنہ کے الجھڑے میں پھنسنے کی بجائے فاضل مرتب نے مولانا حالی پر اعتراض کرتے ہوے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں کا موازنہ صحیح نہیں - اس میں شبہ نہیں دونوں مثنویوں کی رویداد جدا ہے زمانہ اور ماحول جدا ہے تاہم بحیثیت صنف نظم کے دونوں کے موازنے میں بہر طور گنجائش ہے - اور یہاں سحرالبیان کو جو تفوق حاصل ہے وہ مسلم ہے ' گلزار نسیم کو اس کے مقابلے میں لانا حقیقت میں غلطی ہے —

سحر البیان ایک حد تک تخلیقی مثنوی ہے اور گلزار نسیم ماخذ - گلزار نسیم کی رویداد کی ترتیب مصنف کی ذاتی نہیں ہے نسیم نے نثر کے ایک قصہ کو نظم کا

جامہ پہنایا ہے جیسا کہ خود وہ لکھتے ہیں —

افسانہ گل بکاولی کا افسوں ہو بہار عاشقی کا
ہر چند سدا گیا اس کو اردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے داد نظم دوں میں اس مے کو دو آتشہ کروں میں

مقدمہ میں مثنوی پرجو تبصرہ کیا گیا ہےوہ بالکل اسی انداز میں ہے - چند مخصوص عنوان ہیں، جن کے تحت عموماً اشعار نقل کردیے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تشریح و توضیح بھی ہوتی ہے - اس سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا - فاضل مرتب نے نسیم کا " عام رتبۂ شاعری " کا جو عنوان قایم کیا ہے اس پر دو صفحہ لکھے ہیں لیکن اس سے نسیم کی شاعری میں کوئی جگہ متعین نہ ہوسکی —

فاضل مرتب نے بہت محنت سے اس کو ترتیب دیا ہے - طلبہ کے لئے یہ ایڈیشن مفید ہے - شروع میں گل بکاؤلی کی ایک تصویر بھی ہے —

(چ)

تاریخ نثر اردو

مرتبہ جناب مولوی احسن صاحب مارہروی اردو لکچرار اینگلو عربک کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تقطیع اوسط درجہ کی ۲۰۰ صفحات ۲۱۰ - لکھائی چھپائی اچھی قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

اس کتاب میں سنہ ۱۰۸۰ ھ سے موجودہ زمانے تک کے اردو نثر کے نمونے نقل کئے گئے ہیں - اس کے کل چھ باب ہیں - ہر باب سو سال کا ہے-یہ التزام کسی خاص اصول پر مبنی نہیں بلکہ کتاب کی تبویب میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے - خود مرتب نے صفحہ ۱۵۷ پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے ہر دور کی ضمن میں متعدد نمونے درج ہیں اور ان پر تبصرہ بھی ہے - اس میں " مذہبی ، اخلاقی ، طبی ، سیاسی ، قانونی ، دفتری ، مکتوبی ، اخباری، تقریری، اشتہاری " ہر قسم کی نثر کے نمونے موجود ہیں جن کی تلاش میں ظاہر ہے کہ کیا کچھ کھکیڑ نہ اٹھانی پڑی ہوگی —

کتاب کا نام سننے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ نثر اردو کی کوئی مستقل اور اصولی تاریخ ہوگی، لیکن خود فاضل مرتب نے سر ورق پر اس کی تشریح کردی

ہے کہ اس میں صرف نمونے ہیں - اس کا تاریخی نام نہایت موزوں ہے یعنی "نمونۂ منشورات" - اگر یہی نام ہوتا تو مناسب تھا ورنہ " تاریخ نثر اردو " سے شبہ ہوتا ہے -

شروع میں فاضل مرتب نے ۳۸ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں نثر اردو کے متعلق کسی قدر جامعیت سے بحث کی ہے - اس میں وہ تمام مسایل ہیں جو نثر اردو سے متعلق ہیں اور جن پر بہت سنجیدگی اور محنت سے تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے —

فاضل مرتب کا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ سے معمولی طالب علم بھی نثر اردو کی تدریجی ترقی کو بخوبی و بآسانی سمجھ سکتا ہے - ہمارا خیال ہے کہ اس کی ترتیب کچھہ ایسی ہے کہ طالب علم کا طایر فہم اس جال سے بمشکل رہائی پا سکتا ہے —

اس کتاب سے نثر اردو کی تدریجی ترقی کا اندازہ ٹھیک طور سے نہیں ہوسکتا البتہ مختلف نمونے یکجا مل جاتے ہیں جن کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں دفتری مراسلوں اور اشتہاروں سے جو عموماً معمولی نیم تعلیم یافتہ محرروں کے لکھے ہوے ہوتے ہیں نثر اردو کی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، ہر لکھی ہوی چیز ادب میں داخل نہیں ہوسکتی اگر ایسا ہی ہے تو معمولی ناٹکوں کے اشتہار بھی اس میں جگہ پاسکتے ہیں - اس میں شبہ ہے کہ ان کی زبان خاص ہوتی ہے ' لیکن ان کا ادب میں شمار نہیں ہو سکتا —

فاضل مرتب نے بہت تلاش اور محنت سے کام لیا ہے اور بہت خاص انداز میں لکھا ہے جس میں کہنہ مشقی اور استادی کی خوبیاں موجود ہیں —

ج

ضحاک

(مترجمہ جناب اختر شیرانی - پنجاب
اردو اکاڈیمی لاہور - قیمت ایک روپیہ)

اختر شیرانی صاحب نے اس ڈرامے کو اردو کا جامہ پہنایا ہے یہ نہ کُھلا کہ اصل

ڈرامہ کس زبان میں لکھا گیا ہے سرورق پر مترجمہ جناب اختر شیرانی صاحب " دیکھہ کر معاً خیال ہوا کہ غالباً مقدمہ میں اس کی تصریح کردی گئی ہوگی کہ اصل کس زبان میں ہے - مگر " سامی " صاحب کے ساڑھے تین صفحے کے مقدمہ میں سب کچھہ ہے سوائے اس کے جس کا ہونا از بس ضروری تھا - باوجود ۳۶ خطوط فاصل (Dash) کے جو ان ساڑھے تین صفحوں میں استعمال کئے گئے ہیں (اور خطوط فاصل عموماً توضیحی ہوا کرتے ہیں) اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آخر کس زبان سے اس ڈراما کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اس کا اصلی مصنف کون ہے - طرز خطاب اور اسلوب بیان سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ غالباً " سامی " صاحب اختر شیرانی صاحب کا دوسرا تخلص ہے - بہر حال یہ سب باتیں عجیب طور پر الجھی ہوئی ہیں - اچھا ہوتا اگر اس مقدمہ میں تعقید سے زیادہ توضیح کی کوشش کی جاتی

اس ڈرامے میں ضحاک کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اسنے جمشید کی حکومت پر قبضہ و تصرف حاصل کرنے کے بعد ایرانی قوم کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا - فردوسی نے شاہنامہ میں اس قصہ کو بیان کیا ہے مگر چونکہ اس کی اصلی غرض تاریخ نویسی نہ تھی بلکہ ایسے اساطیری کارنامون کو بیان کرنا تھا جو ایرانی قوم کے دلوں کو گرمائیں اور انہیں عمل اور حوصلہ کے لئے اکسائیں اس لئے تاریخی اعتبار سے ان افسانوں کو جانچنا سراسر غلط ہے اور مقدمہ میں جو یہ دعوی کیا گیا ہے کہ " تاریخ ہمارے ڈرامے کی تکذیب نہیں کر سکتی " غیر ضروری ہے - تاریخ اور ڈرامے کی حدود اور قدور الگ الگ ہیں —

ترجمہ اچھا خاصہ ہے مگر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ اس کتاب کو ترجمہ کے لئے کیوں چنا گیا - اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنی زبان میں ترجمہ کے لئے دوسری زبانوں کے صرف ان شہ پاروں کو لیں جن سے ہمارے علوم و ادب کو کسی قسم کے استفادے کی امید ہو —

(ی)

بہارستان عثمانی

(جناب مولوی محمد احمد خان صاحب برتر وکیل -
اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدر آباد دکن)

برتر صاحب نے یہ نظم مسدس کے طرز میں اعلیحضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ کی مدح میں لکھی ہے - یہ محض قصیدہ خوانی نہیں بلکہ اس عام ترقی اور فلاح رعایا اور ہنر پروری کے حقیقی واقعات پر مبنی ہے جو ریاست حیدرآباد کو اس عہد ہمایوں میں حاصل ہوی ہے —

محشر خیال

(مرزا محمد عسکری علی خان صاحب
مجازی لکھنوی - ادب لکھنو - قیمت دو آنے)

یہ مجازی صاحب کی چند نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے - اس میں شاعر نے اپنے افکار حکیمانہ کو نظم کی صورت میں ظاہر کیا ہے اور جو دل میں ہے وہ لفظوں میں ادا کردیا ہے- ان دو تین اشعار سے ان کا رنگ معلوم ہوجائے گا —

گر تجھکو میں چاہوں اے دنیا تو تیرے مزے سب جھوٹے ہیں
گر تجھکو میں چھوڑوں اے دنیا تو چھوڑ کے تجھکو جاؤں کدھر

زیست وہ کیا کہ جو ہو دور عدم میں محدود ایسی ہستی سے تو سو بار فنا بہتر ہے
یاالٰہی تو مجھے پھر سے گرفتار نہ کر مجھکو جنت میں بھی رہنے سے فنا بہتر ہے

رود جہلم

(قاضی محمد رمضان صاحب تبسم اورنٹیل ٹیچر ہائی اسکول
وزیر آباد پنجاب-چھوٹی تقطیع دارالعلم وزیر آباد -قیمت دیڑھ آنہ)

دریائے جہلم کی طغیانی سے جو تباہی اور بربادی نازل ہوئی تھی اس کا شکوہ اور رونا ہے - یہ نظم تبسم صاحب نے ڈوگرل ایجوکیشنل کانفرنس تقسیم راولپنڈی کے اجلاس میں پڑھی تھی - انہیں کی چند نظموں کا مجموعہ " حیات تبسم" کے نام سے بھی شائع ہوا ہے یہی تقطیع اور یہی قیمت ہے نظمیں حسب ونصف میں ہیں —

چینی اور جاپانی افسانے

(مرتبہ عبدالقادر صاحب سروری معاونین محمد غفارالدین و معز خواجہ معین‌الدین صاحبان چھوٹی تقطیع صفحات ۱۷۱ - لکھائی چھپائی معمولی قیمت ۹ آنے ملنے کا پتہ مکتبہ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن)

عبدالقادر صاحب سروری کی کتابوں پر اس سے قبل تبصرے کئے جا چکے ہیں وہ افسانوی ادب کے متعلق بڑی محنت سے کام کر رہے ہیں اور دنیا کے مشہور افسانوں کا اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں - اس کتاب میں تین چینی اور تین جاپانی افسانوں کا ترجمہ ہے ترجمے انگریزی ترجموں کی مدد سے کئے گئے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ترجمہ در ترجمہ میں زبان اور بیان کی خوبی برقرار نہیں رہ سکی - ترجمے بھی کافی احتیاط اور محنت سے نہیں کئے گئے - اسلوب بیان اکھڑا اکھڑا سا ہے جو افسانوں میں خصوصاً بہت معیوب ہے —

(چ)

تعلیمی کتابیں

اردو کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب

(زنانہ مدارس کے لئے - مرتبہ جناب محمد نصیر ہمایوں صاحب بی - اے ، پنجاب پرنٹنگ اور بک ڈپو ، انار کلی - لاہور)

یہ تین کتابیں لڑکیوں کے لئے جناب محمد نصیر ہمایوں صاحب نے مرتب کی ہیں - بہت اچھی چھپی ہیں اور ترتیب بھی اچھی ہے - عبارت بھی ہر جماعت کی استعداد کے مطابق ہے - ہر کتاب میں دو چار سبق ایسے بھی ہیں جو خاص لڑکیوں کے لئے ضروری ہیں ورنہ یوں لڑکوں لڑکیوں کی کتابوں میں کوئی فرق

نہیں اور ہو بھی کیا سکتا ہے - محمد نصیر ہمایوں صاحب جو اردو میں تعلیمی اور ادبی کتابوں کے شائع کرنے میں خاص طور پر لگاتار کوشش کر رہے ہیں، ہمارے شکریے کے مستحق ہیں —

رہنمائے اُردو

(مولفہ جناب محمد لطیف اللہ صاحب خستہ - دو جلدیں
بڑی تقطیع، صفحات جلد اول ۲۲۳ - جلد دوم ۲۴۰ - قیمت
درج نہیں - ملنے کا پتہ قریشی ہاؤس مقامہ -)

یہ نظم و نثر کا انتخاب ہے - لایق مولف نے اس کو طلبۂ بہار و بنگال کے لئے مرتب کیا ہے - ہر جلد میں دو حصے ہیں ایک نثر کا اور ایک نظم کا - نثر کے حصے میں مضامین زیادہ تر خالص ادبی ہیں - اگر اس انتخاب میں مختلف موضوعوں پر مضامین ہوتے اور مختلف علوم و فنون کے ابتدائی اور ضروری مسائل پر سلیس اور پاکیزہ عبارت میں مضامین لکھے جاتے تو مناسب تھا اس سے ایک طرف تو طلبہ کے معلومات میں اضافہ ہو جاتا اور وہ مختلف موضوعوں پر لکھنے کا ڈھنگ معلوم کرتے - موضوع کے ساتھ زبان اور بیان بدل جاتے ہیں، ہر موضوع کے لئے ایک خاص اسلوب بیان اور زبان کی ضرورت ہے، اگر طلبہ کو خالص ادبی مضامین پڑھائے جائیں تو ان کو لکھنے اور اظہار خیال کے ادا کرنے کا ڈھب نہیں آسکتا - نظم کے حصے میں مختلف موضوعوں پر نظمیں بھی ہیں، اور غزلیں بھی - بعض نظمیں اچھی ہیں باقی بھرتی کی - حصۂ نظم میں اردو نظموں اور غزلوں کے ساتھ لایق مرتب نے نہ معلوم کس رو میں زیب النسا مخفی کی شاعری کا موازنہ کرنے کے لئے فارسی اشعار بھی نقل کردیے ہیں - اخیر میں ۳۲ صفحوں پر شعرائے 'بہار' کی غزلیں درج ہیں —

معلوم ہوتا ہے لایق مولف کو اس کام میں بہت محنت اٹھانی پڑی، انہوں نے نہ صرف ادیبوں اور انشا پردازوں کے مضامین جمع کئے ہیں بلکہ خود بھی مضامین لکھے ہیں جن کی تعداد نصف کے قریب ہے - اگر لایق مولف ذرا تلاش سے کام لیتے تو ان کو مختلف موضوعوں پر بہترین مضامین مل جاتے، اس لیے انتخاب میں

تلوع اور تازگی بوی پیدا ہوجاتی اور مولف بھی خامہ فرسائی کی زحمت سے بچ جاتے - بصورت موجودہ یہ انتخاب ۳۰ سال پہلے کا معلوم ہوتا ہے جس میں اصلاح کی ضرورت نظر آتی ہے —

ہماری دلی تمنا ہے کہ اس انتخاب سے لایق مولف کا وہ مقصد پورا ہوجاے جس کا اظہار انھوں نے سرورق پر کیا ہے —

" ہندوستانی طلبہ کی دماغی ' اخلاقی ' معاشرتی ' تاریخی ' علمی اور ادبی ترقی اور مفید معلومات و انکشافات اور ان کے چال چلن و بری عادتوں کی اصلاح کے لئے لکھی گئی " —

(چ)

جغرافیہ ریاضی و طبعی

مولفہ سید انوار حسین صاحب بی - اے ' چھوٹی تقطیع ' صفحات ۶۲
قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراھیمیہ حیدر آباد دکن

مولف نے میٹرک کے طلبہ کے استفادے کے لئے اس کو مرتب کیا ہے - اس میں جغرافیے کی دو مشکل اور اہم قسموں ریاضی و طبعی سے بحث کی گئی ہے ' اور تمام مضامین مختصر طور سے سمجھاے گئے ہیں - مضمون کی اہمیت پر نظر کرتے ہوے یہ کتاب بہت مختصر ہے اور اکثر مسائل تشنہ اور غیر واضح ہیں - اصطلاحات کی بھرمار ہے اور وضاحت کی کمی - یہ ان طلبہ کے لئے مفید ہے جو محض امتحان کامیاب کرنا چاہتے ہیں —

(چ)

جبر و مقابلہ

مرتبہ سید انوار حسین صاحب بی - اے چھوٹی تقطیع صفحات ۱۵۰ قیمت درج نہیں ملنےکا پتہ - مکتبہ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن-

یہ چھٹی اور ساتویں جماعتوں کے طلبہ کے لئے مرتب کیا گیا ہے - اس میں

مساوات مفرد تک کے مسایل ہیں - ہر قاعدے کی حل شدہ مثلیں بھی ہیں اور عبارتی سوالات بھی - امتحانی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت مفید ہے - لکھائی چھپائی اچھی نہیں اور غلطیاں بھی بہت ہیں - جو کتابیں طلبہ کے لئے لکھی جائیں ان میں صحت کا بطور خاص لحاظ رکھا جانا چاہئے اور خصوصاً ریاضی و حساب کی کتابیں ' ورنہ ایک ہندسے کی غلطی سے غریب طالب علم پریشان ہوجاتا ہے اور گھنٹوں غلط سوال کے حل کرنے میں سرگرداں رہتا ہے —

(چ)

بچیوں کا قاعدہ

مولفہ مولوی سید مختار احمد صاحب و مولوی ذہین صاحب
چھوٹی تقطیع صفحات ۲۲ - ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ -

چھوٹی لڑکیوں کو حروف تہجی سے روشناس کرانے اور اعراب کے استعمال سے واقف کرانے کے لئے یہ قاعدہ مفید ہے - کوئی خاص بات اس میں نہیں —

(چ)

مکمل ہندسہ عملی

مرتبہ محمد منیر الدین صاحب بی - اے ' چھوٹی تقطیع صفحات ۱۶۰ - قیمت ایک روپیہ چار آنے ' ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

سرکار عالی کے مدارس کی جماعت میٹرک کے لئے یہ کتاب تالیف کی گئی ہے مرتب نے کافی محنت سے کام لیا ہے اور طلبہ کو امتحان کی تیاری میں سہولت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے —

(چ)

مذہب

نبوت کا ظہور اتم المعروف نبیء کامل

(مولنہ خواجہ کمال الدین صاحب مسلم بک
سوسائٹی عزیز منزل، برانڈرتھ روڈ لاہور)

خواجہ صاحب نے یہ کتاب نواب بیگم صاحبہ مرحومہ والیہ ریاست بھوپال کی یادگار میں تالیف فرمائی ہے - جس پر ۳۲ صفحے کا مقدمہ لارڈ ہیڈلے نے تحریر کیا ہے - خواجہ صاحب اس فن کے استاد ہیں اور انہوں نے ایک عمر اس میں صرف کی ہے - مناظرے اور چھیڑ چھاڑ کا رنگ اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہے اور اس سے بچنا مشکل ہے - ان امور میں خواجہ صاحب کی نظر بہت وسیع ہے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں زمانہ کے رنگ کے لحاظ سے بہت سی کام کی باتیں آجاتی ہیں - شروع میں بہت دلچسپ دیباچہ ہے - اس کے بعد پہلے باب میں حلیۂ مبارک، دوسرے میں انبیاء اللہ بشکل اسوہ، تیسرے میں آنحضرت سے پہلے دنیا کی حالت، چوتھے میں بعثت عظمیٰ پانچویں میں شخصیت کامل، چھٹے میں مکمل سیرت، ساتویں میں حصول منتہاے کامیابی، آٹھویں میں بہترین معلم دین نویں میں عقائد مذہبی کا اعلیٰ ترین شارح، دسویں میں اسوۂ حسنہ گیارھویں میں مجموعۂ حسنات پر بڑی مفصل اور مکمل بحث کی ہے گویا سینکڑوں کتابوں اور مدتوں کے غور و فکر کا نچوڑ ہے —

کتاب الحجاب

(مولنہ مہاں حبیب الرحمان صاحب رئیس
حاجی پورہ ریاست کپورتھلہ قیمت چھے آنے)

اس رسالے میں نقل و عقل سے پردے کا جواز ثابت کیا گیا ہے - قابل مولف نے پردے کے اس تشدد کو جائز رکھا ہے جو عموماً اس وقت ہندوستان میں رائج ہے - ان کے خیال میں ہندوستان کا اور خاص کر شرفاے ہندوستان کا پردہ ہی اصل پردہ اور شرعی

پردہ ہے - ان کی رائے میں عورتیں حتی الوسع ڈولی میں سفر کریں - عورت گھر کی چار دیواری ہی میں رہے - آواز بھی ان کی نہ سنائی دے - اگر نکلیں تو رات کو باہر نکلیں وہ بھی خاص اہتمام سے - ایسی عورتوں سے تو پنجرے کے طوطے مینائیں اچھی - یہ پردہ یا جلم قید - مولف نے پردے کی تعریفیں ہی تعریفیں لکھی ہیں ان کو پردے میں کوئی مضرت کسی قسم کی نظر نہیں آتی - یہ بالکل یک طرفہ رائے ہے —

مخزن نجات

(پہلا حصہ - مترجمہ شرف الدین احمد خاں صاحب - چھوٹی تقطیع صفحات ۱۶ ' مطبوعہ مطبع معارف - اعظم گڑھ قیمت دو آنے)

مولانا عبدالرحمن جامی رح نے آنحضرت (صلعم) کی چالیس حدیثیں جمع کی تھیں جو اخلاق حسنہ پر مبنی تھیں - ان کا ترجمہ شرف الدین احمد خاں صاحب نے سلیس اردو میں مخزن نجات کے نام سے شائع کیا ہے —

متفرق

تلاش حق

(مہاتما گاندھی کی آپ بیتی - مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ' بی ایچ - ڈی قیمت جلد اول ایک روپیہ کلدار جلد دوم ایک ایک روپیہ کلدار - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے)

مہاتما گاندھی نے اس کتاب میں اپنی زندگی کی آپ بیتی کہانی بیان کی ہے - بچپن سے لیکر ناگپور کی کانگریس تک کے وہ سب حالات اس میں آجاتے ہیں جن کا تعلق ان کی زندگی سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے - یہ حالات اصل میں گجراتی زبان میں لکھے گئے تھے پھر دیسائی جی نے انہیں انگریزی کا جامہ

پھیلایا - انگریزی کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کی متعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ نکل چکا ہے - " تلاش حق " کے نام سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اردو میں مہاتما جی کی اس آپ بیتی کو منتقل کیا ہے - مہاتما جی کے اسلوب بیان کی صفائی سادگی اور دلپذیری کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اِس سلیقہ سے ترجمہ میں قایم رکھا ہے کہ کتاب کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے —

آپ بیتی ادب کی ایک بڑی اہم صنف ہے - ہر اعتبار سے اس صنف کی سب شرطوں کو پورا کرنا اور نبھانا بہت مشکل کام ہے - اس صنف ادب کی بنیادی قدر (Value) خلوص ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنس گرامی دنیا میں کمیاب ہے - روسو کی آپ بیتی " اعترافات " دنیا کی بہترین ادبی کتابوں میں سے ہے مگر اس پر بھی ادب کے مبصروں اور نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بعض جگہ روسو بھی خلوص کی جانچ پر پورا نہیں اترتا - مگر مہاتما جی کی آپ بیتی پر ادب کا بڑے سے بڑا نقاد بھی یہ اعتراض نہیں عاید کرسکتا کہ اس میں خلوص اور صاف گوئی کی کمی ہے - اس لئے یہ دعوی غالباً غلط نہیں ہوگا کہ ساری دنیا کے اس مخصوص صنف ادب میں جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے مہاتماجی کی آپ بیتی چوٹی کی کتابوں میں سمجھی جائیگی —

اس میں مہاتماجی نے اپنی شخصیت کو کھول کر رکھ دیا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں - اس کے لئے بڑی اخلاقی جرات درکار ہے - یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو خوب اجاگر کرکے دکھانا چاہتا ہے اور بعض اوقات یہ ذوق نمود اس کی زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہوجاتا ہے جتنا کہ کھانا پینا یا سانس لینا - اس کی شخصیت کے بعض دوسرے گوشے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں وہ اس طرح چھپاتا ہے جیسے کوڑھی اپنے کوڑھ کو - آپ بیتی لکھتے وقت انسانی طبیعت کے ان دونوں رخوں میں اعتدال قائم کرنا لکھنے والے کی ذہنی اور روحانی تہذیب کے کامل ہونے پر دلالت کرتا ہے - مہاتماجی نے اپنی زندگی کے ان دونوں رخوں کو جس صاف گوئی سادگی اور ضبط سے بیان کیا ہے وہ نہ صرف ان کی اعلیٰ روحانیت بلکہ بحیثیت ایک ادیب کے ان کے بلند مرتبہ پر دال ہے ضبط اور خلوص ، ادب کی جان ہیں اور یہ دونوں ان کی تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہیں —

اس پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد جو چیز مہاتماجی کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی زندگی کا اخلاقی پہلو ہے - ان کی زندگی دراصل اخلاقی تجربوں کی ایک مسلسل داستان ہے - وہ دنیا کی ہر خوبی اور اچھائی کو اخلاقی معیار کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں - اخلاق ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے اور اس کی بنیادیں مضبوط مذہبی عقائد پر مبنی ہیں - ان کے نزدیک مذہب اور اخلاق کوئی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کا مجموعی اثر ان کے اعمال کو استقلال اور ان کے ذہن کو تشفی بخشتا ہے- مہاتماجی اپنے اخلاقی معیار کو زندگی کے ہر پہلو پر منطبق کرتے ہیں - مثلاً وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ چرخہ کاتتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اس سے بڑھکر ان کے نزدیک دنیا میں اور کوئی موسیقی نہیں - ان کا یہ دعوی شخصی تجربہ پر مبنی ہے - ممکن ہے کہ اور کوئی دوسرا شخص جو حسن صوت کے دوسرے معیاروں کا قائل ہے' مہاتماجی کے اس دعوے کی تائید نہ کرے - لیکن اگر اس دعوے کو اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہو کہ یہ دعوی اسقدر غلط نہیں جتنا سطحی طور پر نظر آتا ہے - مہاتماجی چرخے کی ترویج ایک اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور انکا خیال ہے کہ اسکی بدولت لاکھوں انسانوں کی بے بسی اور معذوری دور کی جاسکتی ہے چنانچہ وہ چرخہ کی موسیقیت کا دعوی کرتے وقت حسن صوت کے معیار کو نہیں بلکہ اخلاقی معیار کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں - آپ دیکھیں گے کہ سب مشاہیر کی زندگیوں میں آپ کو بعض ایسی باتیں ملیں گی جنھیں نہ جاننے والے تنگیٔ خیال سے تعبیر کرتے ہیں - مگر یہ کبھی نہیں فراموش کرنا چاہئے کہ گہرائی کے لئے تجدید بڑی ضروری چیز ہے - انسانی اعمال میں بھی اس قانوں کا ویسا ہی اثر ہے جیسا کہ عالم فطرت میں - زندگی اپنے اظہار کی خاطر اپنی وسعتوں کو محدود کرنے اور اپنے پھیلاؤ کو سمیٹنے کی خوگر ہے - وہ اپنے آپ کو اسی صورت سے موثر بنا سکتی ہے - انسانی زندگی جب کسی ایک مخصوص معیار کے تابع ہوجاتی ہے تو وہ ساری کائنات کو اس کے رنگ میں رچا ہوا دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے - اگر کوئی حسن پرست (aesthetician) یہ دعوی کرسکتا ہے کہ سچ وہی ہے جو حسین ہے تو یقیناً حق پرست کو بھی یہ دعوی کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے کہ حسین وہی ہے جو سچ ہے - چرخہ کی موسیقیت کا راز اسی مذکورہ نفسی کیفیت میں مضمر ہے —

تاریخ میں اب تک بہت کم ایسے لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے اس خلوص اور تاکید کے ساتھ اخلاق اور سچائی کو انسانی چلن اور برتاؤ کا سنگ بنیاد سمجھا ہے - اسی حق پرستی کی بدولت مہاتماجی باوجود اپنی " ہمالیہ برابر غلطیوں " کے انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہوئے - انھوں نے فوراً اپنی زندگی میں عملی طور پر دنیا کو یہ بتلا دیا کہ واقعی انسانی زندگی کا کمال اسکے اخلاقی کمال میں مضمر ہے - اخلاق انسان کا تمغۂ امتیاز ہے اور اسکی فطرت میں مرکوز ہے - یہ بالکل سچ ہے کہ آدمی کا بچہ جس وقت زندگی میں قدم رکھتا ہے تو معاً اس کا تعلق دو مختلف عالموں سے قایم ہو جاتا ہے - پہلا عالم فطرت اور دوسرا عالم اخلاق - اس کی زندگی ایک طرف تو فطرت کی مساعدت پر منحصر ہوتی ہے اور دوسری جانب اخلاق پر - پیدا ہونے کے بعد ذمہ داری، بے غرضی اور الفت کی آغوش میں اس کی تربیت ہوتی ہے - اگر نظام اخلاق نہ ہوتا تو شاید فطرت کی بے پناہیوں کا مقابلہ اس کے نازک اور کمزور بازو نہ کر سکتے - جوں جوں وہ عمر میں بڑھتا جاتا ہے اسکا یہ تعلق اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے - غرضکہ اس سے شاید ہی کوئی انکار کی جرأت کرے کہ انسانی زندگی کا سب سے اعلیٰ معیار اخلاق ہے جو مہاتماجی کے نزدیک حق پرستی کا دوسرا نام ہے —

" تلاش حق " ایک ایسے شخص کی زندگی کی کہانی ہے جسنے اپنی ساری عمر اخلاقی تجربوں میں گزاری ہے اس پاک کہانی سے ہزاروں کو ہدایت اور روحانی روشنی ملسکتی ہے —

ظاہر ہے کہ جس کتاب میں یہ کہانی بیان کی گئی ہے اسے دنیا کی چوٹی کی کتابوں میں شمار کرنا مبالغہ نہ ہوگا - ہم جامعہ ملیہ کے شکر گزار ہیں کہ اسنے اس کتاب کو چھپواکر اردو داں حضرات کو اسکا موقع بہم پہونچا دیا کہ وہ مہاتماجی کی زندگی کے حالات سے روحانی لطف اور بصیرت حاصل کر سکیں - ہم ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو بھی مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے ان تمام معنوی خوبیوں کو اس ترجمہ میں قایم رکھا جو مہاتماجی کی تحریروں کی خصوصیت ہیں —

(ی)

شوپنہار

(مصنفہ مجلوں صاحب گورکھپوری مجلد قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے - ایوان اشاعت گورکھپور)

یہ کتاب جناب مجلوں صاحب گورکھپوری نے جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کی زندگی کے حالات اور اس کے فلسفہ پر تالیف کی ہے - ایوان اشاعت گورکھپور کی پہلی کتاب ہے جو پبلک کے سامنے پیش کی گئی ہے - ایوان اشاعت کا دستورالعمل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر گورکھپور کے چند مقتدر اور اولوالعزم اصحاب کی سرپرستی میں یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد اردو زبان میں علم و ادب کی اشاعت ہے - بڑی خوشی کی بات ہے کہ ملک میں آج کل طرف اردو زبان کو دنیائے علوم و ادب کے خزانوں سے مالامال کرنے کی عام تحریک کے آثار نظر آرہے ہیں - ہمیں امید ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا —

اس کتاب کے شروع میں ایک دلچسپ تاریخی دیباچہ ہے جس میں شوپنہار سے قبل کے سب اہم یورپی مدارس فلسفہ کا ذکر کیا گیا ہے - پھر شوپنہار کی مابعد الطبیعات ' جمالیات ' اخلاقیات ' پر محققانہ تبصرے ہیں - آخر میں شوپنہار کی تاریخی اہمیت اور اس کے فلسفہ پر مجموعی تبصرہ ہے - مجلوں صاحب کا اسلوب بیان دلپذیر ہے اور انہوں نے خشک فلسفیانہ مضامین میں نہایت سلیقے کے ساتھ ادبی چاشنی اور لطف پیدا کر دیا ہے —

(ی)

اردو کے نئے رسالے

چاند

(اڈیٹر منشی کنہیا لعل صاحب ایم' اے - ایل' ال' بی -
ایڈووکیٹ - الہ آباد - سالانہ چندہ آٹھ روپیہ)

چاند ہندی کا ماہانہ رسالہ تھا - گزشتہ سال سے منشی کنہیالعل صاحب کے ادبی ذوق کی بدولت اردو میں بھی شایع ہونے لگا ہے - اس میں شک نہیں جیسا کہ اس کے اشتہار میں درج ہے کہ " چاند بہ اعتبار مضامین' ضخامت' تصاویر وغیرہ ہندوستان کا سب سے اعلیٰ رسالہ ہے " - رسالہ کیا ہے خاصی کتاب ہے - مضامین' معلومات نیز دلچسپی اور لطف کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں - لکھنے والے بھی قابل ملے ہیں - سنجیدہ مباحث' فسانے' نظمیں مختلف دلچسپ معلومات کے مضامین تصویریں بکثرت درج ہوتے ہیں - منشی صاحب نے اس کی ترتیب و اشاعت میں خاص اہتمام کیا ہے اور ان کی کامیابی پر ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں - عنقریب وہ اس کا اڈیٹر نمبر شایع کرنے والے ہیں جس میں اردو رسالوں کے قابل اڈیٹروں کے مضامین ہوں گے - یہ جدت منشی صاحب کے دماغ کا نتیجہ ہے - امید ہے کہ یہ نمبر بہت پر لطف ہو گا —

ادیب

(اڈیٹر مرزا اشرف بیگ - پشاور سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ پشاور سے شایع ہوتا ہے - اس کا عید نمبر تبصرے کے لئے ہمارے پاس آیا - حیرت ہے کہ سرحدی مقام پشاور سے ایسا اچھا رسالہ کیونکر شایع ہوا - تقریباً ایک سو ساٹھ صفحے کی ضخامت ہے - مختلف قسم کے مضامین نظمیں اور تصویروں نے اسے بہت دلچسپ بنا دیا ہے - گو اس رسالہ کا پایہ ادبی

اور علمی لحاظ سے بہت بلند نہیں ہے مگر سرحدی صوبہ کے صدر مقام سے اچھے اور خوب صورت رسالے کا نکلنا حیرت انگیز ضرور ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی دوسرے صوبے سے پیچھے نہیں ہے —

کوثر

(اڈیٹر ظہر تاباں - دہلی - سالانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ دہلی سے شایع ہوتا ہے - اگرچہ ہر چیز سے معمولی ہے مگر پھر بھی پڑھنے کے قابل ہے - اتنا سستا اور اوسط درجے کا اچھا رسالہ مشکل سے ملے گا —

خیالستان

(اڈیٹر اختر شیرانی - فیلمنگ روڈ لاہور)

اس کے عنوان پر لکھا ہے " اردو علم ادب کی رنگینیوں کا ماہوار مجموعہ " اور یہ بالکل صحیح ہے - اس سے زیادہ ہم اس کی تعریف نہیں کر سکتے - اختر شیرانی کی جدت طبع اور جودت خیالستان کی سیر کے لئے کافی ترغیب ہے —

تصحیح

رسالہ اردو بابت ماہ جولائی سنہ ۳۰ ع میں صفحہ ۵۱۶ پر کتاب " ہند و عرب کے تعلقات " کے تبصرے میں سطر (۲۲) میں سہواً بجائے امام زین العابدین کی والدہ کے امام حسین علیہ اسلام کی والدہ لکھا گیا ہے - براہ کرم اس کی تصحیح فرمائی جائے —

(ایڈیٹر)